بسلسلہ: سالنامہ 2018ء

قلم کا قرض

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

رائٹرز کلب، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن

قلم کا قرض

رائٹرز کلب پاکستان

کتاب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: قلم کا قرض

نظرِ ثانی: حمیرا اطہر

ایڈیشن: اول

سن اشاعت: 2018

تعداد: 700

قیمت: 700

پبلشر: رائٹرز کلب پاکستان

ملنے کا پتہ: تقوی کتب خانہ بالمقابل سفاری پارک گلشن اقبال کراچی۔

جمعیت الفلاح اکوڈ ریگل چوک صدر کراچی۔

Contact No:

0301-7886719

0313-6286827

email: urdu.article@gmail.com

www.writersclubpakistan.com

فہرست

قلم کار کا نام صفحہ نمبر

پیش لفظ

ادارے کا تعارف

تاثرات، ہدایات

عارف رمضان جتوئی 30

1۔فیشن سے فحاشی تک

2۔نئے لکھاری کیا چاہتے ہیں؟

3۔تعلیم سے ڈانس تک

4۔رشتوں کے ریشم

5۔محبت جرم کیوں

☆.....☆.....☆

عاصمہ عزیز 45

1۔بیسویں صدی کے سائنس دان.....البرٹ آئن سٹائن

2۔شکر گزاری

3۔کائنات، سائنس اور قرآن کی نظر میں

4۔زعم زدہ نفس

5۔ناقص نظام تعلیم

☆.....☆.....☆

ارم فاطمہ 58

1۔نمکین پانی

2۔عدم برداشت، ایک آکاس بیل
3۔دل کی بات
4۔جینے کا حق
5۔سودا

☆.....☆.....☆

دیا خان بلوچ 73
1۔ماڈل یا رول ماڈل
2۔نوجوان خودکشی کیوں کرتے ہیں
3۔خوف الٰہی ہی عین عبادت ہے
4۔دعا....آنسوؤں میں کِھلا پھول
5۔الفاظ کی اہمیت

☆.....☆.....☆

مریم صدیقی 87
1۔خودشناسی
2۔اسلام میں عورت کا مقام
3۔مردِ مومن
4۔مغرب کی تقلید اور آزادی اظہارِ رائے
5۔عورت گھر کی زینت

☆.....☆.....☆

مفتی عثمان الدین 101
1۔ماہ ذی الحجہ اور قربانی

2۔معاشرے کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟
3۔ماتحتوں سے متعلق ایک پریشانی کا حل
4۔''مکروہ'' شریعت کی نظر میں
5۔حکومتی سودن کی کارکردگی

☆.....☆.....☆

رقیہ فاروقی 119

1۔سنت کا نور
2۔ہم پریشان کیوں ہیں؟
3۔اصلاح معاشرہ کیسے ممکن؟
4۔علم ہے منزلِ عرفان وہدایت کا چراغ
5۔بطور شہری ہماری ذمے داری

☆.....☆.....☆

مولانا تنویر احمد اعوان 129

1۔مقام سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ اور پیغام کربلا
2۔حرم مکہ، اہل ایمان کی محبتوں کا مرکز
3۔ماہِ صفر....توہمات اور اسلامی تعلیمات
4۔صحابہ کرام، معیار ایمان

☆.....☆.....☆

نور بخاری 141

1۔حصول تعلیم اور مقاصد
2۔گرمی کی آمد

3۔ملک ہمارا، رسومات ہندوؤں کی
4۔نفسیاتی بیماریاں اور علاج
5۔ملک میں تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے؟
☆.....☆.....☆

ام محمد سلمان 154
1۔بائیکاٹ
2-دلہن کا جنازہ
3-میرے ابا جی
4-ازدواجی زندگی میں سوشل میڈیا کی مداخلت
☆.....☆.....☆

چودھری محمد اویس سکندر 168
1-اچھی معاشرتی حکمرانی کے تقاضے
2- تعلیمی اداروں میں گزرے لمحات
3-ہمارا نظام تعلیم اور جہالت
4-صحافت، ریاست کا چوتھا ستون
5-سرسبز و شاداب، ساہیوال
☆.....☆.....☆

مشعل اسلام 180
1-اخلاقِ حَسنہ کیا ہے؟
2۔پیغام اقبال
3۔حیا ایمان کا حصہ ہے

4۔خود پسندی
5۔سیاسی ایمان داریاں

☆.....☆.....☆

فخر الدین پشاوری 191

1-بہترین لوگ
2-اسلام اور آج کا معاشرہ
3-مدرز ڈے اور ہم
4-سوشل میڈیا پر شیئرنگ کے وقت ذرا سوچیے
5-یومِ شہدائے پولیس

☆.....☆.....☆

عائشہ یاسین 203

1۔بابے لوگ
2۔سفید چھڑی
3۔آگہی
4۔کامیاب بیوی
5۔بند مُٹھی

☆.....☆.....☆

علینہ فاطمہ 217

1۔الیکشن اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی
2۔دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں
3۔مقصدیات

4۔پنجاب، یو پی ٹارگٹ کے نام پر اساتذہ کا استحصال
5۔مان

☆.....☆.....☆

ساحر مرزا 229

1۔پڑھا لکھا پنجاب
2۔دلچسپی کا امتحان
3۔پرانی رنجشیں
4۔نئے دور کی اُداسی
5۔محبت راکھ بن گئی

☆.....☆.....☆

علی عبداللہ 242

1-برگد سے جڑے توہمات اور حقیقت
2-فلسفہ سقراط پر ایک نظر
3-اسلام ہی کیوں؟
4-منطق الطیر، جدید

☆.....☆.....☆

عظمیٰ ظفر 257

1-اے کاش!
2-بارش
3-مستعار
4-جہاد بالقلم

5-روشن رات

☆.....☆.....☆

طیبہ شیریں 273

1-محنت سے ہی کامیابی ملتی ہے
2-تعلیم کا درجہ و مقام
3-عورت کا مرتبہ
4-بیٹی....اللہ کی رحمت
5-فیس بک

☆.....☆.....☆

عائزہ ظہیر چغتائی 287

1-عورتوں کا استحصال
2-کشمیر....وادی جنت نظیر
3-دور حاضر کا فتنہ....مذہب انسانیت
4-دہرا نظام تعلیم
5-خوشی اور سکون

☆☆☆☆☆

صبیح الحسن 300

1-ٹیلنٹ کی تو کوئی قدر ہی نہیں
2-مستقبل کی یادیں (ڈی جاوو)
3-تبرک (افسانچہ)
4-زرخیز زمین

5- موجودہ سے سابق تک کا سفر

☆.....☆.....☆

صدف نایاب 315

1- ایک احساس

2- ڈراما

3- ہم بنے لکھاری

4- میں تو اُمّتی ہوں

5- قاتل پر ایک نظر

☆.....☆.....☆

شافعہ افضل 329

1- آزمائش (افسانہ)

2- خود کو ناپسند کرنے کی وجوہ

3- بچوں کی تعلیم و تربیت

4- مکافاتِ عمل

5- سوشل میڈیا

☆.....☆.....☆

ثناء نوشین 344

1- قومی تشخص محفوظ کرنے کی ضرورت

2- والدین کا احترام

3- اردو زبان کا المیہ

☆.....☆.....☆

شیبا اعجاز 353

1-مذہب انسانیت
2-زندگی بے کار نہیں (افسانہ)
3-مطالعے کی اہمیت
4-ذرا سی بات
5-سیاست کا رنگین چشمہ

☆.....☆.....☆

زیبا عظیم 365

1- تعلیم میں اساتذہ کا کردار
2-رشتے نبھانے کی آخری صدی
3-ریڈرز ہی لیڈر
4- حقیقی رشتوں کی قدر کیجیے
5-فرائیڈے....بلیک یا وائٹ؟ فیصلہ آپ کا

☆.....☆.....☆

سعدیہ انعم 377

1-ذہنی بوجھ
2-بہت ساری جنتیں
3-غیرت
4-نظم

☆.....☆.....☆

ام محمد عبداللہ 390

1- سالار کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
2- جائز کاموں میں سفارش کا اجر و ثواب
3- نفع نقصان کا مالک
4- عقیدہ ختم نبوت، ایمان کا لازمی حصہ
5- آم کھاؤ بھئی آم

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر حامد حسن حامی 406

1- خطرناک کون....ایڈز یا معاشرہ؟
2- بڑا آدمی
3- غرض....بے غرض
4- قوانین اصلاح
5- تبدیلی کیسے لائی جائے؟

☆.....☆.....☆

اسری نوشین ملک 419

1- میں پاکستان ہوں
2- ٹیلی وژن کی تباہ کاریاں
3- ایٹمی قوت.... پاکستان کی نئی شناخت
4- پہلا قدم
5- اڑان

☆.....☆.....☆

حوریہ ایمان ملک 431

1- آج میرا روزہ ہے
2- عقل مند کی تلاش
3- ہم دیکھیں گے
4- کیا آپ ڈپریشن کا شکار ہیں؟
5- پاکستانی ڈرامے اور اخلاقی شعور

☆.....☆.....☆

انیلہ افضال 443

1- وطن کی خاطر
2- عبادت اور خوفِ الٰہی
3- بطور پاکستانی ہماری ذمے داریاں
4- یہ دو کوڑی کے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں
5- زنانی کی زبان

☆.....☆.....☆

عاجزہ بنت عارف 457

1- عظیم شہید بیٹا
2- فکر دنیا نے کیا ہمیں برباد
3- پھولوں جیسے نازک جذبات
4- رشتوں کی مٹھاس
5- مقصد زندگی

☆.....☆.....☆

آسیہ پری وش 472

1-اپنی دنیا آپ پیدا کر
2-معاشرے کی اصلاح کیسے ممکن
3-اصل محتاجی معذوری نہیں ذہنی ہے
4-ٹیوشن سینٹر
5-توجہ کے طالب، اپنے آنگن کے پھول

☆.....☆.....☆

آمنہ وزیر امن 484

1-دستک
2-حاصل سفر
3-(نظمیں)

☆.....☆.....☆

انصر محمود بابر

1-عبادات و معاملات 497
2- کتاب یا ہتھیار.....ثقافت یا فحاشی؟
3- تغیر و ثبات
4-انسان اور مشین
5- فکر

☆.....☆.....☆

اسامہ فاروق 509

1-خدمت کو ووٹ دیں

2- ہمیں بھی پروٹوکول چاہیے، تنقید کیوں؟
3- بے حسی یا بے بسی
4- بچوں کی تربیت کا فقدان
5- تعلیم، ہر بچے کا حق ہے

☆.....☆.....☆

520 انعم ثناء

1- کشمیر جنت نظیر
2- بچوں میں موازنہ
3- سادگی ہی حسن ہے
4- تعلیم یا تربیت؟

☆.....☆.....☆

529 حمیدہ کیلانی

1- میرا رب ہی تمام خزانوں کا مالک ہے
2- تقویٰ، توکل اور دعا

☆.....☆.....☆

541 سید شاہ زمان شمسی

1- عالم تمام حلقہ دام خیال ہے
2- کتابوں سے عشق کی آخری صدی
3- محسوسات و کیفیات کیا ہیں؟
4- نظام چاپلوسیت کا خاتمہ ناگزیر
5- آنکھوں سے نورِ ایمانی چھن گیا

☆.....☆.....☆

فریحہ سوہاگ 555
1- ڈپریشن کی وجوہ اور علاج
2- تعلیم کی اہمیت
3- پاکستان میں آبی مسائل

☆.....☆.....☆

561
محترمہ مغیثہ خالد صاحبہ
دعا کی فضیلت و اہمیت

☆.....☆.....☆

564
عمر الطاف باجوہ
1- ففتھ جنریشن وار کیا ہے؟
2- یوم تکبیر
3- قلم کا تقدس
4- غزوہِ ہند
5- یوم پاکستان

☆.....☆.....☆

576
شاہ زیب ملک
1- بچوں کو دکھائیں امکانات کی دنیا
2- زندگی کیسے گزاریں
3- سیرتِ حضرت بلالؓ

4- عشق حقیقی

☆.....☆.....☆

587

ضیاء اللہ گلگتی

1- اخلاق حسنہ، سنّتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

2- ناممکن سے ممکن کیسے ہو گیا

3- افغانستان، ایک خود مختار ملک

4- وادی ہوڈر، گلگت بلتستان

☆.....☆.....☆

598

عائشہ عارف

1- رزقِ حلال

2- ہمارے ہیرو، ہمارے رہنما

3- ہم کیوں لکھیں؟

4- مکمل ضابطہ حیات

☆.....☆.....☆

آسیہ عبدالحمید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نظم

ادیب اور ادب۔۔۔۔۔۔۔،۔۔زہرا تنویر

سوشل میڈیا اور منہ بولے رشتے۔۔۔ابن نیاز

میت کا کھانا اور معاشرتی بے حسی۔۔درصدف ایمان

نجی تعلیمی ادارے یا نجی کاروبار۔۔۔۔فری ناز خان

پردے سے متعلق سائنسی حقائق۔۔۔۔عائشہ صدیقہ

نوجوان نسل کی ذمہ داریاں۔۔۔۔۔ثوبیہ اجمل

رسول اکرم ﷺ بحیثیت مثالی شوہر۔۔حسنین معاویہ

کامیابی سے ملاقات۔۔۔۔۔۔۔۔بلال شیخ

صلاح الدین ایوبی۔۔۔۔۔۔۔۔ایمن احمد

استاد، تعظیم کا حقیقی حقدار۔۔۔۔۔۔۔مریم بتول

صحافت جرائم پیشہ افراد کا گنگا جمنا۔۔۔علی احمد ساگر

فرائض میں کوتاہی کیوں؟۔۔۔۔۔۔ام کلثوم

دوہرا معیار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔معصومہ ارشاد سولنگی

ایک غلط بیانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امان اللہ با جوڑی

آئینہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مدیحہ مدثر

عبادت کے معنی و مفہوم۔۔۔۔۔عالیہ ذوالقرنین

گوشت خور گدھ اور مسلمان۔۔۔سفیر احمد چوہدری

بیٹیاں رحمت، زحمت مت سمجھیں۔آمنہ عبدالغفور

قرارداد پاکستان۔۔۔۔۔۔۔۔۔سیدہ حمیرا فاطمہ

پیش لفظ

ہر انسان کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے کہ اگر وہ اس سے فائدہ اٹھالے تو نہ صرف اپنی زندگی بدل سکتا ہے بلکہ اور بہت سے لوگوں کی زندگیاں بھی بدل سکتا ہے۔ یہ لمحہ بہت ہی قیمتی ہوتا ہے اور آنے والا وقت اس لمحے سے اٹھائے گئے فائدے کی بنا پر اس کی اصل قیمت سے آگاہ کرتا ہے لیکن اس لمحے کے ہاتھ سے نکل جانے پر شاید نقصان کا اندازہ نہ لگایا جا سکے لیکن ایک پچھتاوا ساری زندگی انسان کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ ''رائٹرز کلب'' کے قیام کا فیصلہ بھی ایسے ہی ایک لمحے کا مرہون منت ہے۔ ایک موقع محسوس ہوا تو سوچا کوشش کرنے میں کیا حرج ہے اور پھر اس موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ سوچنے اور سمجھنے میں وقت برباد کیے بغیر اہل قلم کو جمع کیا اور سفر کا آغاز کر دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اللہ نے ہمیں مقصد میں کامیابیاں عطا کرنا شروع کر دیں۔ کئی ایک خواب تھے جو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں شرمندہ تعبیر ہوئے اور آج بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رائٹرز کلب ترقی کی راہ پر ہر گزرتے دن ایک نیا سنگ میل عبور کر رہا ہے۔ آج ہمارے لیے یہ مسرت کا ایک اور لمحہ ہے کہ ہم باقاعدہ طور پر اپنے ارکان کی منتخب تحریروں پر مشتمل ایک کتاب چھپوا چکے ہیں۔ اس کتاب کے پہلے لمس سے وابستہ احساسات کا اندازہ شاید ہی کوئی لگا سکے لیکن ہماری خوشی کو آپ ان تمام لکھاریوں کے چہروں پر با آسانی دیکھ سکیں گے جن کی تحریریں اس کتاب میں شامل ہیں۔

اس کامیابی پر میں اپنے گروپ کے ایڈمنز، ایڈیٹرز اور ارکان کا تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی بدولت آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں۔ خصوصا محترمہ حمیرہ اطہر صاحبہ کا شکریہ جنہوں نے اپنا قیمتی اور طویل وقت لگا کر اس کتاب کی ہر تحریر کو نہ صرف پڑھا بلکہ درستی بھی کی۔ ایڈیٹنگ کا ایک مشکل ترین مرحلہ طے ہوا، حقیقت میں ہمارے پاس اس کاوش کے لیے الفاظ نہیں۔

کتاب ''قلم کا قرض'' اپنی نوعیت کی ایک الگ کتاب ہے۔ اس کو سالنامہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں کسی دوسرے سالنامے سے زیادہ محبت اور خلوص موجود ہے۔ کہنے کو شاید یہ ڈھیر ساری بے ترتیب تحریروں کا مجموعہ ہے مگر کوئی سمجھے تو ہر تحریر اپنی جگہ مکمل ہے، بس اس کے لیے آپ کو یہ کتاب ہماری سوچ اور سمجھ سے پڑھنی پڑے گی۔

کن کن کامیوں کا زکر کروں اور کس کس کا نام لے کر شکریہ ادا کروں بس یہ سمجھ لیجیے کہ عمارت کی بنیادوں سے لے کر آخری اینٹ تک بے شمار کردار موجود رہے اور ہیں۔ ان گنت ارمان، ان گنت افراد اور ان گنت امیدوں کا یہ ایک مجموعہ ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ اس کتاب میں موجود غلطیوں کو بشر ہونے کے ناتے درگزر کیجیے گا اور جو اچھا ہے اس پر حوصلہ افزائی صاحب تحریر کا حق ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قلم کا قرض ادا کرنے کے قابل بنائے اور اپنے قلم کو درست سمت میں استعمال کرنے کا حوصلہ اور ہمت دے، آمین

عارف رمضان جتوئی

بانی رائٹرز کلب پاکستان

رائٹرز کلب، تعارف و مقصد

ہر چیز کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہی مقصد ہی اس کی جہت اور راستے کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ رائٹرز کلب بھی ایک ایسے ہی بے مثال مقصد کے تحت وجود میں آنے والا ادارہ ہے جو اپنے راستے کی جانب کامیابی سے گامزن ہے۔ ایک مختصر سا سوشل میڈیا پر بننے والا یہ گروپ اب ایک مکمل ادارے کی صورت اختیار کر چکا تو صرف اس وجہ سے کہ اس میں کام کرنے والا ہر شخص چاہے وہ ذمہ داران ہوں، ایڈیٹر یا پھر ممبر سب ہی مخلص ہیں۔ ان کے قلم کا ایک مقصد ہے نہ کہ لکھنا مقصد ہے۔ اس گروپ کی تشکیل اور اب تک کے تمام مراحل کا ذکر کیا جائے تو شاید ان تمام مخلصین کے اخلاص کا حق ادا نہ ہو سکے مگر پھر بھی بہت کم الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے۔

رائٹرز کلب کی تشکیل:

اصلاح معاشرہ کی سوچ کے تحت 14 جنوری 2016ء کو وجود میں آنے والا یہ ادارہ آج سوشل میڈیا کے تمام پورٹلز اور پرنٹ میڈیا میں مقبولیت کی منازل طے کر رہا ہے۔ یہ ادارہ ان تمام قلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد کا ہے جو معاشرے اور امت مسلمہ کی اصلاح کا جذبہ رکھتے ہیں، جو اپنے قلم کے مقصد سے آگاہ ہیں۔ جو اپنے قلم کی روشنی سے معاشرے کی تاریکیاں دور کرنے کے خواہاں ہیں۔ یہ ادارہ ان کا ہے جنہوں نے اسے اپنا قیمتی وقت دیا اور اسے پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔

اغراض و مقاصد:

رائٹرز کلب کا آغاز ایک سوچ اور جذبے کے تحت کیا گیا، اصلاح معاشرہ ہی وہ جذبہ ہے جو اس ادارے کے قیام کی وجہ بنی۔ اس پرفتن دور میں جہاں ہماری نوجوان نسل کو مذہب اور ملک و قوم سے دور کیا جا رہا ہے، نت نئے فتنے روز بروز سر اٹھا رہے ہیں وہیں ان فتنوں کا سد باب کرنے کی ذمے داری رائٹرز کلب پاکستان نے اٹھائی اور نئے قلم کاروں کو ان کے لکھنے کے مقاصد سے آگاہ کیا۔

رائٹرز کلب پاکستان کے مقاصد میں شامل ہے:

☆ نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی اور تحریروں کی اصلاح کر کے موقر جرائد میں اشاعت ممکن بنانا۔
☆ اخبارات میں شائع شدہ تحاریر کے تراشے رائٹرز کو فراہم کرنا۔
☆ اخبارات کے تراشے سوشل میڈیا، رائٹرز کلب کی ویب سائٹ اور یوٹیوب چینل پر وائرل کرنا۔
☆ مقابلہ جات کے ذریعے رائٹرز کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنا اور ان کے لکھے ہوئے کی تصحیح کرانا۔
☆ مختلف ورکشاپس کے ذریعے سیکھنے کے مواقع فراہم کرنا۔
☆ مذہبی، سماجی و معاشرتی مسائل پر قلم اٹھانا اور عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ آگہی فراہم کرنا۔
☆ آن لائن میٹنگز کے ذریعے اہداف کا تعین کرنا۔

رائٹرز کلب پاکستان کی انتظامیہ نے ہمیشہ اپنے مقاصد کو مدنظر رکھا اور سالنامہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

ہمارے رفقاء:

دنیا کا دستور ہے کہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ گردش دوراں نے ہمیں بہت سے نئے لوگوں سے ملوایا تو ہمارے کچھ ساتھی ہم سے دور ہو گئے۔

ابتدائی دور میں فرحین ریاض، دانیہ آفرین اور عارف رمضان جتوئی نے مل کر رائٹرز کلب کی بنیاد رکھی اور منتظمین کے فرائض سرانجام دیے۔ اس دوران بے شمار نئے قلم کاروں کے قلم نے فیض حاصل کیا اور قلم کی دھار کا درست استعمال کرنا سیکھا۔ گروپ کی بدولت کئی نئے لکھنے والوں نے اپنا نام بنایا اور آج وہ بہت اچھی جگہ باقاعدہ طور پر لکھ رہے ہیں۔

پھر راستہ طویل منزل بعید اور مقصد لازوال ہونے کی وجہ سے ابتدائی منتظمین حوادث زماں میں کہیں کھو گئے۔ اس کے بعد آمنہ نسیم اور عاصمہ عزیز نے گروپ میں بھرپور منتظم کا کردار ادا کیا۔ طویل عرصہ ساتھ رہنے کے بعد بالآخر آمنہ نسیم کا ساتھ بھی ماضی کے دریچوں میں چلا گیا۔ ان کے علاوہ نوجوان رائٹر محرومہ رفعت خان نے بھی منتظم کے طور خدمات دیں مگر۔۔۔

بعد ازاں ثنا واجد، ارم فاطمہ، عبداللہ، ابن احمد، دیا خان، زہرا تنویر، عائشہ صدیقہ، عالیہ ذوالقرنین، حوریہ ایمان ملک اور موجودہ ذمہ داران میں مریم صدیقی، عائشہ یاسین، فائزہ خالد اور کچھ پس پردہ دیگر نام شامل ہیں جنہوں نے بھرپور ساتھ دیا اور اب تک ساتھ ہیں۔ رائٹرز کلب کی کامیابی میں اخلاص نیت اور مخلص ساتھی ہیں اور یہ تمام رائٹرز ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں جنہیں ہم کبھی بھلا نہ سکیں گے۔

رائٹرز کلب کی کارکردگی:

گزشتہ 4 سال کے عرصے میں اللہ کے فضل و کرم سے اور رائٹرز کلب کی ٹیم کے اخلاص اور محنت کے باعث آج رائٹرز کلب سوشل میڈیا کے مختلف فورمز پر اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اپنے ارکان کی کتاب کی اشاعت سے لے کر، ویب سائٹ، یوٹیوب چینل، اردو اور انگریزی ای میگزین کے افتتاح تک رائٹرز کلب کی ٹیم کی مکمل معاونت اور پرخلوص جدوجہد شامل ہے۔ رائٹرز کلب پاکستان کی انتظامیہ شکرگزار ہے ان تمام لوگوں کی بشمول رائٹرز کلب کے ذمہ داران اور اراکین کی جنہوں نے رائٹرز کلب کو وقت دیا، ہماری پرخلوص کاوشوں کو سراہا اور اسے آج اس مقام تک پہنچانے کا سبب بنے۔

روزنامہ جسارت کے چیف ایڈیٹر اطہر ہاشمی کے تاثرات

جہاں اب ملک میں مختلف قسم کے کلب کام کر رہے ہیں جو تفریح کے نام پر جانے کیا کر رہے ہیں ان میں ایک رائٹرز کلب بھی ہے جو شعور پیدا کر رہا ہے اور آگہی پھیلا رہا ہے۔ یہ گروپ اخبارات میں مختلف مضامین شائع کرواتا ہے اور سماجی ذریعہ ابلاغ سے مثبت خیالات کو فروغ دیتا ہے۔

''قلم کا قرض'' اتارتے ہوئے اب رائٹرز کلب کی رت سے ہر رکن کے 5، 5 مضامین لے کر کتابی شکل میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ ''قلم کا قرض'' ہی نہیں فرض بھی ہے کہ آگہی کو عام کیا جائے۔

سچی بات یہ ہے کہ خود ہمیں واٹس ایپ، فیس بک وغیرہ کا کوئی علم نہیں کہ یہ کیا ہیں اور کیسے کام کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ہمارے بارے میں یہ کہا تھا۔۔

''آئین نو سے ڈرتا، طرز کہن پہ اڑتا''

ہم اب تک طرز کہن پہ اڑے ہوئے ہیں لیکن جو نوجوان سماجی رابطوں کا مثبت استعمال کر رہے ہیں وہ قابل مبارکباد ہیں۔

بقول اقبال۔۔

''جوانوں کو پیروں کا استاد کر''

اور وہ استادی دکھا رہے ہیں، دھیان رہے پیروں کے پے کے نیچے زیر ہے، زبر نہ کیا جائے۔

اطہر ہاشمی

روزنامہ اوصاف کے ادبی صفحے کی انچارج سلمیٰ اسد لکھتی ہیں

تخلیقی عمل توجہ مانگتا ہے۔ قلمکاری ہو یا کوئی بھی تخلیقی عمل، اس کے لیے آپ کا معاشرے، ماحول اور افراد سے جڑا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اب یہ جڑت کیسی ہونی چاہیے؟ سمعی، بصری یا وجدانی۔۔ قلم کار کا حساس ہونا بھی ضروری ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ قلم کار حساس ہی ہوتا ہے اور اپنی اس حساسیت کی بنا پر ہی وہ اپنے اردگرد بکھرے مسائل کو کہانی یا آرٹیکل کی صورت میں یکجا کرتا ہے۔۔۔ لفظوں کو تراشتا اور بیونتا ہے اس میں اپنے احساسات کے رنگ بھرتا ہے۔ کہیں کوئی ذرہ برابر بھی کجی رہ جائے تو بات قاری کے دل پر اترتی نہیں، اپنا رنگ نہیں جماتی۔ رائٹرز کلب پاکستان نئے لکھنے والوں کے لیے ایک پلیٹ فورم ہے، اس پلیٹ فورم سے میرے پاس اکثر روزنامہ اوصاف کے لیے تحریریں آتی رہتی ہیں۔ رائٹرز کلب کے ذمے دار عارف رمضان جتوئی صاحب سے یہ سن کر مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میرے خواتین اور ادب ایڈیشنز میں بلکہ خصوصا خواتین کے صفحے پر رائٹرز کلب ارکان کی ایک تسلسل سے چھپنے والی کہانیوں اور آرٹیکلز کو کتابی صورت میں پبلش کیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں اس عمل سے نئے لکھنے والوں کی مزید حوصلہ افزائی ہوگی اور ان میں زیادہ بہتر لکھنے کا رجحان بڑھے گا۔ اگرچہ میں کتاب کی تمام تحریروں کو نہیں پڑھ سکی البتہ جو میرے پاس پہنچیں اور میں نے ان تحریروں کو اپنے پاس جگہ دی وہ تمام تحریریں کمال کی تھیں۔ ان پیاری مصنفین کی توصیف بھی یقیناً ان کا حق بنتا ہے کہ بحیثیت ایک ایڈیٹر کے کبھی کبھی مجھے ان ینگ رائٹرز میں سے چناؤ کرنے میں بھی دقت پیش آتی رہی کہ کس کی تحریر کو شامل اشاعت کیا جائے اور کسے نہیں۔ بہرکیف ان کے لیے بیسٹ وشز اور ان کی تخلیقات کو کتابی صورت میں چھاپنے کے لیے عارف رمضان جتوئی صاحب کو بھی بہت مبارک ہو۔ لکھنے اور چھاپنے کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

سلمیٰ اسد (انچارج ادب/خواتین ایڈیشنز۔ روزنامہ اوصاف)

کچھ تاثرات اور چند مشورے

گزشتہ برس جب ''رائٹرز کلب'' کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ پورے سال کے دوران اس کلب کے ارکان کی شائع شدہ تحریروں کو یکجا کر کے کتابی شکل دی جائے گی، تو یقین مانئے کہ یہ جان کر بہت اچھا لگا۔ اگر یہ کام سالانہ بنیادوں پر جاری رہے تو کیا کہنے!

دنیا بھر میں قلم کاروں کی اچھی تنظیمیں یہی کرتی ہیں اور ''رائٹرز کلب'' نے یہ فیصلہ کر کے بہت ہی مناسب قدم اٹھایا ہے۔

لیکن ''ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے'' کے مصداق، عارف میاں (عارف رمضان جتوئی) نے میرے ذمے ایک مشکل اور عجیب سا کام لگا دیا: کچھ تاثرات اور کچھ نصیحتیں۔

خیر! تاثرات کا معاملہ تو سطورِ بالا میں پورا ہوا مگر نصیحتوں کی طلسمِ ہوش ربا میں اتنا کچھ ہے کہ اگر انہیں یہیں بیان کرنے بیٹھ گیا تو علیحدہ سے ایک پوری کتاب درکار ہوگی۔ البتہ، تحریر کی سنگلاخ زمین پر خوب سے خوب تر کے سفر پر گامزن رہنے کے لیے کچھ مشورے ضرور دینا چاہوں گا۔

لکھنے سے پہلے پڑھئے: معذرت کہ نئے لکھنے والوں کے یہاں لکھنے کا شوق تو ہے لیکن مطالعے کا رجحان تقریباً ناپید ہے۔ واٹس ایپ گروپس میں فارورڈ کیے ہوئے پیغامات، ٹوئٹر کی ٹویٹس اور فیس بک پر ''اسٹیٹس اپ ڈیٹس'' پڑھنے کو مطالعہ نہیں کہا جا سکتا۔ مطالعے سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص موضوع کے بارے میں مختلف حوالوں سے مستند اور مفصل تحریریں پڑھی جائیں۔ جس بارے میں لکھنا ہے، اس بارے میں متنوع فیہ ذرائع سے معلومات یکجا کی جائیں اور انہیں ''ہضم'' بھی کیا جائے (یعنی اچھی طرح سمجھا بھی جائے)۔ اس کے بعد لکھنا شروع کیا جائے۔

زبان پر دھیان: بیشتر لکھنے والے، اندازِ بیان اور زبان کو برتنے کے معاملے میں خاصے غیر محتاط ہیں۔ اگر تحریر کا موضوع اچھا ہو اور لکھنے والے نے مطالعہ بھی خوب کر رکھا ہو لیکن زبان پر توجہ نہ دی ہو تو تحریر بالعموم ''ہم تو ان کو خط لکھیں گے، چاہے مطلب کچھ نہ ہو'' کی بے ہنگم تفسیر بن کر رہ جاتی ہے۔ نہ املا درست نہ جملہ صحیح، نہ اندازِ بیان میں کوئی روانی نہ رموزِ اوقاف کی کچھ خبر... بس جب لکھنا شروع کیا تو لکھتے چلے گئے اور مکمل کرتے ہی یہاں وہاں اشاعت کی غرض سے بھیج دیا۔ مدیر نے مسترد کر دیا تو منہ بسورے بیٹھے ہیں کہ میں نے تو اتنی محنت سے اور اتنا اچھا لکھا تھا، نہ جانے مدیر/مدیرہ کو اس میں کونسے کیڑے نظر آ گئے جو ''ردّی کی مجازی ٹوکری'' (ای میل ٹریش) میں پھینک دیا۔ غلطی کی نشاندہی کر دو تو آگ بگولا ہو گئے۔ (منہ پر نہ سہی لیکن دل ہی دل میں خوب کھری کھوٹی سنا ڈالیں کہ لو جی! ان کے تو نخرے ہی

نہیں ملتے!) یاد رکھئے، مسترد ہونے والی لگ بھگ 80 فیصد تحریریں اپنے اندازِ بیان اور زبان کی غلطیوں ہی کی وجہ سے ردّی کی ٹوکری میں جاتی ہیں۔ اس لیے مشورہ دوں گا کہ جس زبان میں بھی لکھ رہے ہیں، اسے عزت دیجئے اور درست طور پر لکھئے۔ ایک زبان میں غیر ضروری طور پر کسی دوسری زبان کا پیوند نہ لگائیے۔ (ہاں! اگر ضرورت پڑ جائے تو پھر دوسری زبان کے الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں مگر ان کی بھرمار نہیں ہونی چاہیے۔)

اپنا لکھا کیوں پڑھوں: ایک اچھا قلم کار اپنی تحریر مکمل کرنے کے بعد اسے کم از کم دو مرتبہ ضرور پڑھتا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں یہ رجحان بہت کم رہ گیا ہے۔ نئے لکھاری اکثر سینہ ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہمی نے تو لکھا ہے، بھلا ہمیں اپنا ہی لکھا ہوا پڑھنے کی کیا ضرورت؟ اس بھاری غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ یاد رکھئے کہ لکھتے وقت انسان کا مزاج اور ہوتا ہے جبکہ پڑھتے وقت اور۔ اپنی تحریر کو قاری کی نظر سے، قاری بن کر پڑھئے۔ ایک ایسا قاری جو آپ سے واقف نہیں لیکن آپ اسے متوجہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایک ایسا قاری جو بے رحم ہے اور ذرا سی اکتاہٹ محسوس کرنے پر آپ کی تحریر ادھوری چھوڑ کر اٹھ جائے گا۔ جب آپ ایک قاری کی حیثیت سے اپنی تحریر پڑھیں گے تو ممکنہ طور پر آپ کو اس میں بہت سی ایسی خامیاں دکھائی دیں جنہیں آپ لکھتے وقت (یعنی جب آپ لکھاری کے ذہن سے سوچ رہے تھے، تب) نظر انداز کر گئے تھے۔

اپنی شائع شدہ تحریر کا مطالعہ: جب ہم ''خوب سے خوب تر'' کی بات کرتے ہیں تو یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ایک اچھا مدیر کسی بھی تحریر کو توجہ سے پڑھ کر، اس میں ضروری ردّ و بدل (ادارت) کرنے کے بعد ہی اسے شائع کرتا ہے۔ خود اکتسابی کے نقطہ نگاہ سے ضروری ہے کہ جو تحریر آپ نے اشاعت کے لیے ارسال کی تھی، اس کا موازنہ شائع شدہ تحریر سے کیجئے اور اپنے طور پر یہ جاننے کی کوشش کیجئے کہ مدیر نے اس میں کہاں کہاں اور کس کس نوعیت کی تبدیلیاں کر کے اسے شائع کیا ہے۔ یہ مشق ایک طرف آپ کو مدیر اور ادارے کا مزاج سمجھنے میں مدد دے گی تو دوسری جانب آپ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بھی واقف ہوں گے اور امید ہے کہ آئندہ وہ غلطیاں نہیں کریں گے۔ بعض مرتبہ مدیر کسی تحریر کی ادارت کرتے وقت اس میں سے کچھ جملے کم کرتا ہے اور چند جملوں کا اضافہ بھی کر دیتا ہے۔ اس میں ادارتی پالیسی اور خود مدیر کے مزاج کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ارسال کردہ اور شائع شدہ تحریروں میں موازنہ یہ سب سیکھنے میں بھی آپ کا بہت مددگار رہے گا اور (ان شاءاللہ) ہر تحریر کے ساتھ آپ کا قلم کھلتا چلا جائے گا۔

لکھنے کو بہت کچھ ہے لیکن خود مجھے بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب ''رائٹرز کلب'' کے ارکان کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ باقی باتیں پھر سہی... یار زندہ، صحبت باقی۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو

علیم احمد

مدیر اعلیٰ، ماہنامہ گلوبل سائنس، بلاگ ایڈیٹر، ایکسپریس نیوز

قلم کے مجاہدوں کو سلام

قلم اندھا نہیں۔۔۔سوچتا، سمجھتا، سنتا اور دیکھتا بھی ہے۔۔۔بناوٹ پر ہی غور کر لیں، سب صاف صاف دکھائی دے گا۔۔۔یہ ایک ایسی تلوار ہے جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔۔۔جھوٹ لکھو یا سچ۔۔۔سب با اثر۔۔۔اب چاہو تو اس تلوار سے جھوٹ کا سر کاٹو یا سچی زبان۔۔۔

قلم کو سب کرشمہ دکھانا آتا ہے۔۔۔اس میں معجزہ بھی ہے، کرامات بھی، جادو بھی، اظہار بھی۔۔۔یہ جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کی زبان بولتا ہے، اس کے اندر کو باہر لاتا ہے۔۔۔روح کی سوچ کو دنیا پر واضح کرتا ہے۔۔۔اور ظاہری دنیا کو اپنی دنیا میں گھیر لیتا ہے۔۔۔

قلم کو کیا نہیں آتا۔۔۔قلم کو سب آتا ہے۔۔۔قلم کو سب دِکھتا ہے۔۔۔اسے رونا بھی آتا ہے۔۔۔یہ معاشرے کی بے بسی پر کڑھتا، ظلم پہ بولتا، عدل پہ خوش بھی ہوتا ہے۔۔۔قلم منافق نہیں نہ ہی منافقت پسند کرتا ہے۔۔۔یہ انصاف پسند اور سچائی کا عاشق ہے۔۔۔اس کی طبیعت میں جبر نہیں۔۔۔یہ تاریخ ہی نہیں تقدیر بھی رقم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔۔۔قلم کیا کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔

رائٹرز کلب اور ان کے سربراہ عارف رمضان جتوئی کی کاوشوں کے لیے بہت سی دعائیں کہ جو قلم کے نئے مجاہدوں کی صفیں ترتیب دے رہے ہیں۔رائٹرز کلب کی جانب سے سالنامہ کتاب کی اشاعت ایک بہتر قدم ہے۔اس کا سلسلہ یوں جاری رہنا چاہیے۔اللہ اس لشکر کی حفاظت اور قابلیت میں اضافہ کرے، میرے پاس اب تک ان مجاہدین کی جتنی بھی تحریریں آئیں، میں نے ان کے ساتھ اپنے ادارے اور صحافت کے طے کردہ اصولوں کے مطابق بہتر سلوک کرنے کی بھرپور کوشش کی۔۔۔

امید ہے یہ قلمی مجاہدین اپنا اور قلم کا مستقبل اسی سچائی کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے جس کی مختصراً تفصیل اور تمہید میں نے ابتداء میں پیش کرنے کی سعی کی۔۔۔قلم کی اہمیت و تاریخ انتہائی مقدس ہے۔۔۔اللہ اور اس کی نیک ہستیاں جو ''قلم'' سے وابستہ ہیں آپ سب کو اس ''مقدس ہتھیار'' کے ایماندارانہ استعمال کی توفیق عطا فرمائیں۔۔۔جہالت کے خلاف قلم کے مجاہدوں کے ساتھ ہم جیسے سدا سے ہیں اور سدا رہیں گے۔۔۔

طیبہ بخاری

انچارج میگزین، روزنامہ ''دنیا''

اپنی نوعیت کی منفرد کتاب

برسوں پہلے ممتاز براڈ کاسٹر زیڈ۔اے۔بخاری نے کسی طالب علم کو آٹو گراف دیتے ہوئے لکھا:
''آٹو گراف بک ایسا اصطبل ہے جس میں گھوڑوں اور گدھوں کو ایک ساتھ باندھا جاتا ہے۔''
''رائٹرز کلب'' کے تحت شائع ہونے والی اس کتاب ''قلم کا قرض'' کو میں زیڈ۔اے۔بخاری صاحب کی تشریح کے مطابق آٹو گراف بک کا نام تو نہیں دے سکتی تاہم، میرے نزدیک اسے گل دستہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جسے بیس سے زیادہ مصنّفین نے تحریر کیا ہے۔

''رائٹرز کلب'' کے کرتا دھرتا عارف رمضان جتوئی نوجوان صحافی ہیں، جو صحافت میں آنے سے قبل بھی اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ نئی نسل کو نہ صرف لکھنے پڑھنے کی طرف راغب کیا جائے بلکہ ان کی تحریریں شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے۔ چناں چہ اُنہوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا اور ''رائٹرز کلب'' کے تحت نئے لکھنے والوں کی تحریریں منگوا کر مختلف اخبارات اور ویب سائٹس میں بھیجنے لگے۔ کئی برسوں کی اس سعیِ مسلسل کے بعد انہوں نے ایک اور جرأت مندانہ اقدام یہ کیا کہ جگہ جگہ شائع ہونے والی ان تحریروں کو کتابی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ ''قلم کا قرض'' اسی کام یاب کوشش کا نام ہے۔اس میں ہر لکھاری کی چار پانچ نثری یا منظوم تخلیقات شامل ہیں۔ یہ کتاب گل دستہ ہے اس میں نئے لکھنے والوں کی رنگ برنگی تحریریں شامل ہیں۔ کچھ کالم ہیں، کچھ ناصحانہ تحریریں، کچھ مضامین، کچھ شاعری تو کچھ بچوں کی کہانیاں ہیں۔

ایسا ہی ایک تجربہ آج سے قریباً دس برس پہلے ایک فکاہیہ ماہ نامے ''مزاح +'' کے مدیر جناب انور احمد علوی بھی کر چکے ہیں۔انہوں نے ''اِسرافِ باہمی'' کے نام سے تیرہ مزاح نگاروں کی نگارشات پر مشتمل کتاب شائع کی تھی، جس میں ہر ایک کا ایک ایک کالم شامل تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جو اپنی کتاب شائع کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے یا ابھی ان کی تحریریں خاطر خواہ تعداد میں نہیں ہیں، انہیں بھی ''صاحبِ کتاب'' بنا دیا جائے۔

مذکورہ دونوں کتابوں میں یہ فرق ہے کہ ''اِسرافِ باہمی'' میں مشہور و معروف مزاح نگاروں کی تحریریں شائع کی گئی تھیں جب کہ ''قلم کا قرض'' میں نوآموز اور غیر معروف لکھنے والوں کی تحریریں شامل ہیں۔نظرِ ثانی کے لیے مسودہ مجھے دیا گیا، میں نے پڑھنا شروع کیا تو دیکھ کر افسوس ہوا کہ آج اخبارات کا معیار اس حد تک گر چکا ہے، کچی پکی تحریروں کو بغیر کسی اصلاح کے من و عن شائع کر دیا گیا تھا۔اخبار کے ایڈیٹر یا صفحے کے انچارج نے قلم لگانے کی زحمت نہیں کی۔

بہر کیف....اس کتاب کی اشاعت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کچھ نوآموز لکھاری بھی چار پانچ تحریروں کے ساتھ ''صاحبِ کتاب'' بن گئے۔ عارف جتوئی یقیناً مبارک کے مستحق ہیں، دعا ہے کہ سب کی الگ الگ کتاب شائع ہو۔

حمیرا اطہر

تعارف مصنف

عارف رمضان جتوئی

عارف رمضان جتوئی، صحافی، قلم کار اور کالم نگار ہیں۔ 29 اکتوبر 1990 کو پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل جتوئی میں پیدا ہوئے۔ روزنامہ جنگ، جسارت، نیوز نیٹ ورک انٹرنیشنل (این این آئی)، ساؤتھ ایشین براڈ کاسٹ نیوز ایجنسی اور کراچی اپ ڈیٹس میں بطور نیوز رپورٹر، نیوز ایڈیٹر اور شفٹ انچارج فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔ نئے لکھاریوں پر مشتمل فورم ''رائٹرز کلب پاکستان'' کے بانی اور سرپرست ہیں اور رائٹرز کلب کی ویب سائٹ اور ماہنامہ ''رائٹرز کلب'' کے چیف ایڈیٹر کے طور پر بھی اپنی خدمات فراہم کر رہے ہیں۔ ان دنوں روزنامہ جسارت اور کراچی اپ ڈیٹس سے وابستہ ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ فیشن سے فحاشی تک

2۔ نئے لکھاری کیا چاہتے ہیں؟

3۔ تعلیم سے ڈانس تک

4۔ رشتوں کے ریشم

5۔ محبت جرم کیوں

☆.....☆.....☆

فیشن سے فحاشی تک

آرٹس کونسل آف پاکستان کے اطراف میں ایک سے بڑھ کر ایک گاڑی لائن میں لگتی جا رہی تھی۔ ہر گاڑی میں سے کوئی نہ کوئی اہم شخصیت اترتی اور نہایت ہی نفیس سی چال چلتی ہوئی مرکزی دروازے سے آرٹس کونسل میں داخل ہو جاتی۔ اترنے والوں میں ایسی لڑکیاں اور لڑکے بھی تھے، جن کی عمریں پندرہ سے پچیس سال کے درمیان تھیں۔ بہت عمدہ ملبوسات، منفرد ہیئر اسٹائل، چم چماتے بلیک چشموں کے عقب میں نشیلے نین، لال اور گلابی رنگوں کی لپ اسٹک سے مزین ہونٹ اور اترنے کے ساتھ ہی ان ہونٹوں پر جنبش پھر کھلکھلاہٹ نے ماحول کو سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ ہر گاڑی کے کھلتے دروازے کے ساتھ ٹھنڈی ہوا میں خوشبوؤں کی ملاوٹ سے بھرپور جھونکے وہاں موجود افراد کو مسحور کیے دیتے تھے۔ گاڑیوں سے اترنے والوں کو دیکھنے کے لیے گاڑیوں پر گزرنے والے بھی کچھ پل کے لیے رفتار ہلکی کرتے پھر نہایت ''احتیاط'' سے دوطرفہ نظریں دوڑاتے ہوئے نکل جاتے تھے۔

آرٹس کونسل کے مرکزی دروازے پر ایک بڑی سی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ انتظامیہ کی جانب سے موجود ایک لڑکا اس کی جانب بڑھا مگر اس سے قبل ہی گارڈ نے برق رفتاری سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا باہر نکلے۔ چال ڈھال اور وضع قطع سے انتہائی درجے کے امیر خاندان سے لگ رہے تھے۔ ''کیا ہی عجب حال ہے، بڑی بڑی گاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی عمر کی بچیوں کے اتنے کم کپڑے''۔ وہاں کھڑے ایک شخص نے خود کلامی میں تبصرہ کیا اور پھر انہیں دیکھنے لگا۔

''کم کپڑے والے'' لفظ پر چونکتے ہوئے میں ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے جب نگاہیں مڑیں تو کم کپڑوں والی بات سمجھ میں آ گئی۔ کچھ پل کو چور نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر شرم سے نظریں جھکا لیں۔ ہوں گے سمندر پار کے یا پڑوسی ملک کے۔ یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ متعلقہ گاڑی کا ڈرائیور عین میرے سامنے آ گیا۔ شکل وصورت سے سادہ سا آدمی لگتا تھا۔ سامنے پا کر میں نے اس سے پوچھ ہی ڈالا۔ ''آپ کے صاحب لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ پاکستان ہی کے ہیں؟''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا، کیوں.... خیریت؟ یہ کہانی کسی ایک دن کی نہیں۔ مجھے روزانہ ہی اس طرح کے لوگ آرٹس کونسل کے گیٹ میں داخل ہوتے اور پھر رات گئے وہاں سے نکلتے نظر آتے ہیں۔ اس پر افسوس کیا کرنا.... اب تو یہ فیشن بن گیا ہے۔ اسی مقام پر ایسے لڑکے بھی دیکھے کہ وہ جو کپڑے پہن کر وارد ہوتے ہیں، اُنہیں کوئی شریف آدمی اپنے گھر اور اپنی بہنوں کے سامنے پہننے سے بھی شرماتا رہے۔ مگر کچھ کہو تو جواب ملے گا، فیشن ہے۔ شاپنگ مال اور اہم مقامات پر لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ ایسی حالت میں گھومتے پھریں کہ اگر کوئی شرماتے ہوئے کہہ بھی دے کہ دیکھیں، یہ ٹھیک نہیں لگتا تو فوری جواب ملے گا، ''دیٹ از فیشن برو''۔

فحاشی اور فیشن میں کیا فرق ہے؟ یہ سوال بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یقیناً فحاشی اور فیشن میں بہت فرق ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ فیشن کا تعلق کسی مہذب یا بہت زیادہ اسلامی سوچ رکھنے والے طبقے سے نہیں ہے۔ یہ تاثر بالکل بے جا اور غلط ہے۔ فیشن کوئی بھی، کہیں بھی، کرنے کا حق رکھتا ہے۔ فیشن کا مطلب ہے، خود کو خوب سے خوب تر بنا کر رکھنا۔ فیشن میں نت نئے اور خوب صورت ملبوسات، سولہ سنگھار، ڈیزائنز یا کسی بھی دوسری چیز پر باقاعدگی سے توجہ دینا شامل ہے۔ خوب صورت بننا کسی کے لیے بھی ممانعت نہیں رکھتا۔ وہ چاہے پردے میں ہو یا پردے کے باہر۔ مگر فیشن کرنے والوں کے لیے جو لوازمات ہیں انہیں اگر ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو یقیناً فیشن کرنے کا لطف دوبالا ہو جائے۔

درج بالا واقعات و حالات میں دو باتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔ کیا ہمیں دوسروں کی زندگی میں مداخلت (انٹرفیئر) کرنے کی ضرورت ہے؟ یہ دیکھتے رہیں کہ کون کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ دوسری بات یہ کہ آیا وطنِ عزیز میں فحاشی اور عریانی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب یہ سب کچھ کھلے عام ہو رہا ہے یا اس پر کوئی کنٹرول بھی ہے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ دوسروں کی زندگی میں خوامخواہ اُلجھنے اور انہیں پریشان کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ بعض اوقات یہ سوال اس وقت بھی سامنے آتا ہے کہ جب ہم کسی برائی اور بدی پر اس نیت سے تنقید کرتے ہیں کہ اس کی اصلاح ہو سکے تو پاس والے الجھ پڑتے ہیں کہ ہر کسی کی اپنی زندگی ہے، وہ جیسے چاہے جیے۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ ہر کسی کی اپنی زندگی ہے۔ مگر یہاں بات صرف اور صرف ان مقامات کی ہو رہی ہے جنہیں ''پبلک پلیس'' یا عوامی مقامات کہا جاتا ہے۔ ایسی تفریح گاہیں، روڈ، شاپنگ سینٹرز وغیرہ کہ جہاں ایسی کسی بھی حرکت سے دوسرے بری طرح پریشان ہوں۔ دوسروں کی زندگی میں درحقیقت وہ لوگ ہی مداخلت کر رہے ہوتے ہیں جو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔

عوامی مقامات پر ایسی حرکات و سکنات کس حد تک جائز ہیں؟ اس کے لیے عالمی منشور کو مدِّنظر رکھا جائے تو کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948 کو ''انسانی حقوق کا عالمی منشور'' منظور کر کے اس کا اعلان عام کیا۔ منشور کی دفعہ 29 میں کہا گیا ہے کہ ''ہر شخص پر معاشرے کے حقوق ہیں کیوں کہ معاشرے میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔ اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر

شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامّہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں''۔

اس کا واضح مطلب ہے کہ دنیا کا ہر شہری معاشرے کے حقوق اور معاشرتی اقدار کا پابند ہے۔ ہر ملک، شہر اور علاقے کا معاشرہ اور ثقافت اس کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پاکستانی معاشرے میں یورپ کے معاشرے کے حقوق پر عمل کیا جانے لگے۔

کسی بھی معاشرے میں پائی جانے والی سوچ کو بدلنے کے لیے سب سے اہم ہوتا ہے نیت کا مخلص ہونا۔ اسی لیے فحاشی اور عریانی کو نیت کے فتور سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لاکھ پردوں میں ڈھکی عفت وعصمت کی پاسبان کے دل میں ہی فتور ہوگا تو اس کے یہ لاکھ پردے بھی کسی کام کے نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اسلامی چہرے سے مزین، سر پر بڑا سا عمامہ لگائے شخص کے دل میں کھوٹ ہوگا تو وہ بھی اسی طرح فحش ہوگا اور اس کی سوچ لتھڑی ہوئی ہی ہوگی جیسے کم کپڑے والوں کی ہوتی ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہوگا کہ کوئی پس پردہ ہوگا اور کوئی سرعام۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنی سوچ بدلی جائے۔ ہمیشہ مثبت اور آلودگی سے پاک سوچ ہی انسان کی عفت وعصمت کا تحفظ کر سکتی ہے۔ سوچ کے ساتھ ساتھ فحاشی کے اسباب کا سدِّ باب بھی بہت ضروری ہے۔ اسباب ہی وہ بنیادی جڑ ہیں جو معاشرے کی برائی کا سبب بنتے ہیں جسے ختم کر کے ہر برائی سے بچا جا سکتا ہے۔

''نئے زمانے'' اور ''زمانہ بدلو'' کے سلوگن سے معاشرے کو پستیوں میں ڈالنے کی مہم پر بہت ہی سنجیدگی سے عمل درآمد شروع کر دیا گیا ہے، جس کے لیے سب سے زیادہ میڈیا کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ نت نئے انداز میں اس سلوگن کو عام کیا جا رہا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا شوبز کی مختلف شخصیات کو بھی اس پر عملی کردار ادا کرنے کے لیے کانٹریکٹ دے دیا گیا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں یہ بٹھایا جا رہا ہے کہ وہ جس زمانے میں جی رہے ہیں شاید وہ پتھر کا دَور ہے۔ اب اس زمانے سے باہر آنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے نیا زمانہ موجود ہے، جس میں لڑکے اور لڑکیاں اپنے والدین کی روک ٹوک سے آزاد ہو کر مخلوط محفلیں سجائیں۔ اچھا یا برا کھائیں یا پیئیں اور اپنی مرضی کے اوٹ پٹانگ فیشن کر کے باہر نکلیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ کیا ہم واقعی جدید نہیں ہوئے یا فیشن کو نہیں جان پائے۔ کیا ایسا ہی ہے کہ جو فیشن ہمیں بیرونِ ملک سے دیا جا رہا ہے، وہی فیشن ہے جسے ہمارے شوبز کے لوگوں سے لے کر تاجر تک، سب ہی اپنی اپنی منڈی میں لا کر خوب چرچا کرتے ہیں۔ عوام الناس کو عریاں اور عجیب وغریب صورت حال میں ریمپ پر کیٹ واک کر کے بتایا جاتا ہے کہ دیکھو! یہ ہے اصل زمانہ۔ گھر سے نکلو تو ہر قسم کی پابندیوں سے عاری، خواتین کے آدھے

ادھورے جسموں پر موجود کچھ کپڑوں کے نمائشی سائن بورڈ دکھائی دیتے ہیں جو ہر آنے جانے والے کے سامنے بیرونی جدت پسندی اور فیشن کی تشہیر کرتے نظر آتے ہیں۔

کسی نے یہ نہیں سوچا کہ فیشن اور جدت کی بھی کوئی تو حد ہوگی۔ جدت اور فیشن کا مطلب عریانی کو فروغ دینا ہرگز نہیں۔ کم کپڑے زیب تن کر کے دوسروں کی ہوس کا نشانہ بننے کے لیے خود کو پیش کرنا بھی نہیں ہے۔ سب چیزیں اپنے اوقات اور اپنے مدار میں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اس سے قبل کہ کوئی آپ پر شب خون مارے، خود کو محفوظ کر لیں۔ اپنے جسم کو نمائش کے لیے پیش کرنے کے بجائے اسے پردے میں ڈھکیں۔ اس لیے نہیں کہ آپ کی سوچ منفی ہے بلکہ اس لیے کہ آپ کی وجہ سے کسی اور کی سوچ منفی ہو سکتی ہے جو آپ کو تکلیف بھی پہنچا سکتی ہے۔

آپ فیشن کریں، ایک سے بڑھ کر ایک فیشن کریں اور کروائیں۔ مگر آپ اسے اپنی حد تک رکھیں۔ بیوی اپنے خاوند کے لیے کرے۔ بیٹیاں، اپنی بہنوں اور خاندان کی دیگر خواتین کے لیے کریں۔ خود کو غیر مردوں کی پہنچ سے دُور رکھیں۔ پھر کون منع کرتا ہے اور کون اعتراض کرتا ہے؟ ہاں اگر آپ خود کو خوب بنا سنوار کر بھرپور فیشن کر کے نکلیں گی تو یاد رکھیں، آپ کو تکلیف بھی پہنچائی جا سکتی ہے۔ اغوا، تیزاب گردی اور قتل کے کتنے ہی واقعات صرف اور صرف اس لیے پیش آتے ہیں کہ لڑکی گھر سے خود کو ڈھک کر نہیں نکلی۔ راستے میں کسی اوباش، بدمعاش کی نظر پڑ گئی اور وہ پہلی ہی نظر میں فدا ہو بیٹھا، انکار پر اس کے سامنے تین راستے تھے۔ وہ چہرہ، جسے وہ پسند کرتا ہے، کسی اور کا کیوں ہو؟ لہٰذا، اسے ہی برباد کر دیا جائے۔ یا پھر وہ، جو اس کا نہیں ہو سکتا، کسی اور کا کیوں ہو؟ چناں چہ اسے ختم کر دیا جائے۔ یا وہ پسند ہی کیا جسے وہ حاصل نہ کر سکے؟ تو اسے اٹھا لیا جائے۔ کبھی کسی نے سوچا کہ آخر یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کرنے والوں کے جذبات کیا ہوتے ہی؟، یہی.... کہ وہ اپنے انجام کو تو محسوس کر ہی چکے ہوتے ہیں مگر کسی اور کی زندگی بھی ہمیشہ کے لیے تاریک کر جاتے ہیں اور جس کی زندگی تاریک ہوتی ہے، اس کے پس پردہ اس کی اپنی ہی غلطی ہوتی ہے۔

بات ہو رہی تھی فیشن کی، اصل فیشن تو یہ ہے کہ گرمیوں کے لحاظ سے گرمیوں کے اور سردیوں کے لحاظ سے سردیوں کے کپڑے پہنے جائیں۔ زیب و زینت عوامی جگہوں پر نہیں، صرف اور صرف آپ کے گھر اور خاندان ہی میں مناسب ہیں۔ ہر قسم کا فیشن کریں لیکن اس کے متعلقہ مقام اور جگہ کے اعتبار سے۔ اگر حالات و واقعات میں تضاد آیا تو پھر فیشن فحاشی بھی بن سکتا ہے۔ اسی لیے فحاشی سے بچ کر خود کو بچائیں۔

☆.....☆.....☆

نئے لکھاری کیا چاہتے ہیں؟

امداد یونیورسٹی کے لیے نکلتا تو راستے میں بہت کچھ دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا پھر حالات کے بہاؤ میں کھو کر سب کچھ بھلا دیتا۔ اس نے بوڑھے ریڑھی بان کو پھل بیچتے ہوئے دیکھا، چائے کے ہوٹل پر میز صاف کرتے معصوم بچے کو بھی مگن پایا۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھے بے فکری سے پان گٹکا تھوکتے موٹے آدمی کو بھی سمجھانا چاہتا تھا اور بڑی سی گاڑی میں بیٹھے جلتی سگریٹ کا بٹ بغیر دیکھے گاڑی سے باہر پھینکنے والے باس سے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسے حکومت کی کرپشن پر اعتراض تھا اور گلی کے کونے میں چھوٹی سی دکان والے کے ترازو کے جھول پر بھی تکلیف ہوتی تھی۔ روز ہی بہت کچھ اس کے دل میں آتا اور نکل جاتا۔ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ وہ ہمیشہ اسی ہاں اور نہ کے بیچ اٹکا رہتا۔ اس کے دماغ میں مچلتی اس ہلچل کو اس کی یونیورسٹی کے ہم جماعتوں نے بھی محسوس کیا۔ کوئی ''چِل (chill) کر'' کی پالیسی اپنانے کا مشورہ دیتا تو کوئی اس پر آواز اٹھانے کی بات کرتا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ اس پر قلم اٹھائے مگر کیسے؟ لکھے تو کیسے اور لکھ لے تو دوسروں تک کیسے پہنچائے؟

ایک روز سوشل میڈیا پر ''رائٹرز کلب'' کے نام سے ایک پیج دیکھا۔ نئے لکھنے والوں کے لیے قلمی معاونت کے ٹیگ سے مزین اس پیج نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس پیج کے ایڈمن سے بات کرنے کو دل مچلا اور پھر میسج کر دیا۔ جواب مثبت ملا اور یوں اردو یونیورسٹی کے اس طالب علم نے اپنے قلمی سفر کا آغاز کر دیا۔ ابتدا میں کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، کبھی تحریر کا عنوان سمجھ میں نہیں آیا تو کبھی وہ اس کے ابتدائیے میں اٹک گیا، کبھی اسے لگتا کہ اختتام درست نہیں کر پایا۔ مگر ''جہدِ مسلسل کامیابی کا بہترین زینہ ہے''۔ پر عمل کرتا رہا اور بالآخر کامیابی بھی مل ہی گئی۔

امداد کا یہ سوال کہ وہ لکھے تو کیسے اور بھیجے تو کہاں؟ ایسا سوال ہے جو یقیناً ہر نئے لکھنے والے یا اس شعبے سے لگاؤ رکھنے والے کے دماغ میں آتا ہوگا۔ بہت کم ہوں گے جنہیں اس سوال کا جواب اور پھر رہنمائی بھی میسّر ہوگی۔ ممکن ہے کہ بہت سارے لوگ ان دونوں سوالوں کے بیچ پھنس کر شاید اب تک اپنے قلمی سفر کا آغاز ہی نہ کر پائے ہوں۔ اگر وہ لکھتے تو شاید کئی لکھنے والوں سے کہیں بہتر اور اچھا لکھ رہے ہوتے۔ یہاں دو باتیں اہم ہیں: ایک طرف وہ، جس کے

دل میں سوال ہیں کہ وہ کیسے لکھے اور کہاں بھیجے؟ اور دوسری یہ کہ کیا کوئی ان سوالوں کے جواب دینے یا جواب بننے والا ہے؟

ابتدائی طور پر قلم اٹھانے والے کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسی ڈوبنے والے کی۔ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا چاہیے ہوتا ہے اور لکھنے والے کو بھی کوئی ہلکا سا سہارا مل جائے تو وہ بھی قلم تھام کر چل پڑتا ہے۔ ان دونوں میں ایک بات یہ بھی یکساں ہے کہ ڈوبنے والا زندگی سے اور معاشرے کی اصلاح نہ کرنے والا اخلاقیات سے جاتا ہے۔ وہ نظریاتی طور پر مرتا چلا جاتا ہے جو شاید جان جانے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

لکھنے کی بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ کچھ شوقیہ لکھتے ہیں، کچھ اپنی تشہیر کے لیے تو کچھ صفحے کا پیٹ بھرنے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔ مگر ان سب میں اہم ہے، نظریات اور معاشرے کے لیے لکھنا۔ یعنی آپ جو لکھ رہے ہیں وہ کم از کم قاری کی ذات کو تو فائدہ دے۔ آپ کے لکھے ہوئے میں معلومات کی فراہمی ہو یا پھر آپ بطور قلم کار معاشرے کے لیے نظریاتی ڈاکٹر ہوں۔ یہ ایک طویل بحث ہے کہ کیا لکھنا اور کیا نہیں لکھنا چاہیے۔ تاہم، یہاں بات ہو رہی ہے ''کیسے اور کہاں بھیجنے'' کی۔

امداد کو ایک گروپ مل جاتا ہے تو وہ اپنے قلمی سفر کا آغاز کر دیتا ہے، اس طرح کسی بھی لکھنے کا عزم رکھنے والے کو کوئی سہارا مل جائے تو وہ اپنے قلم کے ہنر کو خوب آزما سکتا ہے۔ ''رائٹرز کلب'' کی قلمی خدمات اگرچہ زیادہ نہیں مگر یہ سوشل میڈیا پر لکھنے والے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اس وقت بہترین فورم ہے۔ اس فورم نے لکھنے والوں اور لکھنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے دو طرح سے کام کیا۔ ایک تو ان کی بھیجی گئی تحریر کی اصلاح کی اور پھر اسے قومی اخبارات میں شائع کرائی۔ یہ کام اس لیے اہم تھا کہ تحریر جیسی بھی ہو، جب وہ چھپتی ہے تو اس کے لکھنے والے میں ایک ہمت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں جستجو بڑھتی ہے اور وہ مزید اچھے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

''رائٹرز کلب'' جیسے دیگر بہت سے فورم سوشل میڈیا پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ غیر سنجیدہ ہیں تو کچھ سنجیدگی سے لکھنے والوں کو صحیح راستہ دِکھا رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے اور باعث تشویش بھی کہ اس وقت دیگر شعبوں کی نسبت شاعری اور نثر نگاری کا شعبہ اہل قلم و علم کی توجہ سے بالکل محروم ہے۔ الیکٹرونک میڈیا، اخبارات اور رسائل و جرائد میں اردو میں لکھنے والوں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہے مگر ان کے لکھے ہوئے کا معیار گویا ''صفر'' ہے۔ پورے پورے پیراگراف اور جملے سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ رموزِ اوقاف کا خیال رکھنا تو کوئی ضروری بھی نہیں سمجھتا اور نہ ہی اخبارات کے ایڈیٹرز اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ صفِ اوّل کے اخبارات تک اب اس کا خیال نہیں رکھتے۔

اس میں قصور کس کا ہے؟ قصور ہے بھی یا نہیں؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ آج کے بیش تر لکھنے والے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنے کا ارادہ بھی تو نہیں رکھتے۔ انہیں اس بات کی فکر ہی نہیں ہے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور کیوں لکھ

رہے ہیں۔کئی ایک مضامین یا کالم،شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد سمجھ ہی میں نہیں آتے کہ موصوف قلم کار آخر کہنا کیا چاہتے ہیں۔

بات دوسری طرف نکل گئی۔سوال یہ تھا کہ کیسے لکھیں؟اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بس لکھنا شروع کر دیجیے۔ جب بہت بار لکھنے کے بعد اندازہ ہو جائے کہ اب کچھ بہتری آئی ہے تو اسے کئی بار خود پڑھیے۔اپنی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد کسی اچھے قلم کار کو پڑھوایئے۔تصحیح کرانے کے بعد اسے اخبارات میں بھیج دیجیے۔ ہر اخبار کے ادارتی صفحے پر اس کا ای میل ایڈریس موجود ہوتا ہے۔

ایک اور اہم نکتہ....اچھا لکھنے کے لیے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اچھا لکھنے کی کوشش بہت ضروری ہے۔ ہمارے استادِ محترم کے مطابق، روز کچھ نہ کچھ لکھیے اور اس کی اصلاح کراتے رہیے۔ڈانٹ پڑنے پر گھبرایئے نہیں بلکہ اور اچھا کر کے لکھیے۔ یاد رکھیے کہ معاشرے کی اصلاح ہماری اپنی ذمے داری ہے۔ پہلے خود کی اصلاح کیجیے اور پھر اپنے قلم سے دوسروں کی اصلاح کا عزم کرتے ہوئے لکھیے اور ضرور بالضرور لکھیے۔اہلِ قلم بھی اس طرف توجہ دیں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے تربیتی ورکشاپ کروائیں،ایڈیٹر حضرات وخواتین،لکھاری کی تحریر درست کرتے وقت انہیں بتائیں کہ وہ کیا غلطی کر گئے ہیں۔اس معاملے پر سنجیدگی سے توجہ کی اشد ضرورت ہے۔

☆.....☆.....☆

تعلیم سے ڈانس تک

کراچی کے ایک مقامی ہوٹل میں میوزک کنسرٹ منعقد کیا گیا۔ جس میں مختلف اہم موسیقاروں کو مدعو کیا گیا۔ یہ کنسرٹ ایک تعلیمی ادارے کی جانب سے کرایا گیا، جس کی مناسبت سے کالجز اور یونیورسٹیز کے بڑی تعداد میں لڑکیاں اور لڑکے شریک تھے۔ کچھ ہی لمحوں میں ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ موسیقار اپنے اپنے انداز میں سُر بکھیرتے رہے۔ ہال کبھی تیز تو کبھی ہلکی میوزک سے مسلسل گونج رہا تھا۔ تاہم، اس میوزک کے شوخ اور مدھم ہونے کے ساتھ ساتھ محفل میں شریک طلبا و طالبات کا جوش و خروش بھی کبھی بڑھتا تو کبھی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ روایت کے مطابق میوزک کنسرٹ کے مہمان خصوصی کو سب سے آخر میں موقع دیا گیا۔

اسٹیج پر ان کی آمد کے ساتھ ہی ہال میں خاموشی چھا گئی پھر ایک آواز کے ساتھ پورا ہال سیٹیوں، تالیوں اور شور سے گونج اٹھا۔ شور کرنے میں وہاں موجود تمام مرد و خواتین اور نوجوان پورا پورا حصہ لے رہے تھے۔ انتہائی تیز میوزک کی آواز دھیرے دھیرے ہلکی ہونے لگی۔ موسیقار جوں ہی خاموش ہوا، پورا ہال ایک مرتبہ پھر سیٹیوں، تالیوں اور ہلڑ بازی سے گونج اٹھا۔ ہلڑ بازی ایسی ہوئی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے تھے اور ایک طوفان بدتمیزی تھا۔ کافی دیر بعد دو لڑکیاں ہانپتی کانپتی، دھکے کھاتی بیرونی گیٹ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ان کی ظاہری حالت کافی ابتر لگ رہی تھی اور وہ کافی پریشان بھی دِکھائی دے رہی تھیں۔ پریشانی کی وجہ تو ظاہر تھی کہ وہ اپنے گھر سے لیٹ ہو چکی تھیں۔ وہ ایک رکشے والے کو روک کر عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گئیں جب کہ میوزیکل شو کے مقام پر تا حال رقص و سرور چل رہا تھا اور کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اب بھی ڈانس کر رہے تھے۔

گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے نکلنے والی وہ دونوں لڑکیاں شکل وصورت سے کسی امیر گھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ تاہم، حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ایک کے والد ٹیکسی چلاتے تھے جب کہ دوسری کے والد اسکول میں ملازمت

کرتے تھے۔ان دولڑکیوں کی بات پر مجھے ایک اور باپ یاد آ گیا، جو قریباً ہر روز صبح فجر کے وقت، گھر کے قریب واقع ہسپتال کے ٹھنڈے، میٹھے اور فلٹر شدہ پانی کے کولر سے یہ کہہ کر پانی بھرتا تھا کہ اس کے بچے کھارا پانی نہیں پی سکتے۔ پھر ایک روز یہ بات آشکار ہوئی کہ دراصل وہ پانی یونیورسٹی میں پڑھنے والی اپنی نوجوان بیٹی کے سر کے بال دھونے کے لیے بھرتا تھا کہ کہیں اس کی بیٹی کے بالوں کی رونق کھارے پانی کی وجہ سے ماند نہ پڑ جائے۔

ایک باپ، جو اپنی بیٹی کی تعلیم کے لیے دن بھر ٹیکسی چلاتا ہے، یہ امید رکھتا ہے کہ اس کی بیٹی پڑھ لکھ کر اپنا مستقبل سنوارنے کے ساتھ اس کا نام بھی روشن کرے گی۔ایک باپ، جو سارا سارا دن اسکول میں بچوں کو پڑھاتا ہے اور اپنا پیٹ کاٹ کر اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت پر لگا دیتا ہے۔ایک باپ، جو اپنی بیٹی کے لیے صبح سویرے اٹھ کر پانی بھرتا ہے تا کہ وہ اپنی تعلیم کے حصول کے لیے اچھی طرح تیار ہو کر گھر سے جائے۔ جب ان تمام والدین کو اپنی بیٹیاں کسی تعلیمی ادارے کی بجائے ڈانس پارٹیوں میں ملیں گی تو ان کی کیا حالت ہوگی۔

کیوں احساس نہیں ہوتا ان بیٹیوں کو اپنے والدین کا کہ وہ انہیں کس مقصد کے لیے بھیجتے ہیں اور وہ کیا کرتی پھر رہی ہیں۔کھیلنا کودنا، تفریح اور دیگر دلچسپ سرگرمیوں میں حصہ لینا وقت کی ضرورت ہے۔تاہم، اس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شاید والدین کی تربیت اور ان کے آپ پر اعتماد کی توہین کرنے اور خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔وہ کیوں نہیں سوچتیں کہ وہ نوجوان ہیں اور یہ وہ وقت ہے جسے فضولیات میں ضائع کرنے کی بجائے اپنے بنیادی مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے کچھ حاصل کرنا چاہیے۔اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی تعلیم و تربیت پر توجہ دیں اور غیر ضروری سرگرمیوں سے پرہیز کریں۔

☆.....☆.....☆

رشتوں کے ریشم

رشتوں میں پیدا ہونے والی امید نے جب ایک دھوکے پر دَم توڑا تو اس کم زور جان لڑکی کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز میں اس قدر تاثیر تھی کہ اس سے وابستہ ہر شخص کو سنائی دی۔ پھر کئی روز تک اسے ایسی چپ لگی کہ اس کے جاننے والوں کی قطار لگ گئی۔ مگر وہ کسی سے کیا کہتی کہ آج اسے اس رشتے نے تکلیف دی جو ہمیشہ اس کی تکلیفوں کو دور کیا کرتا تھا۔

اِس قسم کے بے شمار واقعات روزانہ ہی ہمارے اردگرد رونما ہو رہے ہیں۔ رشتے بنتے ہیں، سنورتے ہیں، کچھ آگے چلتے ہیں اور پھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ رشتے بننے میں جتنی دیر لگتی ہے اس سے کہیں کم وقت ان کے بکھرنے میں لگتا ہے۔ رشتوں کو سنبھال کر رکھنا بہت مشکل اور کٹھن کام ہے۔ ہم جتنا، جس رشتے کی موجودگی پر خوش ہوتے ہیں، اس کے دیے گئے غم پر اتنی ہی تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی کبھار جذبات میں کیے گئے فیصلے ہمارے جان سے عزیز تر رشتوں کو بھی ہم سے جدا کر دیتے ہیں۔ وہ وجوہ، جو رشتوں کو کم زور کرنے یا توڑنے کا سبب بنتی ہیں، ان میں طنز و بحث، دھوکا، غلط فہمی اور نہ جانے کیا کچھ شامل ہے۔

طنز اور بحث سے رشتے کم زور ہو جاتے ہیں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بحث سے آپ لڑائی تو جیت لیتے ہیں مگر اپنوں کو ہار بیٹھتے ہیں۔ اس لیے طنز و بحث کو اس طرح برتا جائے کہ رشتوں کے تقدس پر آنچ نہ آنے پائے۔ رشتوں میں دراڑیں ڈالنے والی ایک بڑی وجہ غلط فہمی بھی ہے۔ غلط فہمی کبھی کبھار حقیقی غلطی سے شروع ہوتی ہے اور اندر ہی اندر اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ایک دوسرے سے افہام و تفہیم سے معاملہ سلجھانے کی نوبت ہی نہیں آنے دیتی اور یوں کوئی بھی مضبوط رشتہ ایک چھوٹی سی غلط فہمی کا شکار ہو کے ٹوٹ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ رشتوں کی رسی کم زور تب ہوتی ہے جب انسان غلط فہمی میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب بھی خود بنا لیتا ہے۔ کبھی رشتے کے ٹوٹنے کی وجہ وہ حقیقی غلطی بنتی ہے جو ہم سے جانے یا اَن جانے میں سرزد ہو جاتی ہے۔ غلطی ہونے کے بعد ندامت ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے بڑھ کر اس غلطی کا ازالہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ اِس ندامت کا احساس کبھی دلانا پڑتا اور کبھی خود بخود ہو جاتا ہے۔ رشتہ تو

تب منقطع کیا جانا چاہیے جب ندامت کا احساس دلانے کے بعد بھی کوئی نادم نہ ہو۔ مگر یہاں تو ندامت کا ہزار بار احساس ہو جانے کے بعد بھی رشتوں میں انقطاع آ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہوتی ہے جو غلطی سرزد ہونے کے بعد بھی کی جا رہی ہوتی ہے۔ واضح رہے، رشتوں کی مضبوطی آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ رشتے بننے میں نہ جانے کن کن چیزوں کا پایا جانا پرکھا جاتا ہے اور جب رشتے جڑ جائیں تو انہیں سرزد ہونے والی ایک غلطی کی نذر کر دیا جانا انصاف کے منافی ہے۔ غلطی ہو جائے تو اس کا ازالہ اس پر ندامت سے ہو جاتا ہے مگر غلطی کے بعد ندامت کو نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ غلطی کرنے والے کو سزا کے طور پر خود سے اتنا دور کر دیا جاتا ہے کہ وہ دور رہنا ہی سیکھ جاتا ہے اور یوں ایک رشتہ خود ہی اپنے ہاتھوں توڑ دیا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ اپنی غلطی کا ازالہ بھی کر چکا ہو تب بھی اسے سزا دی جاتی ہے۔ یہ سزا ایسی ہوتی ہے، جو اچھائی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روک کر اُلٹے قدموں پر چلا دیتی ہے۔ یوں نہ صرف رشتہ ٹوٹتا ہے بلکہ ایک باغی بھی جنم لیتا ہے اور پھر اس باغی کی سرکشی نہ جانے مزید کتنے رشتوں کے ٹوٹنے کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے اس کا احساس دلایا جائے، ندامت کی صورت میں اسے اپنے قریب کیا جائے، پہلے سے بڑھ کر محبت اور پیار دیا جائے تاکہ وہ جس اچھائی کی طرف لوٹا ہے، ہمیشہ اس پر گام زن رہے۔ خوامخواہ کسی کو پریشان کرتے رہنے سے رشتہ تو برقرار نہیں رہتا ساتھ میں متعلقہ فرد سے اچھائی کی امید بھی نہیں رکھی جا سکتی۔

ایک بات یاد رکھیں! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچھے شخص سے بھی ناقابل معافی غلطی ہو جاتی ہے اور کبھی برے شخص سے قابل تعریف اچھائی سرزد ہو جاتی ہے۔ فرق صرف آپ کو کرنا ہے۔ ایک اچھے شخص کو معاف کر کے دوبارہ اسے اچھائی کی طرف لانا ہے یا پھر اسے معاف نہ کر کے ہمیشہ کے لیے برائی کی راہ پر گام زن کرنا ہے۔ آپ نے اگر آج اس کا ہاتھ نہ تھاما تو یقیناً کچھ دن بعد اُس کا شمار اچھوں میں ہونے کے بجائے ہمیشہ کے لیے دھوکا دینے والوں میں ہونے لگے گا جس میں آپ بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

☆.....☆.....☆

محبت جرم کیوں؟

لفظ محبت اپنے اندر ایک ایسی جاذبیت رکھتا ہے، جسے سنتے ہی انسان اپنے اندر اَن جانی مٹھاس سی محسوس کرتا ہے۔ محبت کئی طرح کی ہوتی ہے۔ سب سے افضل اور محبت کا پہلا درجہ، اللہ رب العزت کی محبت اپنے بندوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ماں کی محبت سے ستّر (70) گنا زیادہ محبت کرتا ہے۔ دوسری محبت وہ ہے، جو والدین اپنے بچوں سے اور بچے اپنے والدین سے، عزیز و اقارب اپنے رشتے داروں سے کرتے ہیں۔ دنیا میں ایک دوسرے سے کی جانے والی محبت مختلف درجوں میں مختلف انداز اختیار کر جاتی ہے۔ ان تمام محبتوں میں سے ایک محبت ایسی بھی ہے، جس کا تعلق ایک نوجوان محرم لڑکی اور لڑکے سے ہے۔ یہ وہ محبت ہے جسے ایک دوسرے کی ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ ایک ایسی محبت کہ جس کے بعد عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ محبت کرنے والا کسی کام کا نہیں رہتا۔ بڑے بڑے شاعر محبت کی شاعری کرتے ہوئے دنیا چھوڑ گئے۔ کسی نے لڑکے اور لڑکی کی اس محبت کو انتہائی نقصان دہ قرار دیا تو کوئی اس کے بغیر زندگی کو ادھورا کہہ گیا۔ کوئی محبوب کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا نظر آتا ہے تو کوئی خود کو محبت میں ناکامی پر صبر کرنے والا سمجھتا ہے۔

یہ بات تو طے ہے کہ کسی بھی انسان کو زندگی میں کسی ایک شخص سے ایسی محبت کا ہونا ضروری ہے، جس پر بعد میں ان کی آپس میں ازدواجی زندگی استوار ہو سکے۔ مگر موجودہ حالات جس تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہے ہیں، محبت کے انداز میں بھی اسی طرح اضافہ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ پہلے دو محبت کرنے والے اپنی محبت کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتے تھے، وہ اپنے محبوب کو مختلف قسم کی کاغذ کی پرچیاں لکھا کرتے تھے۔ اس جدید دور میں محبت کا اظہار اور پھر اس کی طرف پیش رفت بھی جدید ہو گئی ہے۔ اب محبت کے انداز، طور طریقے سب کچھ بدل گئے مگر نہیں بدلا تو محبت کی شادی پر قتل کی دھمکیاں ملنا، دو محبت کرنے والوں کی لاشوں کا گرنا، ڈر ڈر کے زندگی گزارنا۔ آج بھی اگر کوئی محبت کرتا ہے تو غالب گمان یہ ہے کہ اس کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اس قدر اذیت ناک ہوتا ہے کہ جس کے بعد شاید ہی کوئی غلطی سے محبت کا نام اپنی زبان پر لائے۔ مگر محبت چیز ہی ایسی ہے کہ جو نہ تو شکل وصورت دیکھتی ہے اور نہ ہی

امیری وغریبی۔

اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے بعد کا سلسلہ صرف اور صرف شادی کی دہلیز ہی پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ مگر اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہمیشہ سے محبت کرنے والوں کو پریشانیوں کا سامنا رہا ہے۔ لڑکے کو لڑکی سے محبت ہوئی مگر والدین نہ مانے اور لڑکی کی شادی بغیر اس کی منشا اور مرضی کے، کہیں اور طے کر دی گئی، جس کے بعد لڑکے اور لڑکی نے گھر سے بھاگ کر اپنی محبت کو بچانے کے لیے انتہائی قدم اٹھایا۔ یوں دونوں کے گھروں میں کشیدگی بڑھی پھر لڑکی اور لڑکے کو محبت کی شادی کے جرم کی سزا اپنی موت سے چکانی پڑی۔ محبت کی شادی کرنے والے جوڑے کو قتل کر دیا گیا، گولیاں مار دی گئیں، گھر سے نکال دیا گیا، جائیداد سے عاق کر دیا گیا.... جیسے واقعات آئے روز اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

محبت ہو جانا کائنات کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ کسی کے دل سے اپنی محبت نکالنا یا اپنے دل سے کسی کی محبت نکال دینا بہت مشکل ہے۔ جب یہ کام مشکل ہے تو والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کی منشا اور رضامندی کے مطابق فیصلہ کریں۔ اگر والدین اپنی بیٹیوں اور بیٹوں سے ان کی رضامندی کے مطابق ان کی شادی کے مراحل طے کریں تو کبھی ایسے واقعات رونما نہ ہوں۔ کبھی کسی والدین کے لیے ان کی بیٹی مسئلہ نہ بنے۔

بچوں کی تربیت اور ان کی اصلاح کی ذمے داری اسکول کے پرنسپل یا کسی کالج کے پروفیسر کی نہیں بلکہ یہ بھاری ذمے داری والدین پر لاگو ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت اچھی اور حیاتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے مطابق کریں۔ ان کے لیے مغربی ثقافت اور روایات کی بجائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور سیرتِ صحابیا تکو معیار بنائیں تو ان کی اولادیں محبت بھی اس سے کریں گی جس سے اس کے والدین چاہیں گے۔ اگر والدین اپنے بچوں کی تربیت ہی ایسی کریں گے کہ جسے وہ پسند کرتے ہیں، اسے ان کے بچے بھی پسند کرنے لگیں تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوگا۔ دراصل والدین جس رشتے کو پسند کر رہے ہوتے ہیں، وہ اچھا اور سلجھا ہوا ہوتا ہے مگر ان کی پسند کے برعکس ان کے بچوں کے ذہن میں کوئی ایسا آئیڈیل بس چکا ہوتا ہے جسے معاشرہ اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں بچوں کو بھی اپنے والدین کا بھرپور ساتھ دینا چاہیے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیے تا کہ انصاف کیا جا سکے۔ محبت کی شادی کرنا یوں تو جرم نہیں مگر اس کی وجہ سے جو برے اثرات ہماری معاشرتی زندگیوں پر مرتب ہوئے ہیں انہیں دیکھ کر محبت کی شادی نہ صرف جرم بلکہ ایسا جرم بن گیا ہے، جو جرائم کی آماج گاہ بن چکا ہے۔ یہ بات اکثر مشاہدے میں آئی ہے کہ محبت کی شادیاں اکثر ناکام ہو جاتی ہیں یا پھر یہ ایسے گل کھلاتی ہیں جس کا معاشرے کو گراں قدر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ذیل میں کچھ ایسے واقعات درج کیے جا رہے ہیں جو اس قدر لرزہ خیز ہیں کہ الحفیظ والاماں۔

''بیٹی کی شادی پر تنازع۔ خاوند نے ساتھیوں کی مدد سے ٹانگیں اور ہاتھ کاٹ کر بیوی کو پھانسی دے دی۔ مرضی کا رشتہ نہ کرنے پر بیٹے نے باپ کو گولی ماردی۔ شادی شدہ عورت نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر خاوند اور دو بچوں کو قتل کر دیا۔ محبت کی شادی میں رکاوٹ بننے پر بیٹی نے باپ کو قتل کروادیا۔ محبت کا ڈرامارچا کر لڑکی کی عزت اور زیور لوٹ کر لڑکا فرار۔ لڑکی کو محبت کے چنگل میں پھنسا کر اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد دوستوں کی مدد سے قتل کر دیا''۔

مذکورہ بالا واقعات وہ ہیں، جو کسی نہ کسی اخبار کی سرخی بن چکے ہیں۔ ان خبروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے معاشرے میں چادر اور چار دیواری کے اندر کی زندگی کس قدر الم ناک بن چکی ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہمارے ارباب حل وعقد، دانش ور اور پڑھے لکھے مرد وخواتین اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرتے۔ ازدواجی زندگی میں اسلام نے مرد اور عورت کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں ان کا تحفظ کیا جاتا لیکن یہ حقیقت بڑی افسوس ناک ہے کہ گزشتہ پچاس برس سے وطن عزیز میں ایسا طبقہ حکم رانی کرتا چلا آرہا ہے جو مغربی طرزِ معاشرت سے اس قدر مرعوب ہے کہ اپنے تمام مسائل کا حل اسی طرزِ معاشرت کی پیروی میں سمجھتا ہے۔

یہاں یہ موضوع بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہر شخص اپنی ذمے داری کو سمجھتے ہوئے مثبت کردار ادا کرے تاکہ معاشرے میں کثرت سے سر اٹھاتی اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاسکے۔ مذکورہ صورت حال دیکھ کر چند باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، جس کے بعد معاشرہ اپنے آپ مثالی بن جائے گا۔ سب سے پہلی چیز یہ کہ گھروں میں پردے کا اہتمام ہوتا کہ نہ کوئی غیر محرم کسی کو دیکھے اور نہ اس محبت جیسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ دوسری ذمے داری والدین کی بنتی ہے کہ وہ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے اپنی اولاد کی شادی ان کی جائز رضامندی کے ساتھ کریں اور کوئی بھی فیصلہ ان پر زبردستی نہ تھوپیں۔ تیسری ذمے داری خود نوجوان طبقے پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین کا ادب واحترام کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے ان کی بات کو ترجیح دیں۔ محبت کا جو اصل معیار ہے وہ ہمارے پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے کہ ''میں نکاح سے بڑھ کر اور کسی چیز کو محبت بڑھانے والا نہیں دیکھتا''۔ مطلب یہ کہ اصل محبت وہ ہے جو شرعی نکاح کے بعد ہوتی ہے۔ آپ کی محبت کی حقیقی حق دار کوئی غیر محرم لڑکی نہیں بلکہ وہ ہے جو آپ کے نکاح میں آچکی ہے۔ آپ ساری دنیا کی لڑکیوں کو چھوڑ کر صرف اور صرف اس سے محبت کریں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

عاصمہ عزیز

عاصمہ عزیز ہے کا تعلق پنجاب کے شہر راولپنڈی سے ہے۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سے طبیعات میں بی ایس آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنے کا آغاز 2016 میں کیا۔ رائٹرز کلب سے طویل عرصے سے وابستہ ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں

1۔ بیسویں صدی کے سائنس دان.....البرٹ آئن سٹائن

2۔ شکر گزاری

3۔ کائنات، سائنس اور قرآن کی نظر میں

4۔ زعم زدہ نفس

5۔ ناقص نظام تعلیم

☆.....☆.....☆

بیسویں صدی کے سائنس دان.....البرٹ آئن سٹائن

البرٹ آئن سٹائن (14 مارچ 1879 ۔ 18 اپریل 1955) ایک جرمن ریاضی دان اور طبیعات دان تھے جنہوں نے تنصیب کے خصوصی اور عام نظریات پیش کیے۔ان کا شمار بیسویں صدی کے ایک با اثر طبیعات دان میں ہوتا ہے۔ وہ سیکولر یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد ہرمن آئن سٹائن انجینئر تھے جنہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر بجلی کے آلات تیار کرنے والی ایک کمپنی بنائی۔ان کی والدہ پالین کوچ گھریلو معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ان کی ایک بہن ماجا،ان سے دو سال چھوٹی تھی۔

1921 میں البرٹ آئن سٹائن کو طبیعات میں فوٹو الیکٹرک ایفیکٹ کی وضاحت کرنے پر نوبل انعام ملا۔اسی صدی میں وہ نازیوں کے حملے کی وجہ سے امریکا ہجرت کر گئے۔البرٹ آئن سٹائن کے کام نے جوہری توانائی کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ 1921 کے بعد آنے والے سالوں میں البرٹ آئن سٹائن نے یونیفائیڈ فیلڈ تھیوری پر بھی توجہ مرکوز کی۔ایک طبیعات دان کی حیثیت سے آئن سٹائن نے بہت سی دریافتیں کیں لیکن تنصیب کے نظریے اور E=mc2 کی بدولت انہیں زیادہ جانا جاتا ہے،جس نے جوہری طاقت اور ایٹمی بم کی ترقی کو فروغ دیا۔

1905 میں آئن سٹائن نے اپنے پیپر میں پیش کیے جانے والے خصوصی تنصیب کے نظریے سے طبیعات کو ایک نئی سمت دی۔نومبر 1915 میں انہوں نے تنصیب کا عام (جنرل) نظریہ مکمل کیا۔اس نظریے کو ان کی تحقیقی زندگی کا خاتمہ سمجھا جاتا ہے۔آئن سٹائن عام تنصیب کی خوبیوں کے قائل تھے کیوں کہ اس اصول نے سورج کے گرد سیّاروں کے مدار کی درست پیش گوئی کو یقینی بنایا،جس کی نیوٹن کے نظریے میں کمی تھی۔اس نظریے نے،کشش ثقل کی قوتیں کیسے کام کرتی ہیں؟ کی بھی تفصیلی وضاحت کی۔ 1919 کے سورج گرہن کے دوران مشاہدات اور پیمائش کے ذریعے انگریز ماہرین فلکیات سر فرینک اور سر ارتھر نے آئن سٹائن کے دعوؤں کو درست قرار دیا۔اس طرح ایک عالمی سائنسی

آئنکون کی پیدائش ہوئی۔

آئن سٹائن نے 1905 میں مادّہ اور توانائی کے درمیان تعلق کو واضح کرنے کے لیے E=mc2 کی مساوات پیش کی۔اس مساوات کے مطابق ایک جسم کی توانائی برابر ہوتی ہے،جسم کی کمیت ضرب روشنی کی رفتار کے مربع کے۔ یہ مساوات ظاہر کرتی ہے کہ مادّے کے چھوٹے چھوٹے ذرّے توانائی کی بڑی مقدار میں منتقل ہو سکتے ہیں۔کوانٹم فزکس کے مشہور سائنس دان میکس پلینک نے آئن سٹائن کے ان دعوؤں کو محفوظ کر کے اوران پر مزید کام کر کے اپنا نام بنایا۔

1940 میں امریکا میں جرمنی کے یہودیوں اور افریقا کے امریکیوں کے رویوں کے درمیان روا رکھے جانے والے اختلاف کو دیکھتے ہوئے آئن سٹائن ''نیشنل ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپل'' (این اے اے سی پی) کے ممبر بنے۔وہ نسل پرستی کو بیماری سمجھتے تھے۔

آئن سٹائن 18 اپریل 1955 کو 76 برس کی عمر میں پرنسٹن کے یونیورسٹی میڈیکل سینٹر میں صبح کے وقت وفات پا گئے۔اس سے ایک روز پہلے اسرائیل کی ساتویں سال گرہ کے موقع پر کی جانے والی تقریر پر کام کرتے ہوئے وہ معدے کی بیماری کا شکار ہو گئے۔انہیں علاج کے لیے ہسپتال لے جایا گیا اور سرجری کروانے کی تجویز دی گئی تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے سرجری کروانے سے انکار کر دیا کہ میں اپنی زندگی جی چکا اور اب اپنی موت کو قبول کرنے کے لیے مطمئن ہیں۔اس لمحے ان کے الفاظ یہ تھے:

''میں جانا چاہتا ہوں، جب میں چاہوں گا۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ زندگی کو مصنوعی طریقے سے طویل کیا جائے۔میں اپنا حصہ وصول کر چکا ہوں،اب میرے جانے کا وقت ہے اور میں یہ کام خوب صورتی سے کروں گا''۔

1999 میں کینیڈا کے سائنس دانوں نے آئن سٹائن کے دماغ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آئن سٹائن کے دماغ کا ایک حصہ، جو اسپیشل ریلیشن شپ،تھری ڈی اور ریاضی کے افکار پر مشتمل ہوتا ہے، وہ عام ذہانت کے لوگوں کی نسبت ان میں پندرہ فی صد زیادہ وسیع تھا۔''دی نیویارک ٹائمز'' کے مطابق، محققین اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آئن سٹائن اتنا ذہین کیوں تھا۔

☆.....☆.....☆

شکر گزاری

شُکر ادا نہ کرنا بھی ایک بیماری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں یہ بیماری سب سے زیادہ انسان میں پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں سورۃ العدیت میں ہانپتے ہوئے گھوڑوں کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ ''انسان اپنے رب کا بڑا ناشُکرا ہے''۔ لفظ شُکر عربی زبان کے لفظ دابۃ شکور سے نکلا ہے۔ دابۃ شکور اس جانور کو کہتے ہیں جو اپنے صحت مند ہونے کی وجہ سے اپنے مالک کا شُکر گزار ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں گھوڑوں کو جنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گھوڑا اگرچہ بہت طاقت ور جانور ہے لیکن پھر بھی اللہ کے حکم سے انسان کے تابع اور اس کا فرماں بردار ہے۔ انسان صرف اس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور وہ انسان کے اس احسان کا بدلہ چکانے کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال کر جنگ میں اپنے مالک کی حفاظت کرتا ہے۔ جب کہ انسان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نعمتوں کا ایک جہان آباد کر رکھا ہے پھر بھی وہ اپنے رویے سے اللہ کی نعمتوں کا اعتراف کرنے کی بجائے اس سے گلہ شکوہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شکوہ، شُکر کی ضد ہے اور گلہ شکوہ چاہے خالق کا کیا جائے یا اس کی مخلوق کا، دونوں صورتوں میں ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انسان پر سب سے بڑا احسان اور اس کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے انسان کی ہدایت کے لیے انبیاء اور پیغمبر بھیج کر نہ صرف انسان کی رہنمائی کے لیے عملی نمونہ پیش کیا بلکہ آسمانی کتب کے ذریعے ہدایت کی اس روشنی کو کئی اُمّتوں اور نسلوں کے لیے محفوظ بھی کر دیا۔ لیکن انسانوں میں سے بعض نے اللہ کے پیغمبروں اور کتب کو جھٹلا کر اللہ کی اس نعمت پر ناشُکری کا ارتکاب کیا۔ بنی اسرائیل کی قوم، جسے اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں پر فضیلت عطا فرمائی اور دنیاوی اور دینی ترقی سے نوازا، پھر بھی وہ اللہ کی نعمتوں سے انکار اور ناشُکری کرتے ہوئے بداخلاقی اور ناسمجھی کا ثبوت دیتی رہی۔ اس کے اسی رویے کی وجہ سے اس پر مختلف آزمائشیں آئیں اور وہ زوال کا شکار ہوئی۔

آج اگر ہم مسلمانوں پر نظر ڈالی جائے تو ہمارا رویہ بھی بنی اسرائیل سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمام نبیوں کے سردار حضرت محمد ﷺ کا اُمّتی بنا کر بھیجا اور ہماری رہنمائی کے لیے ایک محفوظ اور مکمل کتاب بھیجی۔ اللہ کی

اس نعمت پر ہم زبان سے تو شُکر ادا کرتے ہیں لیکن ہمارے رویے اس کے برعکس دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ کی اس نعمت کی ناشکری ہم نے یوں کی کہ ہم اس کا حق ادا نہیں کر سکے۔ ہم نے اللہ کی کتاب کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے اسے محض خاص مواقع میں کھولنے والی کتاب سمجھ لیا ہے۔ ہم قرآن کی عزت و تکریم کرتے ہوئے اسے اپنے گھروں میں سب سے اونچی جگہ پر تو رکھتے ہیں لیکن نہ اسے سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کی تعلیمات پر عمل کر پاتے ہیں۔ ہم دنیاوی تعلیم کو ترجیحی جب کہ قرآنی تعلیم کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں، جو اس نعمت سے ناشکری کا ثبوت ہے۔

ناشکری کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جس رب نے ہمیں دنیا کی نعمتوں سے نوازا ہے ہم اس سے غافل رہیں۔ اللہ کی عطا کردہ ان گنت نعمتوں کو ہم میں سے کوئی بھی شمار نہیں کر سکتا پھر بھی ہمیں اس کے سامنے سجدۂ شُکر کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ ہم لوگوں کے احسانوں اور مہربانیوں کو تو کسی حد تک یاد رکھتے ہیں لیکن اپنے رب کی مہربانیاں بھلا کر اس کی طرف سے ملنے والی آزمائشوں پر گلے شکوے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نعمت، شکر کا امتحان ہوتی ہے۔ ہر نعمت اپنے ساتھ آزمائش کا پہلو ضرور رکھتی ہے۔ جب ہم اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر ادا نہیں کر پاتے تو بعض دفعہ نعمت پیچھے چلی جاتی ہے اور آزمائش سامنے آجاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمیں مایوسی اور اللہ سے گلے شکوے کرنے کے بجائے توبہ اور استغفار کرنا چاہیے۔ ایک مومن کا رویہ یہی ہوتا ہے کہ وہ نعمت پر شکر ادا کرتا ہے اور نہ ملے تو صبر کر کے جتنا اللہ نے دیا ہے، اس پر قناعت کرتا ہے۔ جب کہ ہم شکر اس لیے نہیں ادا کر پاتے کہ ہمارا ظرف چھوٹا ہے۔ جس طرح ایک چھوٹے برتن میں کم چیزیں سما سکتی ہیں، اسی طرح چھوٹے ظرف والے انسان میں بھی مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ جب ہی وہ اللہ کی تمام نعمتیں بھلا کر مشکل میں گلے شکوے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بننے کے لیے ہمیں اپنا ظرف بڑا کرنا ہوگا۔ اگر ہم مشکلات کے وقت اپنے اردگرد خود سے زیادہ مصیبت زدہ لوگوں پر نظر رکھیں تو یقیناً اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر اس کا شکر ادا کر سکیں گے۔

☆.....☆.....☆

کائنات، سائنس اور قرآن کی نظر میں

بیسویں صدی کے وسط میں سائنس کی دنیا میں یہ نظریہ رائج تھا کہ کائنات ابد سے ہے اور ازل تک قائم رہے گی۔ اس نظریے کے مطابق سائنس دانوں کا کہنا تھا کہ کائنات مقررہ، جامد اور غیر متغیر مادّے کا مجموعہ ہے۔ یہ نظریہ ''میٹر یلسٹ فلاسفی'' پر مشتمل ہے جو پوری کائنات کو وجود میں لانے والے خالق کی نفی کرتا ہے۔ تاہم، بیسویں صدی کے دوران جیسے ہی سائنس نے مزید ترقی کی، اس نظریے کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا۔ اکیسویں صدی کے آتے ہی بہت سے تجربات اور مشاہدات کے بعد جدید طبیعیات دان اور مفکر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کائنات کی یقیناً کوئی نہ کوئی ابتدا تھی اور یہ جامد اور غیر متغیر نہیں بلکہ کائنات مسلسل تحریک کے عمل سے گزر رہی ہے۔ کائنات کی ابتدا کو قرآن کریم کی اس آیت سے واضح کیا جا رہا ہے، ''وہ (اللہ) آسمانوں اور زمین کا موجد ہے''۔ (سورۃ الانعام: 101)

موجودہ ماہرین فلکیات بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ پوری کائنات کافی عرصہ پہلے ہونے والے ایک عظیم دھماکے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی۔ اس عظیم دھماکے یا کائنات کے وجود میں آنے والے واقعے کو ''بگ بینگ'' کہا جاتا ہے۔ پورا سائنسی طبقہ اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ یہ دھماکا پندرہ ارب سال پہلے، ایک واحد پوائنٹ یا نقطے سے نکلا تھا۔ اس بگ بینگ سے پہلے مادّہ، توانائی، حتیٰ کہ وقت جیسی بھی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی تھی۔ یہ حقیقت، جو حال ہی میں جدید طبیعیات دانوں نے دریافت کی ہے، چودہ سو سال پہلے قرآن میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

چودہ سو سال پہلے جب فلکیات کا علم نہ ہونے کے برابر یا اپنے ابتدائی دور میں تھا، تب قرآن مجید میں کائنات کے توسیع ہونے کے عمل کو بیان کر دیا گیا تھا۔ ''آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں''۔ (سورۃ الذریٰت: 47) اس آیت میں وسیع ہونے یا کشادگی کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ یعنی آسمان پہلے ہی بہت وسیع ہے لیکن ہم اسے اس سے بھی زیادہ وسیع کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس آیت میں عربی کے لفظ موسع کو وُسع قرار دیا جائے تو مطلب ہوگا کہ ہمارے اندر اس جیسے اور آسمان بنانے کی بھی طاقت وقدرت

موجود ہے اور موجودہ دور میں سائنس بھی اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ کائنات مسلسل تحریک اور توسیع کے عمل سے گزر رہی ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں روسی طبیعیات دان الیگزینڈر فرائیڈمن اور بیلجیم کے عالمِ تکوینیات، جارجز لیمیٹری (Georges Lemaitre) نے تھیوری کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے۔ اس تصور کی تصدیق 1929 میں مشاہدات کے ذریعے لیے گئے اعداد و شمار سے کی گئی۔

امریکا کے ماہر فلکیات، ہبل نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے آسمان کا مشاہدہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ ستارے اور گلیکسیز ایک دوسرے سے دُور حرکت کر رہے ہیں۔ قانونِ طبیعیات کے مطابق، مشاہدے کے مقام کی طرف بڑھنے والی روشنی بنفشئی رنگ کی ہوتی ہے جب کہ مشاہدے کے مقام سے دُور جانے والی روشنی گہری سرخی مائل رنگت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہبل نے یہ بھی دریافت کیا کہ اپنے فاصلے کے لحاظ سے ستارے جو روشنی خارج کرتے ہیں وہ سرخی مائل رنگت کی ہوتی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ستارے اور گلیکسیز ہر وقت نہ صرف ہم سے بلکہ ایک دوسرے سے بھی دُور ہو رہے ہیں۔ کائنات میں ہر شے کا ایک دوسرے سے دُور حرکت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات توسیع کے عمل سے گزر رہی ہے اور یہ حقیقت قرآن مجید میں اس وقت بیان کر دی گئی تھی جب ٹیلی اسکوپ یا اس جیسے ٹیکنالوجی کے دیگر آلات ایجاد ہونے کے قریب بھی نہیں تھے۔ یہ اس لیے کہ قرآن اُس رب کا کلام ہے جو کائنات کا خالق و حکم ران ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، کائنات کی ابتدا عظیم دھماکے سے ہوئی اور اس کے بعد سے یہ مسلسل توسیع کے عمل سے گزر رہی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کائنات کا ماس کافی سطح تک پہنچے گا اور کشش ثقل کی بدولت اس کی توسیع رک جائے گی یوں واپس سکڑنے کے بعد کائنات خود بخود ختم ہو جائے گی اور آخر ایسے نقطے پر پہنچ جائے گی جہاں سے اس کی شروعات ہوئی تھی۔ کائنات کے اس خاتمے کو ''بگ کرنچ'' کا نام دیا گیا۔ اسٹینڈ فورڈ یونیورسٹی کے طبیعیات کے پروفیسرز کا اس بارے میں کہنا ہے کہ آج جو ہم دیکھ سکتے ہیں یا نہیں بھی دیکھ سکتے، سب کچھ پروٹون سے بھی چھوٹے سائز میں تباہ ہو جائے گا۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے آپ ایک سیاہ سوراخ (black hole) کے اندر تھے۔ اس کا ذکر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے، ''جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ لیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں، جیسے ہم نے اوّل دفعہ پیدائش کی تھی اسی طرح دوبارہ کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم اسے ضرور پورا کر کے (ہی) رہیں گے''۔ (سورۃ الانبیاء: 104)

مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں اوراق کی مانند لپیٹ دینے کی بات کی گئی ہے جو غور طلب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کاغذ کو تہ لگا کر لپیٹا جاتا ہے اور تہ ایسی چیز کی لگائی جاتی ہے جو متوازی ہو۔ اسی طرح پہلے کے سائنس دان اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کائنات کی شکل بیضوی یا گول ہے لیکن بیسویں صدی کے سائنس دان، آئن سٹائن نے یہ نظریہ پیش کیا

کہ ہماری کائنات متوازی اور ململ کے کپڑے کی مانند ہے، جس پر کوئی بھی چیز رکھ دی جائے تو اس چیز کے وزن کی بدولت جتنا زیادہ دباؤ ہوگا، اس کے متاثرہ حصوں تک اس کی کشش ثقل کی قوت موجود ہوگی۔ جیسے ہماری زمین کا، اس کے وزن یا ماس کی وجہ سے خلا میں جتنا زیادہ دباؤ ہے، اس کے اثرات چاند تک میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چاند، زمین کی کشش ثقل کی قوت کی وجہ سے اس کے گرد گھومنے پر مجبور ہے۔ اسی طرح سورج کے زیادہ ماس کی وجہ سے اس کی کشش ثقل کے اثرات پلوٹو سیّارے تک موجود ہیں، جو بہت زیادہ فاصلہ ہونے کے باوجود سورج کی کشش ثقل کی وجہ سے اس کے گرد گھوم رہا ہے۔

کائنات کی ابتدا اور خاتمے کے بارے میں موجودہ سائنس کی تحقیقات چودہ سو سال پہلے قرآن کریم میں دیے گئے بیانات سے مکمل اتفاق کرتی ہیں۔ پھر بھی آج کے دور میں ہم، سائنس کی تحقیقات پر تو بہت یقین رکھتے ہیں لیکن قرآن میں بیان کیے گئے معجزات پر غور و فکر نہیں کرتے۔

☆.....☆.....☆

زعم زدہ نفس

''تایا ابا! آپ یہاں....؟'' ایدھی سینٹر کے ہال نما کمرے کے وسط میں وہیل چیئر پر آنکھیں موندیں بیٹھے، اپنے اداس اور وحشت ناک دنوں میں حسین یادوں کی پیوند کاری کرتے ہوئے انہیں ایک جانی پہچانی نسوانی آواز سنائی دی۔ اس بڑے سے کمرے میں انہی جیسے بے بس و مجبور بوڑھے تھے، جن کا وجود ان کے گھر والوں کو کھٹکتا تھا۔ ثانیہ ایک این جی او میں کام کرتی تھی، آج اس کا وہاں آنا ہوا تو اپنے عزیز از جان تایا ابا کو ایدھی سینٹر میں بے کس پڑا دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گئی۔ ''پاپا کو تو کچھ بتایا ہوتا۔ آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' پنجوں کے بل نیچے، ان کی وھیل چئیر کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے خفگی سے کہا۔

غیروں سے شکوہ ہوتا تو اپنوں کو کچھ بتاتا۔ اپنی ہی اولاد کی شکایت تو کوئی نہیں کیا کرتا''۔ ان کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی سی کرچیاں تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے بیٹوں کو سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا۔ حتیٰ کہ وہ بیٹوں کی خواہش میں اتنے اندھے ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو بھی دھتکار دیا تھا۔ لیکن آج انہی بیٹوں نے انہیں یہاں بے یار و مددگار لا چھوڑا تھا۔ مجبوری، بے کسی اور درد کی انتہا کب، کیوں اور کیسے ہوتی ہے؟ عبدالجبار صاحب پر واضح ہو چکا تھا۔ یہاں گزارے پچھلے پندرہ بدترین دنوں میں انہیں ایدھی سینٹر کے در و دیوار اپنا مذاق اُڑاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ''جب اپنے بے نیازی برتنے لگیں۔ منہ پھیر کر اپنے کان اور آنکھیں بند کر لیں تو گھر کے در و دیوار سمیت ہر بے جان چیز کے جیسے کان اور آنکھیں اُگ آتی ہیں''۔ بے بسی کی انتہاؤں کو پہنچتے ہوئے انہوں نے کئی دفعہ سوچا تھا۔

گاڑی اسلام آباد کی سڑک پر رواں دواں تھی۔ اوپر آسمان پر روئی کے گالوں کی مانند سفید بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا سورج نرم گرم شعاعیں نیچے زمین پر بکھیرے ہوئے تھا۔ ثانیہ کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ایدھی سینٹر سے اپنے بھائی کے گھر جاتے ہوئے اُن کا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں کھونے لگا تھا اور ماضی کے اوراق پلٹتے ہی انہیں اپنا قبیح چہرہ آج پہلی بار دکھائی دیا تھا، جب کئی سال پہلے اپنی بیٹی کے پیدا ہوتے ہی انہوں نے اسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔ انہوں نے زندگی میں اپنی ماں اور بہن کے علاوہ کبھی کسی عورت کو قابل اعتنا اور قابل عزت جانا ہی نہیں تھا۔

جب زندگی بھر بیٹی کی ماں کو عزت اور مان نہیں ملا تھا تو بیٹی کو کیوں کر مل سکتا تھا۔ ان کا دل سنگ مرمر کی مانند سخت ہو چکا تھا۔ گردن سریے کی مانند اکڑی ہوئی۔

''اس گھر میں بیٹی رہے گی یا اس کی ماں''۔ کاٹ میں لیٹی چند دن کی بیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے تحکم سے اپنی بہن کے سامنے حکم صادر کیا تھا۔ یہ حکم صادر کرتے ہوئے بھی وہ جانتے تھے کہ زندگی کے کتنے ہی قیمتی ماہ وسال صبر شکر کے ساتھ ان کے سنگ گزارنے والی عورت بیٹی کو تو چھوڑ سکتی تھی لیکن ان کا گھر چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ گھر اور رتبے کی ملکیت کا احساس ہی مرد کو زعم اور تفاخر میں مبتلا کرنے کو کافی ہوتا ہے۔

''بھائی جان! کیوں اللہ کی رحمت سے منہ موڑ رہے ہیں''۔ بہن نے انہیں سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ عبدالجبار صاحب کی چیخ پکار اور اللہ کی رحمت سے منہ پھیرنے نے انہیں ہولا کے رکھ دیا تھا۔

''ایسی رحمت کا کیا فائدہ جسے مستقبل میں زحمت ہی بننا ہے''۔ بیٹے کی خواہش میں غرق ان پر عجیب جنون سوار تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر بیٹی سمیت بیوی کو باہر نکال دیتے۔

''مستقبل کی جب خبر نہیں تو پھر کیوں اس کی فکر میں مبتلا ہیں؟'' بہن نے ناصحانہ انداز میں کہا تھا۔ لیکن جن کی آنکھوں پر خواہشات کی پٹی بندھ جائے انہیں جتنی بھی نصیحتیں کی جائیں سب اکارت جاتی ہیں۔ بالآخر ان کو احساس دلانے میں ناکامی کے بعد ان کی بہن اپنی چند دن کی بھتیجی کو اٹھا کے اس کے چچا کے حوالے کر آئی تھیں۔

وقت کی پٹڑی میں کئی ماہ وسال کسی تیز رفتار گاڑی کی مانند بیت گئے تھے۔ اس دوران قدرت نے انہیں چاند سے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ اپنی خواہش بر آنے پر ان کی گردن احساس تشکر سے جھکنے کی بجائے فخر سے مزید تن گئی تھی۔ بہت سے باپوں کی طرح انہوں نے بھی اپنی جوانی اور اوائل بڑھاپے کے دن بیٹوں کی اعلیٰ پرورش اور ان کے لیے مال و دولت جمع کرنے میں صرف کر دیے۔ اس دوران انہیں کبھی بھولے سے بھی اپنی بیٹی کی یاد نہیں آئی تھی۔ ماں یاد کرتی تو وہ اسے بھی بری طرح جھڑک دیتے۔ ویسے بھی انہیں اپنے اور اپنے بیٹوں کے سوا کبھی کسی سے محبت تھی ہی نہیں جو وہ کسی کے جذبات و احساسات کی پروا کرتے۔

وقت کے سمندر میں اسی طرح کئی سال بہ گئے تھے لیکن بیٹی کی طرف سے ان پر چڑھا بے حسی کا جمود نہیں ٹوٹا تھا اور ٹوٹ بھی کیسے سکتا تھا؟ انسان تو ازل ہی سے ٹھوکر کھائے، درد سہے بغیر صحیح راستوں کا تعین نہیں کر پاتا۔ یہی ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ خود پر چڑھا بے حسی اور فخر و غرور کا خول بروقت اتار نہیں پائے تھے۔ کئی سال گزرے.... بیٹے جوان ہوئے، ان کی شادیاں ہوئیں، اس دوران ان کی ماں بھی کچھ ماہ بستر سے لگنے کے بعد خالق حقیقی سے جا ملی۔ بیوی کی جدائی کا غم کیا ہوتا، اس کی موت کے بعد تو ان کی اپنی ہڈیوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ بالوں میں سفیدی گھل گئی تھی اور ٹانگیں زیادہ قدموں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں۔ بیوی کی جدائی کے بعد وہ مکمل طور پر بیٹوں اور بہوؤں کے رحم و کرم

پر تھے۔کئی کئی گھنٹے بھوکے پیاسے، بستر پر چت لیٹے جب وہ اپنے کمرے میں تنہا پڑے رہتے تو انہیں اس عورت کے ساتھ رکھا اپنا ناروا رویہ کانٹوں کی طرح چبھتا۔اب اکثر اپنی بیٹی ثانیہ کا من موہنا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔جن بیٹوں کی خواہش میں انہوں نے اپنی بیٹی کو دھتکارا تھا، انہی بیٹوں کی اپنی جانب سے لاپروائی اور بے نیازی دیکھتے ہوئے اپنی آدھی جائیداد بیٹی کے نام کر دی تھی۔ساری زندگی جس کا چہرہ دیکھنے کے بھی روادر نہیں ہوئے تھے، مرنے سے پہلے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرنا چاہتے تھے اور زندگی میں پہلی دفعہ بیٹی کے حق میں کیا گیا کوئی فیصلہ ان کے لیے گلے کا پھندا ثابت ہوا تھا۔بیٹی کو جائیداد میں حصہ دینے کے جس جرم میں بیٹوں نے انہیں ایدھی سینٹر میں لا پھینکا تھا، اس پہ انہیں اپنی زندگی کی آخری سانس تک کوئی شرمندگی وندامت نہیں ہونی تھی۔ماضی میں بڑے طمطراق سے انہوں نے اپنی بیٹی کو دھتکار کر اس کی ماں کا دل زخموں سے چور کیا تھا اور آج....ان کے محبوب بیٹوں نے ان کے بوڑھے ولاغر وجود کو ایدھی سینٹر میں پھینک کر ان کا سینہ کانٹوں سے چھلنی کر دیا تھا۔افسوس وملال جاتا بھی تو کیسے....عبدالجبار صاحب کی تو اپنی ''کرنی'' ہی آگے آئی تھی۔قدرت کے حساب کتاب ہمیشہ عدل کی بنیاد ہی پر ہوتے ہیں۔کل بیٹوں کی محبت میں انہوں نے بیٹی کو دھتکارا تھا اور آج انہی بیٹوں نے انہیں بری طرح دھتکار دیا تھا۔کسی نے ٹھیک کہا ہے، جو گردنیں جھکتی نہیں وہ توڑ دی جاتی ہیں۔

ایدھی سینٹر سے اپنے بھائی کے گھر جاتے ہوئے ڈرائیونگ کرتی اپنی بیٹی ثانیہ کے معصوم چہرے کو کنکھیوں سے دیکھتے وہ سوچ رہے تھے کہ جب اسے ساری حقیقت کا ادراک ہوگا تو وہ اس کی محبت کو نفرت میں بدلتے کیسے سہ پائیں گے؟

☆.....☆.....☆

ناقص نظامِ تعلیم

کہتے ہیں، پڑھو گے لکھو گے تو بنو گے نواب۔ لیکن دنیا کی دس کام یاب شخصیات ایسی بھی ہیں جنہیں تعلیمی اداروں سے نکال دیا گیا اس کے باوجود انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا پوری دنیا سے منوایا اور اس محاورے کو غلط ثابت کر دیا۔ اگرچہ تعلیم حاصل کیے بغیر بھی نواب بنا جا سکتا ہے تاہم، تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی معاشرے اور قوم کی ترقی کے لیے اس کے افراد کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جن چیزوں کی قسم کھائی ہے، ان میں قلم بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی نعمت انسان کو علم کی عطا کی اور اس علم کو محفوظ کرنے کے لیے قلم تخلیق کیا۔ لہٰذا، دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے لازم ہے۔ تعلیم نہ صرف ملک کی ترقی کا سبب بنتی ہے بلکہ انسان کی شخصیت سنوارنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تعلیم، جو کسی بھی ملک کی ترقی کا باعث بنتی ہے، بدقسمتی سے پاکستان میں اس کو بہتر بنانے کے لیے کوئی خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے گئے۔ پاکستان کا تعلیمی نظام دنیا کے دیگر ممالک کے تعلیمی نظام سے بہت پیچھے ہے۔ آنے والی ہر حکومت اس کا نظام بہتر بنانے کے لیے بہت سی پالیسیاں بناتی ہے، اس کے باوجود پاکستان کے تعلیمی نظام میں کوئی بہتری دیکھنے میں نہیں آتی۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے ملک کے تعلیمی نظام میں یکسانیت نہیں ہے۔ غریب کے لیے سرکاری اور امیر کے لیے نجی اسکول قائم ہیں، جن کے نظامِ تعلیم میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ موجودہ دَور میں مغربی طرزِ تعلیم پر چلنے والے نجی اسکولوں میں بچوں کو داخل کروانا بہت سے گھرانوں کے لیے اسٹیٹس سمبل بھی بن چکا ہے۔ جہاں دنیا کی تعلیم تو دی جاتی ہے لیکن دین کی تعلیم، جو ہماری دنیا اور آخرت سنوارنے کا ذریعہ بنتی ہے، اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ان اسکولوں میں تعلیمی نظام تو بہتر اور جدید ہوتا ہے لیکن ان کی فیسیں ادا کرنا ایک کم آمدنی والے انسان کے بس کی بات نہیں۔

دوسری طرف چھوٹے شہروں اور گاؤں کے وہ سرکاری تعلیمی ادارے ہیں جہاں ''مفت تعلیم'' کے نام پر مہیا کی

جانے والی تعلیم بھی غیر معیاری ہوتی ہے۔ان تعلیمی اداروں کے نظام میں خرابی کی اصل وجہ اساتذہ پر مؤثر چیک کا نہ ہونا ہے۔اس کے علاوہ تدریس کی ذمے داری جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہے، ان میں سے بعض تو جدید تعلیمی تقاضے پورا کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں اور بعض اہل ہونے کے باوجود اپنی ذمے داریاں ایمان داری سے ادا نہیں کرتے۔ کرپشن جیسی بیماری پاکستان کے تعلیمی اداروں کو بھی پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔اساتذہ کی تقرری کا معاملہ ہو یا ان کی تنخواہوں کا، ہر جگہ بدعنوانی کے رجحانات بڑی تعداد میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔حکومت کی طرف سے ان اداروں کی بہتری کے لیے جو فنڈز مختص کیے جاتے ہیں وہ تعلیمی اداروں کی بہتری کا ذریعہ بننے کی بجائے محکمۂ تعلیم میں کام کرنے والے افراد کے بینک بیلنس بڑھانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ حکومت کی طرف سے کی جانے والی کوئی بھی کوشش کوئی خاص رنگ نہیں لاتی۔

تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی کی ضامن ہے، اس لیے حکومت کو چاہیے کہ اسے بہتر بنانے کے لیے بنائی جانے والی پالیسیوں پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔اس کے علاوہ اساتذہ تقرری سیاسی بنیادوں کی بجائے میرٹ پر یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جانے چاہئیں۔حکومت کے علاوہ تدریسی شعبے میں کام کرنے والے افراد پر بھی یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تعلیم جیسے مقدس شعبے کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنانے کے بجائے اپنی ذمے داریوں کو ایمان داری سے ادا کریں۔اساتذہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ ایسا رویہ اپنائیں جس سے ان میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق اجاگر کیا جا سکے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

ارم فاطمہ

ارم فاطمہ نے 7 برس قبل لکھنے کا آغاز سوشل میڈیا پر مختصر افسانہ نگاری سے کیا۔ متعدد مقابلے جیتے اور 3 برس قبل رائٹرز کلب میں شمولیت اختیار کی اور آرٹیکل اور بچوں کی مختصر کہانیاں لکھیں۔ رائٹرز کلب کے توسط سے یہ کہانیاں ملک کے ممتاز اخبارات میں پبلش ہوئیں اور ایک مقام حاصل کیا۔

سالنامے میں شامل تحریریں

1۔ نمکین پانی

2۔ عدم برداشت، ایک آکاس بیل

3۔ دل کی بات

4۔ جینے کا حق

5۔ سودا

☆.....☆.....☆

نمکین پانی

آج کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ تو روز اس کے ساتھ ہوتا تھا پھر آج ایسی کیا بات ہوئی کہ اس کی آنکھوں کا نمکین پانی اس کا تکیہ بھگو رہا تھا۔ تعلیم حاصل کرنا اس کا خواب تھا۔ مگر کیا یہ ضروری تھا کہ اس راہ میں ہر روز اس کے احساس محرومی کو نمایاں کیا جاتا۔ آج پھر وہ کلاس میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ وجہ وہی تھی، یعنی اس کے یونیفارم پر پانی اور مٹی کے داغ۔

وہ کسی کو کیسے بتاتی کہ وہ روز رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر چھت سے ٹپکنے والی بوندوں کو ایسے شمار کرتی ہے جیسے لوگ چاندنی راتوں میں ستارے گنتے ہیں۔ مکان کی چھت کچی ہونے کے باعث ایک دن بھی ہوئی بارش کا پانی کئی دنوں تک ایسے ٹپکتا رہتا ہے جیسے چھلنی سے پانی ٹپک رہا ہو۔ واپڈا والوں کی مہربانی سونے پر سہاگا کا کام کرتی ہے، مطلب نہ بجلی نہ پانی۔ اس میں قصور کس کا؟ سزا کس کے کھاتے میں؟

اس کی دوست ثانیہ نے کہا کہ وہ اس کی امی سے بات کرتی ہے، وہ ایک اور یونیفارم خرید لیں تا کہ روز روز کی ذلت سے بچا جا سکے۔ جب وہ رابعہ کے گھر پہنچی تو اس کی امی اور چھوٹی بہن گھر کے آنگن میں کھڑے پانی کو بالٹیوں سے نکال رہی تھیں۔ چھت کا بکھرا ہوا ملبہ ان کی بے چارگی اور کسمپرسی کی داستاں سنا رہا تھا۔

ٹوٹا مرا مکان کھلے مفلسی کے بھید
بارش نے انکشاف سرِ عام کر دیا

برسات کا موسم بھی کسی کے لیے رحمت اور کسی کے لیے زحمت کا سبب بن جاتا ہے۔ جن کے گھروں کی چھت سلامت رہتی ہے، وہاں اس کا استقبال خوشیوں اور مسکراہٹوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور جن گھروں کی چھتیں لرزنے لگتی ہیں، ان کے ہاتھ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ اس ملک میں نہ جانے کتنے ایسے خاندان ہیں، جو رات کو اس فکر میں سوتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو، صبح سر پر سائبان نہ رہے۔ یہ خستہ حالی کچھ تو ان کا مقدر ہے اور کچھ حالات کی ستم ظریفی کہ مہنگائی کے اس دور میں سفید پوش طبقہ، خوراک اور رہائش کے اخراجات پورے کرے یا اپنے بچوں کی

آنکھوں میں بسے تعلیم کے خواب پورا کرنے کی سعی کرے۔شاید ان کی قسمت میں یہی ہے کہ وہ اپنے خواب اس زمین میں دفن کر دیں جہاں خوش حال حکم ران کی ہر آسائش سے مزیّن بلند اور مضبوط محلات کھڑے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر کون ان کے کھلے سروں پر مضبوط چھت مہیا کرے گا؟ کون ان کے سائبان بچانے میں مددگار ہوگا؟ کتنا آسان ہے ان خوش حال، صاحب ثروت اور ارباب اختیار کے لیے، ائیر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھ کر صحافتی نمائندوں کے جلو میں مخصوص علاقوں کا دورہ کرنا، برائے نام امدادی رقوم تقسیم کرنا، آس، امید اور کل کے وعدوں کے خواب دکھانا اور یہ بھول جانا کہ یہ امداد مستحق افراد تک پہنچی بھی یا نہیں۔ان کی ذمے داری یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ آگے وہ جانیں اور ان کا خدا جانے، آج ان کی آنکھیں بند ہیں۔سیلاب کے بہتے ریلے کے ساتھ کسی غریب کی بیٹی کی شادی کے ارمان بہ گئے یا ان ماؤں کے جگر گوشے، جو رات کو تو ان کے پہلو میں سوئے لیکن صبح ان کی آنکھیں انہیں دیکھنے کو ترس گئیں۔کھلے آسمان تلے بے گھر انسانوں کا ہجوم، جن کی آنکھیں نمکین پانی سے بھری ہوئی شکوہ کناں ہیں۔

☆.....☆.....☆

عدم برداشت، ایک آکاس بیل

آکاس بیل کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ اس کے پتّے نہیں ہوتے۔ اس کے پھول دسمبر میں نکلتے ہیں اور مارچ میں پک کر زمین پر گر جاتے ہیں۔ بیجوں سے نازک پودے نکل کر میزبان پودے کو تلاش کرتے ہیں اور جب انہیں میزبان پودے کی شاخ مل جاتی ہے تو یہ زمین سے رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ آکاس بیل کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی جڑیں مہمان پودے کا رس چوستی ہیں جس کی وجہ سے پودے کی نشو ونما رک جاتی ہے۔ آکاس بیل جس درخت کو چمٹ جائے اسے سُکھا دیتی ہے۔

آج ہمارا پیارا ملک پاکستان بھی ایک ایسے درخت کی مانند ہو چکا ہے جس کے گرد دہشت گردی، فرقہ ورانہ فسادات، انتہا پسندی، شعور کی کمی اور معاشی بدحالی جیسی چھوٹی چھوٹی جڑوں نے عدم برداشت جیسی آکاس بیل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ وطن عزیز سے لپٹی اس کی یک جہتی، سلامتی، خودداری اور بقا کا رس چوس رہی ہیں، اسے کھوکھلا کر رہی ہیں۔ شدت پسندی اور انتہا پسندی کا بڑھتا رجحان معاشرے کے لیے زہر قاتل ہے۔

معاشرے میں پھیلے عدم استحکام، معاشرتی و معاشی تنزلی اور عدم تحفظ کی بات کی جائے تو اس کی ابتدا فرد کے انفرادی رویے سے ہوتی ہے کہ معاشرے کا انفرادی فرد اپنے عدم برداشت رویے سے معاشرے کی اجتماعی صورت حال کو بگاڑنے کا ذمے دار ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ 'ایک عام انسان میں عدم برداشت کا فقدان کیوں ہے؟' معاشرے کے اجتماعی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

میانہ روی، تحمل مزاجی اور ایک دوسرے کو برداشت کرنا، وہ مثبت رویے ہیں جن سے معاشرے میں امن، سکون اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔ جن معاشروں میں ان خوبیوں کی کمی ہوتی ہے وہاں بے چینی، شدت پسندی، جارحانہ پن، غصہ، تشدد، لاقانونیت اور دیگر بہت سی برائیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں جو معاشرے کا اجتماعی حُسن خراب کرتی ہیں

اور اسے گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کئی سالوں سے عدم برداشت میں بے انتہا اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر فرد میں قوتِ برداشت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر فرد کے رویے اور باتوں سے بے صبری اور بے چینی نمایاں ہے۔

اکثر معمول کی زندگی میں پبلک مقامات پر ذرا ذرا سی بات پر مختلف افراد کا آپس میں لڑ پڑنا، کرایہ زیادہ مانگنے پر کنڈکٹر کی شامت.... اپنے اسٹاپ سے پہلے یا بعد میں روکنے پر مسافروں میں عدم برداشت، والدین کا بچوں کو ضرورت سے زیادہ جھڑک دینا، کبھی بچوں کا اپنے والدین سے طویل بحث کرنا اور غصہ دکھانا، گاڑی کی معمولی ٹکر پر سیخ پا ہونا، اوورٹیک کرنے پر گالیاں دینا، لوڈشیڈنگ پر غصہ نکالنا، ہمارے عمومی رویے بن چکے ہیں۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ بچے کارٹون پروگرام دیکھ رہے ہیں، اتنے میں نیوز ہیڈ لائنز کا وقت ہوتا ہے، صرف ایک لمحے لے لیے ریموٹ مانگنے پر ان کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات آ جاتے ہیں۔ انہیں اپنے رویے پر افسوس نہیں ہوتا۔ نیوز ہیڈ لائنز کچھ طویل ہو جاتی ہیں تو وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر جاتے ہیں۔ یہ رویے لیے جب ہر فرد عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو معاشرے کے دیگر افراد کے ساتھ بھی اس کا سلوک ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی اسی کی غلطی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اگر کسی سے غلطی ہو جائے اور وہ اسے کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے معذرت کر لے تو لازمی بات ہے، دوسرے کو بھی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف کرنا پڑے گا، یوں بات ختم ہو جائے گی مگر بدقسمتی سے بات کو بڑھایا جاتا ہے۔ ہمارا مذہب انسان کو اخلاق کی تربیت دیتا ہے تاکہ وہ معاشرے کا اہم فرد بن سکے مگر ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ شدت پسندی، مذہب کے معاملے ہی میں دکھائی جاتی ہے۔

اسلام نہ صرف رواداری اور میانہ روی کا درس دیتا ہے بلکہ دوسرے مذاہب کا احترام کرنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ اگر کوئی زیادتی کرے تو معاف کرنا اس کے نزدیک افضل ترین ہے مگر بدقسمتی سے مذہب کی اصل روح کو سمجھنے کی بجائے اس کی اپنی مرضی سے تشریح کی جاتی ہے اور فساد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مذہب کا مقصد معاشرے میں برائی کا خاتمہ کر کے امن اور سکون قائم کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ انصاف اور مساوات کو معاشرے میں فروغ دیا جائے۔

اسی لیے معاشرتی ناہمواریاں بھی عدم برداشت کی ایک اہم وجہ ہے جس کی سب سے بڑی ذمے دار حکومت ہے۔ بڑھتی بے روزگاری، انصاف کی عدم فراہمی، مہنگائی اور عدم تحفظ جیسے عوامل آج کے انسان کو اس مقام پر لے آئے ہیں جہاں اس نے محبت اور انسانیت چھوڑ کر طاقت اور اجارہ داری کو اپنا قبیلہ بنا لیا ہے۔

سیاست ہو یا سماجی افراتفری، انار کی آکاس بیل کی طرح پھیلتی دکھائی دیتی ہے۔ اندرونی تضادات اور انتشار

پر قابو پا کر ہی کوئی قوم بڑے سے بڑا ٹارگٹ حاصل کر سکتی ہے۔ وہ مملکتیں اور قومیں ہمیشہ زوال پزیر رہتی ہیں جہاں تضادات اور تعصّبات کی پرورش کرنا خود ریاستی اداروں کا مشغلہ بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم بطور معاشرہ عدم برداشت، خوں ریزی، دہشت گردی اور نفرت کی گھٹن آمیز فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم مذہب، علاقے، زبان، نسل اور ثقافت کے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کبھی ایک قومی طاقت نہیں بن سکے۔

ہمیں اپنا سفر یہیں سے شروع کرنا ہے۔ ایک ایسی مثبت، فعال اور پائیدار قومی پالیسی بنانی چاہیے جو ایک خوش حال پاکستان کی بنیاد رکھ سکیں۔ اگر ہم ایک قومی سوچ تشکیل نہ دے پائے تو پھر اس معاشرے کے ہر فرد میں موجود تنگ نظری، تشدد، خوں ریزی، تعصب اور نفرت کبھی ختم نہیں کر پائیں گے جو ہماری سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ریاستی زوال کا سبب ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی جڑوں کو کاٹ کر ہی ہم اپنے وطن کو اس آکاس بیل سے نجات دلا کر ایک ایسا مضبوط پاکستان تشکیل دے سکتے ہیں جہاں مذاہب، فرقوں، قوموں، صوبوں، ثقافتوں، زبانوں اور تہذیبوں کا احترام بھی ہوگا اور پاکستان قومی یک جہتی اور معاشی ترقی کے نئے سفر پر بھی گام زن ہوگا۔

☆.....☆.....☆

دل کی بات

ایک سوال معاشرے کے ہر فرد سے، ایک لمحے کے لیے سوچیے گا ضرور۔ آپ کی کبھی کسی ایسے انسان سے ملاقات ہوئی، جو اپنے دل میں ہر ذی نفس کے دل کی بات لیے پھرتا ہو، جسے سن کر اور مل کر آپ کو لگے کہ ہاں.... یہ تو ہمارے ہی دل کی بات کر رہا ہے۔ یہ کہنا بہت آسان ہے، جو اکثر لوگ کہتے بھی ہیں کہ 'ہم دل سے سوچتے ہیں۔'

اس بات کی گہرائی تک جائیں تو ہم سب سے پہلے یہی سوچتے ہیں کہ وہ اگر سوچتا ہے تو یقیناً اپنے دل سے سوچتا ہوگا۔ جب دل اس کا ہے تو باتیں بھی اسی کی ہیں۔ وہ اپنے لیے سوچتا ہے، اپنے لیے زندہ رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ دل میرا ہے مگر اس میں ابھرتی باتیں ہر اس انسان کی ہیں، جو کہیں نہ کہیں، سینے میں کسی خواہش کو دبائے ہوئے ہے، جس کا تعلق اس کی ذات سے کم اور اس سے جڑے رشتوں اور انسانوں سے زیادہ ہے جن سے اس کی زندگی رواں دواں ہے۔

کہیں یہ خواہش دل کی خوشی بنتی ہے، مکمل ہوتی ہے، اپنی منزل پاتی ہے، تو دل کی حسرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تب وہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ مسکراتا تو ہے مگر آنکھیں نامکمل رہ جانے والے خواب کی نمی سے جھلملاتی رہتی ہیں۔ ایسے انسان کے لیے ہم کہتے ہیں، یہ حسّاس دل رکھنے والا انسان ہے جو اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ سوچتا ہے۔ مگر اسے ہر دَور اور ہر زمانے میں بہت ناقدری کا سامنا کرنا پڑا ہے کیوں کہ کچھ لوگ، جو اس دل میں حسد رکھیں، ان باتوں سے نظر چرائیں، وہ اس انسان کو اس کا مقام دینے سے گریز کرتے ہیں۔ اکثر آپ نے سنا ہوگا، ایسے انسانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا رویہ نارمل نہیں ہے۔

آپ سبھی جانتے ہیں، نارمل ہم اسی کو سمجھتے ہیں جو ہمارے اور آپ جیسا ہو۔ اپنی خواہشات کو سوچتا ہو، اپنے خیالات بیان کرتا ہو۔ صرف اور صرف اپنی ذات کا تذکرہ کرتا ہو۔ فی زمانہ ایسا ہی انسان کام یاب ہے۔ کہیں اسے

معاشرے کے لیے اَن فِٹ کہا جاتا ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ بھائی! زندگی اپنے لیے جینے کا نام ہے۔خوشی سے جیو، اسے گزارو اور اگلے ٹھکانے کی تیاری شروع کر دو۔مگر شاید یہ وہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ انسانیت اپنا ایک اجر رکھتی ہے۔خوشی کا ایک احساس رکھتی ہے۔

آپ جاننا چاہتے ہیں، ایسا کون سا انسان ہے جو اپنے دل میں دوسروں کی بات لیے جیتا ہے؟ یہ وہ انسان ہے، جو ہم میں سے ہی ہے، بس ہم اسے پہچان نہیں پاتے۔ یہ وہ انسان ہے جو ظاہری آنکھ رکھتے ہوئے بھی اپنے من کی آنکھ روشن رکھتا ہے۔ جو یہ سب دیکھتا ہے، جسے ہم دیکھتے ہوئے بھی بِنا دیکھے گزر جاتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہے جو دل میں درد رکھتا ہے۔ درد سہتا بھی ہے، جسے اکثر لوگ نظر انداز کر کے اپنے دل کو مادّی لذتوں سے بہلاتے ہوئے زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہے، جو دیکھتا ہے کہ اس ملک میں کتنے ایسے بچے ہیں جن کی زندگی کچرے کے ڈھیر سے شروع ہوتی ہے اور قبرستان کی کسی نیم تاریک قبر پر چرس اور افیون کے دھوئیں میں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ وہ انسان ہے، جو یہ دیکھتا ہے کہ غربت اور عسرت میں پلی نوخیز کلیاں کہیں نظروں کی ہوس سے گھبرا کر موت کی آغوش میں پناہ لیتی ہیں یا پھر زندگی جینے کی خواہش میں اپنی روح کو کچل دیتی ہیں اور ہوس زدہ نظروں کے آگے ہار جاتی ہے۔ یہ وہ انسان ہے، جس کے دل کی بات یہ ہے کہ میرے ملک کے ہر نوجوان کا ایک خواب ہے، جو اسے یہ کوشش کرنے پر اکساتا ہے کہ اسے بھی زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہے اور اگر وہ چاہے تو ناجائز ذرائع اختیار کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے، جو ایک عام انسان کے مسائل کی بات کرتا ہے، جس کے لیے صبح سویرے بجلی کا ہونا ہی بہت غنیمت ہے۔نلکوں سے دھواں نہ نکلے، کپڑے استری کے انتظار میں سوکھتے نہ ہوں۔اسے زندگی کی بنیادی سہولیات میسر ہوں۔ یہ وہ انسان ہے جس کے دل کی بات ہر انسان کے دل کی بات ہے، جس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ کون اقتدار اور اختیارات کی کرسی کی بھاگ دوڑ میں آگے ہے اور کون سب سے پیچھے؟

سب اپنے اپنے مفادات کے ساتھ زندہ ہیں مگر یہ اپنے حسّاس دل کو لے کے کہاں جائے، کیسے جیے؟ نہ اس کی نگاہیں ملک کے معاشی بحران سے ہٹی ہیں اور نہ ہی وہ بجلی، پانی کی بندش سے پیدا ہونے والے مسائل سے بے خبر ہے۔نوجوان طبقے کے مسائل بھی اس کے اپنے مسائل ہیں جنہیں وہ سمجھنا اور ان کا حل بھی چاہتا ہے۔اس کی امیدیں بھی اسی طبقے سے زیادہ ہیں کیوں کہ وہ ایک زندہ انسان ہے۔ یہ ایک عام انسان کی باتیں ہیں، جس نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ صرف مسائل کو دیکھنا، سمجھنا اور اس کے لیے راہ نکالنا ہی کافی نہیں بلکہ یہ احساس ہر اس انسان میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جو صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اس معاشرے سے جڑے ہر فرد کے لیے سوچتا ہے۔

زندگی گزارنے کا عمل بہت تھکا دینے والا ہے۔ جہاں انسان اپنی کامیابی کے لیے جدوجہد کرنا خواب سمجھتا ہے

وہیں ہر فرد کے خواب سنبھالنا کسی آزمائش سے کم نہیں۔اس کی نظر ملک میں بڑھتے جرائم پر بھی ہے اور دہشت گردی کے سبب گرتی معاشی اور معاشرتی زندگی کے مسائل پر بھی۔بدقسمتی سے ایسا انسان ہم میں سے اکثر کے اندر موجود ہے مگر ہم اس سے نظریں چراتے ہیں۔ہم میں حوصلہ نہیں کہ معاشرے کے اس بگاڑ کو درست کرنے کے لیے آواز بلند کریں۔مگر یاد رکھیں، ایسے ہی انسانوں کے دَم سے معاشرے کی سانسیں چل رہی ہیں۔معاشرہ زندہ ہے تو ہم زندہ ہیں۔کوشش کریں کہ اپنے احساسِ آدمیت کو زندہ رکھیں تبھی معاشرے کے افکار و خیالات بدلے جا سکتے ہیں، ایک نئ زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔اسی لیے اپنے دل کی بات سنیں اور ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کریں تا کہ بات بھی پہنچ جائے اور اس کے اثرات بھی دُور رس ہوں، اس لیے خدارا دل کی بات سنیں، اسی میں زندگی ہے۔

☆.....☆.....☆

جینے کا حق

زندگی رواں دواں ہے۔ وقت گزر رہا ہے، کبھی مہربان تو کبھی نامہربان اور ہم سب بھاگ رہے ہیں۔ کوئی دولت کے پیچھے، کوئی شہرت کے پیچھے، کسی کو کرسی کی ہوس ہے تو کسی کو عزت اور نام کی خواہش اور سب سے بڑھ کر ہم زندگی سے خوشیاں کشید کرنے کے لیے ہر طرح کی تگ و دو میں مصروف۔ اس دوڑ میں رشتوں کو بھلاتے، ان سے ناتا توڑتے اور ہر احساس کو ختم کرتے، خودغرضی کا لبادہ اوڑھے اپنی دنیا کی خوب صورتی ختم کرتے، کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتے ہیں۔

کبھی کسی نے ان معصوم، نازک پھول کی مانند بچوں کو دیکھا ہے، جو اپنے ننھے ہاتھوں میں گجرے اور پھولوں کے ہار لیے، کہیں غبارے اور کھلونے لیے، کہیں ٹریفک سگنلز پر صفائی کا سامان لیے گاڑیوں کے پیچھے بھاگتے، جو اُن کے خوابوں ہی کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کہیں ہاتھوں میں کشکول لیے، پیوند کپڑوں میں ملبوس صدائیں دیتے، کہیں اپنے وجود سے بھاری اوزار اٹھائے ورک شاپوں، فیکٹریوں کے دھوؤں میں، کہیں چائے کے ڈھابوں پر اور کبھی بازاروں میں دس روپے کے رومال لیے، کبھی کسی گاڑی کے پیچھے بھاگتے اور کبھی کسی خاتون کا دامن پکڑے التجائیں کرتے ہوئے.... ''بی بی جی! صرف دس روپے کا رومال ہے''۔ ان کی آنکھوں کی التجائیں، ان کے لہجے کا کرب، ان کے دلوں میں چھپی حسرتوں کی موت، کبھی کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔ ہر سال عیدین کی خوشیوں میں ان کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے۔

پاکستان کو بنے 68 سال ہو چکے ہیں۔ ایسا ملک، جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا کہ جہاں سب آزادی سے زندگی گزار سکیں۔ سب کو ان کے حقوق ملیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ نوعمر بچے اپنے بنیادی اور تعلیمی حقوق سے محروم، مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔ بچوں کی مزدوری کی اہم وجہ غربت ہے۔ پاکستان میں 65 فی صد سے زیادہ لوگ غربت

کی لکیر کے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو مزدوری کے لیے بھیجنے پر مجبور ہیں تا کہ گھر کا چولہا ٹھنڈا نہ پڑے۔ آخری سروے، جو 1996 میں کیا گیا، اس میں بتایا گیا کہ ملک میں 33 لاکھ مزدور بچے ہیں۔ جب کہ گھروں اور فیکٹریوں میں 20 لاکھ سے زائد بچے، جن کی عمریں 6 سے 13 سال ہیں، زندگی کی مشقت سہتے ہیں اور کئی لاکھ بچے صرف بھیک کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ یہ مزدور بچے اس قدر بدنصیب ہیں کہ زیادہ مزدوری کرنے کے باوجود کم اجرت لینے پر مجبور ہیں۔ ان بچوں کو کام کے ساتھ ساتھ سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔ ان کی صحت، صفائی اور علاج کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان کے لیے کسی قسم کی قانون سازی بھی نہیں کی گئی۔

آج تک کسی بھی حکومت نے ٹھوس بنیادوں پر کوئی حکمت عملی مرتب نہیں کی اور نہ ہی معاشرے کے کسی طبقے کی طرف سے کوئی پیش رفت سامنے آتی ہے۔ حکم رانوں کے بلند و بانگ دعوے، بڑھکیں اور بہت سی این جی اوز، جو بچوں کے حقوق کی دعوے دار ہیں، نیند کی گولی کھا کر گہری نیند سو جاتی ہیں جب کہ یہ مزدور بچے کسی پارک یا فٹ پاتھ پر نیند کی گولی کھائے بغیر گہری نیند سو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کے دور میں غریب کو انسان ہونے یا جینے کا کوئی حق نہیں۔

ہم بے حس اور احساس سے عاری لوگ ہیں۔ ہم اس نبی ﷺ کے اُمّتی ہیں، جو محسنِ انسانیت کہلائے، جنہوں نے کردار میں رواداری، حُسنِ سلوک، حُسنِ اخلاق، ایثار، ہمدردی، محبت اور احساسِ انسانیت کو سب سے زیادہ فوقیت دی۔ کیا بحیثیت انسان ہم اپنے فرائض پورے کر رہے ہیں؟

ہماری صفوں میں کون ایسا وارثِ انبیائے کرام ہے، جو ان غریبوں کے ساتھ راتیں بسر کرتا ہے؟ آج کوئی ایسا دکھائی دیتا ہے، جو مٹی اور میل سے اَٹے ہاتھوں کو آگے بڑھ کر چومے اور اسوہِ نبی ﷺ کو زندہ کرے؟ کون ایسا وارثِ نبی ﷺ ہے، جو اپنے کسی ہمسائے، کسی رشتے دار یا کسی مزدور کی زندگی کی مشکلیں سمجھے اور اسے دلاسا دے؟ کون ہے، جو ناامیدیوں میں امید کی کرن دکھائے، مایوس دلوں کو سوکھے پتّوں کی طرح بکھرنے سے پہلے پانی سے سیراب کر دے؟

عیدالفطر کا موقع ہی ان یتیم، مزدور اور مفلوک الحال بچوں کے سروں پر، جو اپنی تنگ دستی کی وجہ سے خوشیوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور خواہشات کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جنہیں کوئی عیدی نہیں دیتا، جو اچھا لباس پہننے کو ترس جاتے ہیں، دستِ شفقت رکھنے کا نام ہے۔ عیدالفطر منانے کا حق انہیں ہے، جو اپنی خوشیوں میں غریبوں کو بھی شریک رکھتے ہیں۔ نمازِ عید سے قبل صدقہ وفطر کی ادائیگی بھی اسی لیے کی جاتی ہے تا کہ تنگ دست اور پریشان حال لوگ بھی عید کی مسرتوں میں شامل ہو سکیں۔ اگر آپ اپنے بچوں کے لیے عید کی خریداری کر رہے ہیں تو کوشش کریں کہ کسی غریب یا یتیم کے لیے بھی کچھ خرید کر انہیں ان خوشیوں میں شامل کر لیں۔ مگر ہم اپنی زندگیوں میں، اس کی خوشیاں سمیٹتے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اردگرد کتنے ایسے خوشیوں اور مسرتوں سے محروم لوگ ہیں، جنہیں ہماری ضرورت

ہے۔ کیا ہم ان فرائض کو پورا کر رہے ہیں، جو بحیثیتِ انسان ہم پہ عائد ہوتے ہیں؟

ہمیں جینے کا حق ہے کیوں کہ ہماری زندگی مسرتوں اور خوشیوں سے لب ریز ہے اور ان لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں، جو اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ ایک جدوجہد اور مشقت میں گزار رہے ہیں۔ یہ زندگی ان کا اپنا انتخاب نہیں، یہ وہ زندگی ہے جو معاشرے کی ناہمواریوں اور بے ہنگم نظام کی دین ہے، جس نے ان سے جینے کا حق چھین لیا ہے۔ ہم اپنے احساسِ محبت اور رواداری سے انہیں ان کے جینے کا حق دے سکتے ہیں اگر یہ معاشرہ اور اس کے افراد زندگی کے اس نصب العین کو اپنا لیں کہ ہمیں سب کو برابری کی نظر سے دیکھنا اور ان کے حقوق کی ادائیگی کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

سودا

دریچے سے چھن چھن کر آتی چاند کی روشنی کمرے کے نیم تاریک ماحول میں اجالے کا تاثر پیدا کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ کرسی پر دراز اس کا خاموش وجود کسی گہری سوچ میں ڈوبا اس کی افسردگی نمایاں کر رہا تھا۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی، گزشتہ کئی سالوں سے اس کے ساتھ اسی طرح ہوتا آ رہا تھا۔ ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی اسے قربانی کے جانور کی طرح سجا کر اور ہدایات دے کر ایسے ناقدرے انسانوں کے سامنے پیش کیا گیا، جو اسے اپنے بے لاگ تبصروں کی کند چھری سے ذبح کر رہے تھے۔ وہ خالی الذہن اور بے جان روح کی طرح ان کے درمیان بیٹھی اپنی ذات کی نفی ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ خواتین کبھی بسکٹوں اور کبابوں پر ہاتھ صاف کرتیں اور کبھی سموسا اٹھا کر پلیٹ میں ڈالتیں اور سوال کرتیں۔

آپ کی بیٹی کی عمر کتنی ہے؟ دیکھنے میں تو 26، 27 سال کی لگ رہی ہے۔ رنگ کچھ دبتا ہوا سا ہے۔ میرے بیٹے کی پہلی ڈیمانڈ ہی یہی ہے کہ لڑکی خوب صورت ہونی چاہیے۔ میرا بیٹا تو ماشاءاللہ بہت گورا ہے۔ ویسے تو سب صورتیں اللہ نے بنائی ہیں۔

تبصرے کے ساتھ اپنی بات کا بھرم رکھنے کے لیے لوگ کیسے اللہ کا سہارا لیتے ہیں؟ وہ بس سوچ کر رہ گئی اور اس بار بھی پھانسی کے منتظر قیدی کی طرح ثمرین کے گھر والے انتظار کی سولی پر لٹکا دیے گئے۔ اس آزمائش سے گزرنے کے بعد اور گھر میں سب کی نظروں سے بچنے کے لیے وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیتی۔ کس بات کی کمی ہے؟ وہ آئینے سے سوال کرتی۔ میرے ہاتھ خالی تو نہیں ہیں۔ تعلیم کا ہنر اور گھر داری کا سلیقہ ہے۔ اس خالق کائنات کے تمام فرائض ادا کرتی ہوں۔ کیا کم صورت ہونا میرا جرم ہے؟

اسے شاید دنیا والوں کی نظروں سے اپنے آپ کو دیکھنا نہیں آتا تھا تبھی آئینہ اسے بہلا دیتا اور وہ پھر سے خواب بننے لگتی اور پھر سے نئی آزمائش کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

کبھی وہ سوچتی، اس کے ذہن میں بھی تو سوال اٹھتے ہیں۔ کیا کبھی اسے یہ حق ملے گا کہ وہ بھی ان لوگوں سے جواب مانگ سکے، جو اسے مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا کر کے ناکردہ جرم کی سزا اس کے نصیب میں لکھ دیتے ہیں۔ وہ بھی کبھی ان سے پوچھے، جب آپ کے سامنے، آپ کی بیٹی میں موجود ذات کی خامیاں بتائی جاتی ہیں تب شاید آپ کو خیال آتا ہو کہ اس جرم کا ارتکاب آپ نے بھی کیا تھا۔ کسی کی آنکھوں کے خواب توڑے تھے؟ کسی کی بیٹی کی ہنسی چھین کر اسے آنسوؤں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا؟ مگر ہر بار وہ یہ سوچ کر رہ جاتی۔

ثمرین کو کئی دنوں سے گھر والوں کے رویے میں پُراسراریت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آپس میں بات چیت کر رہے ہوتے اور اسے دیکھتے ہی خاموش ہو جاتے۔ وہ کچھ سمجھ نہ پاتی۔ کچھ دنوں سے وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ اس کے بھائی آذر کا رویہ بھی کچھ بدلا ہوا ہے۔ وہ اس سے پہلے کی طرح مذاق نہیں کرتا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آتی تو آذر اٹھ کر چلا جاتا۔ وہ کوئی بات کرنے کی کوشش کرتی تو مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ وہ اس کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بہت حسّاس ہو گئی تھی۔ ہر ایک بات کے بارے میں سوچ کر گھنٹوں اداس رہتی اور کبھی کبھی آنسوؤں سے رو کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی۔ مگر وہ اس ساری صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ جانے اب زندگی اس کا اور کیا امتحان لینے والی تھی؟

اس دن کچن میں جاتے ہوئے امی کے کمرے سے آنے والی آوازوں نے اسے معاملے کی تہ تک پہنچا دیا۔ کمرے میں امی، ابو کے علاوہ بڑے بھائی اور بھابھی بھی موجود تھے۔ ہمیں ان کی بات مان لینی چاہیے۔ رشتہ اچھا ہے۔ امی کہہ رہی تھیں۔ میں ادلے بدلے کا رشتہ کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ صرف اپنے مفاد کا سوچ رہے ہیں۔ ایسے رشتے قائم نہیں رہتے۔ ابو کی آواز آئی۔

اسے یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ لڑکے والے اس شرط کے ساتھ ثمرین کا رشتہ قبول کرنے کو تیار تھے کہ وہ ان کی قبول صورت بیٹی کو اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹے سے بیاہ دیتے۔ اس انکشاف نے اسے لرزا دیا۔ وہ اس قدر بے مایہ تھی کہ اس کے خوب رو بھائی کو اس کے لیے قربانی دینی پڑے۔ اپنے خوابوں کو چکنا چور کرنا پڑے۔ آذر اپنی کولیگ کے رشتے کے لیے ماں باپ سے بات کر چکا تھا اور اب وہی گھر والے اسے قربانی دینے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ اپنے کمرے کی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی، اپنی سوچوں کو کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے وہ بہت پُرسکون تھی۔ اس نے کچھ سوال اٹھائے تھے؟ مجبوری کے رشتے میں بندھے یہ بندھن کب دل سے نبھائے جا سکتے ہیں؟ کیا رشتوں میں محبت اور اپنائیت کے بجائے اب صرف سودے ہوا کریں گے؟

اپنے مفاد کے سودے، کسی کے خواب توڑنے کے سودے، اُن نازک کانچ کی مانند بیٹیوں کے جذبات کے سودے، خدارا! کسی کی بیٹی کی آنکھوں میں بسے خوابوں کو رنگوں سے بھر دیں۔ کل کوئی آپ کی بیٹی کے خوابوں کی تکمیل

کرے گا پھر شاید یہ معاشرہ ایک مثبت سوچ اور ایک نئی راہ پر گام زن ہو سکے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے وہ بہت پُرسکون تھی۔ اسے یہ سودا منظور نہیں تھا۔ ایک لمحے کو اسے لگا، وہ جدوجہد سے بھاگ رہی ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ کہیں شاید امید کی کرن ملے۔ وہ گھر والوں کو اپنے احساس اور سوچ سے آگاہ کر سکے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جلد یا بدیر، اسے ان کے فیصلے پر سر جھکانا پڑے گا۔ تب شاید وہ اپنے بھائی کے خوابوں کو روندنے کی مجرم ٹھہرے۔ ممکن ہے اس کی قربانی کی مثال اور اس کی تحریر سے معاشرے کے افراد کے رویے اور ذہن بدل جائیں۔

اپنی اس تحریر کو اخبار کے ادبی ایڈیشن کے پتے پر ارسال کر کے اس نے موت کی آغوش میں پناہ لے لی۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

دیا خان بلوچ

دیا خان بلوچ کا تعلق پنجاب کے شہر احمد پور شرقیہ سے ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے۔ 2016 سے باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا ہے۔ رائٹرز کلب سے تعلق تقریباً 2 برس پرانا ہے۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ ماڈل یا رول ماڈل

2۔ نوجوان خودکشی کیوں کرتے ہیں

3۔ خوف الٰہی ہی عین عبادت ہے

4۔ دعا.... آنسوؤں میں کِھلا پھول

5۔ الفاظ کی اہمیت

☆.....☆.....☆

ماڈل یا رول ماڈل

مجھے اکثر و بیش تر ایک ہی بات سننے کو ملتی ہے کہ ''بچے ہماری بات نہیں سنتے، آپ ہی سمجھائیں ناں''۔ اور جب بے چاری استانی ان سے ذرا سختی سے پیش آئے تو آپ خود ہی شکایت لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ ایک وقت تھا، جب ہم اپنے اساتذہ کی دل و جان سے عزت کیا کرتے تھے اور ان کے ایک بار کہے پر ایسے عمل کرتے تھے جیسے اگر نہ کیا تو جانے کیا ہو جائے گا حالاں کہ ہمارے استاد بھی بہت اچھے ہوا کرتے تھے اور ہماری غلطی معاف کر دیا کرتے تھے۔ ان کی ان عادتوں کی وجہ سے ہم ہمیشہ ان کی بات مانا کرتے تھے، کبھی ان کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب، جب کہ ہم نے خود استاد کی کرسی سنبھال لی ہے، ان ساری چیزوں کو ناپید پایا ہے جن کی وجہ سے ہم نے معلّمہ کے شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ آج کے استاد کی ذمے داری تو یہ ہے کہ وہ طلبا کی ہر بری بات کو برداشت کرے، چاہے وہ جیسے بات کریں، آپ انہیں کچھ نہ کہیں کہ آپ کی شکایت ہو جائے گی۔

اسکول میں کوئی تقریب ہو تو ان کا کام صرف یہ ہے کہ سج سنور کر کھڑی ہوں اور اسکول کو سجائیں، جو کام مردوں کے کرنے کے ہیں، وہ بھی خود سر انجام دیں اور مرد صرف تماشائی بنے دیکھتے رہیں۔ یہ سب کریں گی تو آپ بہت ایکٹیو ہیں۔ لیکن یہ کہاں کے اصول ہیں؟ کیا ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ ہم اس طرح کے کام کریں۔ ہمیں آنے والی نسلوں کو سنوارنا ہے اور اگر ہم خود ہی سیدھی راہ پر نہیں چل رہے تو ان کی رہنمائی کس طرح کر سکتے ہیں؟ جب آپ انہیں یہ سکھا رہے ہیں کہ ٹیچر وہ ہے جس کے بال کھلے ہوں، چہرہ میک اپ سے سجا ہو اور مغربی لباس پہنے، حجاب اور دوپٹے کا نام و نشاں نہ ہو، تو خود ہی بتائیے کہ نسل بگڑے گی یا سنورے گی؟ آپ ٹیچر ہیں یا ماڈل؟ اس کا فیصلہ آپ کو خود کرنا ہے۔ بچے ہم سے اسی طرح بات کریں گے جس طرح کا رویہ ہم ان سے روا رکھیں گے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہماری نسل بگڑ رہی ہے۔ جب اس بگاڑ کی وجہ ہم خود ہیں تو دوسروں کو کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

ہم جب تک برائی کو اس کی جڑ سے ختم نہیں کریں گے تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ معاشرہ سدھر جائے گا۔ کس طرح ترقی و کامیابی حاصل ہوگی۔ کس طرح ہمارے چھوٹے، اپنے بڑوں کی عزت کیا کریں گے، ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا کریں گے۔ کس طرح سے ان میں محمد بن قاسم اور صلاح الدین ایوبی والی صفات پیدا ہوں گی۔ سوچیں....اور غور کریں، تب کہیں جا کر کوئی راستہ دکھائی دے گا۔ پتا چلے گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، کیوں یہ نوجوان نسل تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے؟

سوچنا ہے اور پھر عمل کرنا ہے۔ یہ جو شکوہ ہے ناں کہ عزت نہیں، احترام نہیں۔ یہ سب شکوے خود بخود دم توڑ جائیں گے۔ ان سارے سوالات کے جواب مل جائیں گے۔ صرف ایک بار قدم بڑھائیں پھر دیکھیں کہ کامیابی کس طرح آپ کے قدم چومتی ہے۔ بارش کا پہلا قطرہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اگر ہم خود ہی بارش کا پہلا قطرہ بن جائیں تو کیا بات ہے۔ ہاں محنت ہوگی، جان جلے گی پر آنے والی نسلیں گم راہی سے بچ جائیں گی۔ یہ جو اُن کو ہم سے شکوے ہیں کہ کیا دیا ہے؟ یا پھر یہ کہ جو دیا ہے وہ لوٹا رہے ہیں، تو یہ ختم ہو جائیں گے۔ کوشش ہمیں ہی کرنی ہے اور پھر دیکھنا ہے کہ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں ماڈل بننا ہے یا رول ماڈل؟

☆.....☆.....☆

نوجوان خودکشی کیوں کرتے ہیں؟

ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیوں ہو گیا مجھ سے؟ وہ اپنا سر تھامے آئینے کے سامنے کھڑا خود سے ایک ہی سوال کر رہا تھا۔ ہر بار جواب وہی ہوتا، شب و روز کی محنت کا نتیجہ زیرو تھا۔ وہ میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ میں فیل ہو چکا تھا۔ والدین کی امیدوں کا چراغ، ان کی جھوٹی عزت و وقار کو بچاتے بچاتے وہ تھک گیا تھا۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا، فرار کا راستہ۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی خفیہ دراز کا لاک کھولا اور گن نکال کر لوڈ کی۔ ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آیا کہ شاید میں غلط کر رہا ہوں لیکن اگلے ہی پل وہ سب اس کے ذہن میں گونج رہا تھا، جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس بار اس کا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا، گولی کی آواز نے پھیلے سکوت کو توڑ دیا۔ کمرے میں خون پھیلتا جا رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب سب امتحان ختم ہو گئے ہیں لیکن درحقیقت ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

زندگی اور موت دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی زندگی خود ختم کرتا ہے تو وہ جان لے کہ وہ ناقابل معافی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ آج یہ مرض بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ہماری نوجوان نسل اس طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی ہے۔ جب بھی کسی ایسے معاملے کی تحقیق کی جاتی ہے تو بہت معمولی سی وجہ سے سامنے آتی ہے اور دیکھنے اور سننے والا افسوس کرتا رہ جاتا ہے۔ کاش! اس سے پہلے یہ خبر مل جاتی تو ایسا نہ ہوتا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

خودکُشی کے حوالے سے جب ایک سروے کیا گیا تو بہت سی آراء سامنے آئیں۔ خودکشی کسی بھی مسئلے کا حل نہیں، اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے مرجانے سے آپ کے سارے مسائل ختم ہو جائیں گے تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ خودکشی مایوسی کی انتہا ہے، جب آپ ہر طرف سے مایوس ہوں اور کوئی بھی روزن نہ ملتا ہو تب ایک ہی راستہ نظر آتا ہے اور وہ ہے خود کو ختم کرنے کا۔ تنہائی بھی خودکشی کی بہت بڑی وجہ ہے، جب ہم تنہا ہوتے

ہیں تو بہت سی ایسی باتیں سوچتے ہیں جو اکثر ڈپریشن کی طرف لے جاتی ہیں اور جس کا نتیجہ خودکشی کی صورت میں نکلتا ہے۔ وقت کی کمی، والدین کا بچوں کے ساتھ وقت نہ گزارنا، ان کی ذہنی کیفیت کو نہ سمجھنا، ان سے دور رہنا اور پیار و محبت کی کمی۔ یہ سب معاملات نوجوانوں کو خودکشی کی طرف لے جانے والے اسباب ہیں۔ ہمیشہ کوشش کریں کہ کسی کی دل آزاری نہ کریں کیوں کہ آپ نہیں جانتے کہ آپ کی ایک چھوٹی سی بات آپ کے کسی بہت پیارے کو اتنی تکلیف دے سکتی ہے کہ وہ مایوسی کی جانب قدم بڑھا دے۔

ہم اکثر سنتے ہیں، ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے'' لیکن ایسا صرف کہنے کی حد تک ہے۔ خاموشی....ایک طویل خاموشی، جو آپ کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی ہوتی ہے۔ ایک لاوا، جو اندر ہی اندر پک رہا ہوتا ہے، جب ایک دم پھٹتا ہے تو اپنے ساتھ بہت تباہی لاتا ہے، یہاں تک کہ خودکشی کی بھی وجہ بنتا ہے۔ ذرا غور کیا جائے تو خودکشی کی بیش تر وجوہ ہماری اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں، ہمارا معاشرتی رویہ اس طرف لے جاتا ہے۔ ہمیں اپنے آس پاس کی خبر نہیں۔ اپنے گرد و نواح کی خبر رکھیں، کیا پتا کوئی ہمارا منتظر ہو، جس کے لیے ہم امید کا دیا ہوں۔ زندگی کو آسان بنائیے، اپنی بھی اور دوسروں کی بھی، سادگی اپنائیے۔

کہیں محبت میں ناکامی اس راستے پہ لے جاتی ہے تو کہیں تنہائی اور ڈپریشن۔ کہیں اداسی اس راہ پہ لے جاتی ہے۔ میرا سوال صرف اتنا سا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ اس لیے دیا کہ وہ خود کو اس طرح فنا کر دے؟ ان مسائل پہ دل برداشتہ ہو کر اپنی جان لے لے، جن کا مناسب حل نکالا جا سکتا ہے، کیوں کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل نہ ہو۔ بے شک اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ غم یا دکھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں الفاظ کے پیرہن میں بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ان غموں کو بھلا کر، امید کی شمع جلا کر، ایک نئی منزل تو تلاش کی جا سکتی ہے اور یہ قابلیت اللہ نے ہر انسان کو دی ہے جس کے پاس دماغ ہے۔ اس کی سوچ کو وسعت دی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم صرف تقلید ہی کریں؟ کیوں نہ ہم سب کے لیے مشعل راہ بن جائیں، ایسے کہ جو نئے راستوں پہ چلیں اور نئی نئی منزلیں دریافت کر لیں۔ زندگی نعمت ہے، اس کی قدر کریں۔ ان سے پوچھیں، جو نہ جانے کتنی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہیں، ہر ڈھلتا سورج ان کو زندگی سے دور کرتا جا رہا ہوتا ہے، تو کیا اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کی خاطر وہ بھی خودکشی کر لیں؟ نہیں....وہ ایسا بالکل نہیں کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی رضا پہ راضی ہیں۔ محبت بانٹیں، پیار بانٹیں۔ اس معاشرے کو تعمیر کرنے والے ہم ہی ہیں، یہی ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ بہادری تو اسی میں ہے کہ ہر طرح کے مسائل اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ دیکھنے والے پہلے تو ہنسیں گے، ڈرائیں گے لیکن بالآخر حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لیں۔

☆.....☆.....☆

خوف الٰہی ہی عین عبادت ہے

کسی بھی کام کو مکمل توجہ اور خلوص کے ساتھ کیا جائے، تب ہی اسے اچھے طریقے سے نبھایا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر کسی کام کو بددلی اور لاپروائی کے ساتھ کیا جائے یا اس میں عدم دلچسپی ہو تو اسے کرنے کا لطف بھی نہیں آتا اور نہ ہی اسے اَحسن طریقے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے نتائج بھی ہماری منشاء کے مطابق نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اتنا ہی پھل ملتا ہے جتنی ہم اس کے لیے محنت کرتے اور وقت دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح عبادت میں تقویٰ، اخلاص اور خشیت الٰہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عبادت صرف اللہ کے لیے ہے، یہ جتنے خلوص سے کی جائے، اس کا فائدہ ہماری سوچ سے بڑھ کر ملتا ہے۔ سب سے بڑا انعام اس پاک ذات کا قرب حاصل ہونا ہے، جو تمام دنیا کا خالق و مالک ہے۔

تقویٰ بڑی اونچی اور بیش بہا صفت ہے اور ساری مطلوبہ صفات کی جامع بھی۔ جو تقویٰ کی صفت رکھتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیوں کی ضمانت دی ہے۔ تقویٰ، وہ چیز ہے جس سے ہر مشکل سے نکلنے کا راستہ ملتا ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری ہے اور پرہیزگاری ہمیں جنت کے راستے کی طرف لے جاتی ہے۔

تقویٰ، قلب و روح، شعور و آگہی، عزم و ارادے، ضبط و نظم اور عمل و کردار کی اس قوت اور استعداد کا نام ہے جس کے بل پر ہم ہر اس چیز سے رک جائیں جو غلط ہو اور اس چیز پر جم جائیں جو صحیح ہو۔ تقویٰ، غیب پر ایمان کا نام ہے۔ ہم نے اکثر و بیش تر پڑھا کہ جھوٹ بولنے سے زبان آگ میں جل جاتی ہے۔ اس آگ کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں کیوں کہ یہ ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن ہم جھوٹ بولنا چھوڑ دیتے ہیں، صرف اس لیے کہ اس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ یہی تقویٰ ہے، خشیتِ الٰہی ہے۔ اس بات پر یقین رکھنا کہ ہم جو بھی غلط کام کریں گے اس کی سزا بہر طور ملنی ہے۔

اس سزا سے بچنے کے لیے غلط راستے کو چھوڑ دینا ہی تقویٰ کہلاتا ہے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضورﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ سب انسانی اعمال کا دارومدار صرف نیتوں پر ہے۔ (بخاری) یعنی ہر کام کو کرنے میں نیت کا خالص ہونا ضروری ہے۔ نیت میں اخلاص ہوگا تو اس کا انعام بھی بہت زیادہ ملے گا۔ خالی عمل سے کچھ نہیں ملتا۔

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ ہر اچھا کام یا کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ صرف اس لیے کیا جائے کہ ہمارا خالق و پروردگار ہم سے راضی ہو، ہم پر رحمت فرمائے۔ اخلاص کا تعلق دل سے ہے، جس کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اخلاص کو عمل میں اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ جس طرح تعمیر، اساس کے بغیر اور جسم سر کے بغیر بے کار ہے، اسی طرح اعمال اخلاص کے بغیر بے کار ہیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ جب انہیں یمن کی جانب بھیجا جا رہا تھا تو انہوں نے آپﷺ سے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسولﷺ! مجھے نصیحت کیجیے''۔ تو آپﷺ نے فرمایا: ''دین میں (یعنی دین کے اعمال میں) اخلاص پیدا کرو، تھوڑا عمل بھی کافی ہو جائے گا''۔

خشیتِ الٰہی سے مراد اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے یعنی ہر کام کو کرنے سے پہلے یہ سوچنا کہ کہیں اس سے ہمارا رب ناراض تو نہیں ہو جائے گا؟ کہیں ہم اس کے ناپسندیدہ بندوں میں تو شامل نہیں ہو رہے؟ اس کی رضا بہت ضروری ہے۔ اللہ کا خوف ہوگا تو کوئی بھی غلط کام نہیں ہوگا۔ جب اس بات پر یقین کامل ہو کہ اللہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو ہر برائی کرنے سے پہلے ہم سوچیں گے۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور ہمارا رب ہماری فطرت بخوبی جانتا ہے۔ اس لیے ربِ کائنات نے ہمارے لیے معافی کا در کھلا رکھا ہے۔ ایک بار توبہ کرنے بعد اگلی بار گناہ کرنے سے پہلے ہمیں اللہ سے حیا آتی ہے اور اس کے روٹھ جانے کا ڈر بھی ہوتا ہے، جو ہمیں گناہ کی طرف بڑھنے سے روک دیتا ہے۔

خالص عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اس میں کسی قسم کی نمود و نمائش کی جائے تو اخلاص نہیں رہتا۔ ایسی عبادت صرف دکھاوا ہے، جس کا دنیاوی فائدہ تو ہے لیکن آخروی فائدہ کوئی نہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ ایک دوسرے کو اپنی نمازوں، صدقہ و خیرات، روزوں اور نوافل جتاتے ہیں۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق عبادت کرتا ہے، کوئی کم تو کوئی زیادہ۔ یاد رکھیں! عبادت وہی مقبول و قبول ہوگی جس میں تقویٰ، اخلاص اور خشیتِ الٰہی شامل ہو۔ اگر عبادت شہرت، دکھاوے یا کسی اور مقصد کے تحت کی جائے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

جس طرح ہمیں اپنے کسی ساتھی کے بارے میں علم ہو جائے کہ وہ ہمارے ساتھ مخلص نہیں تو ہم اس کے ساتھ رابطہ رکھنا نہیں چاہیں گے۔ یہ تو ایک چھوٹی سی دنیاوی مثال ہے لیکن بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی ہماری ان عبادتوں کی کوئی ضرورت نہیں جن میں دکھاوا ہو۔ عبادت میں اخلاص تو یہ ہے کہ اِدھر اذان ہو اور اُدھر ہم سب کام چھوڑ کر اپنے رب کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فوراً لبیک کہیں۔ تقویٰ تو یہ ہے کہ اپنے نفس کو مار دیا جائے، اپنی سوچ کو

پاکیزہ رکھا جائے، اپنے ہر عمل کو اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔ عبادت صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا وہ عمل نہیں جنہیں سب دیکھ سکتے ہوں۔ عبادت تو والدین کو پیار سے مسکرا کر دیکھنا بھی ہے، ان سے اچھا سلوک بھی عبادت ہے۔

عبادت دو طرح کی ہیں، ایک فرض عبادت اور ایک نفل عبادت۔ دونوں طرح کی عبادتوں میں تقویٰ، اخلاص اور خشیتِ الٰہی اوّلین ترجیح ہے۔ الغرض عبادت میں تقویٰ، اخلاص اور خشیت الٰہی کا ہونا لازم ہے۔

☆.....☆.....☆

دعا....آنسوؤں میں کِھلا پھول

آج کل اکثر سننے میں آرہا ہے کہ جی! ہم دعا کیوں کریں؟ ملنا تو وہی ہے جو نصیب میں پہلے سے لکھا ہے۔ جب کہ دعا تو ہمارے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ دعا ہی وہ عمل ہے، جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے، آنسوؤں کو ہنسی میں بدلتا ہے۔ دلوں کو سکون کس چیز سے حاصل ہوتا ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے، دعا۔

زندگی ہر روز نیا امتحان لیتی ہے۔ جب ہم کسی الجھن کا شکار ہوتے ہیں اور ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں تو دعا ہی وہ واحد ذریعہ بنتی ہے جو الجھنوں کے حل نکالتی ہے اور دل کو بے چینی کے چنگل سے آزاد کرواتی ہے۔ دعا، آنسوؤں میں کِھلا پھول ہے کہ جس کے کھلنے سے چاروں طرف بہار آجاتی ہے۔ جب غموں کی برسات ہوتی ہے تو دعا کی بدولت خوشیاں گھر کی چوکھٹ پہ آبیٹھتی ہیں اور ہر سو خوشیوں کے پھول کھل جاتے ہیں۔ ناامیدی، اداسی لمحوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ شرط بس ایک ہے کہ دعا مانگو تو کامل یقین کے ساتھ اور پھر اللہ تعالی کی رحمتوں کا نزول دیکھو۔

دعا، مقدر کا لکھا بدل دینے کی قدرت رکھتی ہے۔ کبھی کبھی ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے قبول ہونے کا وقت وہ نہیں ہوتا جب ہم مانگ رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تو ہمارے لیے بہتر ہی کرتا ہے، صرف ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دعا، ایک امید ہے، اندھیرے میں روشنی کی کرن ہے۔ دکھوں اور تکلیفوں سے نجات پانے کا واحد ذریعہ دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم ہم سے دعا مانگتے رہو، ہم تمہاری دعاؤں کو قبول کریں گے''۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ''دعا مانگنا عبادت کا سر اور مغز ہے۔ مسلمانوں کا ہتھیار اور دین کا ستون ہے اور آسمان وزمین کا نور ہے''۔ اور فرمایا، ''تم لوگ دعا مانگنے میں کمی نہ کیا کرو کیوں کہ دعا مانگتے ہوئے کوئی برباد نہیں ہوتا۔ دعا مانگنے والے کو تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور مل جاتی ہے۔ پہلی یہ کہ اس کی مصیبتیں ٹالنے کے کام آجاتی ہے۔

دوسرے، جو چیز مانگی ہے وہ اسی وقت مل جائے۔ تیسرے، قیامت کے روز اس کا بدلہ ملے''۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو بے حد نعمتیں عطا فرمائے گا۔ وہ بندے کہیں گے، اے ہمارے پروردگار! ہم کو یہ بے شمار نعمتیں کس عمل کے بدلے میں دی ہیں؟ ارشاد ہوگا کہ یہ نعمتیں تمہاری ان دعاؤں کا بدلہ ہے، جن کو ہم نے تمہارے ہی فائدے کے لیے دنیا میں قبول نہیں کیا تھا''۔ پس ثابت ہوا کہ دنیا اور آخرت میں بھی فائدہ صرف دعا مانگنے کی بِنا پر ہوگا۔

دعا مانگنے کے آداب:

حلال مال سے کھانا، پینا اور پہننا۔ دل لگا کر اور اللہ تعالیٰ سے مکمل یقین اور یکسوئی سے مانگنا۔ پاک صاف ہو کر مانگنا۔ کعبے شریف کی طرف منہ کر کے مانگنا۔ نماز کی طرح بیٹھ کر، دعا سے پہلے اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنا اور درود شریف پڑھنا۔ دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھانا۔ دعا مانگتے ہوئے آسمان کی طرف نہ دیکھنا۔ آہستہ آواز سے مانگنا۔ دوسروں کو نہ سنانا۔

دعا قبول ہونے کے اوقات:

اللہ تعالیٰ نے ہم عاجز بندوں پر بڑی مہربانی فرمائی ہے۔ ہر وقت، ہر حالت میں اور ہر جگہ ہم کو دعا مانگنے اور بارگاہِ عالیہ میں درخواست پیش کرنے کی اجازت دی ہے۔ تاہم، درجِ ذیل اوقات میں خاص درجے کی برکت اور قبولیت زیادہ ہے۔

☆ اذان اور جماعت ہونے کے درمیانی وقفے میں دعا مانگنا۔
☆ بارش کے وقت۔
☆ فرض نمازوں کے بعد۔
☆ تلاوتِ قرآن کے بعد۔
☆ جمعے کے دن کی ایک خاص گھڑی۔
☆ ہر رات کی ایک مخصوص ساعت۔
☆ آبِ زم زم پیتے ہوئے۔
☆ سفر کی حالت میں۔
☆ بیماری کی حالت میں۔
☆ زوال کے وقت۔
☆ مصیبت اور پریشانی کے وقت۔
☆ سجدے میں مانگتے ہوئے۔

☆عرفات کے میدان میں۔
☆ کعبے شریف کی زیارت کے وقت۔
☆طواف کرنے کے وقت۔
☆ حجرِ اسود کی زیارت کے وقت۔
دعا مانگ کر مایوس یا ناامید نہیں ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندے کی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے بشرط یہ کہ کسی گناہ یا قطع تعلق کی دعا نہ کرے اور جلد بازی سے کام نہ لے''۔

لوگوں نے پوچھا، ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جلد بازی کا کیا مطلب ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دعا کرنے والا سوچنے لگتا ہے کہ میں نے بہت دعا کی لیکن قبول نہیں ہوئی۔ پس وہ تھک جاتا ہے اور دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے''۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالی حیادار اور سخی ہے، جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتا ہے تو ناکام اور خالی ہاتھ لوٹانے سے اسے شرم آتی ہے''۔ یعنی اللہ تعالی دعا کسی نہ کسی شکل میں قبول ضرور کرتا ہے۔

دعا مانگنا فرض ہے اور جب بھی دعا مانگیں تو اس یقین کے ساتھ مانگیں کہ اللہ تعالی کبھی ہماری دعا رد نہیں کرے گا۔ اس بابرکت ذات پہ پختہ یقین اور بھروسا ہی ہماری ترقی و کامیابی کا راز ہے اور اس کا بہترین ذریعہ دعا ہے۔ دعا کو اپنی زندگی کا اہم جز بنا لیجیے، ان شاءاللہ زندگی پھول کی مانند مہکنے لگے گی۔

☆.....☆.....☆

الفاظ کی اہمیت

کیا الفاظ کے بغیر زندگی گزاری جاسکتی ہے؟ آپ کا جواب یقیناً 'نہیں' ہوگا کیوں کہ الفاظ کے بِنا ہم کچھ بھی نہیں۔ ہماری زندگی میں رونق ان ہی کی بدولت ہے۔ جب ہمیں کچھ کہنا ہو، لکھنا ہو یا کچھ سمجھنا، سمجھانا ہو تو ہم الفاظ ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ ہماری خوشی اور غمی کے ترجمان ہیں۔ ان کے ہونے سے روشنی اور نہ ہونے سے اندھیرا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر انسان الفاظ کا استعمال اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق کرتا ہے۔ کوئی غلط انداز میں اور کوئی صحیح انداز میں، اب اس کے بغیر گزارا بھی تو نہیں ناں۔

ہر جذبے کو زبان چاہیے ہوتی ہے اور زبان بھی الفاظ کے ذریعے ہی ملتی ہے۔ اظہار، محبت کا ہو یا نفرت کا، ذکر وصل کا ہو یا ہجر کا، ہم الفاظ ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ الفاظ ہماری شخصیت کا آئینہ ہیں۔ ہماری سوچ، ہماری تربیت، ہماری تعلیم اور ہمارا پیشہ، سب ان ہی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کو سہل بنانا چاہتے ہیں تو لفظوں کو ناپ تول کر استعمال کریں۔ یہ الفاظ دیکھنے میں جتنے بے ضرر سے لگتے ہیں، اتنے ہیں نہیں۔ ان کی کاٹ بہت تیز ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کاٹ سے خود کو بچایا جائے اور دوسروں کو بھی محفوظ رکھا جائے۔

لفظ دعا بھی ہے اور بد دعا بھی۔ الفاظ کی ذرا سی ترتیب بدلنے سے بھی بہت اثر ہوتا ہے، اس لیے ان کے بے دھڑک استعمال سے بچنا اور سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے تاکہ یہ اپنی اہمیت نہ کھو دیں۔ کبھی کبھی ہم لفظوں سے زیادتی بھی کر جاتے ہیں یعنی انہیں ہم ان لوگوں پہ استعمال کرتے ہیں جو اُن کے اہل نہیں ہوتے۔ ہم اَن جانے میں ایسی غلطی کر جاتے ہیں۔ اب ہمیں اپنی اس غلطی کو سدھارنا ہے۔

بظاہر یہ بات بہت عام سی محسوس ہوتی ہے کہ لفظوں کی کیا اہمیت ہے؟ ہم ان کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ درحقیقت لفظوں ہی کی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ ایک بہتی ناؤ کی مانند ہیں جو چلتے رہی تو زندگی سے بھرپور ہے اور اگر

رک جائے تو زندگی کا کارواں بھی رک سا جاتا ہے۔ رکی رکی سی زندگی بہت بے معنی اور فضول لگتی ہے۔ لیکن اگر اسی زندگی کو لفظوں کی خوب صورت ڈور سے سجایا جائے تو ہر طرف اجالا ہو جاتا ہے۔ چند لمحے پہلے جو چیز اپنی اہمیت کھو چکی ہوتی ہے، اگر اسی کو چند لمحوں بعد دل کش لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک ادیب کے لیے اس کی تحریر اس وقت تک جان دار نہیں ہوتی جب تک کہ اسے قاری کے تند و تیز یا ستائش کے چند لفظوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اچھی تربیت کے لیے اچھے الفاظ کا ہونا ضروری ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ایک مہذب معاشرہ ہو لیکن ہم اسے عملی جامہ نہیں پہناتے۔ ہمیں سب سے پہلے اپنے الفاظ کو سنوارنا ہوگا، تب کہیں جا کر یہ معاشرہ سلجھے گا۔ معاشرے کو اچھا اور برا بنانے والے، میں اور آپ ہی ہیں۔ اچھے الفاظ کا استعمال ہوگا تو سوچ بھی اچھی پروان چڑھے گی۔ بہت سے مسائل تو چٹکیوں میں حل ہو جایا کریں گے۔

اب معاشرہ بہت بدل چکا ہے۔ ہم بھی کافی حد تک بدل گئے ہیں، ہماری ترجیحات اب وہ نہیں رہیں، جواب سے چند برس پہلے ہوا کرتی تھیں۔ اب مشینی دور ہے، سب کچھ منٹوں میں طے پا جاتا ہے، آپ چاہے دنیا کے کسی کونے میں ہوں۔ اس جمودی کیفیت سے نکلنے کی وجہ یہی الفاظ بنتے ہیں۔ کسی کے پورے دن کی تھکن ایک اچھے سے جملے سے ختم ہو جاتی ہے اور کسی کے لیے اپنائیت کے دو لفظ بھی خاص ہوتے ہیں۔

الفاظ کی بدولت ہی کسی کو اپنایا، سنوارا اور بگاڑا جا سکتا ہے۔ ملازمت کے پہلے دن اگر افسر یا اپنے کسی ساتھی سے داد کے چند الفاظ سننے کو مل جائیں تو آپ خود میں ایک نئی تحریک اور لگن پاتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی ڈھیروں خون بڑھا دیتی ہے۔

اسی طرح اگر ہم کسی کو پہلے ہی دن تلخ و ترش جملوں سے نوازیں گے تو میرا خیال ہے کہ وہ اگلے دن پلٹ کر نہیں آئے گا اور اگر باعث مجبوری آ بھی گیا تو بہت بددل ہو کر کام کرے گا۔

اچھے الفاظ زندگی پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں، ان سے آگے بڑھنے کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح برے اور سخت الفاظ طبیعت پر سخت گراں گزرتے ہیں۔ بعض لوگ الفاظ کو بہت خوب صورتی اور موقع محل کی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں۔

الفاظ کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے لہجوں کو بھی سنوارنا چاہیے کہ خوب صورت الفاظ لہجے کے محتاج ہوتے ہیں۔ سادہ سے الفاظ کو چاشنی ہمارے لہجے سے ملتی ہے۔ لہجے ہی انہیں رنگوں سے سجاتے ہیں۔ کبھی خوشی کے رنگوں سے، کبھی دکھ کے رنگوں سے، کبھی تلخی سے اور کبھی سادہ سے رنگوں سے۔ الفاظ سے کھیلنا بھی ایک فن ہے، جس طرح ایک ادیب اپنے لفظوں سے خوشیاں اور غم بکھیر کے ان کے معنی بدل دیتا ہے اسی طرح اگر ان کا صحیح استعمال نہ کیا جائے تو یہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟ اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ ہمیں اپنی ذات کو خود ہی بدلنا ہے، یہ کوئی اور نہیں بتائے گا۔ اگر آج سے پہلے ہم اچھے الفاظ سے آشنا نہیں تھے تو اب طے کر لیں کہ ان سے ہمارا رشتہ جڑ گیا ہے۔

اس تعلق کو مضبوط بھی بنانا ہے۔ سادہ سے الفاظ اور ان کا خوب صورت استعمال بہار کی مانند ہیں، جو زندگی کے غموں کو بہت حد تک سمیٹ لیتے ہیں۔ اپنے الفاظ کے ذریعے اپنی اور اپنے پیاروں کی زندگیوں کو سنوار یے کہ یہ اَن مول تحفہ ہیں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

مریم صدیقی

مریم صدیقی کا تعلق شہر کراچی سے ہے۔ تعلیم حفظ القرآن اور ایم اے اردو ہے۔ گزشتہ آٹھ برس سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔ لکھنے کا آغاز تین سال قبل کیا۔ گزشتہ آٹھ ماہ سے رائٹرز کلب سے منسلک ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔خودشناسی

2۔اسلام میں عورت کا مقام

3۔مردِ مومن

4۔مغرب کی تقلید اور آزادی اظہارِ رائے

5۔عورت گھر کی زینت

☆.....☆.....☆

خودشناسی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر دنیا میں بھیجا اور اسے علم و عقل عطا کیا تا کہ وہ غور و فکر کرے اور اللہ کی نشانیاں تلاش کرے۔ انسان معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لیے تلاش کہاں سے شروع کرے، کس شے پر غور و فکر کرے؟ انسان کو چاہیے کہ اس تلاش کی شروعات اپنی ذات سے کرے۔

یہ جاننے کی کوشش کرے کہ میں کیا ہوں، کیا صرف ایک خاک کا پتلا یا فقط آدم زاد، جو چند سانسیں مستعار لے کر اس روئے زمین پر آ بسا اور چند سال عیش و عشرت میں گزار کر واپسی کی راہ لی؟ کیا بس یہی میرا مقصدِ حیات ہے۔ چند دن کی دوڑ دھوپ اور روکھی سوکھی کھا کر غفلت کی چادر تان کر سو جانا؟ کیا فقط یہی منشائے الٰہی تھی کہ وہ ایسا نائب تخلیق کرے جو اپنے مقصدِ تخلیق تک سے آگاہ نہ ہو۔ جسے اپنی ذات میں مخفی صلاحیتوں کا علم تک نہ ہو۔

یہ سوال جب میں نے خود سے کیا تو میرے اندر سے جواب آیا، نہیں۔ رب تبارک وتعالیٰ نے روئے زمین پر موجود حشرات الارض کو بھی بے مقصد تخلیق نہیں کیا پھر میں تو اشرف المخلوقات ہوں، نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ایسی مخلوق، جسے اللہ نے عقل و شعور اور علم سے نوازا ہے۔

اس جواب نے میرے اندر خودشناسی کے جذبے کو پیدا کیا کہ آخر میں بھی تو جانوں کہ میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟ پھر میں نے اپنے مقصدِ حیات کی تلاش شروع کر دی کہ خودشناسی ہی بالواسطہ یا بلا واسطہ وہ سیڑھی ہے جو مجھے مقصدِ تخلیق کائنات سے آگہی فراہم کر سکتی ہے۔

خود آگہی کے اس سفر کی شروعات میں، میں نے اپنے ظاہر و باطن کو ٹٹولا، اپنی ذات کے شب و روز کو پرکھا۔ اس تلاش کے دوران میرے علم میں یہ بات آئی کہ انسان جب تک خود آگہی کے مرحلے سے نہیں گزرتا، وہ خود کو جان نہیں لیتا، تب تک وہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس کا مقصدِ حیات و مقصدِ تخلیق کیا ہے۔

میں نے اپنی ذات کی خوبیوں اور خامیوں کو جانچا، دن رات اپنی ذات کا مطالعہ کیا۔ خود آگہی کے اس سفر میں مجھ پر اپنی ہی ذات کے بارے میں کئی راز افشا ہوئے۔ کئی خامیوں سے بھی آگہی حاصل ہوئی۔ بالآخر میں نے جانا کہ اللہ نے مجھ میں دیگر کئی صلاحیتوں کے ساتھ تخلیقی صلاحیت بھی پوشیدہ رکھی ہے۔ ایک حسّاس دل دیا ہے اور جذبات کو قرطاس پر رقم کرنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ میری خود شناسی نے مجھے میری ذات کے اندر مخفی قلم کار سے متعارف کروایا اور میں نے جانا کہ یہی میرا مقصدِ حیات ہے۔

یہ سوال بہت اہمیت کا حامل ہے کہ میرا لکھاری ہونا میرا مقصدِ حیات کیسے ہے؟ کیوں کہ انسان کی تخلیق کا مقصد تو رب تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں بیان کر چکا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہوتا ہے، ''اور میں نے جن اور آدمی بنائے تا کہ وہ میری بندگی کریں''۔ (سورۃ الذریات: 56) یہاں اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد بیان فرمایا، جو عبادتِ الٰہی ہے۔

اب اگر ہم عبادت کو سمجھیں تو لفظ عبادت کا مفہوم بے حد وسیع ہے۔ اس میں فقط نماز، روزہ اور فرائضِ حج شامل نہیں بلکہ دین اسلام میں تو کسی کو مسکرا کر ملنا بھی عبادت ہے، کسی کو پانی پلانا بھی عبادت ہے اور کسی کی اصلاح کرنا بھی عبادت ہے، کسی کے راستے کی تکلیف دور کرنا بھی عبادت ہے۔

میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟ اس سوال کا جواب مجھے اپنے سفرِ خود آگہی میں ملا کہ میں وہ اشرف المخلوقات اور نائبِ خدا ہوں، جو اپنے قلم سے اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ میں وہ مصلح ہوں، جس کے قلم کا مقصد دین وملت کے لوگوں کی اصلاح ہے۔

میں وہ قلم کار ہوں جس کا قلم ہی بوقتِ ضرورت اس کا ہتھیار ہے اور یہی میرا مقصدِ حیات ہے کہ میرے قلم سے لکھے گئے الفاظ اگر کسی کی زندگی میں مثبت تبدیلی لانے یا کسی کی اصلاح کا باعث بنتے ہیں تو یہی میری عبادت ہے۔

اس دورِ جدید میں ملک وملت کے خلاف آئے دن کئی قسم کے فتنے سر اٹھا رہے ہیں اور اسلام دشمن گروہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر لادینیت پھیلا رہے ہیں۔ اس پُرفتن دَور میں بحیثیت قلم کار یہ میری اور ہر اس شخص کی ذمے داری ہے جسے اللہ کی جانب سے یہ صلاحیت عطا ہوئی ہے کہ وہ جہادِ بالقلم کر کے ان فتنہ پرور لوگوں کو منہ توڑ جواب دے اور ہر حال میں اپنا یہ کام جاری رکھے۔

درحقیقت یہی اقبال کا پیغام خودی بھی ہے، جس میں وہ انسان کو اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہم میں سے کئی لوگ ہیں جو آج بھی اپنی مخفی صلاحیتوں سے ناآشنا ہیں۔ ناآشنا ہونے کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔

ہم نے خود کو اس مشینی زندگی اور نفسا نفسی کے دور کا حصہ بنا لیا ہے۔ اب ہمارے پاس نہ اپنوں کے لیے وقت ہے اور نہ ہی اپنی ذات کے لیے یا پھر ہم خود شناسی کو اہم نہیں سمجھتے اور جیسا ہے، جہاں ہے، کی ڈگر پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

خود آگہی بلاشبہ ایک مشکل عمل ہے۔ اس مرحلے کے دوران ہمیں ہماری ذات کے ان منفی پہلوؤں سے بھی آگہی ہوتی ہے، جنہیں ہم بعض اوقات جان کر بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں نے اس سفر کے دوران یہ جانا کہ خود شناسی، کامیاب زندگی کی کنجی ہے۔

خود سے ملنے کا چلن عام نہیں ہے ورنہ
اپنے اندر ہی چھُپا ہوتا ہے رستہ اپنا

☆.....☆.....☆

اسلام میں عورت کا مقام

سیّدالانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہ کائنات جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انسان اپنی تخلیق کے مقصد کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ ہر طرف جہالت کا دَور دَورہ تھا۔ بھائی، بھائی کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا تھا۔ انسان کا سر بارگاہِ الٰہی میں جھکنے کے بجائے اپنے ہی ہاتھوں سے بنے مٹی، لکڑی اور سونے چاندی کے بتوں کے آگے جھکتا تھا۔

لوگ خالقِ حقیقی کو بھول کر آگ، سورج، ستاروں اور درختوں کو پوجتے تھے۔ اس سے بڑھ کر گم راہی کا عالم کیا ہوگا کہ انسان اپنے معبودِ حقیقی سے منہ موڑ کر جھوٹے خداؤں کی پرستش کرے۔ یہی وہ دَور تھا جسے تاریخ میں دَورِ جاہلیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل ہر طرف ظلم وستم کا راج تھا، ہر جانب گم راہی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

ذرا ذرا سی بات پر بات جنگ وقتال تک جا پہنچتی اور یہ دشمنیاں نسلوں تک جاری رہتیں۔ شراب اور جوئے کی لت عام تھی۔ لوگ رنگ، نسل، ذات پات میں تقسیم ہو کر خود کو افضل واعلیٰ سمجھتے تھے۔ غرض ایسی کوئی برائی نہیں تھی جس میں اہل عرب ملوث نہ ہوں۔ تو ایسا کیسے ممکن تھا کہ ان تمام تر برائیوں کے بعد صنفِ نازک کو عزت وحرمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا؟ تاریخ شاہد ہے کہ اس دَور میں عورت کو ہر طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کا ہر طرح سے استحصال کیا گیا۔

بیٹی کی ولادت کو منحوس تصور کیا جاتا۔ عورت کی حیثیت فقط زرخرید غلام اور باندی کی سی تھی، جسے بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کیا جاتا اور اس کے لیے بازاروں میں بولیاں لگائی جاتیں۔ وہ عورت، جس کے وجود سے نسل انسانی کی بقا ہے، وہ کسی رشتے میں بھی معتبر نہ تھی۔

مختصر یہ کہ عورت کو کسی طرح کے کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ اسے ماں، بیٹی، بہن، بیوی الغرض ہر حیثیت سے بالکل مفلوج کر دیا گیا تھا۔ عورت، مرد کے ہاتھوں فقط ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ اہل عرب عورت کے وجود کو موجبِ ذلت و عار تصور کرتے تھے۔ گھر میں لڑکی کی ولادت پر منہ چھپائے پھرتے۔

بیٹی کی پیدائش پر یا تو اسے زندہ درگور کر دیا جاتا یا اگر وہ منشائے خداوندی سے زندہ بچ جاتی تو اس کے تمام حقوق سلب کر لیے جاتے۔ پھر جب.... معاشرے میں عورت کا استحصال کیا جا رہا تھا، ایسے میں دینِ اسلام کا سورج چمکا، جس نے عورت پر سے ظلم و ستم اور تشدد کی تاریکیاں دُور کیں۔ آفتابِ اسلام چمکا تو چہار سو اجالا ہو گیا۔

بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے رحمت سے بھرے دین نے عرب کے باشندوں کو ایسے بدلنا شروع کیا کہ بت پرست، خدا پرست بن گئے۔ رہزن، رہبر بن گئے۔ جنگ و جدل کرنے والے آپس میں ایسے شیر و شکر ہوئے کہ اخوت کی انوکھی مثال قائم کی۔ وہ لوگ، جو عورتوں کی عزت و حرمت اور حقوق چھیننے کے درپے تھے، عورتوں کے محافظ بن گئے۔

دینِ اسلام نے جہاں عورتوں کو حقوق فراہم کیے، وہیں انہیں مردوں کی عزت و ناموس میں خیانت نہ کرنے کا حکم دیا۔ اسلام نے ماں، بہن، بیوی، بیٹی، غرض ہر رشتے کے تحت حقوق اور مرتبے کا لحاظ رکھا۔ بحیثیت ماں، اس کی خدمت کو جہاد پر ترجیح دی۔ بیوی سے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''یہی خانہ آبادی کا سبب ہیں۔ رزق انہی کے نیک قدموں سے بڑھتا ہے''۔ بیٹیوں اور بہنوں کے بارے میں فرمایا، ''جس نے تین بیٹیوں یا تین بہنوں کے اخراجات برداشت کیے، انہیں ادب سکھایا، رحم اور شفقت کا برتاؤ کیا حتیٰ کہ وہ اس کے خرچ سے بے نیاز ہو گئیں۔ (بیاہ دی گئیں) اللہ اس کے لیے جنت واجب کرے گا''۔

اسلام عورت کے لیے تربیت اور نان نفقہ کے حق کا ضامن بنا کہ اسے روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج کی سہولت 'ولی الامر' کی طرف سے ملے گی۔ جہاں بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور جہاں معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہ تھا، انہیں نہ صرف عزت و احترام سے نوازا گیا بلکہ وراثت میں ان کا حصہ بھی مقرر کیا گیا۔

ان کے لیے ارشاد ہوا، ''اللہ تمہیں تمہاری اولاد (کی وراثت) کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے، پھر اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں (دو یا) دو سے زائد، تو ان کے لیے اس ترکے کا دو تہائی حصہ ہے اور اگر وہ اکیلی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے''۔ (سورۃ النساء، 11:4)

اسی طرح عورت کی تعلیم و تربیت کو بھی اسلام میں اس حد تک اہمیت حاصل ہے کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو درس دینے کے لیے ہفتے میں ایک دن مقرر فرمایا۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا علم و فضل میں اتنا کمال پا گئیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال

کے بعد آپ رضی اللہ عنہا نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کی بھی معلّمہ (با پردہ) بنیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، ''اے لوگو! عورتوں کے بارے میں نیکی اور بھلائی کرنے کی وصیت فرماتا ہوں، تم میری وصیت قبول کرو۔ بے شک عورتوں کا تمہارے اوپر حق ہے۔ تم ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی اختیار کرو''۔

دین اسلام نے عورت کو ذلت و پستی کے عمیق گڑھے سے نکال کر عزت و رحمت، تقدس و تحفظ کی وہ بلندی بخشی جس کی نظیر دوسرے ادیان میں نہیں ملتی۔ دین اسلام نے عورت کو معاشرے میں معتبر مقام عطا فرمایا۔

آج کے دَور میں عورت کو جو عزت و مقام حاصل ہے، وہ اسلام کا عطا کردہ ہے۔ عورت کو ایک نسل کا امین تصور کیا جاتا ہے۔ ایک عورت، ایک نسل کی تربیت کرتی ہے، جس سے ایک قوم تشکیل پاتی ہے۔ آج کے دَور میں عورت کو ہر حیثیت سے معاشرے کا فرد سمجھا جاتا ہے اور اس کے متعین کردہ حقوق ادا کیے جاتے ہیں۔

یہ بلاشبہ دین اسلام ہی کی بدولت ہے جس نے عورتوں کو گھر کی زینت اور عزت بنا دیا۔ اب یہ عورت کی ذمے داری ہے کہ دین اسلام نے اسے جس منصب پر فائز کیا ہے وہ اس کا احترام بجالاتے ہوئے اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرے۔

7 جنوری 1929 کو علامہ اقبال نے 'انجمن خواتین اسلام' مدراس کے ایک سپاس نامے کے جواب میں جو ارشادات فرمائے، اس کی تلخیص کچھ یوں ہے: ''میرا عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں''۔

پابند وفا میں ہوں۔۔۔ مانوس حیا میں ہوں۔۔۔ آدم کی دعا میں ہوں۔۔۔ کیا جانیے کیا میں ہوں۔۔۔ مجھے کہتے ہیں 'عورت'۔۔۔

☆.....☆.....☆

مردِ مومن

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اس دنیا میں صدیوں بعد ایسے لوگ جنم لیتے ہیں جن کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے۔ جو خود تو دار فانی سے کوچ کر جاتے ہیں لیکن آنے والی نسلوں کے لیے علم و آگہی کی شمعیں فروزاں کر جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک نام بیسویں صدی کے شاعر، مصنف، قانون دان، مفکر، مصلح، سیاست دان اور تحریک پاکستان کی ایک اہم شخصیت، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا ہے، جو تاریخ میں سنہری حروف سے رقم ہے۔ علامہ اقبال سیالکوٹ میں 9 نومبر 1877 کو شیخ نور محمد کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اقبال نے اردو اور فارسی میں شاعری کی۔ انہوں نے اپنی شاعری کو امتِ مسلمہ کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

اقبالیات کو سمجھنے سے قبل ضروری ہے کہ ان کی ذات کو سمجھا جائے، ان کی شخصیت کو جانا جائے۔ اقبال بنیادی طور پر ایک سچے مسلمان تھے۔ ان کے سینے میں اسلام کی روح موج زن تھی۔ لہٰذا، انہوں نے اپنے فلسفیانہ تصورات کی بنیاد بھی اسلامی تصورات و تعلیمات پر رکھی اور کوئی ایسا نظریہ پیش نہیں کیا جو اسلام کی تعلیمات کے منافی ہو۔ آپ کے پیش کردہ فلسفیانہ نظریات امتیازی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان میں نظریۂ خودی کو مرکزی و بنیادی مقام حاصل ہے۔ آپ کی ہر بات کسی نہ کسی طور 'تصورِ خودی' ہی سے وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں آپ خود کہتے ہیں، 'یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں'۔

اقبالیات میں تصورِ خودی اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس کے کسی بھی پہلو کا جائزہ لیتے وقت اس کا ذکر نا گزیر ہو جاتا ہے اور فلسفۂ اقبال اس کے بغیر نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ اگر اقبال کے فلسفۂ خودی کو سمجھ لیا جائے تو ان کی شاعری کو بھی سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ اقبالیات کے ہر نقاد نے کسی نہ کسی طور خودی پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بے داریٔ کائنات

اقبال کی نظر میں خودی، غرور و تکبر، خود پرستی اور شانِ بے نیازی نہیں جیسا کہ خودی کا مطلب فارسی میں عام ہے، بلکہ اقبال کے نزدیک خودی، خودشناسی، خودآگہی اور اپنی ہستی کے عرفان کا نام ہے۔ اقبال نے خودی کو غرور کے بجائے عزوشان کا درجہ دیا۔ جب انسان خودشناسی کے مقام سے گزرتا ہے تو اس کے سینے میں علم و آگہی کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں۔ وہ تزکیۂ نفس کرتا ہے، اپنے مقصدِ حیات پر غور و خوض کرتا ہے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ ان جملہ مراحل سے آگہی حاصل کر لیتا ہے تو حقیقتاً نیابتِ الٰہی کا حق ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور ایسے ہی شخص کو اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا مردِ خدا، مردِ کامل، مردِ مسلماں، مردِ حر، مردِ قلندر اور مردِ مومن کہہ کر مخاطب کیا ہے، جو دراصل خودی کو اپنا کر اور اس کی تکمیل کر کے یہ درجہ پاتا ہے، جس کا ذکر اقبال نے یوں کیا ہے:

نقطہ ہر کارِ حق مردِ خدا کا یقین
اور عالم تم، وہم و طلسم و مجاز
عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ ادراک نہیں
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکُشا، کارساز
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اپنے اسی مردِ مومن کے اوصاف وہ امتِ مسلمہ کے ہر نوجوان میں دیکھنے کے خواہاں تھے۔ انہی اوصاف کے

ذریعے محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا اور صلاح الدین ایوبی نے فلسطین پر حکومت کی۔ یہی اوصاف اقبال اپنے شاہینوں میں دیکھنے کے خواہش مند تھے کہ وہ ایک بار پھر متحد ہو کر اٹھیں اور کفر کے ایوانوں میں قہر بن کر اتریں۔ یہی وہ اوصاف تھے جو اقبال چاہتے تھے کہ برصغیر کے ہر نوجوان میں پیدا ہو جائیں اور وہ ایک زبان ہو کر ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کریں، اپنی ذات کو پہچانیں، اپنے کل سے معرفت حاصل کریں۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

یہی پیغامِ اقبال ہے، جو انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے امت مسلمہ کو دیا اور بتایا کہ ہمارا وجود تب تک قائم ہے جب تک ہم اپنی اصل، اپنے مذہب سے جڑے ہیں۔ جب تک ہم تعلیمات اسلامی پر کاربند ہیں، تب تک ہم متحد ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود آگہی کے مرحلے سے گزریں اپنے آباواجداد کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

آج ایک بار پھر ہم اسی دہانے پر کھڑے ہیں جہاں ہم ایک قوم نہیں بلکہ رنگ، نسل، زبان اور فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔ آج پھر اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہماری صفوں میں سے کوئی اقبال آگے آئے اور ہمیں جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کرے۔ ہمیں پھر سے اتحاد کا درس دے اور ہماری عظمت رفتہ ہمیں لوٹا دے۔ آج پھر وہ وقت لوٹ آیا ہے جب دشمن ہم پر قابض ہونے کے لیے تیار ہے اور مختلف پینترے استعمال کر رہا ہے۔ اگر ہم اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک بار پھر پرچم اسلام کے سائے تلے متحد ہونا ہوگا۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

☆.....☆.....☆

مغرب کی تقلید اور آزادی اظہار رائے

مغربی ثقافت میں جہاں عوام الناس کو زندگی کے ہر شعبے میں بے جا آزادی حاصل ہے وہیں مغربی معاشرہ انہیں آزادئ اظہارِ رائے کا حق بھی مہیا کرتا ہے۔ پھر چاہے اس کا استعمال وہ مثبت انداز میں کریں یا جارحانہ انداز بیاں اختیار کریں، چوں کہ وہ اس حق کے استعمال میں آزاد ہیں تو جواب طلبی سے بھی مستثنیٰ ہیں۔ مغربی معاشرے کے افراد جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں آزادی پسند واقع ہوئے ہیں وہیں اپنی رائے کے بے دھڑک، بے محل اور بے جا استعمال کو بھی آزادئ اظہار میں شمار کرتے ہیں۔ اس بات سے قطعی طور پر بے بہرہ ہیں کہ ان کی یہ آزادی کس کس کے جذبات مجروح کرنے کا سبب بن رہی ہے۔

ہم نے جہاں مغربی ثقافت کی اندھا دھند تقلید میں بے شمار چیزیں ان کی ثقافت سے متاثر ہو کر مستعار لی ہوئی ہیں، ان میں سے ایک اظہارِ آزادئ رائے بھی ہے۔ آج معاشرے میں جس طرف نظر دوڑائی جائے، ہر دوسرا شخص اس کا سہارا لے کر لوگوں کے بخیے ادھیڑتا، تنقید، عیب جوئی اور غیبت کو آزادئ اظہارِ رائے کے پیراہن میں ڈھال کر پیش کرتا نظر آتا ہے۔ دوسروں کی شخصیت، کردار و لباس، یہاں تک کہ ذاتی زندگی کو بھی تنقید کا نشانہ بنانا ہم نے اپنا قومی فریضہ سمجھ لیا ہے اور اس کے لیے سوشل میڈیا کی صورت میں بہترین پلیٹ فارم بھی میسر ہے۔ جہاں جب، جس وقت، جس کا دل چاہے، کسی بھی شخص کی ذات کو کرید کر تنقید کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ اس کے ذات کے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈال کر انہیں تضحیک کا نشانہ بنا سکتا ہے۔

مغرب کی اندھی تقلید میں ہم اپنے مذہب، اپنے دین کی تعلیمات کو بھی یکسر فراموش کر چکے ہیں۔ ہم یہ بات بھی بھول گئے ہیں کہ ہمارا مذہب ہمیں عیب چھپانے کا حکم دیتا ہے۔ تنقید برائے اصلاح بھی تنہائی میں کرنے اور دل آزاری سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ ہم یہ بھی بھول گئے کہ اپنی زبان سے دوسروں کو ایذا دینے والا مومن نہیں ہوتا۔ ہمارا

مذہب اسلام ہمیں زبان کی حفاظت کا درس دیتا ہے لیکن آج ہم محفل میں بیٹھ کر لوگوں کی عیب جوئی کرنے کو آزادئ اظہارِ رائے خیال کرتے ہیں۔ کہیں محفل میں کسی کی ذات پر اس کے سامنے ہی تنقید شروع کر دیتے ہیں اور خود کو صاف گو اور حق پر سمجھتے ہیں، تو کہیں پیٹھ پیچھے تنقید کر کے غیبت جیسے گناہِ کبیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن اپنے اس عمل کو حق بجانب بھی گمان کرتے ہیں۔

اپنی خرابیوں کو پس پشت ڈال کر
ہر شخص کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم آزادئ اظہارِ رائے کے لیے منفی رویہ ہی کیوں اختیار کرتے ہیں، مثبت رویہ کیوں اختیار نہیں کرتے؟ ہم لوگوں کے عیوب کا چرچا کرنے کے بجائے ان کی صلاحیتوں اور ان کی ذات میں موجود خوبیوں کو کیوں نہیں تلاشتے، ہماری نظر کیوں ایک صحیح بات کو چھوڑ کر چار غلط باتوں تک جاتی ہے۔ ہمیں کیوں دوسروں کی ذاتی زندگی کی فکر ہے؟ کون کیا کر رہا ہے، اس کا حساب کرنے والے ہم کون ہیں؟ کبھی اس بات پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہم کس جانب رواں دواں ہیں۔ ہماری سوچ، ہمارا نظریہ، ہمارا انداز، سب منفی ہو چکا ہے۔ ہم اچھائی سننا اور دیکھنا پسند نہیں کرتے، دوسروں کی صلاحیتیں ہماری آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتی ہیں۔

ہم دوسروں کے معاملے میں کبھی وکیل صفائی کا کردار نہیں ادا کرتے۔ دوسروں کے لیے ہم ہمیشہ اپنی زبان اور عمل سے دودھاری تلوار کا کردار نبھاتے ہیں۔ آزادئ اظہارِ رائے کا مقصد زبان کو شتر بے مہار کی طرح کھلا چھوڑ دینا نہیں۔ آزادئ اظہار کے وقت تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے، ہم اپنی ذات میں بھی کامل و اکمل نہیں ہیں۔ آج جو زبر ہے وہ کل زیر بھی ہو سکتا ہے۔ جن لاتعداد خامیوں کی نشان دہی ہم دوسروں کی ذات، ان کے کردار میں کرتے ہیں اگر اسی ایک نظر سے ہم اپنی ذات میں موجود خامیوں کو تلاشیں تو یقیناً فائدہ ہی ہوگا۔

اظہار آزادرائے غلط نہیں، اس کا کثرت سے منفی استعمال غلط ہے۔ دوسروں کی خامیاں تلاشتے تلاشتے ہماری سوچ منفی ہو جاتی ہے۔ ہمارا موضوعِ کلام فقط دوسروں کی ذات اور اس میں موجود خامیاں ہی رہ جاتی ہیں، جس سے نقصان ہماری ہی ذات کو پہنچ رہا ہے۔ جس زاویے سے بھی دیکھیں، یہ عمل ہمارے ہی نقصان کا باعث ہے۔ لمحۂ فکریہ ہے ہمارے لیے کہ ہم نسل نو میں کیا طرزِ زندگی منتقل کر رہے ہیں؟ ہم آج جو اپنے منفی رویوں سے نفرت کے بیج بو رہے ہیں، آنے والی نسلوں کو وہ نفرت ورثے میں تناور درخت کی صورت میں ملے گی۔ ذرا سوچیے۔

☆.....☆.....☆

عورت، گھر کی زینت

اکثر خواتین کو گھر کی آرائش و زیبائش کا شوق ہوتا ہے، وہ نت نئی چیزوں سے گھر سجانے اور سنوارنے میں مصروف رہتی ہیں۔ جب بھی بازار جاتی ہیں، گھر کی سجاوٹ کا کوئی نہ کوئی سامان لے آتی ہیں۔ گھر سجانا، سنوارنا بے شک ایک عورت ہی کی ذمے داری ہے اور وہی یہ کام اَحسن طریقے سے انجام دے سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت ایک عورت ہی میں رکھی ہے کہ وہ ایک مکان کو سجا سنوار کر، اسے محبتوں سے آراستہ کر کے گھر بناتی ہے۔ اس میں خوشیوں کے رنگ بھرتی ہے اور گھر کے مکینوں کو جوڑ کر رکھتی ہے۔ گھر کی ظاہری زیب و زینت اپنی جگہ اہم ہے۔ تاہم، کسی بھی گھر کی اصل خوب صورتی اس گھر کے افراد کی باہمی محبت ہوتی ہے۔ اگر گھر اپنی باطنی خوبی سے عاری ہے تو ظاہری خوبی دل کے بہلاوے کے سوا کچھ نہیں۔ گھر کو اشیائے زیب و زینت سے آراستہ کرنے کے باوجود اگر رشتوں میں اعتماد کی فضا قائم نہیں ہوتی، زوجین میں ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوتی، گھر ہر وقت میدانِ جنگ کا سا منظر پیش کرتا نظر آتا ہے، گھریلو ناچاقیوں کے سبب گھر کا ماحول کھنچا کھنچا سا رہتا ہے، فریقین ایک دوسرے کو جھکانے کے لیے پیش پیش رہتے ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی انا کے ہاتھوں شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا تو ایسے رشتے جلد یا بدیر اپنے اختتام کو پہنچ جاتے ہیں۔ رشتوں کی خوب صورتی انہیں ساتھ لے کر چلنے اور ایک دوسرے کی انفرادی حیثیت تسلیم کرنے میں ہے۔ جس طرح کسی بھی گھر کی آرائش و زیبائش کی ذمے دار عورت ہوتی ہے کہ وہ کیسے اپنی ذہانت سے اپنی چادر میں رہ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے اپنے گھر کو ظاہری طور پر جنت کا نمونہ بناتی ہے۔ کس طرح کم سے کم اخراجات میں گھر کی زیب و زینت کا کام سرانجام دیتی ہے، ویسے ہی اپنے ازدواجی رشتے کی خوب صورتی قائم رکھنے کی ذمے داری بھی عورت ہی پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ اللہ نے مرد کی نسبت عورت میں محبت اور برداشت کا مادّہ زیادہ رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد اس ذمے داری سے بری الذمہ ہے بلکہ مرد بھی اسی قدر ذمے دار ہے لیکن ایک عورت اپنے حُسنِ اخلاق سے

اپنے گھروندے کو ٹوٹنے سے بچا سکتی ہے۔

بعض خواتین اپنے گھر کے ساتھ اپنے ذاتی اخراجات بھی اس قدر بڑھا لیتی ہیں کہ مرد کے لیے ان کا بوجھ برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ایسے میں ناچاقیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں۔ عورت کی سمجھ داری اسی میں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی موجود آمدنی میں قناعت اختیار کرے کہ ایسے میں اللہ مال میں برکت عطا کرتا ہے۔ کوئی بھی عورت اگر چاہے تو اپنے اخلاق، اپنی محبت اور حُسنِ سلوک سے اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔ بوقت ضرورت تھوڑا سا تحمل ہمیشہ کے پچھتاوے سے بہتر ہوتا ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے اگر وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی جائے تو کئی طوفانوں کے رخ موڑے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ خود کو صحیح تصور کرتی ہیں تو پھر کسی وقت رسان سے اپنی بات دوسرے فریق کے سامنے رکھی جا سکتی ہے۔ بروقت خاموشی اختیار کر لینے سے ممکن ہے کہ دوسرے فریق کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔

عورت ہی ہمیشہ غلط ہو اور مرد ہمیشہ صحیح، ایسا کہنا درست نہ ہوگا لیکن اگر عورت صحیح وقت پر سمجھ داری کا مظاہرہ کرے تو زندگی کی کئی مشکلات حل کر سکتی ہے۔ جیسے گھر میں رکھے پودوں کی حفاظت کرنی پڑتی ہے کہ ان میں کیڑا نہ لگے، انہیں انتہائی نگہداشت اور توجہ و محبت سے پروان چڑھایا جاتا ہے بالکل ایسے ہی یہ رشتۂ ازدواج توجہ، محبت اور اعتماد کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر پل توجہ کا طلب گار رہتا ہے۔

یہ رشتہ خون کا نہیں ہوتا لیکن اسی رشتے سے خون کے رشتے جنم لیتے ہیں۔ ہمیں پہلے اس پر توجہ دینی ہوگی، پہلے اسے سنواریں گے تو اس سے جنم لینے والے رشتے اپنے آپ سنور جائیں گے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

مفتی عثمان الدین

مفتی عثمان الدین صاحب جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاون سے عالم اور مفتی کو کورس کیا ہے۔ اصلاح امت اور دعوت الی اللہ کے جذبے سے سرشار امت مسلمہ کی اپنے قلم کے ذریعے اصلاح کرنے میں کوشاں ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ ماہ ذی الحجہ اور قربانی

2۔ معاشرے کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟

3۔ ماتحتوں سے متعلق ایک پریشانی کا حل

4۔ ''مکروہ'' شریعت کی نظر میں

5۔ حکومتی سودن کی کارکردگی

☆.....☆.....☆

ماہ ذی الحجہ اور قربانی

سال کے اسلامی بارہ مہینوں میں رمضان المبارک اور ذی الحجہ کے مہینے، عبادات کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ رمضان کے مہینے میں روزے، تراویح، اعتکاف، صدقہ، فطر جیسی اہم عبادات ادا کی جاتی ہیں تو ماہ ذی الحجہ میں مسلمان حج اور قربانی کی عظیم عبادتیں ادا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے سال میں دو عیدیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ، بھی انہی مہینوں اور عبادتوں کی مناسبت سے رکھی گئی ہیں۔ الحمدللہ! ماہ ذی الحجہ شروع ہو چکا ہے، اس مہینے کی سب سے بڑی اور عظیم عبادت بلا شبہ حج ہے، جن مسلمانوں کو اس ماہ میں یہ سعادت حاصل ہوتی ہے وہ انتہائی خوش نصیب ہیں۔ البتہ حج کے علاوہ دیگر چند اہم عبادات، احکام بھی اس مہینے سے متعلق ہیں، جو تمام ہی مسلمانوں کے لیے عام ہیں، ان کا علم میں ہونا ضروری ہے اس لیے اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

عشرہ ذی الحجہ:

اس مہینے کے شروع کے دس دن اور راتیں خصوصی فضیلت کی حامل ہیں۔ ان کی عظمت و فضیلت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ خود اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں ''ولیال عشر'' فرما کر انہیں دس راتوں کی قسم کھائی ہے۔ دوسری جگہ ان کو ''ایّامِ معلومات'' فرما کر ان میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں نیک عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان دس دنوں کے عمل سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو''۔ لہٰذا، ان دس دنوں اور راتوں کو غنیمت سمجھتے ہوئے ان میں ذکر و اذکار، دعاؤں اور عبادات کا خصوصی اہتمام کرنا ضروری ہے۔

عشرہ ذی الحجہ سے متعلق ایک حکم یہ ہے کہ جس شخص کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو، وہ ذی الحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد سے قربانی تک، جسم کے کسی حصے کے بال اور ناخن نہ تراشے، البتہ یہ ایک مستحب حکم ہے۔ لہٰذا، اگر کوئی اس پر عمل نہ

کر سکے تو گناہ نہیں اور قربانی پر بھی کوئی اثر نہیں ہوگا۔

یوم عرفہ کا روزہ:

عیدالاضحیٰ سے ایک دن قبل نو ذی الحجہ کے دن کو ''یوم عرفہ'' کہا جاتا ہے۔اس دن روزہ رکھنے کا بہت اجر وثواب ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''عرفہ کے دن کے روزے کے متعلق میں اللہ تعالی سے پختہ امید رکھتا ہوں کہ وہ اس کے ذریعے ایک سال پچھلے اور ایک سال اگلے گناہ معاف فرمادیں گے''۔ایک دن کے روزے پر اتنی بڑی فضیلت ہے۔لہٰذا،اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے اس دن روزے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

تکبیراتِ تشریق:

یوم عرفہ یعنی نو ذی الحجہ کو فجر کی نماز سے تیرہ ذی الحجہ کی نماز عصر تک، ہر فرض نماز کے فوراً بعد مردوں کے لیے بلند آواز سے اور عورتوں کے لیے آہستہ آواز میں تکبیرِ تشریق کہنا واجب ہے۔یہ کل تئیس نمازیں ہوئیں،جن کے بعد درج ذیل الفاظ میں تکبیرِ تشریق کہنا واجب ہے:اللہ اکبر،اللہ اکبر،لا الہ الا اللہ واللہ اکبر،اللہ اکبر وللہ الحمد۔

قربانی:

عیدالاضحیٰ کے دنوں میں اللہ تعالی کی رضا کے لیے اور اس کا نام لے کر مخصوص جانوروں کو ذبح کرنا 'قربانی' ہے، جو اس مہینے کی اہم ترین عبادت ہے۔قربانی کے اس عمل کو ''سنّتِ ابراہیمی'' کہا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جب ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تو ان دونوں نے اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔

قربانی کا حکم اور اس کی فضیلت:

قربانی کرنا واجب اور اسلام کے شعائر میں سے ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد ایک سال بھی قربانی ترک نہیں فرمائی، جو اس کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ایک حدیث میں یہ وعید بھی منقول ہے کہ جو شخص قربانی نہ کرے، وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔

قربانی کس پر واجب ہے؟:

جس شخص پر صدقۂ فطر واجب ہے، اس پر قربانی بھی واجب ہے۔جس کے پاس قربانی کے دنوں میں اپنی ضرورت سے زائد اتنا نقد روپیا یا سامان موجود ہو،جس کی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو تو اس پر قربانی واجب ہے۔

قربانی کے جانور:

اونٹ، گائے، بھینس، بکری اور بھیڑ (نر و مادہ)،ان جانوروں کی قربانی کرنا جائز ہے۔ان جانوروں کی قربانی

کے لیے کم از کم عمر، بھیڑ اور بکری کی ایک سال، گائے اور بھینس کی دو سال اور اونٹ کی پانچ سال، ہونا ضروری ہے۔ اس سے کم عمر ہو تو اس جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ البتہ بھیڑ اور دنبہ اگر اتنا موٹا تازہ ہو کہ سال بھر کا معلوم ہوتا ہو، اگر چہ عمر کم ہو، تو بھی قربانی جائز ہے۔ قربانی کے ان جانوروں میں سے اونٹ، گائے اور بھینس میں سات آدمی بھی قربانی کے لیے شریک ہو سکتے ہیں لیکن کسی شریک کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح سات سے کم افراد بھی مل کر ان جانوروں کی قربانی کر سکتے ہیں، البتہ سب شریکوں کا قربانی یا عقیقے کی نیت کا ہونا ضروری ہے، محض گوشت کی نیت سے شریک ہونا جائز نہیں۔

قربانی کے ایّام اور وقت:

قربانی کا وقت شہر والوں کے لیے دسویں ذی الحجہ کو نماز عید کے بعد سے بارہویں ذی الحجہ کو سورج غروب ہونے تک ہے۔ گاؤں اور دیہات والے دسویں ذی الحجہ کو صبح صادق کے بعد نماز عید سے پہلے بھی قربانی کا جانور ذبح کر سکتے ہیں۔ قربانی کے دنوں میں افضل، عید کا دن ہے پھر گیارہویں اور بارہویں تاریخ ہے۔ اس دوران دن اور رات میں کسی بھی وقت قربانی کرنا جائز ہے، البتہ دن میں کرنا افضل ہے۔

قربانی کا گوشت:

قربانی کے گوشت میں بہتر یہ ہے کہ اس کے تین حصے کیے جائیں۔ ایک حصہ اپنے لیے رکھے، باقی ایک حصہ رشتے داروں اور ایک غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے، البتہ اگر سارا گوشت اپنے لیے رکھ لیا جائے تب بھی جائز ہے۔

ماہ ذی الحجہ اور قربانی کے متعلق یہ چند اہم اور بنیادی احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ قربانی سے متعلق اس کے علاوہ بھی کئی مسائل ہیں، جن کا احاطہ ایک مضمون میں ممکن نہیں۔ قربانی کرنے سے پہلے ان مسائل کو علمائے کرام سے پوچھ لیا جائے۔ کسی بات میں کوئی الجھن پیش آئے تو فوراً ان کی جانب رجوع کیا جائے، اس طرح ان شاء اللہ قربانی کا عمل درست اور شرعی طریقۂ کار کے مطابق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مقبول ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ماہ ذی الحجہ کے تمام اعمال بالخصوص قربانی کا عمل، اخلاص کے ساتھ شرعی طریقۂ کار کے مطابق کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

معاشرے کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟

معاشرے کا کردار کسی بھی ملک وقوم کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ معاشرہ ایک ایسی بنیاد ہے جس پر ملکوں اور قوموں کی خوش حالی اور فلاح و بہبود کا انحصار ہوتا ہے۔ جس ملک وقوم کو اچھا اور بہترین معاشرہ نصیب ہوتا ہے، خوش حالی اور فلاح و بہبود اس کا مقدر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب معاشرہ بگاڑ کا شکار ہوتا ہے تو خوش حالی اور فلاح و بہبود جیسی نعمتیں اس ملک وقوم سے کوسوں دُور چلی جاتی ہیں۔

بدقسمتی سے جب ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ مجموعی لحاظ سے خرابی اور بگاڑ کا شکار نظر آتا ہے۔ جھوٹ، بددیانتی، کرپشن، قتل وغارت، لوٹ مار، لسانیت، عصبیت، لڑائی جھگڑے وغیرہ۔ یہ وہ خرابیاں ہیں جو ہمارے معاشرے کے لیے ناسور بن چکی ہیں اور جن کی وجہ سے ہمارا ملک اور معاشرہ جس زبوں حالی کا شکار ہے وہ ہم سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس سے ہم من حیث القوم بخوبی واقف بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''معاشرہ بہت خراب ہو چکا ہے''۔ جیسے جملے ہمیں اکثر وبیش تر اپنے اردگرد کے ماحول میں سننے کو ملتے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کی جانب کوئی توجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دراصل اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑا طبقہ ''معاشرے'' کی حقیقت ہی سے واقف نہیں ہے یا پھر اس کی طرف توجہ نہیں ہے، اس لیے ''معاشرے'' کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے۔

''معاشرہ'' بنیادی طور پر افراد کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔ کسی بھی جگہ ایک ساتھ رہنے والے افراد کو مجموعی لحاظ سے ''معاشرہ'' کہا جاتا ہے، گویا ''معاشرہ'' دراصل افراد ہی کا نام ہے۔ پس جب ''معاشرہ'' افراد سے بنتا ہے تو پھر اس لحاظ سے اس کی صلاح وبگاڑ کا دارومدار بھی افراد کی صلاح وبگاڑ پر ہے، اس لیے معاشرے کی اصلاح کے لیے افراد کی اصلاح بہت زیادہ ضروری ہے۔ اب ہمارے یہاں ہوتا یہ ہے کہ ہر فرد معاشرے کو برا بھلا کہنا تو ضروری سمجھتا

ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا کہ خود وہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے خود اس کا بھی انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے کردار ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر معاشرہ بگاڑ کا شکار ہے تو وہ خود اس سے بری الذّمہ ہرگز نہیں ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے اس بنیادی سوچ کا من حیث القوم ہمارے اندر پیدا ہونا بہت ضروری ہے کیوں کہ یہی سوچ ان شاءاللہ معاشرے کی اصلاح میں کلیدی کردار ادا کرے گی۔ جب معاشرے میں بسنے والا ہر فرد اس سوچ کی بنیاد پر مذہب اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی اصلاح کی فکر کرنا شروع کر دے گا اور معاشرے کی اصلاح کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنا کردار بھی ادا کرتا رہے گا تو پھر ایک نیک اور صالح معاشرے کا وجود میں آنا کوئی مشکل نہیں ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے لیے مذہب اسلام میں بیان کردہ معاشرتی احکام اور مسائل سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ قرآن وحدیث میں جابجا معاشرتی احکام ومسائل کا بیان ہے۔ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے، البتہ قرآن کریم کے چھبیسویں پارے کی ''سورۃ الحجرات'' میں یک جا طور پر چند انتہائی اہم معاشرتی احکام مذکور ہیں اور اس مناسبت سے یہ سورت خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ ذیل میں ان احکام کو ترتیب وار مختصر وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

:

1۔ کسی بھی خبر پر بغیر تحقیق یقین کر کے اس پر عملی کارروائی کرنا:

یہ ایک بہت ہی خطرناک معاشرتی برائی ہے اور بدقسمتی سے معاشرے میں یہ بہت عام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی کے متعلق، کہیں سے بھی، کوئی خبر یا بات سننے کو ملتے ہی تحقیق کی زحمت کیے بغیر نہ صرف یہ کہ اس پر یقین کر لیا جاتا ہے بلکہ اس پر عملی کارروائی بھی شروع کر دی جاتی ہے، بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ خبر جھوٹ یا غلط تھی لیکن اس وقت تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے، اس لیے ندامت ہی نصیب ہوتی ہے۔ چناں چہ کسی کے متعلق کوئی خبر یا بات معلوم ہو تو اس پر یقین کرنے اور کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس کی اچھی طرح تحقیق کرنا ایک انتہائی اہم معاشرتی ذمے داری اور حکم ہے۔

2۔ لڑائی کرنے والوں میں صلح کرانا:

معاشرے میں بسنے والے افراد کے درمیان اختلافات اور بسا اوقات لڑائی جھگڑے کا ہونا ایک فطری بات ہے۔ ایسی صورت حال میں باقی لوگوں کے لیے محض تماشا دیکھنے کے بجائے غیر جانب داری اور عدل وانصاف کے ساتھ ان کے درمیان صلح صفائی کرا کے ان کے اختلافات اور لڑائی جھگڑے کو ختم کرنا ایک اہم معاشرتی ذمے داری ہے۔ پھر اگر بالفرض ان میں سے ایک فریق دوسرے کے خلاف ظلم پر اتر آئے تو جب تک ظالم، اس ظلم سے باز نہ آ جائے، مظلوم کی نصرت وحمایت کرنا بھی ضروری ہے۔

3۔کسی دوسرے مسلمان بھائی بہن کا مذاق اُڑانا:

یہ ایک انتہائی مذموم معاشرتی عمل ہے جس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ دراصل مذہب اسلام میں ہر مسلمان کی عزتِ نفس کا بہت خیال رکھا گیا ہے، اسی وجہ سے ہر ایسا عمل، جو کسی کی عزتِ نفس کو مجروح کرے، اس سے منع کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کسی کے مذاق اُڑانے اور تمسخر کرنے سے یقیناً اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اس لیے یہ عمل ممنوع ہے۔ اللہ تعالی نے مردوں اور عورتوں کو الگ الگ مخاطب کر کے اس عمل سے بچنے کا حکم دیا ہے، جس سے اس کی برائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہو۔ بہر حال یہ بھی ایک بڑی معاشرتی برائی ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔

4۔طعنہ دینا:

طعنہ زنی یہ ایک مذموم عمل ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک دوسرے کو طرح طرح کی اور برسوں پرانی باتوں پر طعنے دے کر اذیت دینا عام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

5۔ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارنا:

معاشرے میں بسنے والے افراد کا ایک دوسرے کو برے ناموں اور القابات سے پکارنا اور یاد کرنا دراصل ایک دوسرے کی عزتِ نفس سے کھیلنے کے مترادف ہے اور یہ عمل عزت واحترام کے اس رشتے کے بھی منافی ہے، جس کا ایک معاشرے کے لوگوں کے درمیان موجود ہونا نہایت ضروری ہے، اس لیے اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے کو اچھے ناموں اور القابات سے پکارنا اور یاد کرنا چاہیے، یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

6۔دوسروں کے متعلق منفی سوچ اور بدگمانی رکھنا:

انسان کی سوچ اس کے افعال واعمال میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جو بھی فیصلہ اور عملی اقدام کرتا ہے، اس کی بنیاد اس کی سوچ ہوتی ہے کیوں کہ انسان ہر معاملے میں سب سے پہلے اپنی عقل کے ذریعے سوچنے کے بعد دل سے فیصلہ کرتا ہے، اس کے بعد آخر میں اپنے اعضاء وجوارح کے ذریعے اسے عملی جامہ پہناتا ہے۔

اس بِنا پر انسان کی سوچ کا درست ہونا انتہائی ضروری ہے۔ سوچ کے درست ہونے کی ایک اہم اور بنیادی جہت یہ ہے کہ انسان اپنی سوچ ہمیشہ، ہر وقت صرف 'منفی' نہ رکھے۔ اپنی زندگی میں جو بھی فیصلہ کرے، جو بھی عملی اقدام کرے، خواہ اس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے ہو یا دوسروں سے، اس کی بنیاد صرف منفی سوچ نہ ہو۔ کیوں کہ جس فیصلے اور عمل کی بنیاد مثبت کے بجائے منفی سوچ ہوتی ہے، اس کے نتائج بھی منفی ہی ظاہر ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

اسلام نے دوسروں کے متعلق بلا کسی وجہ کے منفی سوچ قائم کرنے اور بدگمانی کرنے سے منع کیا ہے، اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

7۔ایک دوسرے کی ٹوہ اور جاسوسی میں لگے رہنا:

ایک معاشرے میں رہنے والے افراد کو ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کی جستجو میں لگے رہنے سے منع کیا گیا ہے، اس سے آپس میں اعتماد کا رشتہ بھی ختم ہو جاتا ہے، جو کسی بھی معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ ہر انسان کو اپنی کمزوریوں اور برائیوں پر نظر رکھتے ہوئے ان کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

8۔غیبت کرنا:

کسی دوسرے مسلمان کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی بیان کرنا 'غیبت' کہلاتی ہے۔ مذہب اسلام نے اس سے بہت سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اسی سورت میں اس عمل کو دوسرے مردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے زنا سے بھی بدتر گناہ قرار دیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ مرض ہمارے معاشرے کے خواص و عوام میں اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اس کی برائی ہی اب دلوں سے ختم ہو چکی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا لمحۂ فکریہ ہے۔ اس لیے اس قبیح فعل کی برائی دل میں پیدا کرنا اور اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

9۔مساوات:

یہ ایک انتہائی اہم معاشرتی اصول ہے جسے اس سورت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے اور یہی ماقبل میں مذکور معاشرتی برائیوں سے بچنے کا ایک آسان نسخہ بھی ہے۔ دراصل انسان جب غیبت، طعن و تشنیع اور عیب جوئی کرتا ہے، دوسروں کا مذاق اُڑاتا ہے اور ان کو برے القابات سے یاد کرتا ہے تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کو دوسروں سے بہتر سمجھ رہا ہوتا ہے۔

اس لیے ان تمام معاشرتی برائیوں کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ''مساوات'' کی تعلیم دی گئی ہے کہ سب بنی نوع انسان آدم و حوا علیہما السّلام کی اولاد ہیں۔ کسی کو دوسرے پر رنگ، نسل، قوم و قبیلے یا کسی اور سبب سے کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہے۔ فضیلت و برتری کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے ''تقویٰ'' یعنی اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف ہے۔

یہ چند اہم معاشرتی احکام ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے اس سورت میں بیان کیا ہے۔ آج ہمارے معاشرے کی برائیوں میں سے ایک بڑی برائی آپس کے اختلافات اور لڑائی جھگڑے ہیں۔ کسی بھی ذریعے اور رشتے سے باہم منسلک افراد کے درمیان نفرت، اختلافات اور لڑائی جھگڑے معمول کا حصہ ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ ہو،

قرابت داری، مالک اور ملازم یا کاروباری رشتہ وغیرہ غیرہ۔

ان سب رشتوں میں جڑے ہوئے افراد کے مابین اختلافات اور لڑائی جھگڑے کثرت کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں، اسی وجہ سے جلد یا بدیر، یہ رشتے ختم ہو جاتے ہیں اور اگر باقی رہتے ہیں تب بھی الفت اور محبت کا عنصر تو بہر حال مفقود ہوتا ہے۔ اگر ہم پس پردہ اس کے اسباب اور وجوہ پر غور کریں تو ہمیں اس سب کے پیچھے بنیادی اور کلیدی کردار ان مذکورہ معاشرتی احکام سے روگردانی کا نظر آئے گا۔

اس لیے اگر ہم معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں، معاشرے سے اختلافات اور لڑائی جھگڑوں کا خاتمہ، اس میں امن و محبت اور سکون و اطمینان دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن و حدیث میں ذکر کردہ ان معاشرتی احکام کو اپنانا ہوگا اور بات پھر وہی ہے کہ یہ معاشرے میں بسنے والے ہر فرد کی ذمے داری ہے کیوں کہ افراد ہی سے معاشرہ بنتا ہے۔ اگر ہم سب نے معاشرتی احکام کو سیکھ کر ان کے مطابق زندگی گزارنے اور معاشرے کی اصلاح میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی نیت کر لی اور ایسا کر دکھایا تو یقیناً اسی سے ایک نیک اور اچھا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

☆.....☆.....☆

ماتحتوں سے متعلق ایک پریشانی کا حل

دنیا کا نظام حیات اجتماعی ہے اور انسان اسی میں زندگی گزارتا ہے۔ اجتماعی نظام حیات میں ہر شخص کسی رشتے یا تعلق کے واسطے سے دوسرے کے ساتھ جُڑا ہوتا ہے۔ انسانوں کے یہ باہمی روابط مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات آپس کے اس تعلق میں ایک شخص بڑا اور حاکم ہوتا ہے جب کہ دوسرا، اس کے ماتحت اور زیر حکم ہوتا ہے۔ اس نوعیت کا تعلق معاشرے میں بہت وسعت رکھتا ہے اور مختلف طبقات کے افراد اس میں جڑے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر والدین اور اولاد، استاد اور شاگرد، مالک اور ملازم کا تعلق اسی نوعیت کا ہے کیوں کہ اولاد، شاگرد اور ملازم.... یہ سب اپنے والدین، استاد اور مالک کے ماتحت ہوتے ہیں۔

معاشرے میں اس رشتے میں جڑے افراد آپس کے اس تعلق کے حوالے سے جن پریشانیوں کے شکار ہوتے ہیں، ان میں سے ایک پریشانی بڑوں کو اپنے ماتحتوں سے یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ان کی بات نہیں مانتے۔ ان کی خواہش کے مطابق کام نہیں کرتے چناں چہ والدین اپنی اولاد کی، استاد اپنے شاگردوں کی، اسی طرح مالک اپنے ماتحت ملازمین کی یہی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک بڑی پریشانی ہے، جو بڑوں کو اپنے ماتحتوں سے ہوتی ہے۔ مذکورہ پریشانی میں مبتلا افراد بسا اوقات اپنے ماتحتوں کے لیے صرف سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے وہ ان کے مطیع و فرماں بردار ہو جائیں گے لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے کہ ماتحت اس سے ایک طرح کی بغاوت پر اتر آتے ہیں، جس سے پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات یہ لاعلاج ہو جاتی ہے، اس لیے اس طریقۂ کار کا انتخاب نقصان دہ ہے۔

مذکورہ پریشانی کا ایک بہترین حل ماتحتوں کی 'حوصلہ افزائی' ہے۔ حوصلہ افزائی کا مطلب یہ ہے کہ آپ ماتحتوں کے اچھے کام پر اپنے قول و فعل سے ان کی تعریف کریں اور ان کی غلطیوں سے حتی الامکان درگزر کریں۔ آپ کے اس

رویے سے ان کے دل میں آپ کے لیے اطاعت اور فرماں برداری کا سچا اور دیرپا جذبہ پیدا ہوگا جو اصل مطلوب ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ ان کے ساتھ ہر وقت سختی سے پیش آئیں گے، ان کے اچھے کاموں کو نظر انداز کر کے صرف ان کی غلطیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان پر ٹوکیں گے تو ایسی صورت میں وہ وقتی طور پر بہ امر مجبوری شاید آپ کی بات مان جائیں گے لیکن عمومی طور پر یہ فرماں برداری صرف ظاہر تک ہی محدود ہوتی ہے، باقی دل ہی دل میں وہ آپ کے باغی بنتے چلے جاتے ہیں، جس کے آثار ان کے ظاہری اقوال و افعال میں بھی ظاہر ہوتے ہیں اور یہ بات جانبین کے لیے پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ حوصلہ افزائی کا یہ عمل انتہائی مفید ہے جو صرف ماتحتوں کے لیے ہی خاص نہیں بلکہ انسان کا اپنی زندگی میں جن کے ساتھ بھی تعلق ہو، ان کے ساتھ حوصلہ افزائی کا یہی رویہ اپنانا چاہیے۔

دراصل انسان جو بھی کام کرتا ہے وہ حوصلے کے ذریعے ہی کرتا ہے کیوں کہ حوصلہ ہی انسان کو آگے بڑھاتا ہے اور حوصلہ افزائی کے معنی ہی حوصلہ بڑھانے کے ہیں۔ لہٰذا، اگر آپ اپنے ماتحتوں کی حوصلہ افزائی کریں گے تو ان کا حوصلہ بڑھے گا، جس سے وہ آپ کی مرضی و منشا کے مطابق کام کریں گے اور اگر آپ ان پر ہر وقت غصہ اور سختی کریں گے، ڈانٹ ڈپٹ کریں گے تو اس سے ان کی حوصلہ شکنی ہوگی جس کے نتیجے میں کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لوگ چوں کہ اسے سمجھتے نہیں ہیں اس لیے وہ اس پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہمارے لیے عملی نمونہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سارے کے سارے آپ کے انتہائی مطیع و فرماں بردار تھے۔ ان کی اس اطاعت اور فرماں برداری کا راز، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے ساتھ نرمی اور احسان پر مبنی رویہ اور برتاؤ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ سخت دل اور سخت مزاج نہیں تھے بلکہ نرم مزاج تھے اور وہ ان کے ساتھ انتہائی احسان اور نرمی کا برتاؤ رکھتے تھے۔ ان کے اچھے کاموں پر ان کی حوصلہ افزائی کے لیے تعریفی جملے ارشاد فرماتے تھے اور ان کی خطاؤں سے درگزر فرماتے تھے۔

حضرت انس نبیؐ کے خادم خاص تھے، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال آپؐ کی خدمت کی اور اس دوران آپؐ نے مجھے کبھی کسی بات پر ڈانٹا نہیں۔ اس عرصے میں یقیناً ان سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی کیوں کہ وہ بھی انسان تھے اور کم عمر بھی لیکن آپؐ نے ان کی غلطیوں سے اس حد تک درگزر کیا کہ کبھی انہیں ڈانٹنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔

اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ماتحتوں کے ساتھ اخلاق اور برتاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا یہی برتاؤ اور رویہ تھا، جس کے سبب صحابہ کرام آپؐ پر ہر وقت اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی صحابہ کرام کی اس جاں نثاری کا یہی راز بتایا ہے۔

غرض نبی کریمؐ کی اس عملی زندگی سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ اگر ہم اپنے ماتحتوں کو اپنا مطیع وفرماں بردار دیکھنا چاہتے ہیں ان سے اپنی مرضی ومنشا کے مطابق درست کام لینا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے ساتھ صرف سختی اور ڈانٹ ڈپٹ والا رویہ اپنانے کے بجائے پیار ومحبت کے ساتھ نرمی اور حوصلہ افزائی والا رویہ بھی اپنانا چاہیے۔

اسی سے ان کا حوصلہ بڑھے گا اور اسی حوصلے کی بنیاد پر وہ محنت اور لگن کے ساتھ اپنی ذمے داریاں پوری کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

''مکروہ'' شریعت کی نظر میں

شریعت کے احکام و مسائل کے بیان میں حلال اور حرام کے ساتھ ایک لفظ 'مکروہ' کا بھی کثرت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ آپ نے بھی اس طرح کے جملے علمائے کرام سے سنے ہوں گے اور کتابوں میں پڑھے بھی ہوں گے کہ فلاں چیز مکروہ ہے، فلاں کام مکروہ ہے۔ لیکن 'مکروہ' کا شرعی مفہوم عوام الناس کے نزدیک حلال اور حرام کی طرح معروف اور واضح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے لوگ 'مکروہ' کی حقیقت و تعریف اور اس کے ثبوت سے متعلق سوال کرتے ہیں، اس لیے 'مکروہ' کی وضاحت سے متعلق چند بنیادی باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔

شریعت کے احکام کی بنیادی طور دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کا نام 'مامورات' ہے جب کہ دوسری قسم کو 'منہیات' کہتے ہیں۔ مامورات ان احکام کو کہا جاتا ہے جن میں کسی کام کے 'کرنے' کا حکم دیا گیا ہو جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ اور منہیات ان احکام کو کہتے ہیں جن میں کسی کام سے 'بچنے' کا حکم دیا گیا ہو جیسے جھوٹ بولنا، خیانت کرنا، غیبت کرنا وغیرہ۔

احکام کی مذکورہ دونوں قسمیں درجے اور مرتبے کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں بلکہ مختلف مراتب اور درجات میں منقسم ہیں۔

احکام کے یہ مختلف مراتب و درجات قرآن و حدیث سے ثابت ہیں اور اس درجہ بندی کا مقصد درحقیقت اُمّت کے لیے عمل کے لحاظ سے آسانی اور سہولت پیدا کرنا ہے کیوں کہ اگر شریعت کے تمام احکام ایک ہی درجے کے ہوتے تو اُمّت کے لیے ان کی بجا آوری میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ احکام کی انہی اقسام میں سے ایک قسم 'مکروہ' ہے۔

مکروہ کی تعریف:

لغوی معنی کے اعتبار سے 'ناپسندیدہ' کو 'مکروہ' کہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں 'مکروہ' کی حقیقت اور تعریف

سمجھنے کے لیے پہلے یہ تفصیل جاننا ضروری ہے کہ حکم کے اعتبار سے چیزوں کی تین قسمیں ہیں:

(1) بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی ممانعت قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہے۔ ایسی چیزوں کو 'حرام' کہا جاتا ہے۔

(2) بعض چیزیں ایسی ہیں، جن کی اجازت قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہے یا ان کی ممانعت ثابت نہیں ہے، ایسی چیزوں کو 'حلال' کہا جاتا ہے۔

(3) بعض چیزیں ایسی ہیں، جن کے متعلق اجازت اور ممانعت، دونوں جانب کے دلائل موجود ہیں جن کی وجہ سے انہیں مکمل طور پر حلال کہا جا سکتا ہے نہ حرام۔ جو چیز اس قسم کی قبیل سے ہو اسے 'مکروہ' کہا جاتا ہے۔

مذکورہ تفصیل سے 'مکروہ' کا شرعی مفہوم واضح ہو گیا کہ ایسی چیزیں، جن کے متعلق اجازت اور ممانعت، دونوں جانب کے دلائل موجود ہوں اور اس وجہ سے وہ مکمل طور پر حلال یا حرام اشیا کی فہرست میں شامل نہ ہوں، انہیں 'مکروہ' کہا جاتا ہے۔ 'مکروہ' نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسی چیزیں شریعت کی نظر میں حرام نہ سہی لیکن بہر حال ناپسندیدہ ضرور ہوتی ہیں۔

مکروہ کا ثبوت:

مکروہ کی مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اب ذیل میں دو احادیث ذکر کی جاتی ہیں، جن سے مکروہ کی مزید وضاحت کے ساتھ احادیث سے اس کا ثبوت بھی واضح ہو جائے گا۔

(1) حضرت نعمان ابن بشیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ (الی آخر الحدیث۔ مشکوۃ المصابیح)

اس حدیث میں حکم کے اعتبار سے چیزوں کی تین اقسام کا بیان ہے، جن کا ذکر ماقبل میں آپ کے سامنے آیا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں تیسری قسم کی چیزوں کو 'متشابہات' کہا گیا ہے کیوں کہ ان میں اجازت اور ممانعت، دونوں جانب کے دلائل موجود ہوتے اور اس وجہ سے ان کے حلال یا حرام ہونے میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کی چیزوں کو فقہائے کرام 'مکروہات' بھی کہتے ہیں۔ اس طرح مذکورہ حدیث سے 'مکروہ' کی اصطلاح اچھی طرح واضح اور ثابت ہو جاتی ہے۔

(2) حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے گوہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں ؐ نے فرمایا: میں نہ تو اس کو کھاتا ہوں اور نہ حرام کرتا ہوں۔ (سنن ترمذی)

مکروہ کی قسمیں اور ان کا حکم:

مکروہ کے ساتھ بسا اوقات 'تنزیہی' اور 'تحریمی' کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس بِنا پر ان کی مختصر وضاحت بھی ضروری ہے۔ مکروہ کے بارے میں جیسا کہ معلوم ہوا، اس میں اجازت اور ممانعت، دونوں جانب کے دلائل موجود ہوتے ہیں اور اس کی حلال اور حرام، دونوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے، اس لیے مکروہ کی اس اعتبار سے دو قسمیں ہیں۔ مکروہِ تنزیہی اور مکروہِ تحریمی۔

مکروہِ تنزیہی اُس مکروہ کو کہتے ہیں جس میں ممانعت کے مقابلے میں اجازت کے دلائل غالب اور قوی ہوتے ہیں۔ اس بِنا پر وہ حرام کے مقابلے میں حلال سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مکروہِ تحریمی اس مکروہ کو کہتے ہیں جو اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی اس میں ممانعت کے دلائل غالب اور قوی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ حرام کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مکروہِ تنزیہی کا حکم یہ ہے کہ اس سے اپنے آپ کو بچانا بہتر اور باعثِ اجر وثواب ہے لیکن اگر اس کا ارتکاب ہو جائے تو گناہ نہیں ہوتا ہے اور مکروہِ تحریمی کا حکم یہ ہے کہ اس سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے اور اس کا مرتکب گناہ کا مستحق ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ شریعت کے احکام کی درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے مختلف قسمیں ہیں۔ 'مکروہ' بھی ان میں سے ایک اہم قسم ہے۔ اس کی حقیقت اور تعریف کو سمجھنے کے لیے مذکورہ چند اہم اور ضروری باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین وشریعت کے تمام احکام کو سمجھنے اور ان کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

حکومتی 100 دن کی کارکردگی

25 جولائی کے انتخابات کے بعد اقتدار میں آنے والی موجودہ حکومت کی اب تک کی کارکردگی میڈیا اور عوام میں زیر بحث ہے۔ تعریفی اور تنقیدی، دونوں قسم کے تبصرے ہو رہے ہیں، البتہ تنقید کا پہلو غالب ہے۔ قابل تنقید معاملات پر بروقت تنقید ضروری بھی ہے کیوں کہ اسی سے حکومت کا قبلہ کسی حد تک درست رہتا ہے۔

پاکستان میں سیاست دانوں کا اقتدار میں آنے سے پہلے قوم سے بڑے بڑے وعدے اور دعوے کرنا معمول کی بات ہے۔ وزیراعظم عمران خان نے البتہ گزشتہ کئی سالوں میں جس طرح کے بلند و بانگ وعدے اور دعوے کر کے قوم کو سبز باغ دکھائے ہیں، اس کی مثال ماضی میں ملنا بہت مشکل ہے اور اسی وجہ سے قوم کی ان سے توقعات بھی بہت زیادہ ہیں۔ اقتدار حاصل ہونے کے بعد اب ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج ان کے مطابق کارکردگی دکھانا ہے اور یہی موجودہ حکومت کا سب سے بڑا امتحان ہے۔

حکومت کی اب تک کی کارکردگی ان دعووں اور وعدوں کے مقابلے میں پہاڑ کے سامنے رائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ عمران خان کے لیے خود ان کے بیش تر دعوے اور وعدے اب پریشانی کا باعث بن رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معمولی عرصے ہی میں اپنی کہی ہوئی بہت ساری باتوں پر عملی طور پر 'یوٹرن' لے چکے ہیں۔ میڈیا اور عوام انہیں مسلسل ان سب باتوں کی یاد دہانی کرا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ہر محاذ پر جلد بازی اور جھنجھلاہٹ کا شکار بھی نظر آ رہی ہے۔

خارجہ پالیسی کی بات کی جائے تو اس حوالے سے منصوبہ بندی اور سفارت کاری کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال پاک بھارت تعلقات کا معاملہ ہے۔ وزیر خارجہ نے پہلے تو دعویٰ کیا کہ بھارت نے مذاکرات کی پیش کش کی ہے۔ بھارت نے اس کی تردید کر دی تو حکومت خاموش ہو گئی۔ پھر ہمارے وزیراعظم کی طرف سے خفیہ طور پر

بھارتی وزیراعظم کو مذاکرات کی بحالی اور وزرائے خارجہ کی ملاقات کے لیے خط لکھنے کا معاملہ سامنے آیا۔ قوم کو تب پتا چلا جب بھارت نے اس خط کو دنیا کے سامنے لاکر پہلے ملاقات کے لیے ہاں اور پھر انکار کر دیا۔

جواب میں وزیراعظم نے خود بھارتی وزیراعظم سے متعلق ایک ایسی ٹویٹ کر دی جو سفارتی لحاظ سے شاید مناسب نہیں تھی۔ بھارت سے تعلقات جیسے اہم اور حساس معاملے پر عجلت میں کیے گئے ان اقدامات کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ دونوں ملکوں میں جنگ تک کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دوسری جانب، بھارت ہی سے جڑے مسئلہ کشمیر اور بھارتی جاسوس کلبھوشن پر وزیراعظم اپنے پہلے خطاب سے اب تک پُراسرار خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ امریکی وزیر خارجہ کے فون کال پر ایک تنازع کھڑا کر دیا گیا۔ فرانسیسی صدر کی فون کال کے معاملے پر تماشا لگا دیا گیا، چین کے ساتھ تعلقات اور سی پیک منصوبوں پر شکوک وشبہات پیدا کر کے انہیں بند کر دینے تک کے بیانات دیے گئے۔

یہ سب باتیں خارجہ محاذ پر حکومتی ناکامی اور ناتجربے کاری کی عکاس ہیں۔ دوسری جانب حکومت کی داخلی سطح پر کارکردگی بھی اب تک اس معیار سے کوسوں دُور ہے، جو عمران خان نے عوام کے ذہنوں میں اپنی حکومت کے لیے قائم کیا تھا اور جس کی بنیاد پر وہ سابق حکومت پر ہر وقت تنقید کیا کرتے تھے، حکومت کے عملی اقدامات اقتدار میں آنے سے پہلے کیے جانے والے بلند وبانگ عوامی دعوؤں کے بالکل برعکس ہے۔ وزیراعظم ہاؤس میں نہ رہنے، پروٹوکول نہ لینے، پاک وشفاف اور قابل افراد کو عہدے دینے، میرٹ پر تعیناتی، بیرونی قرض نہ لینے اور ان جیسے بے شمار نئے اور خوش نما دعوے، جو پرانے پاکستان میں کیے جاتے تھے، وہ سب نئے پاکستان میں بہت جلد ہی پرانے ہو چکے ہیں۔

واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ محض حصول اقتدار کے لیے ان کے ذریعے قوم کے جذبات سے کھیلا گیا تھا، جو یقیناً باعثِ افسوس ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ حکومت اب بھی بالغ نظری کا ثبوت دینے کے بجائے اسی طرح زبانی دعوؤں کی روش پر قائم ہے۔ آئے روز قوم کے سامنے ایک دعویٰ کر کے اگلے ہی دن اس پر یوٹرن لے لیا جاتا ہے اور پھر ایسی تاویلیں کی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

حکومت نے ٹیکسوں سے بھرپور 'منی بجٹ' کے نام پر عوام پر مہنگائی بھی مسلط کر دی ہے۔ گیس، بجلی، آٹے اور گندم جیسی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں ہوش رُبا اضافہ ہو گیا ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ حکومت اتفاق رائے کے بغیر جلد بازی میں پیچیدہ قسم کے فیصلے اور اعلانات کر رہی ہے، افغان مہاجرین اور بہاریوں کو پاکستان کی شہریت دینے کا اعلان اس کی ایک بڑی مثال ہے، چناں چہ حکومت ہی کی اتحادی جماعت کی مخالفت کے بعد وزیراعظم نے یوٹرن لے کر کہا کہ یہ محض ایک تجویز ہے۔

حکومت کی داخلی اور خارجی سطح پر اس کارکردگی کے علاوہ بعض اقدامات حکومت کے عزائم ہی کو مشکوک بنا رہے ہیں۔

قادیانی میاں عاطف کو اقتصادی مشاورتی کونسل کا ممبر بنانا اس کی ایک بڑی مثال ہے۔ بعد میں سخت عوامی دباؤ پر یہ فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ قادیانیوں کی سرگرمیوں میں بھی اس کے بعد غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اسی طرح مدارس کی رجسٹریشن منسوخ کر کے ان کو نیکٹا کے حوالے کرنے کا معاملہ، مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی باتیں، بعض وزراء کے بیانات اور اس طرح کے بعض دیگر اقدامات سے حکومتی مقاصد کے بارے میں سوالات جنم لے رہے ہیں۔

غرض یہ کہ حکومت کی اب تک کی کارکردگی مایوس اور پریشان کن ہے، اسے فوری طور پر بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت کے سامنے مضبوط و طاقت ور حریف سیاسی جماعتوں اور خود حکومتی دعوؤں اور وعدوں کی صورت میں بہت مضبوط اپوزیشن موجود ہے۔

اس سے نمٹنے کا واحد حل جلد سے جلد غیر معمولی کارکردگی دکھانا ہے۔ اگر حکومت ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو وہ کسی بھی وقت اپوزیشن اور عوامی غیظ و غضب کا شکار ہو کر بڑی محنت اور کاوش سے حاصل کردہ اقتدار سے محروم بھی ہو سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

رقیہ فاروقی

رقیہ فاروقی کا تعلق روالپنڈی سے ہے اور شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔ تعلیم حفظ القرآن اور درس نظامی مکمل کی ہوئی ہے۔ رائٹرز کلب سے 1 برس سے وابستہ ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ سنت کا نور

2۔ ہم پریشان کیوں ہیں؟

3۔ اصلاح معاشرہ کیسے ممکن؟

4۔ علم ہے منزلِ عرفان وہدایت کا چراغ

5۔ بطور شہری ہماری ذمے داری

☆.....☆.....☆

سنت کا نور

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: ''اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دیجیے اگر تم اللہ پاک سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو''۔ دنیا کا ہر انسان کسی نہ کسی طرح ضرور اللہ پاک سے محبت کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بھنور میں پھنس جانے والی کشتیوں کو کنارے لگانے والی کوئی ہستی موجود ہے، جو طوفان کی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی سرکش موجوں کو لگام دیتی ہے، ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دینے والی ہواؤں کو باد صبا میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اس عظیم رب نے محبت کے دعوے داروں کے لیے ایک معیار مقرر کر دیا ہے۔ یعنی معیار ربانی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقوں کی اتباع ہے۔ یہ کامیابی کا زینہ ہے۔ دنیا میں ہمیشہ اسی کو کامیاب مانا جاتا ہے جس کی تعریف میں دشمن بھی رطب اللسان ہو۔ تمام دنیا کے لیڈروں میں ایک حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایسی کامل صفات کے حامل تھے کہ دوست تو دوست، دشمن بھی ان کی خوبیوں کے قائل تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو اسوہ حسنہ فرمایا گیا ہے، جس کا ہر پہلو سورج کی طرح روشن اور منور ہے۔ ہر زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنّتوں کو اپنانے والے دنیا میں موجود رہے ہیں، جنہوں نے عملی نمونہ بن کر امت کے لیے رہنما کا راستہ واضح کیا ہے۔ دنیا بظاہر ترقی کے دَور سے گزر رہی ہے۔ ہر قسم کی جدید ٹیکنالوجی متعارف کروائی جا چکی ہے۔

برسوں کی مسافتیں لمحوں میں اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ سوشل میڈیا کے آنے سے فاصلے سمٹ گئے ہیں لیکن اس سب کے باوجود سنّت کی اہمیت مسلم ہے۔ سائنس کی تحقیقات بھی مسنون طریقوں کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ انسان کے لیے اللہ پاک نے رات اور دن کا نظام بنایا ہے، جس میں رات آرام کے لیے ہے۔ جو آدمی رات کو پرسکون نیند لیتا ہے، وہ سارا دن ہشاش بشاش رہتا ہے۔

باوجود ترقی کی راہوں پر سفر کرنے، زمین کے نہاں خانوں میں چھپے خزانوں کو نکالنے اور خلا کو مسخر کر لینے کے، انسان سے نیند کا معمہ نہ حل ہو سکا۔ یہ بات طے نہ کی جا سکی کہ انسان کو کس وقت اور کیسے سونا چاہیے۔ حالاں کہ یہ سب اسلام نے صدیوں پہلے واضح کر دیا تھا۔

1930ء میں الیکٹرو اینسیفالوگراف ایجاد کی گئی، جس سے دماغ کی لہروں کی پیمائش کی جا سکتی ہے لیکن سوئے ہوئے انسان کی بے سکونی کی وجہ دریافت نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ اس کی تکلیف کا ازالہ مسکن ادویہ سے بھی ناممکن ہے جبکہ شریعت مطہرہ نے نیند میں تکلیف سے بچنے کے لیے پورا عمل سمجھا دیا۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں کروٹ پر لیٹتے تھے۔

جدید سائنس کی تحقیقات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ دائیں کروٹ لیٹنا ہر اعتبار سے مفید ہے۔ دائیں کروٹ سونے سے دل پر زیادہ اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ دوران خون کے عمل کے وقت بائیں کروٹ اوپر ہوتی ہے تو اس پر زیادہ زور نہیں پڑتا اور خون دل سے نکل کر جسم میں گردش کرتا رہتا ہے۔ جب دل تن درست اور توانا ہوگا تو تمام جسم اس کے تابع ہو کر درست کام کرے گا۔

دائیں کروٹ لیٹنے کا دوسرا اچھا اثر معدے پر پڑتا ہے۔ جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو وہ منہ کے ذریعے کھانے کی نالی سے گزر کر معدے میں آ جاتا ہے۔ معدے سے لگا آنت کا حصہ ہے، اس کے ساتھ ہی پتہ جگر سے ملتا ہے۔ یہ اعضا دائیں طرف ہونے کی وجہ سے معدے کے اندر کی غذا بآسانی آنت میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد نظام ہضم کا عمل بھی بالکل سہولت سے مکمل ہو جاتا ہے۔ پھیپھڑے اپنا کام صحیح طریقے سے سرانجام دیتے ہیں۔

سبحان اللہ! ایک سنّت کا اہتمام کتنے فوائد کا حامل ہے۔ آج کل لوگوں کو صحت کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بالخصوص دل کے مریض کے لیے تو زندگی کو نظم وضبط کا پابند بنانا ہوتا ہے۔ اگر سوتے وقت کی سنّتوں کا اہتمام کر لیا جائے تو کسی حد تک اس جان لیوا مرض سے بچا جا سکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الٹا لیٹنے سے منع فرمایا۔

میڈیکل سائنس نے بھی اس کے مضر اثرات کی تصدیق کی ہے۔ سائنس کی تحقیقات کے مطابق الٹا لیٹنے سے معدے اور گردوں پر اثر پڑتا ہے۔ نظام انہضام پر دباؤ کی وجہ سے بیسیوں بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ سونے ایک قسم قیلولہ بھی ہے۔ یعنی دوپہر میں سونا۔ حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہمارے پاس سے گزرتے تو قیلولہ کا حکم دیتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''شیطان قیلولہ نہیں کرتا''۔

پروفیسر جم ہارن، انگلستان کی سلیپ ریسرچ لیبارٹری کے ڈائریکٹر ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ دوپہر دو سے چار بجے تک انسانی جسم میں اتار چڑھاؤ کا گہرا عمل ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت قریباً 20 منٹ کا آرام جسم میں قوت

اور چستی کو بڑھا دیتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے جسم میں روح اور جسم کا ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ روح کی تن درستی جسم کو توانا رکھتی ہے۔ بیمار روحوں کے جسم لاغر ہوتے ہیں، چاہے ان کے لیے ہزاروں جتن کر لیے جائیں۔

حاصل یہ ہے کہ ہمیں ہر سنّت کو سنّت سمجھ کر اپنانا چاہیے، جو دنیا میں روحانی اور جسمانی نشاط کا سبب بنے گا۔ قرون اولیٰ کی پہلی جماعت نے ایسا زمانہ پایا تھا کہ جب چہار سو افلاس کے ڈیرے تھے۔ قسما قسم کی صحت افزا خوراکوں کی تمنا بھی بے کار تھی لیکن طاقت کا ایک ایسا جوہر ان میں چھپا ہوا تھا کہ مقابلے کے میدان میں ایک فرد ہزار پر بھاری ہوتا تھا۔ آج بھی ہم اسوۂ حَسنہ کو اپنا کر وہی کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

سنّت کو اللہ پاک نے نور بنایا ہے، جس کی روشنی سے سارا جہاں منور ہے۔ ہم بھی سنّت کی پیروی اختیار کر کے آقائے نام دار کے غلاموں میں اپنا نام رقم کروائیں، جو سعادت دارین کا سبب ہے۔

☆.....☆.....☆

ہم پریشان کیوں ہیں؟

اسپتال کی انتظار گاہ میں بیٹھی میں گردوپیش کا جائزہ لینے میں مشغول تھی۔ سامنے، ڈاکٹر کے کمرے کے باہر، مریضوں کی لمبی لائن کافی دھکم پیل کے بعد اب کچھ پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ ہر ایک رپورٹس کی فائل پکڑے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ ابن آدم کی عجلت مضحکہ خیز منظر پیش کر رہی تھی۔ میں انہماک کے ساتھ اس ساری صورت حال کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید یہ بھاگ دوڑ ایام زیست کو بڑھا دے گی یا ابن آدم کی پریشانیوں کا مداوا ثابت ہو سکے گی؟ اسی اثناء میں میرے پہلو میں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون دھم سے آ کر بیٹھ گئیں۔ میری توجہ کچھ بٹ گئی، سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مختصر سلام دعا کے بعد گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا تو وہ بتانے لگیں کہ میں اپنی والدہ کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ ایک آسودہ حال گھرانے کی خاتون ہیں۔ تمام بچے اپنے گھروں میں خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی والدہ کے حق سے بھی بے خبر نہیں ہیں لیکن ایک بے نام اور اَن جان بے چینی ان کے وجود سے چمٹ گئی ہے۔ معمولی بات آنسوؤں کی برسات کا سبب بن جاتی ہے جس کی وجہ سے ساری اولاد پریشان ہے۔

بظاہر یہ ایک گھر کا قصہ ہے لیکن دنیا میں ایسے کتنے ہی گھرانے ہوں گے جو بظاہر محلات کی طرح سجے ہوئے ہوتے ہیں لیکن مکینوں کے لیے زندہ قبریں بن جاتے ہیں۔ کوئی اچانک پڑی افتاد، چاہے اپنی ذات پر ہو یا اپنے پیاروں پر، لذت زیست چھین لیتی ہے اور انسان زندہ لاش بنا پھرتا ہے۔ ہسپتال میں گزرے چند گھنٹے مجھے یہ باور کروا گئے کہ انسانوں کی اکثریت اس المیے کا شکار ہے۔ ہر دوسرے شخص میں ناشکری کا عنصر نمایاں ہے۔ ہر کوئی رب کریم سے اس چیز کا گمان باندھے ہوئے ہے، جس کی اسے طلب ہے، جہاں نہیں ملا وہیں ڈپریشن کا مرض پال لیا جاتا ہے۔

کوئی مال کے لیے پریشان ہے اور کسی کو اولاد کا غم وبال جان بنا ہوا ہے۔ امت کی یہ حالت دیکھ کر یاد آیا کہ بزرگ تو فرمایا کرتے ہیں کہ کلمہ گو کو ڈپریشن ہو ہی نہیں سکتا، پھر ہر ہسپتال میں نفسیات کا شعبہ کیوں قائم ہے؟ کتنے کلمہ گو

خودکشی جیسے کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوکر جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں اور کتنے ہی انسان بغاوت اور سرکشی پر کمر باندھ لیتے ہیں۔کوئی یہ جاننا ضروری نہیں سمجھتا کہ اصل سبب جان کر اس بے کلی کا مداوا کیا جا سکے۔مومن کا دل تو غم دنیا سے بے نیاز ہونا چاہیے کیوں کہ اس میں تو رب بستا ہے، کائنات کا خالق و مالک۔پھر یہ دل ناتواں نہ جانے کیوں پریشانیوں کے انبار اٹھا کر چشم کو اشکبار کرتا ہے اور انسان مایوسی کے پاتال میں پاؤں پاؤں اتر جاتا ہے۔

ڈپریشن اس وقت ایک بڑا مسئلہ ہے۔وقتی طور پر پریشان ہونا کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے یعنی پریشانی کی لکیر دماغ پر ابھر کر ختم ہو جائے۔اس سے صحت پر بھی مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے۔لیکن پریشانی کو حواس پر طاری کر لینا، روحانی اور جسمانی طور پر انسان کو متاثر کرتا ہے پھر بسا اوقات یہ ہسٹریا کا سبب بن جاتی ہے۔انسان دماغی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔خداداد صلاحیتیں بے کار چلی جاتی ہیں۔ایسے ٹینشن زدہ دماغ، معاشرے کی اخلاقی آلودگی کا سبب بن جاتے ہیں۔

اس گھٹن زدہ کیفیت سے دماغ کو آزاد کرنے کے لیے انسان یہ سوچ لے کہ زندگی اللہ پاک کی نعمت ہے۔اس کی فرماں برداری میں گزارنے ہی سے ہمیں سکون مل سکے گا۔جہاں انسان صراط مستقیم کی پٹڑی سے اترے گا وہیں مسائل کا عفریت اسے نگل لے گا۔چند روزہ عیش و آرام کے لیے مال کمانے کی خاطر وہ صحت خراب کر لے گا۔اپنی اولاد کا حق وصول کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق کچل ڈالے گا۔کہیں یہ وہ اسباب تو نہیں، جو بے نام بے چینی کا سبب بنے ہوئے ہیں؟ نیند کی گولیاں کھا کر بھی لذت آرام سے آشنا نہیں ہونے دیتے۔

ان پریشانیوں کا ایک سبب ناشکری ہے۔انسان بھی عجب حیوان ہے کہ کمی کی لکیر کو پیٹتے ہوئے نعمتوں کے انبار بھول جاتا ہے۔مالی خسارے کے سامنے اسے صحت کی نعمت ہیچ نظر آتی ہے حالاں کہ اسی صحت کو پانے کے لیے سارا مال لٹا دیتا ہے۔اپنے آپ کو خوش اور مطمئن رکھنے کے لیے ہمیں نعمتوں کو سوچنا ہوگا۔مخلوق کے دکھوں کا مداوا کرنا ہوگا اور اپنے خالق کو راضی کرنا ہوگا۔

آیئے! آج سے اپنے آپ کو مایوسی کے اس عمیق گڑھے سے نکال کر ایک نئی زندگی جینے کا عزم کریں۔دنیا سے حسد اور کینہ کے جھاڑ جھنکار کو صاف کر کے مسکراہٹوں کے گلاب اگائیں تا کہ یہ بدحواس اور اداس انسانیت زندگی کی طرف لوٹ سکے۔

☆.....☆.....☆

اصلاح معاشرہ کیسے ممکن ہے؟

اللہ تعالیٰ نے کائنات ہستی کو وجود دیا۔ ہر قسم کی جان دار اور بے جان مخلوقات پیدا کی گئی، پھر انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا کہ یہی انسان علم کا علم تھام کر اوج ثریا تک پرواز کرے گا۔ اسی نسل انسانی میں خدائے وحدہ لاشریک کے پیغمبر تشریف لائیں گے، جو اصلاح عالم کے لیے کوشاں رہیں گے۔ ہر پیغمبر کی محنت کا میدان جدا ہوگا۔ معاشرتی بگاڑ قوموں کو لپیٹ میں لے لے گا۔ ساڑھے نو سو سال کی طویل محنت گنے چنے لوگوں پر اثر انداز ہوگی، لیکن ہدایت کے رہنماؤں کا قافلہ نہیں رکے گا۔ ایک کے بعد ایک ہادی آتا رہے گا۔ پیغمبروں کا قافلہ انسانیت کی رہنمائی کے لیے کوشاں رہے گا لیکن اس فانی دنیا میں بقا صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کو حاصل ہے۔ جہاں انسانیت کی آزمائش کا وقت آیا، ہادی دنیا سے رخصت ہوا، وہیں ازلی دشمن نے اپنا کاری وار کر لیا۔ ہر گناہ، ہر نافرمانی، معاشرے میں رواج پا گئی اور کرہ ارض فساد کی آماج گاہ بن گیا۔ قتل وخون ریزی نے سارے انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس سارے فساد کی جڑ معاشرے کی خرابی بنتی ہے۔

معاشرہ انسانوں کے میل جول کا نام ہے۔ گویا انسانیت کے اجتماع سے معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ پھر انسانوں کے مزاج کا اختلاف معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ معاشرتی بگاڑ کے ذمے دار بھی درحقیقت ہم ہی ہوتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اصلاح معاشرہ کا خواہاں ہوتا ہے لیکن اپنی ذات کی اصلاح سے یکسر غافل ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل پورا عرب معاشرتی اعتبار سے نزع کے عالم میں تھا۔ بدی کا سورج اپنے عروج پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر رحم فرمایا اور اسلام جیسا نور ہدایت عطا فرمایا۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے پہلا قانون مقرر کیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوا: ''اے ایمان والو! اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ''۔

انسان پر سب سے پہلے اپنی ذات کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی اصلاح کی فکر کرے۔ انقلاب کے لیے ایک انسان ہی کافی ہوتا ہے۔ گزرے وقتوں میں کسی بادشاہ نے اپنی رعایا کے اخلاق کا امتحان لینا چاہا۔ ایک حوض کھدوایا گیا اور رعایا میں اعلان کروا دیا گیا کہ ہر کوئی رات کو اس میں دودھ ڈال کر جائے۔ ہر کوئی اس بھروسے پر پانی ڈالتا رہا کہ سب دودھ ڈالیں گے ایک میرے پانی ڈالنے سے کیا فرق پڑے گا؟ صبح سارا حوض پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ہماری مثال بھی کچھ اسی طرح ہے کہ اپنا آئینہ صاف کرنے کے بجائے معاشرے کی گندگی کو دوش دیتے ہیں۔ پھر میڈیا ہو یا نجی محافل، ہر کوئی اپنی ذات میں پارسا بن کر دوسروں پر کیچڑ اچھالتا ہے۔

ایسی صورت حال میں ہم کبھی برائیوں کو نہیں مٹا سکتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب ہدایت میں یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ اگر برائی کو مٹانا ہو تو اچھائی کو عام کر دو۔ اسی صورت میں اصلاح معاشرہ ممکن ہو سکتی ہے۔ آیئے! ہم سب اپنے حصے کا کام کریں اور اپنی ذات کو بنیاد بنا کر ایک بہترین معاشرے کی داغ بیل ڈال دیں۔ اگرچہ اپنی خامیوں کی اصلاح بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ تاہم، ہمت مرداں۔۔۔۔ مدد خدا۔

☆.....☆.....☆

علم ہے منزلِ عرفان و ہدایت کا چراغ

اس جہانِ رنگ و بو میں چہار سو علم کے بغیر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہر زمانے میں علم کی روشنی نے انسان کے اقبال کو بلند کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے قبل انسانیت لگ بھگ چھ سو سال، جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی رہی۔ پھر اللہ پاک نے پکارا، عالم کے سامنے سب سے پہلا جو اعلان ہوا، وہ علم کے متعلق تھا، پڑھنے پڑھانے، سیکھنے سکھانے سے متعلق تھا۔ اگرچہ اس وقت معاشرے میں بدی کا راج تھا۔ ہر برائی اپنے عروج پر تھی، لوگ قیامت کے انکاری تھے۔ ان سب برائیوں کے لیے کوئی مذمتی بیان بھی جاری کیا جا سکتا تھا۔ کوئی ایسا حکم، جس کے ذریعے لوگ بعث بعد الموت کا یقین کر لیتے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ سب سے پہلے علم کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ ایک گنوار قوم کو علم کے ذریعے سے چمکا دیا گیا۔ عرب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں جہالت کا راج اس قدر تھا کہ کوئی حکم راں وہاں حکومت کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر علم کی روشنی نے جہالت میں ڈوبی قوم کو انسانیت کی تہذیب سے آشنا کر دیا۔ علم ہی ایک ایسی روشنی ہے جس نے حیوانات سے انسانوں کو ممتاز کر دیا۔ ابھی تخلیق کائنات کی ابتدا ہوئی تھی۔ عدم سے وجود ملا۔ اللہ تعالی نے اس کا شرف فضیلت دکھانے کے لیے اس کا علم ظاہر کر کے فرشتوں پر برتری ثابت کر دی۔ مٹی کا یہ پتلا آسمان والوں کے لیے قابل رشک بن گیا۔ گویا ابتدائے آفرینش میں فرش سے عرش تک ایک درس گاہ تھی جس کے معلم حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام تھے۔ وہ مسجود ملائکہ بنا دیے گئے اور یہ فضیلت علم کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

علم ایسی روشنی ہے جو دنیا کو منور کر دیتی ہے۔ انسان اس کی جستجو میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ علم کی اسی فضیلت اور اہمیت کی وجہ سے اللہ علیم و خبیر نے فرمایا: تم مجھ سے علم میں ترقی اور زیادتی کی دعا مانگا کرو۔ حالاں کہ دیگر نعمتوں پر قناعت کا درس دیا گیا ہے لیکن علم ایسی دولت ہے جس کا حرص رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود

رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو شخصوں کے سوا کسی پر حسد کرنا جائز نہیں ہے۔ ایک تو وہ شخص، جسے اللہ نے مال دیا اور پھر اس کو راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق دی اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے علم دیا۔ پس وہ اس علم کے مطابق فیصلہ کرتا اور اسے سکھاتا ہے''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ''تھوڑی دیر کے لیے علم کا درس، رات بھر عبادت کرنے سے بہتر ہے''۔ پھر علمی تاریخ میں اگر دیکھا جائے تو اسلامی تاریخ زرّیں ہے۔ قرآن کی تعلیم نے علم اور تحقیق کا ایسا جذبہ پیدا کیا کہ چند ہی صدیوں میں جہالت میں ڈوبی انسانیت علم کے قمقموں سے جگمگا اٹھی۔ ایک عظیم علمی انقلاب برپا ہوا۔ جابر بن حیان اور البیرونی جیسے عظیم سائنس دان پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے کارناموں سے دنیا کو مبہوت کر دیا۔

علم کے میدان میں ترقی کے لیے ہمیں بیدار ہونا ہوگا۔ ترقی کی منازل کو طے کرنے کے لیے محنت کے میدان کو پاٹنا ہوگا۔ پاکستان کی نئی نسل علم کے حصول میں جدوجہد کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتی ہے۔ یاد رکھیں! علم ایسی دولت ہے کہ جس میں زیادتی باعث سکون بنتی ہے جب کہ مال کی زیادتی انسان کے لیے بے سکونی کا باعث بن جاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ علم کے ذریعے دنیا میں اپنا مقام پیدا کریں کیوں کہ ایک جاہل آدمی کبھی اہل علم سے ہمسری کا دعوی نہیں کر سکتا۔ حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے، ''انسان کانوں کی مانند ہیں''۔ جیسے کانیں مختلف معدنیات کی ہوتی ہیں بالکل اسی طرح ہر انسان کے اندر مختلف قسم کی صلاحیتیں ہیں، جنہیں نکھارنے کے لیے علم کی ملمع سازی کی ضرورت ہے۔ حصول علم کے لیے عمر کی قید نہیں ہے۔ مہد سے لحد تک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہر کس و ناکس کو علم کے زیور سے آراستہ ہو کر سفینۂ امت کو سہارا دینا چاہیے۔ اس علم کے ذریعے ہی اس بیمار معاشرے کی تجدید نو کا کام سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

مولانا تنویر احمد اعوان

مولانا تنویر احمد اعوان

ولد محمد اشرف اعوان کا تعلق تحصیل حویلیاں سے ہے۔ حفظ قرآن پاک اور تخصص فی اللغۃ العربیہ کے ساتھ ساتھ میڈیا ورکشاپ سے صحافت کی تعلیم حاصل ہے۔

آپ رائٹرز کلب کے رکن کی حیثیت سے ملک بھر کے نوجوانوں کو تعمیر وطن اور اسلامی و مشرقی اقدار کے تحفظ و بقا کے لیے اپنی قلمی خدمات کو پیش کیے ہوئے ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ مقام سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ اور پیغام کربلا

2۔ حرم مکہ، اہل ایمان کی محبتوں کا مرکز

3۔ ماہِ صفر....توہمات اور اسلامی تعلیمات

4۔ صحابہ کرام، معیار ایمان

☆.....☆.....☆

مقام سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ اور پیغام کربلا

تاریخ اسلام کا اہم باب ایثار، قربانیوں اور شہادتوں سے معنون ہے، جب کہ اللہ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت پر یقین اور اقرار کرنے والے ہر مسلمان مرد و عورت کی زندگی اسی جذبے سے عبارت ہوتی ہے۔ تکمیل ایمان کے لیے ارشاد باری تعالیٰ بھی یہی ہے: ''آپ کہہ دیجیے، میری نماز، میری عبادتیں، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ (الانعام۔162) بلاشبہ اسلام کے ابتدائی زمانے کے مصائب و آلام سے پُر اور تکلیف دہ حالات ہوں یا غزوات اور جنگوں کی تاریخ، ہر ایک موقع پر صحابہ کرام میں فنائیت کا یہ جذبہ ہی غالب نظر آتا ہے، 'اللہ کے لیے جینے اور اللہ ہی کے لیے مرنے' کا جذبہ قرونِ اولیٰ میں بدرجہ اتم موجود تھا، انہی مواقع میں سے ایک موقع معرکۂ کربلا کا بھی ہے، جس کے دو پہلو مدنظر رہنے چاہئیں، اوّل یہ کہ جگر گوشۂ بتول، نواسۂ رسول ﷺ، حیدر کرار رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند، جنت کے نوجوانوں کے سردار، سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ۔ دوم، واقعہ کربلا سے اہل ایمان کو کیا پیغام اور سبق ملتا ہے؟

سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ اور چمنستانِ نبوت کے چہکتے ہوئے عندلیب تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''(سیّدنا) حَسن و حُسین (رضی اللہ عنہما) جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔ (الترمذی) اسی وجہ سے آپ کا لقب ''سیّد شباب اہل الجنۃ'' اور ''ریحانۃ النبی'' مشہور تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کا نام بھی خود تجویز فرمایا اور آپ سے بے حد محبت و شفقت فرماتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو حَسن و حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت رکھے، اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جو ان سے بغض رکھے، اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ (سنن ابن ماجہ)

حضرت سعید بن راشد سے مروی ہے کہ یعلی بن مرہ نے ان سے بیان کیا کہ وہ لوگ نبی ﷺ کے ساتھ ایک دعوتِ طعام کے لیے نکلے۔ حُسینؓ گلی میں کھیل رہے تھے، نبی ﷺ اُن لوگوں سے آگے بڑھے اور اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ (حضرت حُسینؓ) اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ نبی ﷺ ان کو ہنساتے رہے، یہاں تک کہ ان کو پکڑ لیا۔ آپ ﷺ نے

ایک ہاتھ حُسینؓ کی ٹھوڑی کے نیچے اور دوسرا سر کے اوپر رکھا اور بوسہ لیا پھر فرمایا، حُسینؓ مجھ سے ہیں اور میں حُسینؓ سے ہوں۔ اللہ ان سے محبت رکھتا ہے جو حُسینؓ سے محبت رکھتے ہیں۔ حُسینؓ پیشانی ہیں پیشانیوں میں سے۔ (سنن ابن ماجہ) آپ ﷺ روزانہ اپنے دونوں نواسوں کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھا کے گھر دیکھنے جاتے اور ان سے پیار کرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دنیا سے پردہ فرمایا تو اس وقت حُسینؓ کی عمر قریباً سات برس تھی۔ آپ اپنے نانا کے کافی حد تک ہم شکل تھے۔ آپ بچپن ہی سے اصلاح و تعلیم کی طرف رجحان رکھتے تھے، سخاوت، عبادت و ریاضت اور کثرت سے روزے رکھنا، آپ کا معمول تھا۔ حضرات شیخین رضوان اللہ علیھم اجمعین اپنے اپنے دور خلافت میں آپ پر شفقت اور آپ کی رسول اللہ ﷺ سے قرابت کا بدرجہ اولیٰ لحاظ رکھتے اور آپ کے اکرام میں کسی قسم کی کمی نہ فرماتے تھے۔ حضرت امیر المومنین سیّدنا عثمان کے دَورِ خلافت میں آپ نے سن 30 ہجری میں طرستان کے جہاد میں شرکت کی جب کہ مدینۂ منورہ پر بلوائیوں کے حملے کے دوران آپ رضی اللہ عنہ بیتِ امیر المومنین کی حفاظت کے لیے اپنے بھائی حضرت سیّدنا حَسن رضی اللہ عنہ اور دیگر نوجوانوں کے ساتھ ہمہ وقت موجود رہے تھے۔

واقعہ کربلا ہماری اسلامی تاریخ کا ایک تلخ باب ہے، کہ کربلا کے میدان میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لاڈلے اور چہیتے نواسے کو اسی کے ماننے والوں نے خاندان سمیت بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ نے یزید، جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے جانشین کے طور پر سن 60 ہجری میں خلیفہ بنا تھا، کی بیعت سے انکار کیا تو کوفے والوں نے حضرت سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ کے نام ہزاروں خطوط روانہ کیے، جن میں تحریر تھا، ''اب اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے، آپ تشریف لے آیئے کہ شاید اللہ آپ کے ذریعے ہم لوگوں کو حق پر جمع کر دے، یہاں جو اموی گورنر نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) ہیں، ہم ان کے پیچھے جمعہ اور عید تک نہیں پڑھتے۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ اِدھر کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم ان شاء اللہ ان کا بستر باندھ کر شام بھیج دیں گے''۔ (طبری ج6 ص 197) لیکن عبید اللہ بن زیاد کے گورنر کوفہ بننے کے ساتھ ہی اہل کوفہ کے تیور بھی بدل گئے اور حضرت سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ کے نمائندے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو تنہا چھوڑ دیا، جنہیں گورنر کوفہ نے شہید کروا دیا تھا۔ یاد رہے کہ کوفیوں کی بے وفائی سے قبل حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ نے حضرت سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ کو کوفیوں کی وفاداری کا خط لکھ دیا تھا اور حضرت سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ یہ خط موصول ہونے کے بعد اپنے اہل و عیال اور نوجوانوں سمیت کوفے کی طرف عازم سفر ہو چکے تھے۔ اس موقع پر حضرت ابن عباس، حضرت ابو سعید خدری، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنھم سمیت کبار صحابہ کرام نے کوفے کی طرف جانے روکا مگر آپ عزم مصمم کر چکے تھے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب ابن زیاد کی فوج، جس کی قیادت عمرو بن سعد بن وقاص کر رہا تھا، نے آپؓ کا راستہ روکا تو آپؓ نے عمرو کے سامنے تین شرائط رکھیں: اوّل یہ کہ مجھے چھوڑ دو

میں جہاں سے آیا ہوں، وہیں لوٹ جاؤں۔ دوم یہ کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو۔ سوم یہ کہ کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو۔ عمرو نے اس پر آمادگی کا اظہار کیا مگر ابن زیاد نے ان شرائط کو مسترد کر دیا اور یزید کے لیے آپ کی بیعت یا آپ کی گرفتاری سے کم کسی صورت رضامند نہ تھا۔ (طبری) جب کہ سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ خود یزید سے روبرو ملاقات اور گفتگو کے خواہاں تھے۔

چناں چہ 10 محرم الحرام کو میدان کربلا میں سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ کی قیادت میں یہ قافلۂ حریت داستانِ عزم وشجاعت رقم کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر کے سرخ رو ہو گیا جب کہ ہزاروں خط لکھنے والے کوفیوں کی تلواریں، ابن زیاد کے بھیجے ہوئے لشکر کے ساتھ اہل بیت کے پاکیزہ خون سے رنگین تھیں، جو اہل بیت رسول ﷺ کے ساتھ بدترین غداری اور دھوکا تھا، جب کہ سیّدنا حُسین رضی اللہ عنہ نے جس مسئلے کو حق جانا، کٹھن حالات کے باوجود اس پر پوری شرح صدر کے ساتھ ڈٹ گئے، یہاں تک کہ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ آپ کی شہادت یہ درس دیتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہر متاعِ عزیز سے قیمتی تر شے ہے جس کے قیام کے لیے جان قربان کر دینا اصل کامیابی ہے، شہید کی موت حیاتِ جاوداں کی ابتدا ہے جس پر فخر کیا جا سکتا ہے، ندامت، ماتم اور واویلا نہیں۔

☆.....☆.....☆

حرم مکہ.....اہل ایمان کی محبتوں کا مرکز

اللہ کریم نے سر زمین مکہ کو بہت زیادہ عظمتیں اور رفعتیں عطا فرمائی ہیں، اسے حرمت والا شہر قرار دیا اور ہزاروں انبیائے کرام کی قیام گاہ اور آخری آرام گاہ بنایا۔اس کی شان یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی یہ قانون رہا کہ جو یہاں داخل ہو گیا وہ امان پا گیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی جائے پیدائش اور اللہ کریم کا محبوب ترین شہر ہے۔مرکزِ وحی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شہر اسلام کی شان وشوکت کی علامت بھی ہے۔اسلامی تاریخ،تہذیب وثقافت کے اس مرکز کو دنیا کی بقا کا ضامن بھی قرار دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے،''میری امت جب تک اس حرم مقدس کا پورا احترام کرتی رہے گی اور اس کی حرمت وتعظیم کا حق ادا کرے گی، خیریت سے رہے گی اور جب اس میں یہ بات باقی نہ رہے گی، برباد ہو جائے گی''۔(سنن ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ اس مقدس شہر سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے کیوں کہ یہ روئے زمین میں سب سے افضل جگہ ہے۔اللہ کریم کی تجلیات کا مرکز، قیامت تک اہل ایمان کا قبلہ اور مرکز ایمان، یہی شہر ہے۔ہجرتِ مدینہ کے موقع پر آپ ﷺ نے شہر مکہ کے لیے جو کلمات ارشاد فرمائے،ان کا ہر ہر لفظ اس شہر کا مقام ومرتبے واضح کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عدیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ مکے میں مقام حزورہ پر کھڑے تھے اور مکے سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے،''اللہ کی قسم اے مکہ! تو اللہ کی ساری زمین سے بہتر جگہ ہے اور اللہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے،اگر مجھے یہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور نہ کیا گیا ہوتا تو میں ہرگز تجھے چھوڑ کے نہ جاتا''۔(جامع ترمذی)

مکہ مکرمہ کے وسط میں وہ قدیم ترین گھر موجود ہے جس کو اس روئے زمین پر سب سے پہلے عبادت کے لیے

تعمیر کیا گیا، جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السّلام نے رکھی۔ اسی بے آب و گیاہ وادی کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اللہ کے حکم سے آباد کیا، یہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے ایڑیاں رگڑنے سے آب زم زم کا ایسا چشمہ ظاہر ہوا کہ صدیوں سے خلق خدا اس سے فیض یاب ہوتی چلی آ رہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے ساتھ وادیٔ مکہ میں دوبارہ بیت اللہ کی بنیادیں، جو حوادثِ زمانہ کی وجہ سے معدوم ہو چکی تھیں، کھود کر اس کی تعمیر مکمل فرمائی۔ اللہ کریم نے آپ کو لوگوں میں حج کا اعلان کرنے کا حکم فرمایا۔ ''اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو کہ وہ تمہارے پاس پیدل آئیں اور دور دراز کے راستوں سے سفر کرنے والی ان اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں، جو (لمبے سفر سے) دبلی ہو گئی ہوں''۔ (الحج۔ 27)

اور نبی آخر الزّماں اور اس گھر کی آبادی کے لیے دعا فرمائی اور اس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم علیہ السّلام بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے اور اسمٰعیل بھی۔

''اے ہمارے پروردگار! ہماری (یہ خدمت) قبول فرما لے۔ بے شک تو اور صرف تو ہی، ہر ایک کی سننے والا، ہر ایک کو جاننے والا ہے''۔ (البقرۃ۔ 127)

اور آپ نے بیت اللہ کی آبادی کے لیے یہ دعا فرمائی، ''اے ہمارے پروردگار! ان میں ایک ایسا رسول بھیج جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاکیزہ بنائے''۔

(البقرۃ۔ 129) یہی وجہ ہے کہ بیت اللہ کی دیکھ بھال اور یہاں آنے والے حاجیوں کی خدمت آل اسمٰعیل میں رہی اور نبی کریم ﷺ کی ولادت و بعثت بھی مکہ اور آل اسمٰعیل میں ہوئی۔

بیت اللہ کو بیت العتیق بھی کہا جاتا ہے یعنی سب سے قدیم گھر یا آزاد گھر۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ''بے شک اللہ کریم نے بیت اللہ کا نام عتیق اس لیے رکھا کہ اسے ہر ظالم و جابر اور طاغوتی طاقتوں سے آزاد رکھا ہے۔ لہٰذا، کبھی کوئی ظالم و جابر اس پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا''۔ (مستدرک حاکم)

جب کہ بیت اللہ کے عین اوپر ساتویں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، جسے ''بیت المعمور'' کہا جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ''بیت المعمور'' ساتویں آسمان میں ہے، اس میں روزانہ ستّر ہزار فرشتے داخل ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، جو ایک بار اس میں داخل ہو گئے انہیں دوبارہ داخل ہونے کی نوبت نہ آ سکے گی، حتیٰ کہ قیامت قائم ہو جائے گی''۔ (شعب الایمان)

اللہ کریم نے امت مسلمہ کے صاحب استطاعت لوگوں پر حج بیت اللہ کو فرض قرار دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے، ''اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، ان پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے اور اگر کوئی انکار کرے تو اللہ دنیا جہاں کے تمام لوگوں سے بے نیاز ہے''۔ (آل عمران۔ 97)

بیت اللہ پر انوارات و برکات کا نزول اتنی کثرت سے ہوتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ''میری مسجد میں نماز، دوسری مساجد کی بہ نسبت ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے مگر مسجد الحرام میں نماز ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ (مسند احمد)

حرم کی نیکیوں کی قدر کا بڑھنا صرف نماز تک محدود نہیں بلکہ حدودِ حرم میں کی جانے والی ہر نیکی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

بلاشبہ حرم مکہ کے ساتھ جڑنے والی ہر نسبت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ہر مسلمان کا دل اہل حرم کے ساتھ اور ارضِ حرم کے لیے ہر آن اور ہر گھڑی دھڑکتا رہتا ہے، ہر آنکھ بیت اللہ کے دیدار کے لیے تڑپتی رہتی ہے، جو حج و عمرہ کی سعادت حاصل چکے ہوتے ہیں وہ دوبارہ شرفِ باریابی کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں کہ بیت اللہ کی محبت ہر مسلمان کے ایمان کا جزو لاینفک ہے، جسے وہ سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

☆.....☆.....☆

ماہِ صفر...توہمات اور اسلامی تعلیمات

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہ نمائی کے لیے قرآن اور حدیث کی صورت میں احکامات نازل فرمائے ہیں، جو انسانوں کو غلامی سے نکال کر حریت اور آزادی کا درس دیتے ہیں۔ توہمات سے نکال کر حقیقت، معقولیت اور اعتدال کی روشنی میں لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ احکامات انسان کو مشکلات اور تکلفات سے چھٹکارا عطا کرتے ہیں۔ بنی نوع انسان سے متعلق جتنے بھی امور ہیں، ان کے بارے میں تعلیمات الٰہیہ غیر مبہم انداز میں موجود اور محفوظ ہیں جو معاشرے میں پائے جانے والے توہمات اور غلط رسومات کی مکمل نفی کرتی ہیں۔

تقویمِ اسلامی کے دوسرے مہینے ''صفر المظفر'' کے حوالے سے اسلام سے قبل بالخصوص عرب معاشرہ اور بالعموم پوری دنیا، توہمات و شرکیہ رسومات کا شکار تھی۔ مشرکین اس مہینے میں سفر کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ چوں کہ حرمت کے مہینوں کے بعد پہلا مہینہ ہونے کی وجہ سے اس میں قتل و قتال کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا تھا اور لوگ خوف کی وجہ سے اپنے گھروں کو خالی کر دیتے تھے، اس لیے اسے نحوست والا مہینہ سمجھا جاتا تھا جب کہ برصغیر پاک و ہند میں اسے ''تیرہ تیزی'' کا مہینہ کہا جاتا ہے کہ اس کے پہلے تیرہ دنوں میں مصیبتیں اور بلائیں اترتی ہیں۔ یہ عقیدہ بھی اس کے ساتھ جوڑا گیا ہے کہ اس کے پہلے تیرہ دن پیغمبر اسلام ﷺ کو بخار ہوا تھا، جو حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ ایک یہ عقیدہ بھی عام ہے کہ اس ماہ کے آخری بدھ کو رسول اللہ ﷺ نے غسل صحت کیا تھا اس لیے اس دن کو عید جیسے منایا جائے، جب کہ سیرتِ طیبہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیماری صفر کے آخری ایّام میں شروع ہوئی تھی۔

ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ اس ماہ میں آسمان سے لولے لنگڑے جن، زمین پر اترتے ہیں، اس لیے چلتے وقت قدم بسم اللہ پڑھ کر رکھے جائیں تا کہ ان کو ایذا نہ ہو اور یہ نظریۂ باطلہ بھی موجود ہے کہ اس مہینے میں شادی، بیاہ اور خوشی کی

تقریبات، کسی کاروبار کا افتتاح یا کسی اہم کام کی ابتدا نہ کی جائے بصورت دیگر نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بعض لوگ اس ماہ کی نحوست کو مٹی کے برتن توڑ کر اور بعض لوہے کے ''چھلے'' تقسیم کر کے دور کرتے ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدے میں عام ہے کہ لوگ اس ماہ کی نحوست سے بچاؤ کے لیے اس ماہ کی تیرہ تاریخ کو ''گھونگنیاں'' یعنی چنے یا گندم ابال کر تقسیم کرتے ہیں۔ بعض علاقوں میں گندم کی روٹی کی دیسی گھی میں چوری بنا کر تقسیم کی جاتی ہے۔

بلاشبہ اسلام نے روزِ اوّل ہی سے عقیدے کی پاکیزگی اور توہمات کی نفی کی تعلیم دی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے، ''ایک بیماری کا حکم الٰہی کے بغیر دوسرے کو لگ جانا، پرندے سے بدفالی اور نحوست لینا، اُلو اور ماہ صفر کو منحوس سمجھنے میں کوئی حقیقت نہیں ہے''۔ (مشکوٰۃ۔4579) نفع ونقصان، خوشی وغمی، کامیابی وناکامی، زندگی وموت کا اختیار صرف اللہ کریم ہی کو ہے۔ اگر ان صفات میں کسی دوسری چیز، جگہ، وقت اور شخصیت کو مؤثر مانا جائے تو یہ شرک فی الصّفات کہلاتا ہے، جو کسی صورت معاف نہیں ہوتا ہے سوائے توبہ کے۔ اللہ کریم نے کوئی شے منحوس نہیں پیدا کی ہے اور نہ ہی کوئی چیز اللہ کے حکم کے بغیر نفع اور نقصان دے سکتی ہے۔ دنیا میں نظر آنے والی ہر شے کا مالک اللہ ہے اور دن ورات، ہفتے اور مہینے، زمین اور آسمان، سب اللہ کریم کی تخلیق ہیں اور اس نے کسی کو منحوس نہیں بنایا۔ آپ ﷺ نے تکرار کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ ''کسی چیز کو منحوس خیال کرنا شرک ہے، کسی چیز کو منحوس خیال کرنا شرک ہے''۔ (مسند احمد) قرآن پاک میں حالات کے بننے اور بگڑنے کے بارے میں ارشاد فرمایا، ''انسانوں نے اپنے ہاتھوں جو کمائی کی اس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیلا''۔ (الروم۔41) نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد ماہ صفر کو ''صفر المظفر'' اور ''صفر الخیر'' کہا گیا یعنی یہ کامیابیوں اور خیر وبرکت کا مہینہ ہے تاکہ منحوس ہونے کا تصور ونظریہ مسلمانوں کے دلوں سے نکل جائے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ توہمات، رسومات، بدعات اور بے راہ روی صرف اور صرف اسلامی تعلیمات سے دُوری کا نتیجہ ہیں۔ جب تک مسلمانوں نے کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ ﷺ کو مشعل راہ بنایا ہوا تھا، اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں سستی اور کاہلی سے کام نہیں لیتے تھے، اس وقت جہالت، شرک اور بدعات کے اندھیرے اپنی راہ لے چکے تھے۔ صرف اللہ رب العزت کی ذات پر غیر متزلزل یقین نے ہی سلف صالحین کا ہمیشہ کے لیے امر کیا ہوا ہے اور موجودہ دَور میں صرف اور صرف قرآنی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کے پاکیزہ اسوہ ہی ہمیں تمام غلط عقائد، توہمات، مشکلات اور بدشگونیوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

صحابہ کرام....معیارِ ایمان

صحابی، صحبت سے ہے۔ صحابی سے مراد وہ شخص ہے جسے اپنی زندگی میں بحالت اسلام، اپنی آنکھوں سے براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے دیدار کا شرف نصیب ہوا اور پھر وہ مسلسل تادَمِ آخر دینِ اسلام پر قائم رہا اور اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی۔ گویا جماعتِ صحابہ، ان مقدس شخصیات کو کہا جائے گا جنہیں براہِ راست خاتم الانبیاء وامام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت نصیب ہوئی اور انہوں نے انوارات نبوت سے اپنے قلوب کو منور کیا، پیغمبر اسلام ﷺ سے اللہ کریم کا کلام سیکھا، کتاب وحکمت سے بہرہ مند ہوئے اور قلوب ونفوس کی پاکیزگی حاصل کر کے ہدایت یافتہ اور ایمان کا معیار ٹھہرے۔ اللہ کریم نے ایمان وتقویٰ کو ان کے لیے سب سے محبوب شے بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امت میں اعلیٰ مقام ومرتبے کے حامل علماء، اولیاء اور مشائخ، سب مل کر ادنیٰ صحابی کے مقام ومرتبے تک نہیں پہنچ سکتے۔ قرآن کریم میں صحابہ کرام کا تعارف ان الفاظ میں کروایا گیا، ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تو ان کو دیکھے گا کہ وہ اللہ کے فضل ورضا کی تلاش میں رکوع وسجدہ کر رہے ہیں۔ سجدے کی تاثیر سے ان کے چہروں پر ان کے آثارِ نماز ہیں۔ یہ ان کے اوصاف، تورات میں ہیں اور ان کی مثال انجیل میں یوں ہے جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے سوئی کو مضبوط کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی تاکہ کافر لوگ ان سے جلیں۔ اللہ نے ان ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ (الفتح۔29)

صحابہ کرام معیارِ ایمان ہیں اور کامیابی وہدایت کے لیے ایسا ہی ایمان مطلوب ٹھہرا۔ اللہ کریم کا ارشاد مبارک ہے، ''اگر وہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو، تب وہ راہ راست پر آجائیں گے''۔ (البقرۃ۔137) نبی کریم ﷺ نے جماعتِ صحابہ کو نجوم ہدایت ارشاد فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے، ''میرے

صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی اقتدا کروگے، ہدایت پاجاؤ گے''۔(صحیح بخاری)

رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی ہو یا مدنی، شعب ابی طالب ہو یا غزوات وسرایا، ہجرت کے کٹھن مراحل ہوں یا فتوحات کے مواقع، الغرض ہر لمحہ اور ہر گھڑی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ اپنے عہد کو نبھاتے رہے، یہاں تک کہ اللہ کریم نے ان ہستیوں سے راضی ہوکر قرآن پاک میں ارشاد فرمایا،''اللہ ان سے راضی اور خوش اور یہ اللہ سے راضی اور خوش ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ کی عالی صفات کا''پَرتَو'' یہی نفوسِ قدسیہ تھیں۔آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے،''میری امت میں، میری امت پر، سب سے رحم دل ابوبکر ہیں، اللہ کے احکام کی تعمیل میں سب سے سخت عمر ہیں، ان میں سب سے زیادہ حیا کے اعتبار سے بڑھے ہوئے عثمان ہیں، سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے علی ہیں''۔(جامع ترمذی) جب کہ دَورِ نبوت اور دَورِ صحابہ وتابعین کو بہترین زمانہ قرار دیا گی۔آپ ﷺ نے فرمایا،''بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے میں ہیں، پھر وہ لوگ، جو اُن کے بعد اور پھر وہ لوگ، جو اُن کے بعد''۔(صحیح مسلم)

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کے وجود مسعود کو باعثِ خیر وبرکت کا ذریعہ ارشاد فرمایا۔چناں چہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السّلام نے فرمایا،''ستارے آسمان کے لیے امان ہیں، جب ستارے جھڑ جائیں گے تو آسمان بھی اس چیز کو لے آئے گا جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اور میں اپنے صحابہ کے لیے امان ہوں۔جب میں فوت ہو جاؤں گا تو میرے صحابہ میری امت کے لیے امان ہیں، جب میرے صحابہ ختم ہو جائیں گے تو میری امت پر وہ وقت آئے گا، جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے''۔(صحیح مسلم)

حضرت خاتم الانبیا ﷺ نے امت کو صحابہ کے اکرام، عزت وناموس کی پاس داری وحفاظت کا حکم دیا۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،''اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو، میرے صحابہ کے بارے میں۔میرے بعد ان کو ہدفِ ملامت نہ بناؤ کیوں کہ جو اُن سے محبت کرتا ہے، وہ میری محبت کی وجہ سے کرتا ہے اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے، وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے رکھتا ہے اور جو اُن کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ مجھے تکلیف پہنچاتا ہے اور جو مجھے تکلیف دیتا ہے، وہ اللہ کو تکلیف دیتا ہے اور خدا کو تکلیف دینے والا قریب ہے کہ پکڑا جائے''۔(سنن ترمذی)

یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے مکمل دین، علوم، معارف اور حکیمانہ اُسلوب، حضرات صحابہ کرام کے واسطے سے ہم تک پہنچے ہیں، یعنی جماعت صحابہ کرام امت اور نبوت کے درمیان قابل اعتماد اور مضبوط واسطہ ہے، جب کہ علمائے امت کا متفقہ اصول ہے کہ صحابہ سارے کے سارے عادل، امانت دار اور قابل بھروسا ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ نے''الاستیعاب'' میں لکھا ہے،''یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہر زمانے کے

لوگوں سے افضل ہیں اور خیر امت ہیں جنہیں لوگوں کی بھلائی کے لیے ظاہر کیا گیا اور ان سبھی کی عدالت اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کی تعریف وتوصیف سے ثابت ہے اور ان سے بڑھ کر کون عادل ہوسکتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ونصرت کے لیے پسند کر لیا ہو اور کسی کے حق میں عدالت وثقاہت کی شہادت اللہ ورسول کی شہادت وگواہی سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی''۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

نور بخاری

سیدہ زہرہ کریم کا قلمی نام نور بخاری ہے۔8 برسوں سے اردو ادب سے وابستہ ہیں اور مختلف اخبارات میں کالم لکھتی رہی ہیں۔ان کا تعلق پنجاب کی تحصیل کھرڑیانوالہ سے ہے۔تعلیم ایم اے اور بی ایڈ ہے۔رائٹرز کلب سے وابستگی کو 3 برس مکمل ہو چکے ہیں۔رائٹرز کلب کے پلیٹ فارم سے ملک کے نمایاں جرائد میں اپنی تحریریں چھپوا چکی ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔حصول تعلیم اور مقاصد

2۔گرمی کی آمد

3۔ملک ہمارا،رسومات ہندوؤں کی

4۔نفسیاتی بیماریاں اور علاج

5۔ملک میں تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے؟

☆.....☆.....☆

حصول تعلیم اور مقاصد

علم کی افادیت سے وہی باخبر ہوسکتا ہے جو علم کی اہمیت سے آگاہ ہو۔ جیسا کہ ہمارے مذہب اسلام میں علم کی اہمیت بہت اچھے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ مرد اور عورت، دونوں کے لیے علم حاصل کرنا بہت ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایک بات غور طلب ہے۔ اگر مرد تعلیم یافتہ ہو تو اس کے علم کی روشنی سے صرف ایک گھر منور ہوسکتا ہے لیکن اگر ایک عورت تعلیم یافتہ ہو تو اس کے علم کی روشنی کئی نسلوں کو منور کرتی ہے۔ وطن عزیز حاصل کیے ایک طویل عرصہ بیت گیا۔ تاہم، آج بھی ملک کے بیش تر علاقے تعلیم سے محروم ہیں۔ بطور ایک مسلم، اگر ہم تعلیم کی اہمیت وافادیت کو سمجھیں تو یقیناً اسلام نے تعلیم کا حصول ہر مسلم مرد وزن پر لازمی قرار دیا ہے۔ شروع اسلام میں جنگوں کے دوران بھی اسلام نے تعلیم کی بنیاد پر بہت سے دشمنان اسلام کے قیدیوں کو رہائی دیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ہم ہی وہ تھے جنہوں نے تعلیم وتعلم میں وہ کمال حاصل کیا تھا کہ جس کے بہت سے نشانات آج بھی یورپ کی لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ شاید ہم نے اسلام اور پھر تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کی، جس کی وجہ سے ہم پس ماندگیوں میں گرتے چلے گئے۔ وطن عزیز کا حصول یقیناً ایک آزاد مملکت کا حصول تھا، جہاں ہم اپنی آزادی سے جی سکیں۔ تعلیم وتعلم کا حصول اپنے انداز میں جاری رکھ سکیں۔ مگر اللہ کے فضل وکرم سے ملک تو حاصل کر ہی لیا۔ تاہم، وہ مقاصد حاصل کرنے سے تا حال قاصر دکھائی دیتے ہیں، جو حصول وطن کے لیے رکھے گئے تھے۔ خود کو جسمانی طور پر غیروں سے آزاد تو کرالیا تاہم، ذہنی طور پر آج تک ان کی غلامی سے باہر نہیں آسکے۔

ہندووانہ رسم ورواج اور ان کے کلچر کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنانا عام بات ہوگئی ہے۔ ایسا لگتا کہ اسلام سے دوری ہی تعلیم سے دوری کا باعث بن رہی ہے۔ تعلیم سے دوری، اسلام سے دوری اور اسلام سے دوری، تعلیم سے دوری،

دونوں ایک دوسرے کے مترادفات ہی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں سیاسی رسہ کشی کے بجائے اپنے معیار تعلیم کو بہتر کرنا ہوگا۔

ملک کی آزاد قوم کو بھی یہ سوچنا ہوگا کہ یہ ملک ایک مقصد کے تحت حاصل کیا گیا تھا۔اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام اور پھر تعلیم کا حصول یقینی بنا کر معاشرے کو بہتر سے بہترین افراد مہیا کیے جائیں۔

☆.....☆.....☆

گرمی کی آمد

موسم گرما کی آمد آمد ہے۔ موسم گرما اپریل کے مہینے سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس موسم میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ سورج کی شعاعیں سیدھی پڑتی ہیں۔ اس کی تپش بڑھ جاتی ہے۔ جون جولائی کے مہینے میں تو گرمی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ 15 جولائی سے جب ساون آتا ہے تو بارشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ کبھی حبس اور گھٹن بڑھ جاتی ہے تو کبھی موسم معتدل سا ہو جاتا ہے۔

زیادہ تر لوگوں کو گرمی کا موسم نہیں پسند کیوں کہ گرمیوں میں بھوک کم ہو جاتی ہے، سستی سی چھائی رہتی ہے، کوئی کام کرنے کا دل نہیں کرتا اور نیند سی طاری رہتی ہے۔ جلد بہت خشک ہو جاتی ہے۔ گرمی اکثر ذہن کو بھی متاثر کرتی ہے۔ جب ذہن گرمی اور خشکی سے متاثر ہوتا ہے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت سی بیماریاں متاثر کرتی ہیں۔ اس موسم میں حشرات الارض اپنے بلوں سے باہر آ جاتے ہیں۔ مچھر مکھیوں کی بہتات ہو جاتی ہے۔ بجلی کی بار بار لوڈ شیڈنگ ہونے سے لوگوں میں چڑچڑا پن حد سے سوا ہو جاتا ہے۔ یہ سب زیادہ تر بداحتیاطی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس موسم میں بے شمار قسم کے پھل ہوتے ہیں اور سبزیاں بھی۔ سو اس موسم میں تربوز، آم، آڑو، خوبانی اور دوسرے پھلوں کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے۔ زیادہ بھی سلاد کھانا چاہیے۔ گوشت کی نسبت سبزیوں کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے۔ کم سے کم بارہ سے اٹھارہ گلاس پانی پینا چاہیے۔ کوشش کی جائے کہ پانی زیادہ ٹھنڈا یا برف والا نہ ہو بلکہ تازہ پانی ہو۔ یخ ٹھنڈا پانی بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ وقتی طور پر تھوڑا سکون دے گا لیکن مسلز کو کم زور کر کے اندر گرمی پیدا کرے گا۔ اس موسم میں لیموں کی شکن جبین بنا کر پینی چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ جوسز، ٹھنڈے مشروبات، دودھ، دہی اور لسی کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس سے ایک تو جلد تر و تازہ رہتی ہے دوسرے بیماریاں بھی دور رہتی ہیں۔ روزمرہ کے معمولات بآسانی سرانجام دیے جا سکتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں بازاروں میں جگہ جگہ شربتوں اور ٹھنڈے پانی کے ٹھیلے لگ جاتے ہیں تا کہ گرمی سے بے حال لوگ گرمی سے بچنے کا سد باب کر سکیں۔ گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی بازار میں لان کے کپڑے اور باریک کپڑوں کی ورائٹی آ جاتی ہے۔ کوشش کی جائے کہ

ہلکے رنگوں کے لباس بنوائے جائیں، ان سے گرمی کے احساس میں کمی واقع ہوتی ہے۔

تیز دھوپ میں باہر نکلنے سے احتیاط کرنی چاہیے۔ اگر بہت ضروری کام سے یا بوجہ مجبوری نکلنا ہی پڑے تو چھاتا لے کر یا ململ کے کپڑے سے سر، منہ ڈھانپ کر نکلیں۔ آنکھوں پر کوئی اچھا سا چشمہ لگا کر نکلیں نہیں تو سن سٹروک کا خدشہ ہے۔ بہتر ہے کہ گرمی سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ ویسے تو گرمیوں کا موسم شجر کاری کے لیے بہت موزوں ہے۔ گندم کی پکائی، کٹائی اسی موسم میں ہوتی ہے اور انواع اقسام کے پھل، سبزیاں مل جاتے ہیں۔ سو گرمی کا توڑ کرنے کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ گرمی کا موسم اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے اس لیے اللہ کا شُکر گزار ہونا چاہیے۔

☆.....☆.....☆

ملک ہمارا، رسومات ہندوؤں کی

پاکستان کا حصول وقت کی ضرورت بن چکا تھا۔ آزادی کا مقصد تھا کہ ایک ایسا ملک ہوگا جہاں بطور مسلمان ہم اسلامی احکامات پر عمل درآمد کر سکیں گے۔ ملک کو اسلامی جمہوریہ کے نام سے حاصل تو کر لیا گیا تاہم، ملک میں اسلامی اقدار ہی کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ اس معاملے میں خواتین بہت آگے نکل گئیں۔ اسلامی اقدار تو دُور کی بات، ملّی اقدار کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔

یہ غیر اسلامی ہندووانہ رسومات کا سلسلہ شادی کے موقعوں پر سر چڑھ کر بولتا ہے۔ جہیز کی تیاری میں اتنا کچھ خرچ کر دیا جاتا ہے کہ قرض اٹھانا پڑ جاتا ہے۔ جہیز کے معاملے میں سماج میں باتیں نہ بنیں، اس فکر میں خواتین ہر حد تک چلی جاتی ہیں۔ خود پر بہت سارے قرض کا بوجھ لاد کر بیٹی کا جہیز ضرور تیار کیا جاتا ہے۔ ساتھ میں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا کہ کہیں برادری اور سسرال میں باتیں نہ سننی پڑیں۔ پھر مہندی کی رسم ہوتی ہے، اس کے بعد دعوتوں کے معاملات کا دَور آتا ہے، جس کا کم از کم ایک غریب آدمی متحمل نہیں ہوسکتا۔ اکثر و بیش تر انہیں حالات کے پیش نظر بیٹیوں کے بالوں میں سفیدی اتر آتی ہے۔ اس سے آگے بات بڑھتی ہے تو کھانے پر آجاتی ہے۔ بیٹی کے باراتیوں کے لیے طرح طرح کے کھانے، کم سے کم بھی تین ڈشز ضرور تیار کی جاتیں ہیں، اس پر بھی قرض اٹھا لیا جاتا ہے۔ بہت سے افراد یہاں بھی اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے ہندووانہ رسم و رواج پر عمل کرتے ہیں۔ ٹی وی چینلز اور کیبل پر چلتے غیر ملکی خصوصاً بھارتی ڈراموں نے بھی ہمارے معاشرے کی خواتین پر گہرے منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک فیشن، جنہیں والدین نے کبھی دیکھا اور سوچا تک نہیں ہوتا، انہیں اپنانے کی ضد کی جاتی ہے اور معاملہ اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ بچیاں والدین ہی سے ناراضی مول لے لیتی ہیں۔ ایسی ایسی عجیب و غریب فرمائشیں کی جاتی ہیں جنہیں پورا کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا، جن کا ہمارے مذہب سے دُور دُور تک کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا کہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ تاہم، حالات و واقعات مرضی پر تو کیا، اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔ قربانیوں کو بھلا کر جن سے آزادی حاصل کی تھی، انہیں کے رسوم و رواج پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ آج آزادی حاصل کیے ایک لمبا عرصہ ہو گیا پر ہندووانہ رسم و رواج جوں کے توں قائم ہیں۔ شادی میں مہندی، بارات، ولیمہ۔ تینوں تقریبات میں آپ فضول رسموں کا زور بآسانی دیکھ سکتے ہیں اور تو اور.... فضول خرچی بھی زوروں پر ہوتی ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے؟

متوسط طبقے کی بیٹیاں خاموشی سے اپنے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں لیے پیا گھر سدھار جاتیں۔ اگلے گھر میں اب بہوؤں کے ساتھ عجیب سلوک ہوتا۔ بات بات پر اسے خاندان کے طعنے دیے جاتے۔ مطلب ہر طرح سے اسے دباؤ میں رکھا جاتا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کوئی جواب دے گا؟ آخر کب تک ہم اپنی بیٹیوں کے خوابوں کا خون کرتے رہیں گے؟ آخر کب ہندووانہ رسم و رواج کا خاتمہ ہوگا؟ آخر کب یہ تسلیم کیا جائے گا کہ جہیز اتنا ضروری نہیں جتنی ضروری تعلیم اور شعور ہے؟ آخر کب پاکستان میں اسلامی احکامات نہ صرف رائج ہوں گے بلکہ ان پر عمل بھی ہوگا۔

☆.....☆.....☆

نفسیاتی بیماریاں اور علاج

آج کل کے دَور میں ذہنی بیماریاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ ذہنی بیماریوں میں ڈپریشن، شیزوفرینیا، اسٹریس، ذہنی وجسمانی تھکاوٹ، بہت زیادہ سوچنا، انسومنیا، پینک اٹیک، بے وجہ اداسی، انزائٹی، بے جا خوف، نیند بالکل نہ آنا، بہت زیادہ نیند آنا، باتیں بھولنا، طرح طرح کے فوبیاز اور گھبراہٹ وغیرہ شامل ہیں۔ اس تیز دَور میں قریباً ہر 20 میں سے 3 لوگ ذہنی ونفسیاتی بیماری کا شکار ہیں اور ہر عمر کے لوگ اس بیماری کا شکار ہو رہے ہیں۔ بچے بھی ان سے محفوظ نہیں۔ زیادہ تعداد خواتین کی ہے۔

روزانہ کی سرگرمیوں میں دلچسپی، افسوس یا خوشی کے احساسات سے ہم سب واقف ہیں لیکن اگر وہ ہماری زندگی پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں تو یہ شاید ڈپریشن ہو یا کوئی اور ذہنی بیماری۔ نفسیاتی بیماریاں بہت پیچیدہ ہوتی ہیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ ان کی اصل وجہ کیا ہے لیکن یہ مختلف وجوہ کی بِنا پر ہو سکتی ہیں۔ کچھ لوگ ایک سنگین طبی بیماری کے دوران ڈپریشن کا تجربہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو زندگی میں تبدیلیوں کے ساتھ ڈپریشن یا کوئی نفسیاتی عارضہ لاحق ہو سکتا ہے۔

<u>وجوہ:</u>

ذہنی بیماریاں مختلف وجوہ کی بِنا پر پھیل رہی ہیں جیسے بہت زیادہ سوچنا، زیادہ حساس ہونا، بلا وجہ کی روک ٹوک، موبائل فون کا حد سے زیادہ استعمال، کمپیوٹر یا ٹیلی ویژن کا زیادہ استعمال، ناقص غذا، تنہائی، شور زدہ ماحول میں رہنا، لوگوں کا رویہ، خود سے لاپروائی وغیرہ۔ غیر معمولی بلندی سے گرنا، نیند کی کمی، ڈرا دینے والے خیالات، خطرناک فیصلے، جو خطرے سے متعلق رویے کا سبب بن سکتے ہیں، غیر مناسب سماجی رویے، خاندانی رویوں پر موڈ کی خرابی، چھوٹی عمر میں والدین کو کھو دینا، سوشل سپورٹ سسٹم کی کمی یا اس طرح کے نقصان کا خطرہ، نفسیاتی اور سماجی کشیدگی جیسے کام کے

نقصان، تعلقات میں کشیدگی، علیحدگی یا طلاق، بچوں یا خواتین کا جسمانی یا جنسی ہراس کا شکار ہونا، احساس جرم کا شکار ہونا۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ کے مطابق تولیدی، جینیاتی یا دیگر حیاتیاتی عوامل، ایسے عوامل ہیں، جن میں خواتین میں ڈپریشن کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

علامات:

ذہنی بیماریوں کی کچھ علامات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

باتیں بھول جانا، نسیان، ہاتھ بار بار دھونا، اندھیرے سے ڈرنا، عجیب آوازیں سنائی دینا، ہر وقت اداسی چھائی رہنا، کوئی کام کرنے کا دل نہ کرنا، ہر وقت تھکے تھکے سے رہنا، بے زاری چھائی رہنا، بات بات پر غصہ آ جانا، چڑچڑا پن حد سے بڑھ جانا، بھوک نہ لگنا، نیند نہ آنا، تنہا رہنا، ہجوم سے گھبرانا، مایوسی چھائی رہنا وغیرہ۔

علاج:

کوئی بیماری ایسی نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو۔ تو ان بیماریوں کے شکار لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان بیماریوں سے لڑنے کے لیے بہت ہمت کے ساتھ ساتھ خاندان کے مثبت رویے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے اردگرد کوئی ایسا مریض موجود ہے تو اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن کیا کیا جائے، ہمارا معاشرہ کچھ ایسا ہے کہ ایسا کوئی بھی مریض، چاہے جتنا بھی قریبی ہو، اس کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی بجائے اسے طعنے دیے جاتے ہیں، باتیں سنائی جاتی ہیں۔ اس سے مقابلہ بازی کی جاتی ہے۔ ان باتوں سے مریض زیادہ نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایسے سنگ دل معاشرے میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پھر یا تو وہ جارحیت کا مظاہرہ کرتا ہے یا خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا پھر انتہائی شکل میں خودکشی کر لیتا ہے۔

خاندان کے افراد کو تعلیم دینے کے لیے معاون حل کے بارے میں بات چیت کی جانی چاہیے۔ ماہر نفسیات کو اپنے مریض کے ماحول سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ ماہر نفسیات، بھی بات چیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مثلاً ڈپریشن کے لیے نفسیاتی رویے سے متعلق بات چیت کے ذریعے تھراپی میں سنجیدگی (سی بی ٹی) اور دشواری حل کرنے کے علاج شامل ہیں۔ ڈپریشن کے ہلکے معاملات میں نفسیاتی علاج کے لیے پہلا اختیار ہے۔ شدید مقدمات میں دوسرے علاج کے ساتھ اعتدال پسندی اختیار کی جاسکتی ہے۔ جب کہ ایروبک مشق بھی ہلکی نفسیاتی بیماریوں کے خلاف مدد کر سکتی ہے کیوں کہ یہ endorphin کی سطح کو بڑھاتا ہے اور نیوروٹرانسمٹر نوریپینفائین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، جو موڈ سے متعلق ہے، اس کے ساتھ دوائیں بھی دی جاتی ہیں۔

تجاویز:

ایسے مرض سے چھٹکارا پانے کے لیے خاندان والوں کو از حد توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر گھر والے ساتھ

ہوں تو آدھی بیماری تو ویسے ہی ختم ہو جاتی ہے۔اگر گھر کا ماحول ٹھیک ہونے میں رکاوٹ بنتا ہو تو کچھ عرصے کے لیے مریض کا ماحول بدل دینا چاہیے۔مریض کو زیادہ سے زیادہ پانی پینا چاہیے۔اپنی غذا کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔اپنے ماہر نفسیات سے رجوع کرتے رہنا چاہیے۔ورزش کو معمول بنانا ہے۔نماز ادا کرنے کی عادت ڈالنی ہے۔تلاوت قرآن کرنی ہے۔ایسا مریض خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھے۔ان بیماریوں سے چھٹکارا پا کر،صحت مند ہو کر ہی معاشرے میں قابل قبول فرد بنا سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

ملک میں تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے؟

فرمانِ قائد ہے کہ: ''میرے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو دیانت داری، خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرنی چاہیے''۔ ملک میں تبدیلی لانے کے لیے ہمیں خود کو تبدیل کرنا ہوگا، خود اپنی اصلاح کرنی ہوگی کیوں کہ اس معاشرے کا بنیادی حصہ ہم خود ہیں۔ پہلے ہمیں خود اپنا جائزہ لے کر اپنی خامیاں سدھارنی ہیں۔ خود کو اہل کرنا ہے۔ اپنے اندر مثبت سوچ لانی ہے۔ ایسی مثبت سوچ، جس کے ذریعے ہم اپنی منفی اور تخریب کارانہ سوچوں کو شکست دے کر اپنی سوچوں اور ارادوں کو یک جا کر کے دوسروں کے لیے خود کو مددگار ثابت کرسکیں اور خود کو قرآن کے پلیٹ فارم پہ لاسکیں۔ خود میں بدلاؤ لا کر ہی ہم دوسروں میں بدلاؤ لانے کے قابل بن سکتے ہیں۔ تبھی ملک میں تبدیلی لانے کے لیے ضروری ہے کہ قوم متحد ہو۔ پہلے فرداً فرداً اپنی اصلاح کی جائے۔ اس سے معاشرے کی اصلاح ہوگی۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اسی طرح سے ملک بدلا جاسکتا کہ پہلے خود کو بدلا جائے، خود کو نکھارا جائے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور اسلام کیا ہے؟ اسلام جہاں انفرادی زندگی میں فرد کی اصلاح پر زور دیتا ہے، وہیں اجتماعی زندگی کے زرّیں اصول بھی وضع کرتا ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں میں انسانیت کی راہ نمائی کرتا ہے۔ اسلام کا نظامِ سیاست وحکم رانی موجودہ جمہوری نظام سے مختلف اور اس کے نقائص ومفاسد سے بالکل پاک ہے۔ اسلامی جمہوری نظامِ حیات میں جہاں عبادات کی اہمیت ہے، وہیں معاملات ومعاشرت اور اخلاقیات کو بھی اوّلین درجہ حاصل ہے۔

یہ ملک کہنے کو تو اسلام کے نام پر لیا گیا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ اسلام کے مطابق یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ تبھی اس وقت ملک سنگین حالات سے دوچار ہے۔ اس کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی رسوم وروایات اپنانا باعث فخر اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والوں کو تنگ ذہن، تنگ نظر یا دقیانوس سمجھا جاتا ہے۔

اس سے بڑی فکر کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں پروپیگنڈہ کے تحت اسلام ہی سے دُور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جو کسی حد تک کام یابی سے ہم کنار بھی ہے۔ علوم جدیدہ کی تقلید میں مست یونیورسٹیوں کی بھرمار اور جدید علوم کی سرکاری سطح پر حوصلہ افزائی لمحۂ فکریہ ہے۔ حکومتی تحفظ نہ ہونے سے اسلامی ادارے قریباً ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اسی اسلامی تاریخ پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مسلمانوں کے رقیبوں یا مخالفوں کی مرتب کی ہوئی مسخ شدہ انگریزی تصانیف میں موجود ہے۔ چناں چہ، اسلامی معلومات کی کمی اور دوسری قوموں کے من گھڑت افسانے اور کہانیاں مسلمانوں کے ذہن تباہ کر رہی ہیں۔ ہمارا زوال یہی ہے کہ ہم ویسے ہی ہوتے جا رہے ہیں جیسا یورپ والے چاہتے ہیں۔

اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا کہ کس طرح صوبائی ولسانی تعصب بڑھ گیا ہے۔ کرپشن بڑھتی جا رہی ہے۔ جھوٹ، مکر وفریب بڑھ گیا ہے۔ پردہ ختم ہوتا جا رہا ہے، فحاشی وعریانی بڑھ گئی ہے۔ ادب واحترام ختم ہوتا جا رہا ہے۔ تجارت پیشہ افراد اسلامی تعلیمات سے حد درجہ دوری پر نظر آتے ہیں۔ لوٹ مار کا چور بازار سرگرم عمل ہے۔ عجیب نفسانفسی کا عالم ہے۔

ملاوٹ کا عنصر ہمارے معاشرے میں دن بہ دن پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کے تدارک کرنے والے ادارے، ڈی ایچ او، ڈی ایف او، ڈرگ کنٹرول اتھارٹی، ایف آئی اے، اینٹی کرپشن اور دیگر اداروں کو مکمل ناکامی کا سامنا ہے۔ جس میں ملک میں ادویات میں ملاوٹ ہو، دونمبر ادویات کی خرید وفروخت کھلم کھلا جاری ہو، وہاں شرح اموات اور بیماریوں میں اضافہ واضح امر ہے۔ چند دنوں میں کروڑ پتی بننے کی دوڑ نے ہمیں اندھا کر دیا ہے۔ ہم خدا اور رسول صلی علیہ وسلم کے احکامات بھلا کر مکروہ دھندے میں ملوث ہیں کیوں کہ یہاں کوئی سخت قانون یا سزا نہیں ہے۔ اس لیے رہائی یا جرمانے کے بعد دوبارہ زور وشور سے ملاوٹ کا کام شروع کر دیا جاتا ہے۔ دودھ، گھی، تیل، مشروبات، جوس، ادویات، مرچ حتیٰ کہ ہم نمک جیسی سستی شئے میں بھی ملاوٹ سے باز نہیں آتے۔

''جو کسی جان کو ناحق قتل کرے یا زمین پر فساد پھیلائے یہ گویا ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کا قتل کر دیا جائے اور جس نے کسی ایک شخص کی جان بچائی اس نے گویا پوری انسانیت کو بچایا''۔ (القرآن)

ایک اور اہم ترین مسئلہ فرقہ پرستی ہے۔ جہلا نے دین کے مسائل میں بڑی زبان طرازی کی ہے۔ دنیاوی تعلیم یافتہ بعض حلقوں نے مستشرقین اور فرقہ پرستوں کی جدید بولی کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر کے فتنے کو راہ دی۔ فرقہ پرستی ایک بہت بڑا خطرہ ہے جس پر قابو پانا ملکی مفاد میں ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

جس طرح ملکی سالمیت کے لیے صوبائی ولسانی تعصب خطرہ ہے اسی طرح فرقہ پرستی بھی نقصان دہ ہے۔فرقہ پرستی قوم کو گروہوں میں بانٹ کر اتحاد ختم کر دیتی ہے۔اس سے ملک میں تبدیلی لانا از حد مشکل ہو رہا ہے۔اسلام قتل وغارت اور فساد کو پسند نہیں کرتا۔فرمان باری تعالیٰ ہے:''اللہ تعالیٰ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا''۔اس صورت حال کو کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ملک میں تبدیلی لانا از حد ضروری ہو گیا ہے۔اس کے لیے اسلامی تعلیمات کا نفاذ کرنا پڑے گا اور یہ تب ہی ممکن ہے جب عوام کو اسلام سے آگہی ہو۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:''اللہ نے وعدہ دیا ہے ان کو، جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ضرور ان کو زمین پر خلافت دے گا، جیسی ان سے پہلوں کو دی اور ضرور ان کے لیے جما دے گا ان کا وہ دین، جو ان کے لیے پسند فرمایا اور ضرور ان کے اگلے خوف کو امن سے بدل دے گا۔(اگر وہ) میری عبادت کریں اور میرا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں''۔

مسلمانوں کو یہ چار کام کرنے ہوں گے۔ایمان کی دعوت دینا، نیک اعمال کرنا اور اس پر استقامت، اللہ کی عبادت کرنا، توحید پر قائم رہنا اور شرک سے ہر درجہ بچنا۔اگر ہم یہ کام کریں گے تو یقیناً ان کے بدلے میں اللہ ہمیں انعامات سے نوازے گا۔

بحیثیت قوم ہر فرد کی ذمے داری ہے کہ تبدیلی کے لیے اپنے حصے کا کام سرانجام دے۔اس سلسلے میں میڈیا بہت زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے، ویسے بھی میڈیا کی بہت ذمے داری ہے۔پر افسوس! کام اس لیے اچھا نہیں ہو رہا کہ میڈیا غلط لوگوں کے کنٹرول میں ہے، جو قوم کو گمراہ کر رہے ہیں۔بہت کم لوگ ہیں جو میڈیا کا استعمال اصلاح کے لیے کر رہے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین، مثبت سوچ اور پختہ ارادہ رکھنا چاہیے۔اتحاد کی فضا میں سب کو قرآن وسنّت کو مضبوطی سے تھامنا ہوگا۔جس سے ہم معاشرے کی اندرونی وبیرونی برائیوں اور سازشوں پہ قابض ہو سکتے ہیں۔مولانا ظفر علی خان نے کیا خوب کہا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

ام محمد سلمان

کراچی میں رہائش پذیر ام محمد سلمان 3 برس سے ادب سے وابستہ ہیں اور دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ ہیں۔ اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے جو سبق سیکھے وہ ایک امانت کے طور پر دنیا کو سونپنا چاہتی ہیں۔ ان کا مشن ہے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا اور قرآن و سنت سے جوڑنا۔ رائٹرز کلب سے وابستہ ہوئے ایک برس بیت چکا ہے۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ بائیکاٹ

2- دلہن کا جنازہ

3- میرے ابا جی

4- ازدواجی زندگی میں سوشل میڈیا کی مداخلت

☆.....☆.....☆

بائیکاٹ

رات کے دو بجے تھے اور نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن مستقل تانے بانوں میں الجھا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں؟ عرشیہ نے برابر میں سوئی ہوئی اُمِ کلثوم کا کندھا ہلایا، نیند نہیں آ رہی آپی! کب سے کروٹیں بدل رہی ہوں۔ اٹھیں ناں پلیز.... میری بات سنیں آپی! عرشی! پلیز.... سو جاؤ، آدھی رات کو تنگ نہ کرو۔ کلثوم کروٹ لے کر پھر سو گئی۔ آپی پلیز.... اٹھ جائیں، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ عرشی روہانسی ہو کر بولی۔

کلثوم نے آنکھیں کھول کے چھوٹی بہن کی طرف دیکھا، دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے لڑھک جانے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے۔ کیا بات ہے عرشی! میری گڑیا رانی کیا ہوا تمہیں؟ کیوں رو رہی ہو؟ کلثوم سے اس کے آنسو دیکھے نہ گئے۔ آپی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ذرا سی دیر آنکھ لگی تھی تو بہت ڈراؤنا خواب دیکھا۔ اب میں سونا نہیں چاہتی کہیں پھر وہ خواب نہ نظر آ جائے۔ کلثوم نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی۔ فکر نہ کرو میری بہنا، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔ کیا خواب دیکھا تھا مجھے بتاؤ؟ اور بے ساختہ عرشیہ کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔

کیا بتاؤں آپی! وہ بہت برا خواب تھا، بہت ہی برا۔ ملعون یہودی گیرٹ نظر آیا مجھے، وہ بہت قہقہے لگا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، تم مجھے روک نہیں سکتے۔ وہ میرا مذاق اُڑا رہا تھا آپی۔ میری طرف ہاتھ کے اشارے کر کے ہنس رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا، ارے تم لوگ ہو کیا چیز؟ ہمارا کھاتے ہو اور ہم ہی پر غرّاتے ہو۔ ہاہاہا.... تمہیں تو ہم دیکھ لیں گے۔ وہ بہت بھیانک قہقہے لگا رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس کا خون کر دوں، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں لیکن میں کچھ نہیں کر پائی اور وہ ملعون قہقہے لگاتا ہوا چلا گیا۔ عرشیہ سسکتے ہوئے بولی۔ آپی ہماری حکومت کچھ کرتی کیوں نہیں؟ ہالینڈ پر دباؤ کیوں نہیں ڈالتی؟ ہمارے حکمران ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب کیوں نہیں دیتے آپی؟ ہم تو ایٹمی طاقت ہیں ناں.... پھر ہم کیوں ڈرتے ہیں، کچھ کرتے کیوں نہیں؟ عرشیہ نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔ کاش! کاش.... میں اپنی جان دے کے بھی ان مقابلوں کو رکوا سکتی۔ کاش! میں کچھ کر سکتی۔

عرشیہ گہرے دکھ کے ساتھ بولی۔

اُم کلثوم چپ چاپ اس کے سوگوار چہرے کو دیکھتی رہی پھر بولی، حکومت سے کیا امید رکھیں عرشی! اب کوئی نورالدین زنگی نظر نہیں آتا؟ یہاں سب کو اپنی پڑی ہے اور تمہیں پتا ہے، تمہیں یہ خواب کیوں نظر آیا؟ وہ ملعون یہودی کیوں تم پر ہنس رہا تھا؟ کیوں کہ اس گھر میں سب سے زیادہ یونی لیور کی پراڈکٹس تم ہی لے کر آتی ہو۔ ہر نئی چیز کا خمار چڑھتا ہے تمہیں۔ کنور کے سوپ، نوڈلز اور نہ جانے کون کون سے زبان کے چٹخارے ہیں، جن کے بغیر تمہارا گزارا نہیں۔ چائے لپٹن اور سپریم کی، دودھ ڈبوں کا اور وہ پوڈر والا دودھ، جسے تم خشک ہی پھانکتی رہتی ہو۔ ٹینگ، والز آئسکریم، کورنیٹو اور میگنم چاکلیٹ کھائے بغیر تمہارا دن نہیں گزرتا یہاں تک کہ تم تحفے میں بھی لوگوں کو یہی چیزیں دیتی ہو گویا، خود تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ پھر بھی وہ ملعون یہودی اگر تم پر نہ ہنسے، تو کس پر ہنسے گا؟

عرشیہ کے دل پر بجلی سی گری۔ لیکن آپی! اتنے سارے لوگ تو بائیکاٹ کر رہے ہیں، اگر میں یہ چیزیں کھا بھی لیتی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے؟

فرق پڑتا ہے عرشی! فرق پڑتا ہے.... اُم کلثوم زور دے کر بولی۔ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے، اگر ہر بندہ تمہاری طرح سوچ کر بیٹھ جائے کہ ایک صرف میرے کھانے سے کیا فرق پڑے گا تو بتاؤ پھر یہ تحریک تو بالکل بے جان ہو کر رہ جائے گی۔ فرق تو تب ہی پڑے گا جب ہر بندہ اپنی جگہ مضبوطی دکھائے گا اور عزم و استقلال کا پیکر بنے گا۔ تم سمجھتی ہو کہ کیا صرف ناموسِ رسالت ﷺ کی پوسٹ شیئر کرنے سے حق ادا ہو جائے گا؟ نہیں میری بہنا نہیں.... محبت قربانی مانگتی ہے۔ محبت کا پودا ایسے نہیں پنپتا، اسے سچے جذبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی جڑوں میں خواہشات کا بہتا لہو ڈالا جاتا ہے، یہ پودا خونِ جگر سے سینچا جاتا ہے تب کہیں جا کر تناور درخت بنتا ہے۔

میری بہن! محبت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ، کوئی عملی ثبوت دو، ورنہ آج تو صرف خواب دیکھا ہے ایسا نہ ہو کل قیامت کے دن یہ خواب حقیقت بن جائے۔ حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر اپنی خواہشات کو قربان کرنے والے نبی علیہ السّلام کی اقتدا میں ایک طرف کھڑے ہوں اور زبان کے چٹخارے لینے والے، شاید اس ملعون یہودی کے ساتھ دوسری طرف۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے عرشی!

یہ بات سن کر عرشی کی روح تک کانپ گئی۔ ایسا تو نہ کہیں آپی! مجھے ڈر لگتا ہے ایسی باتوں سے۔ عرشیہ دل ہی دل میں قائل ہو رہی تھی مگر دوستوں کی کہی باتیں اب بھی سوال اٹھا رہی تھیں سو پوچھ بیٹھی۔ لیکن آپی! کچھ لوگ کہتے ہیں، بس ہم اپنی غلطیاں سدھار لیں۔ اسلام پہ عمل کریں، سنّت کے طریقوں پر چلیں، بس یہی ہماری ذمے داری ہے۔ عرشیہ نے سوالیہ نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔

یقیناً یہ سب کچھ کرنا چاہیے اور لازمی کرنا چاہیے۔ اچھے اعمال کی برکات یقیناً باطل کا زور توڑ سکتی ہیں لیکن آج

جوصورت حال ہے تو صرف اتنا کر لینا کافی نہیں ہے۔ میری بہن! جب کوئی موذی بیماری لگ جائے تو صرف دوادارو کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ پرہیز بھی کیا جاتا ہے۔ بہت سی پسندیدہ غذائیں چھوڑنی پڑتی ہیں جیسے شوگر کے مریض میٹھا چھوڑ دیتے ہیں بالکل اسی طرح ہمیں بھی دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز بھی کرنا ہے۔ زبان کے ان تمام چٹخاروں سے مکمل پرہیز یعنی دوا کے طور پر دین اسلام اور سنّت نبوی پر عمل اور پرہیز کے طور پر کفار کی مصنوعات کا بائیکاٹ۔ تب کہیں جا کے ہم اپنے مقصد کو پہنچیں گے۔

دیکھو تو....رات کے تین بج گئے اور پتا ہی نہیں چلا۔ اُم کلثوم نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ میں تہجد کی تیاری کر لوں۔ یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز اور پرہیز کے ساتھ اپنے مقصد میں کام یاب ہو جانے کی دعا بھی مانگنی تھی۔ ابھی تو بہت آنسو بہانے تھے۔ رب کریم کو وہ درد دکھانا تھا جو دل میں ٹیسیں بن بن کے ابھرتا ہے۔ اسی کریم ذات سے اپنے منصوبوں کی کام یابی کی دعا کرنی تھی۔ وہی تو ہے جو مضطرب دل کی فریاد سنتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر اُم کلثوم اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلائے سسک رہی تھی اور عرشیہ عزم کر چکی تھی۔ محبت کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ تو کیا میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں اپنی یہ کھٹی میٹھی بے کار سی خواہشات قربان نہیں کر سکتی؟ کیوں نہیں، بالکل کر سکتی ہوں اور میں ایسا کروں گی، ان شاء اللہ۔ کسی کو فرق پڑے یا نہ پڑے، مجھے تو قیامت کے روز اپنے نبی ﷺ کی معیت چاہیے۔

☆.....☆.....☆

دلہن کا جنازہ

کچھ عرصے پہلے کی بات ہے۔ ہمارے دُور کے عزیزوں میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی۔ وہ بے پناہ خوش تھی۔ اس کا رشتہ قریبی رشتے داروں ہی میں طے ہوا تھا۔ دونوں خاندانوں کی آپس میں اچھی ہم آہنگی تھی اس لیے دونوں طرف ہی خوب خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جہیز اور بَری کو شان دار بنانے کے لیے رات دن بڑے بڑے شاپنگ مالز سے خریداری کی گئی۔ لاکھوں کی مالیت کا عروسی جوڑا تیار کروایا گیا۔ آخر کار شادی کا دن بھی آ پہنچا۔ ایک نام ور بیوٹی پارلر سے دلہن تیار کروائی گئی۔ دلہن کو لا کر جب اسٹیج پر بٹھایا گیا تو ہر آنکھ میں ستائش تھی۔ مہمانوں کا ایک ہجوم تھا۔ ہر طرف زرق برق آنچل تھے، پھولوں کے ہار اور گجروں کی خوشبوئیں تھیں۔ میوزک سسٹم پر بجتی مدھر دُھنوں نے سارے ماحول پر ایک سحر طاری کر رکھا تھا۔ دلہن کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ رات گئے دلہن کی رخصتی ہوئی، اگلے دن ولیمے کی شان دار تقریب ہوئی۔ عزیز رشتے دار سب کہہ رہے تھے، دلہن کو ایسا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر کون جانتا تھا، یہ خوشی کتنے دن کی ہے؟ ابھی ہفتہ بھی نہ گزرا تھا، شادی کی رسمیں ابھی تک چل رہی تھیں، دلہن کسی دعوت میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک اس کی طبیعت خراب ہوئی اور اسپتال جاتے جاتے راستے ہی میں دَم دے دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

وہ گھر، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک خوشیوں کا گہوارہ تھا، وہاں اب صفِ ماتم بچھ چکی تھی۔ وہی لڑکی، جسے تھوڑی دیر پہلے تک 'دلہن دلہن' کہہ کر پکارا جا رہا تھا، اب اسے سب لوگ 'میّت' کہہ رہے تھے۔ اپنے پرائے سب اکٹھے ہوئے، میّت کو غسل دیا گیا اور کچھ ہی دیر میں ایک نئی نویلی دلہن کا جنازہ اٹھ گیا۔ میّت دفنا دی گئی۔ سب لوگ قبر پہ مٹی ڈال کر قبرستان سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ماں باپ، بہن بھائی، عزیز رشتے دار چند دن رو دھو کر خاموش ہو گئے۔ دولہے میاں بھی کچھ دن بعد دوسری شادی کر لیں گے۔ ایک نوجوان، حَسین، پڑھی لکھی خوب صورت لڑکی کی زندگی کا باب ختم ہو گیا۔

دنیا اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ واقعی کسی کے چلے جانے سے زندگی نہیں رکتی۔ رکی تو صرف مرنے والے کی۔ آج وہ قبر میں تنہا ہوگی۔ اس کے قیمتی لباس اور زیورات یہیں رہ گئے۔ اس کا جہازی سائز بیڈ، مخملیں بیڈ شیٹ، خوب صورت منقش سنگھار میز، اس پر سجا میک اپ کا سامان، الماری میں لٹکے قیمتی ملبوسات، سب کچھ یہیں رہ گئے، ساتھ گیا تو صرف ایک کفن، جو جہیز یا بَری میں شامل نہیں تھا۔

مہینہ پہلے سے بیوٹی سیلون کے چکر لگ رہے تھے اور جس بدن کو پوری آب وتاب سے نکھارا گیا، آج وہی بدن منوں مٹی تلے کیڑوں کی خوراک بن رہا ہے۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ یہ ہے اس زندگی کا اختتام، جسے ہم ہر لحظہ سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔

ٹھہریے! بات یہاں پہ ختم نہیں ہوئی بلکہ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ بالفرض! اگر صرف ایک ہفتے پہلے دلہن کو پتا چل جاتا کہ شادی کے چوتھے یا پانچویں ہی دن ہی کی موت آجانی ہے اور رب العزت کے حضور اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے، تو کیا پھر بھی وہ اپنی زندگی کے بچے کھچے دن ایسے ہی گزارتی؟

ایک شدید جھرجھری بدن کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس سوچ سے، موت سے کسی طرح فرار ممکن نہیں۔ اگر آپ اس کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟ اگر مجھے رتّی بھر بھی آخرت کے دن اور حساب وکتاب پر یقین ہے تو میں اس بچ جانے والی چند روزہ زندگی کا ایک پل بھی ضائع نہیں کروں گی۔ نافرمانیوں سے توبہ کر لوں گی۔ حقوق وفرائض کی دل وجان سے ادائیگی کروں گی۔ میں لوگوں کے ساتھ اپنے سارے معاملات درست کر لوں گی۔ میری اکڑ، میری انا، میرا غرور.... سب کسی کونے میں جا سوئے گا۔ میں رو رو کر اپنے رب کو مناؤں گی کہ میں نے زندگی بہت غفلت میں گزار لی۔ اب مجھ سے اپنی رضا کے کام لے لے۔ میرا ایک، ایک پل قیمتی ہو جائے گا۔ میں اپنے نامکمل کاموں کو جلدی جلدی پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گی۔ میرے دن لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات کو اچھا کرنے اور راتیں اللہ کے حضور معافیاں مانگتے اور گڑگڑاتے گزریں گی۔ کوئی مجھے کچھ کہے گا بھی تو چپ کر کے برداشت کر لوں گی۔ کھانے پینے، اوڑھنے پہننے کی حرص میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا ہوش مجھے باقی ہی کب رہے گا؟ بس ایک ہی دُھن ہوگی کہ میرا مالک مجھ سے راضی ہو جائے، مجھ پر کسی کا کوئی حق حساب باقی نہ رہے اور میں مرتے ہی اللہ کے نیک بندوں میں شامل کر کے 'علیین' میں پہنچا دی جاؤں۔

مگر یہ سب تو میں اس وقت کروں گی جب میرا اپنی موت پر اسی طرح یقین ہو جائے گا، جیسے صبح کے کاموں کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے اپنی زندگی پر یقین ہے۔ جب کہ موت کو بھلائے بیٹھے ہیں، اپنے انجام سے بے پروا ہیں۔ ہماری ساری دوڑ دھوپ اسی دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے ہے، جس کا انجام صرف فنا ہے۔ ہمیں کب پتا ہے کہ موت کس وقت آجائے؟ ہم نے کیا تیاری کی ہے موت کے لیے؟ کبھی ہم یہ سوچتے ہیں، آج جن چیزوں کو جمع کرنے میں

وقت، پیسہ اور اپنی ساری توانائیاں لگا رہے ہیں، یہ آخر کب تک ہیں ہمارے پاس؟ اس دلہن کی طرح ایک دن ہمیں بھی یہ سب کچھ چھوڑ کر اکیلے ہی اس دنیا سے چلے جانا ہے۔ کیا لوگوں کی موت میں ہمارے لیے کوئی عبرت نہیں؟

ایک بزرگ نے ایک جنازے میں شرکت کے بعد اس کی قبر کے پاس کھڑے ایک آدمی سے پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے، اگر یہ شخص دنیا میں واپس آجائے تو کیا کرنا پسند کرے گا؟ اس آدمی نے جواب دیا کہ یہ استغفار، نماز اور نیکی کے کاموں کے سوا کچھ نہ کرے گا۔ تو بزرگ نے فرمایا، فوت ہونے والا تو یہ کام نہیں کر سکتا، تم ضرور کر لینا۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر ہمیں کسی درجے میں بھی آخرت کا یقین حاصل ہو جائے تو ہم اپنی عمر کا ایک پل بھی ضائع نہ کریں۔

مرنے والے کبھی اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے اہل وعیال اور اپنے قیمتی ساز وسامان پر افسوس نہیں کرتے بلکہ ان کا سارا افسوس اپنے وقت کے ضائع کرنے کا ہوتا ہے کہ کاش! ہم نے اپنے وقت سے بہترین فائدہ اٹھایا ہوتا، کاش! ہم نے اس آیت کو صحیح وقت پر سمجھ لیا ہوتا۔ ''اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ بھی نہیں''۔ (آل عمران) کاش! ہم اس دھوکے کی حقیقت کو سمجھ لیں۔ آج ہمارے پاس وقت ہے، فرصت ہے، صحت ہے تو اسے اللہ کی فرماں برداری میں لگائیں۔ نمازوں کی پابندی کریں، فرائض کی ادائیگی کریں، نیکی کے کام کریں، اللہ کا ذکر کریں اور اپنے اخلاق کو بہتر بنا کر لوگوں کی نفع رسانی کا سبب بنیں۔

☆.....☆.....☆

میرے ابا جی

میرا دل پور پور ان کی محبت میں ڈوبا ہے۔ جی چاہ رہا ہے قلم دوڑ لگا دے اور میرے ابا جی کے بارے میں لکھتا چلا جائے، لکھتا چلا جائے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، ذہین آنکھیں، مضبوط کسرتی جسم، اونچا لمبا قد، خوب صورت ڈیل ڈول، جوانی کی تصویر پر اداکار وحید مراد بھی پانی بھرتا نظر آئے۔ میرے ابا جی کوئی زیادہ بہت پڑھے لکھے عہد ساز شخصیت نہیں ہیں۔ بہت سادہ لیکن میری نظر میں بہت عظیم انسان ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی کو خوب نبھایا۔ اپنی اولاد کو حلال کھلایا اور ان کی بہترین تربیت کی۔

سردیوں کی راتوں میں جب سب گھر والے اپنے اپنے لحافوں میں دبکے ہوتے تو میرے ابا جی اکثر اپنی جوانی کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ وہ پاکستان بننے کے 4، 5 سال بعد پیدا ہوئے۔ دادا، دادی ہجرت کے وقت اپنا سب کچھ لٹا آئے تھے۔ اپنی زمینیں، جائیدادیں، مال و مویشی، لہلہاتے کھیت، سب کچھ وہیں چھوڑا اور بچوں کو ساتھ لے کر قافلے کے ساتھ چل دیے۔ میری ایک پھپھو، ہجرت کے وقت راستے ہی میں انتقال کر گئیں اور وہیں انہیں دفنا دیا گیا۔ نومولود پاکستان اس وقت سخت مشکلات کا شکار تھا۔ مہاجرین کی آبادکاری کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میرے دادا بھی ڈیرہ اسمٰعیل خان سے کچھ آگے ایک چھوٹے سے گاؤں پہاڑ پور شمالی میں رہائش پزیر ہو گئے۔

میرے والد محترم کی عمر 6 سال تھی جب دادا بھی وفات پا گئے۔ ابا سے چھوٹی ایک پھپھو تھیں۔ بس یہ کل تین افراد تھے۔ انتہائی کسمپرسی کی حالت تھی، کئی کئی وقت کے فاقے گزر جاتے تھے۔ کبھی سوکھی روٹی کے ٹکڑوں کو دال کے ساتھ پکا کر 'حلیم' بنا کر کھا لیتے۔ کبھی پانی سے، کبھی نمک مرچ سے، کبھی پیاز اور ہری مرچ سے روٹی کھا لی جاتی۔ کبھی آلو بھوبھل میں دبا کر بھون کر کھا لیتے۔ سالن پکانے کی عیاشی تو کبھی کبھار ہی ہوا کرتی تھی۔ کوئی مدد بھی کرتا تو کیسے؟ دادی اماں بہت خوددار تھیں، بھوکی رہنا گوارا کر لیتیں مگر کبھی کسی سے ادھار کے نام پر بھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ ان کے

ہاں 11 بچوں نے جنم لیا مگر میرے ابا جی اور بوا جی کے علاوہ کوئی نہ بچا۔

ابا جی بتایا کرتے، میں اور میری ماں سخت محنت ومشقت کرتے۔ میں چھوٹا ہی تھا، ماں کے ساتھ کبھی جنگل سے لکڑیاں لا کے بیچتا، کبھی گھاس پھونس اور فصل کی کٹائی کے موسم میں 'لائی' کرتے اور اس سے کچھ اناج وغیرہ حاصل کر لیتے۔ میرے والد صاحب کی شادی بہت کم عمری ہی میں ہوگئی۔ شادی کے وقت امی مرحومہ تیرہ سال کی اور والد صاحب 16 سال کے تھے۔

امی اور ابا دونوں نے بہت کڑے دن دیکھے، بہت مشکل وقت گزارا۔ ابا جی بہت محنتی تھے۔ کوئی باقاعدہ ہنر تو ہاتھ میں نہ تھا مگر اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ہر طرح کا کام کیا۔ ابا جی بڑی تفصیل سے بتایا کرتے، کبھی گرمی کے موسم میں گلی گلی قلفی کا تھرماس لیے قلفیاں بیچتا، کبھی چھولے چاٹ بنا کر بیچتا، کبھی کہیں مزدوری کر لیتا، کبھی ٹین کے کنستر لا کے بیکری کے سانچے بنا بنا کر بیچتا۔ کبھی کسی ہوٹل پر بیرا گیری کی، کبھی مزدوروں کی طرح گارے مٹی میں لت پت ہو کر اینٹیں ڈھونے کا کام کیا۔ کبھی مچھلی کا شکار کرنے دریا پر چلا جاتا۔ ایک بار تو لاہور میں کافی عرصے کسی وکیل کے گھر میں خانساماں گیری کی۔ (سالن بہت اچھا بنایا کرتے تھے ابا جی) اور مجھے تو یاد بھی نہیں کہ ابا جی کیا کیا بتایا کرتے تھے۔ نہ جانے کون کون سے کام انہوں نے صرف حلال کمانے اور ہمارا پیٹ بھرنے کے لیے کیے اور بڑے فخر سے کہا کرتے: ''بیٹا! میں نے تم سب کو ہمیشہ حلال روزی کھلائی ہے''۔

جب میری پیدائش ہوئی تو ابا جی کے ہاتھ بھی ایک ہنر آ گیا۔ کسی مہربان نے ریڈیو، ٹیپ وغیرہ کی مرمت کا کام سکھا دیا۔ اس کام میں ماشاء اللہ ابا جی کا بہت دماغ چلا۔ الیکٹرونک آلات کا کافی کام سیکھ گئے اور پھر خوب ترقی کی۔ رزق کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے مگر ابا جی اپنی کشادہ حالی کا سہرا ہمیشہ میرے سر باندھتے۔ بڑی محبت سے کہتے، میری بیٹی پیدا ہوئی تو اللہ نے مجھ پر رزق کے دہانے کھول دیے۔ غربت اتنی دیکھی تھی کہ غریبوں کا درد دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سخی تو نہیں لیکن میرے ابا دل کے بہت اچھے تھے۔ ہمیشہ پریشان حال کی مدد کرتے۔ سب سے محبت کرتے، بہت خوش مزاج مگر غصے کے بھی تیز تھے۔

میں بچپن میں دوپہر کا کھانا لے کر ابا جی کی دکان پر جایا کرتی تھی تو اکثر ایک مجذوب سا شخص بیٹھا ہوتا۔ میرے شفیق ابا اسے بھی اپنے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھلاتے۔ بڑے ملنسار تھے، دوست بہت زیادہ تھے۔ امی کا بھی بہت خیال رکھتے، کبھی امی کو روپے پیسے کی تنگی نہ ہونے دی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ابا بڑے اچھے گلوکار بھی تھے، اکثر یہ گیت سناتے۔

چل اُڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بے گانہ
ختم ہوئے دن اُس ڈالی کے
جس پر تیرا بسیرا تھا
آج یہاں اور کل ہے وہاں
یہ جوگی والا پھیرا تھا
یہ تیری جاگیر نہیں تھی
چار گھڑی کا ڈیرا تھا
سدا رہا ہے اس دنیا میں کس کا آب و دانہ
چل اُڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بے گانہ

پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہتے، بس بیٹا! یونہی ایک دن دنیا سے چلے جانا ہے۔ دادی کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے۔ ان کے کٹھن دنوں کی داستانیں سنایا کرتے، ان کی ہمت اور حوصلے کو سراہا کرتے۔ مجھ سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔ میری اکثر خواہشوں کو پورا کیا کرتے تھے۔ میں پھلوں کی شوقین تھی تو ہر موسم کا پھل ہمارے گھر میں آیا کرتا اور بطورِ خاص مجھے آواز لگاتے، بیٹا! یہ دیکھو، میں اپنی بیٹی کے لیے کیا لایا ہوں؟

میں بھی اپنے ابا جی کی خوب خدمت کرتی۔ چھوٹی عمر سے ہی ان کے کپڑے استری کرنے لگی، جوتے پالش کرتی، چائے بنا کر دیتی۔ جب ذرا کچھ بڑی ہوئی اور کھانا بنانا سیکھنے لگی تو لکڑی کے چولہے کا دھواں میری آنکھوں میں بہت چبھتا، آنسو بہتے رہتے۔ تو میرے شفیق ابا ایک دن میرے لیے سلنڈر ریگس کا چولہا لے آئے۔ جب میں نویں جماعت میں پڑھتی تھی تو امی بہت بیمار رہنے لگیں، اب گھر بھر کے کپڑے بھی مجھے دھونے پڑتے اور پھر ایک دن میرے ابا جی بڑی خوشی خوشی گھر میں آئے۔ بیٹا! دیکھو، میں تمہارے لیے واشنگ مشین لے آیا۔ اب میری بیٹی کو اتنی محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ پہلی بار ابا ہی نے صابن کاٹ کے مشین میں ڈالا اور پھر یہ سکھایا کہ باری باری کیسے کپڑے دھونے ہیں۔ بازار میں جب کبھی کچھ کھانے کو دل چاہتا تو خرید کر گھر لے آتے اور کہتے اکیلے کھانے کو دل ہی نہ مانا اور ہم سب کو آواز لگاتے، آؤ بچو! آ جاؤ۔ صبح صبح ہم سب بہن بھائیوں کو نماز کے لیے جگا دیتے تھے۔ دونوں بڑے بھائی تو اٹھتے ہی مسجد بھاگتے۔

یونہی خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے جھولتے ایک دن پیا دیس سدھارنے کا وقت آ گیا۔

میری شادی کے 8 سال بعد میری امی جان کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایک اچانک اور حادثاتی موت تھی جس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بڑے دونوں بھائیوں اور بھابیوں نے بہت سنبھالا دیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہم سب بہن

بھائیوں نے مل کر اپنے ابا جی کی دوسری شادی کروادی مگر وائے افسوس! ان کے ساتھ نباہ نہ ہوسکا اور طلاق ہوگئی۔ پھر ہم دوبارہ والد صاحب کی شادی کروانے کے لیے فکر مند رہنے لگے۔ میں اس وقت اپنے ابا کے لیے بہت رویا کرتی۔ ایک نیک شریف خاتون کا ساتھ مانگا کرتی، ان کے اکیلے پن پر مجھے ترس آتا۔ بے شک اولاد ساری بہت نیک اور خدمت گزار تھی مگر بیوی کی طرح تو کوئی خدمت اور دل جوئی نہیں کرسکتا۔ میں اللہ کے سامنے بہت گڑگڑا کے دعا مانگتی، میرے اللہ کلاتے تو ئیں سجدا اے۔ اپنے ابا کا خالی اور ویران کمرہ دیکھ کے کلیجہ منہ کو آتا تھا اور میں کہتی، میرے اللہ! میرے ابا کو ایک بہترین اور نیک شریک حیات سے نواز دے اور پھر اللہ نے دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور ایک بہت ہی ملنسار، نیک، شریف اور محبت بھرا دل رکھنے والی، پیاری سی خاتون کو ہماری ماں بنا دیا۔ وہ میرے ابا جی کا بہت خیال رکھتی ہیں، بہت خدمت گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

میرے ابا جی اب ذرا غصے کے تیز ہوگئے ہیں، اکثر بات بے بات ڈانٹ دیتے ہیں۔ فون کرتے ہیں خیریت پوچھنے کے لیے اور پھر کسی بات پر ان کو غصہ آجاتا ہے تو ڈانٹنا شروع کردیتے ہیں اور میں محبت سے، ناز سے ہنستی رہتی ہوں۔ شکر ہے میرے ابا ہیں، شکر ہے میرے ابا سلامت ہیں۔ بس اتنا ہی یاد رکھتی ہوں۔ یہ برکتوں والی ہستی ہمارے درمیان موجود ہے۔ ساری زندگی والدین اپنی اولاد کے لیے خوار ہوتے ہیں اور جب آخری عمر کا کچھ حصہ آرام کرنا چاہیں تو ہم زمانے کے رسم ورواج کو بیچ میں لے آتے ہیں، لوگ کیا کہیں گے؟ جب ہم ابا جی کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے تھے تو لوگ کہتے تھے، آئے ہائے! اس عمر میں شادی.... اب تو بچے جوان ہوگئے، اب کیا ضرورت ہے؟ توبہ، توبہ کیسی بے شرمی کا زمانہ آگیا ہے۔ جوان اولادیں باپ کے لیے رشتہ ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ لوگوں نے بہت باتیں بنائی تھیں، ابا کی تیسری شادی پر۔ مگر ہم بہن بھائیوں نے سب کا منہ بند کرادیا تھا۔ ہمارے ابا ہیں، جیسے بچپن میں انہوں نے ہمیشہ شفقت سے پالا تھا، ہمیں پڑھایا، لکھایا، معاشرے میں اٹھنے بیٹھنے اور عزت سے جینے کے قابل بنایا۔ آج ہمارا فرض ہے، ان کی خوشیوں اور آرام کا خیال رکھنا اور میں تو کبھی ان کے لیے دعا کرنا نہیں بھولتی، ہمیشہ ان کی خوشیوں کے لیے دعا کرتی ہوں اور وہ بہت خوش ہیں، مطمئن ہیں آج دوسری امی کے ساتھ۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں میں شاد وآباد ہیں۔

ہم سب بہن بھائی اُن سے ملنے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ابا جی ہم سب بہن بھائیوں کی دعوت بھی کرتے ہیں۔ ہمیں بے حد مزہ آتا ہے۔ نئی امی کے ساتھ ابا جی گزشتہ سال حج کی سعادت بھی حاصل کرآئے۔ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ میرے ابا جی کو صحت وتن درستی، خیر وعافیت اور ایمان والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

ازدواجی زندگی میں سوشل میڈیا کی مداخلت

ایک بہن نے سوال کیا کہ اگر شوہر گھر آ کر بھی بہت زیادہ وقت سوشل میڈیا، کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کو دیں، گھر اور بیوی بچوں میں دلچسپی نہ لیں تو بیوی کو کیا کرنا چاہیے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں دورِ حاضر کی اکثر خواتین گرفتار ہیں۔ خاص طور پر وہ شادی شدہ جوڑے، جن کی شادی کو ابھی چند سال ہی ہوئے ہوں۔ ایسے میں بیوی شوہر کی مکمل توجہ چاہتی ہے مگر جب شوہر گھر آ کر بھی اجنبی اور بے گانے کی طرح موبائل اور کمپیوٹر لے کر بیٹھ جائے تو بیوی کے لیے یہ وقت واقعی بہت صبر آزما ہوتا ہے۔

سوشل میڈیا ہماری زندگیوں میں کینسر کی طرح داخل ہو گیا ہے جس کا کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ ایسے میں شوہر سے لڑائی جھگڑا اور گلے شکوے کرنے کے بجائے آرام سے بیٹھ کر گفتگو کی جائے۔ بہت سے مسائل کا حل گفتگو میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب آپس میں تبادلۂ خیال کریں گے تو وجوہ بھی سامنے آئیں گی کہ شوہر کیوں بیوی بچوں کو چھوڑ کر سوشل میڈیا پر مصروف رہتا ہے؟ اگر بیوی کی جانب سے کوئی کمی کوتاہی ہے تو وہ اپنی اصلاح کرے اور اُن خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرے۔ بیوی خود اپنا بھی محاسبہ کرے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود اپنے قریبی رشتوں کو اپنی محبت، خدمت اور توجہ سے محروم کیے ہوئے ہے؟ اور اگر ایسی کوئی بات نہیں بلکہ شوہر کو سوشل میڈیا سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے جس کی وجہ سے وہ بیوی بچوں کو وقت نہیں دیتا تو بیوی کو چاہیے کہ اس سے پیار و محبت سے بات کرے، اس سے اپنی محبت کا اظہار کرے اور اسے باور کرائے کہ شوہر کا یہ رویہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ اس سے کہے کہ دیکھیں! آپ گھر میں وقت مقرر کر لیں کہ اتنا وقت میرے بیوی بچوں کا ہے، اس میں موبائل بالکل آف، آپ کا بھی اور میرا بھی۔ یہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزاریں، دلچسپ موضوعات پر گفتگو کریں۔ شوہر کے پسندیدہ موضوع پر بات کریں۔ ان کے بچپن کی باتیں سنیں، ان کے والدین کے قصے سنیں، بہن بھائیوں کی باتیں سنیں۔ (اکثر بچپن کے قصے

بہت مزے دار ہوتے ہیں) اسی طرح ان سے اپنی بھی باتیں کریں۔ بچوں کی دن بھر کی شرارتیں اچھے خوش گوار لہجے میں بتائیں۔ گھریلو امور پر تبادلۂ خیال کریں۔ مستقبل کے سہانے سپنے ایک دوسرے سے شیئر کریں۔ کوئی اچھی تحریر پڑھی، ویڈیو دیکھی یا آڈیو سنی تو اس پر اظہارِ خیال کریں۔ خود اپنا حلیہ درست کر کے بیٹھیں۔ شوہر سے ناز برداریاں کروائیں کہ دیکھیں میں کیسی لگ رہی ہوں؟ اور خود بھی شوہر کی تعریف کریں۔ صبح گھر سے جاتے ہوئے خاص طور پہ ان پر ایک تعریفی نگاہ ڈالیں اور حفاظت کی دعاؤں میں رخصت کریں۔ پکانے کا پوچھ لیں کہ آج کھانے میں کیا بناؤں، جناب کیا کھانا پسند کریں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اصل میں سوشل میڈیا اتنا دلچسپ فورم ہے کہ یہ دس بیویوں پہ بھاری ہے۔ آج کی عورت کو بہت سخت چیلنجز کا سامنا ہے۔ یوں سمجھیے کہ آپ کے سامنے دس سوکنیں موجود ہیں، جن سے آپ کا مقابلہ ہے اور آپ کو اپنے شوہر کو جیتنا ہے۔ ساتھ ساتھ نماز، صدقے اور دعاؤں سے بھی اللہ تعالیٰ کی مدد مانگیں۔ اللہ آپ کے معاملات کو بہتر کر دے گا ان شاءاللہ۔

اگر آپ کو لگتا ہے کہ ان سب باتوں کا آپ کے شوہر پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا شکر ادا کریں کہ ہمیں کما کے کھلا رہے ہیں۔ ہماری ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، مارتے پیٹتے نہیں۔ ظلم نہیں کرتے، کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں لگاتے، بہت ساری خوبیاں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شوہر وقت نہیں دے رہا تو آپ غم زدہ پھر رہی ہیں۔ تکیے میں منہ دے کے رو رہی ہیں یا دوپٹے میں منہ چھپا کے یا کچن میں جا کے آنسو بہا رہی ہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ ارے بھئی! آپ کی اپنی بھی تو زندگی ہے۔ اپنے فرائض پورے کریں۔ باقی آپ کے پاس بھی موبائل ہے، آپ کچھ اچھا سا کھول کے بیٹھ جائیں۔ کسی بات پہ زور سے ہنسیں، شوہر خود آپ کی طرف متوجہ ہوگا اور پوچھے گا، کیا ہوا؟ آپ اسے دکھائیں، دیکھیں ناں! یہ کتنی دلچسپ پوسٹ ہے اور اسی بہانے ان سے کچھ بات کر لیں۔

زندگی رونے دھونے اور سسکنے کڑھنے کے لیے نہیں ہے۔ ہمیشہ کوشش کرتے رہنا چاہیے، نئے سے نیا حل ڈھونڈیں اس کا۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو کہیں اپنی دینی تعلیم مکمل کر لیں۔ کوئی کھانے پکانے یا سلائی کڑھائی کا کورس جوائن کر لیں۔ یہ سب کچھ آپ کو گھر بیٹھے سوشل میڈیا پر دست یاب ہو جائے گا یا آپ چاہیں تو اپنی دلچسپی کے مطابق کوئی اور جائز مصروفیت ڈھونڈ لیں۔ واٹس ایپ، فیس بک پر کوئی اچھا دینی اخلاقی گروپ جوائن کر لیں، اچھے لیکچر سنیں۔ آپ اپنی کوشش اور دعاؤں سے حالات بہتر بنا سکتی ہیں۔ ان باتوں کو دل پر زیادہ نہ لیں۔ تھوڑے دن کے لیے اس مسئلے کو نظر انداز کر کے بھی دیکھیں۔ اپنی زندگی کی دیگر خوشیوں اور مسرتوں پر نظر ڈالیں۔ بہت کچھ ایسا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کو دیا ہوگا، کسی اور کو نہیں۔

یاد رکھیں! یہ ضروری نہیں کہ ہر میاں بیوی میں مثالی محبت ہو۔ بہت ساری جگہوں پر صرف سمجھوتا اور صبر و شُکر کرنا

پڑتا ہے۔اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اور بہت سی نعمتوں سے نواز دیتا ہے۔اپنی پریشانیاں اللہ سے شیئر کریں وہی انہیں حل کرے گا۔استغفار کی کثرت کریں کہ استغفار ہر تنگی سے نکال دیتا ہے۔

یہاں دو جملے شوہروں کے لیے بھی، جو گھر آ کر بھی بیوی بچوں کو اپنی توجہ سے محروم رکھتے ہیں۔انہیں سوچنا چاہیے کہ وہ بیوی بچوں کی حق تلفی کر رہے ہیں،جس کا نقصان وہ دنیا میں بھی اٹھائیں گے اور ایک دن رب العالمین کی بارگاہ میں بھی جواب دینا ہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

چودھری محمد اویس سکندر

محمد اویس سکندر کی عمر 18 سال ہے۔ لکھنے کا سلسلہ 2017ء میں شروع کیا تھا۔ چیچہ وطنی کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تعلق ہے۔ ایف اے کے طالب علم ہیں۔ رائٹرز کلب سے ایک سال سے منسلک ہیں اور بطور رکن فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1- اچھی معاشرتی حکمرانی کے تقاضے

2- تعلیمی اداروں میں گزرے لمحات

3- ہمارا نظام تعلیم اور جہالت

4- صحافت، ریاست کا چوتھا ستون

5- سرسبز و شاداب، ساہیوال

☆.....☆.....☆

اچھی معاشرتی حکمرانی کے تقاضے

حکمرانی کا تصور کوئی نیا تصور نہیں، یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی تہذیب۔ اس اصطلاح کو گزشتہ کئی سالوں سے سیاسی ماہرین کثرت سے استعمال کر رہے ہیں۔ مثالی تصورِ حکم رانی ایک ایسا فن، لائحہ عمل اور طریقۂ کار ہے جس کے مطابق ریاستی امور اور حکومت کا کاروبار اَحسن طریقے سے بروقت سرانجام دیا جائے تا کہ لوگوں کو اطمنان قلب ہو سکے۔ تمام حکومتی اختیارات کو مکمل طور پر عوام کی حقیقی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے اور ان کے لیے آسانیوں کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے۔ تمام شہریوں کے بنیادی انسانی حقوق، ان کی شخصیت اور سیاسی آزادی کی حفاظت کی جائے۔ حکم ران خدا اور عوام کے سامنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہوں۔ صالح اور نیک سیرت ماتحتوں کا انتخاب کرے۔ تمام حکومتی فیصلے صاف وشفاف طریقے سے سرانجام پائیں اور عوام الناس کو ان میں شامل کیا جائے۔ غیر ذمے داری یا غلطی کی صورت میں حکم ران وعہدے دار کو احتساب کا سامنا کرنا پڑے۔ یہی بہتر حکم رانی کا مقصود ہے۔

بہتر تصورِ حکم رانی کی تعریف اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ عوام کی فلاح ہر وقت مقدم رہے۔ یہ نمونہ آج سے چودہ سو سال پہلے سالت مآب حضرت محمد ﷺ کے حقیقی پیروکار خلفائے راشدین کے دَور میں نظر آتا ہے۔ اس حکم رانی کا کردار مختلف صورتوں میں جاگزیں ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے ریاست مدینہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کی ابتدا بہتر انداز میں کی اور خلفائے راشدین نے بھی اس تصور کی کما حقہ تقلید کی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دَورِ خلافت بھی مثالی حکم رانی کا دور تھا۔ کئی حکم رانوں نے بھی اسے اپنانے کی کوشش کی لیکن ان کے ذاتی اغراض ومقاصد آڑے آ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ جہاں تک بہتر معاشرتی حکم رانی کا تعلق ہے تو اس میں سب

سے پہلے انسانی حقوق کے احترام کا تصور، اسلام نے پیش کیا۔ حضور پاک ﷺ کا خطبۂ حجتہ الوداع اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا، کسی شخص کو کسی دوسرے شخص پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ نہ گورے کو کالے پر برتری ہے اور نہ کالے کو گورے پر۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی برتری حاصل ہے۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر بھی نبی پاک ﷺ کے پیش کردہ خطبے ہی سے اخذ کیا گیا ہے، جس میں سب سے پہلے مساوات کا درس دیتے ہوئے غلامی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مغربی دنیا نے صدیوں بعد ان اصولوں کو اپنانے کی کوشش کی۔

تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی شخصی آزادی کی حفاظت، بہتر تصورِ حکم رانی میں شامل ہے۔ اس میں عام طور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ترویج کی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ میں کسی شخص کو اس کا موقع نہ دوں گا کہ وہ کسی کی حق تلفی یا کسی پر زیادتی کرے۔ اسلام غیر مسلموں کو بھی مکمل معاشرتی حقوق سے نوازتا ہے۔ حضرت علیؓ نے خوارج کو پیغام بھیجا تھا کہ تم کو آزادی حاصل ہے، جہاں چاہو رہو۔ البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرار پایا ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہ بہاؤ گے، بدامنی نہیں پھیلاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو تمہارے خلاف کھلی جنگ ہوگی۔

اسلامی ریاست میں رزقِ حلال اور آزاد تجارت کے اشتراک سے ایسا معاشی نظام معرضِ وجود میں آیا جس میں معاشرے کے تمام طبقے مستفید ہوتے تھے اور کوئی طبقہ مفلوک الحال اور مالی پریشانی کا شکار نہ تھا۔ بیت المال، مال وزر سے بھرا رہتا تھا۔

یہ پبلک کا خزانہ تھا، جس پر خلیفہ کو ذاتی استعمال کا حق نہ ہوتا تھا۔ بنواُمیہ نے اسے ذاتی طور پر استعمال کیا جس سے مثالی اقتصادی حکم رانی کا دَور ختم ہوا۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب اس کی رعایا بدحال ہو۔ اسی طرح سب عمال سے فرمایا کہ تم بھی اپنے آپ کو کج روی سے بچاؤ تاکہ تمہارے ماتحت کج روی اختیار نہ کریں۔

حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اگر ان کے دُورِ خلافت میں دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو وہ قیامت کے دن اس کے بھی جواب دہ ہوں گے۔ اسی لیے وہ اناج کی بوریاں اپنے کندھوں پر لاد کر بھوکوں کے گھروں میں پہنچایا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ وخیرات سے ضرورت مندوں کی مدد کی جاتی تھی۔

بیت المال سے یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کے لیے وظائف مقرر کیے جاتے تھے۔ لوگوں کو یکساں طور پر رزقِ حلال کمانے کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ موجودہ فلاحی ریاستوں میں بھی آج کل اسی تصور کے تحت یتیم، بڑھاپے کی پنشن، بہبود فنڈ، سوشل سیکورٹی اسکیم اور یتیم خانے جیسے ادارے شب وروز اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

آج کے دَور میں، خاص طور پر ہمارے مسلمان معاشرے میں بہتر اور اچھے حکم رانوں کا فقدان ہے۔ ہمیں مسلمان ہوتے ہوئے آپ ﷺ کے دَور اور اس کے بعد صحابۂ اکرامؓ کے مختلف ادوار کی طرف دیکھتے ہوئے ایک اچھا اور بہتر مسلمان معاشرہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہم آپ ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

☆.....☆.....☆

تعلیمی اداروں میں گزرے لمحات

عزت مآب جناب محمد مدثر رضوان صاحب، وائس پرنسپل ڈویژنل پبلک اسکول و کالج، چیچہ وطنی سے ایک سال پہلے ایک وعدہ کیا تھا کہ ایک دن ڈویژنل پبلک اسکول و کالج، چیچہ وطنی کے بارے میں تفصیلی کالم لکھوں گا۔ آج اپنے پرانے کالج کے بارے میں کالم لکھنے ہی بیٹھا تھا کہ عشاء کی اذان ہوگئی۔ دل نے بہت کہا، اویس میاں! پہلے کالم لکھ لو بعد میں نماز پڑھ لینا۔ لیکن یہ دماغ، دل کی کہاں سننے دیتا ہے۔ دماغ نے فوراً کہا، جس شخص کا تذکرہ کر رہے ہو وہ بھی نماز کا بڑا پابند ہے۔ چناچہ میں نے بھی اپنے فیصلہ بدلا اور وضو کر کے نماز پڑھی پھر قلم تھام کر لکھنا شروع کر دیا۔

جناب مدثر رضوان صاحب نماز کے بڑے پابند تھے۔ مجھے یاد ہے، جب میں اسکول میں داخل ہونے گیا تھا تو ان کے ماتھے پر کالے رنگ کے دو گہرے محرابوں ہی نے مجھے نماز پڑھنے کی جانب مائل کیا اور رہی کسر اردو کی ایک ٹیچر میڈم سمعیہ خلیل نے پوری کر دی۔ انہوں نے جب نوجوانی کی عبادت اور اس کی فضیلت پر روشنی ڈالی تو میں نے پابندی سے نماز پڑھنے کا پختہ ارادہ کر لیا مگر ایک آدھ نماز ہی پڑھ پاتا، تب میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ انہی دنوں میں پیر عمران احمد شاہ ولیؒ نے مجھے سختی سے نماز پر ھنے کو کہا تو نماز میری زندگی کا لازمی حصہ بن گئی۔

میں دراصل اس ادارے کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں جس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اس ادارے نے ایک نالائق طالب علم کو پہلے شاعر بنایا اور بعد میں جب وہ نالائق طالب علم اس ادارے سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا تو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی اور کالم نگار بھی بن چکا تھا۔ ڈویژنل پبلک اسکول و کالج نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ خاص طور پر وہ اساتذہ، جنہوں نے قدم قدم پر ناچیز کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں قابل ذکر جناب کاشف بشیر کاشف اور جناب ارشد فاروق بٹ ہیں، جنہوں نے میری ہر دَور میں رہ نمائی کی۔ میں آج ڈویژنل پبلک اسکول کا حصہ نہیں ہوں پھر بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ میں آج بھی اس ادارے میں شامل ہوں۔ ڈویژنل پبلک اسکول و کالج نے چیچہ وطنی کو جہاں بہت سے ڈاکٹر، انجینئر، سیکنڈ لیفٹیننٹ اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ دیے ہیں وہیں ایک شاعر، صحافی اور کالم نگار بھی دیا ہے۔ یہ ڈویژنل پبلک اسکول و کالج کے اساتذہ کی اَن تھک محنت کا نتیجہ ہے کہ وہ چیچہ وطنی کو ایک پڑھا

لکھا معاشرہ بنانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ مجھ ناچیز پر جناب محمد مدثر رضوان، وائس پرنسپل ڈویژنل پبلک اسکول وکالج چیچہ وطنی کی خصوصی نظر رہی ہے اور آج بھی وہ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں جس پر میں ان کا بہت شُکر گزار ہوں۔

ڈویژنل پبلک اسکول وکالج، چیچہ وطنی نے مجھ ایسے ایسے دوست دیے ہیں جو شاید مجھے کہیں اور نہ مل سکتے۔ ان میں خاص طور پر مجھ جیسا انتہا درجے کا نالائق فیضان انصاری، رانا سانول خان، فرغام، احمد حسن عسکری اور اگر ایسے ہی گنواتا چلا گیا تو ایک لمبی فہرست بن جائے گی۔ میں اور فیضان تو اسکول کے سب سے شرارتی بچے ہوا کرتے تھے۔ ایک دن اسکول میں بچوں کے امتحان ہو رہے تھے، ان کی کتابیں اور وہ شاپرز، جن میں ان کا پیپر دینے کا سامان ہوتا ہے، چھوٹے گراؤنڈ (جہاں اب سائیکل اسٹینڈ ہے) میں رکھے تھے اور وہ پیپر دینے کے بعد بڑے گراؤنڈ میں کھیلنے میں مصروف تھے۔ مجھے اور فیضان کو بیٹھے بیٹھے شرارت سوجھی، جو آج تک ہمارے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ پھولوں کی کیاریوں میں پانی لگا ہوا تھا۔ میں نے اور فیضان نے پانی کا رخ اس طرف کر دیا جہاں بچوں کی کتابیں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ بس پھر کیا تھا، دس منٹ کے اندر اندر چھوٹا گراؤنڈ پانی سے بھرا ہوا تھا اور بچے اپنی کتابوں اور بستوں کو پانی میں نہاتا دیکھ رہے تھے۔ یہ میری اور فیضان کی ایسی شرارت تھی جس کا آج تک ہمارے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

آج پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے کالم کا آغاز کیا اور وہ ختم بھی ہو گیا۔ ابھی تو بہت کچھ لکھنا باقی تھا۔ یہ صرف اور صرف ڈویژنل پبلک اسکول وکالج، چیچہ وطنی میں گزارے ہوئے چند لمحات کا تذکرہ ہے، کہانی تو ابھی شروع کرنی تھی۔ پر کیا کیا جائے کہ مجبوری اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ مجھے اپنے الفاظ کو سمیٹنا ہوگا، ان الفاظ کو جو کبھی سمیٹے نہیں جا سکتے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو وقتاً فوقتاً ڈویژنل پبلک اسکول وکالج کے بارے میں ایسے ہی لکھتا رہوں گا تاکہ کچھ تو اس کا حق ادا کر سکوں۔ میں آخر میں پھر جناب محمد مدثر رضوان کا شُکر گزار ہوں کہ وہ ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈویژنل پبلک اسکول وکالج اسی طرح ستاروں میں چاند کی مانند چمکتا رکھے، آمین۔

☆.....☆.....☆

ہمارا نظام تعلیم اور جہالت

تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس کا انتظام معاشرے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کا نظام تعلیم براہ راست اس ملک کے مسائل اور ضروریات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نظام تعلیم اور عمل تعلیم، معاشرے کی ضروریات اور مسائل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ عمل تعلیم کا معاشرے سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے کیوں کہ ہر فرد کا تعلق معاشرے سے ہوتا ہے اور معاشرے میں رہنے والے ہر فرد کے لیے تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے مگر ہمارے معاشرے میں تو الٹی گنگا بہتی ہے۔ یہاں علم کا تعلق پیسے سے جوڑا جاتا ہے حالاں کہ اس کا پیسے سے کیا تعلق؟ علم تو روشنی ہے۔

علم کے بارے میں تو کہا گیا ہے کہ علم، انسان کی غیبی آنکھ ہے، جس سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو تعلیم کا ستیاناس ہو چکا ہے۔ ہماری قوم جس طرح منتشر تھی، اب ایک ہجوم کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس بکھری ہوئی قوم کو ایک مربوط اور خوب صورت تعلیمی نظام سے یک جا کیا جا سکتا تھا مگر بد قسمتی سے یہاں تیرہ قسم کے نظام تعلیم رائج ہو چکے ہیں اور جن کا نیٹ رزلٹ صفر ہے۔ ہمارے ہاں اردو میڈیم، انگلش میڈیم اور مشنری اسکولوں کا اپنا اپنا نظام تعلیم ہے۔ یہاں علم حاصل کرنے والے اداروں کو تین اقسام میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سرکاری، پرائیویٹ اور مدرسے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک چھوٹی سی جگہ پر بارہ تیرہ قومیں پیدا ہو رہی ہیں۔

یہاں میں بتاتا چلوں کہ اَن پڑھ ہونا جرم نہیں، آپ کسی بھی وجہ سے اَن پڑھ رہ سکتے ہیں۔ اپنے ماحول یا کسی اور وجہ سے لیکن جہالت بہت بڑا جرم ہے اور جہالت کی بہترین مثال ہم خود ہیں۔ جہالت کی مثال یہ ہے کہ ایک اَن پڑھ یا پڑھے لکھے شخص سے یہ کہا جائے کہ ہمیں اشارہ نہیں توڑنا چاہیے کیوں کہ اشارہ توڑنے کی وجہ سے تمہاری یا کسی اور کی جان جا سکتی ہے۔ تو جواب ملتا ہے، سارے ہی ٹریفک کے اصول توڑتے ہیں، میں اکیلا تو نہیں توڑتا۔ جاہل شخص سے کہا جاتا ہے کہ اپنے گھر کا کوڑا باہر گلی میں نہیں بلکہ اس کی مخصوص جگہ پر پھینکا کرو تو وہ جاہل شخص جواب دیتا

ہے کہ میرے کوڑا نہ پھینکنے کی وجہ سے کون سا یہ شہر صاف ہو جائے گا؟ اور باقی سب بھی تو کوڑا باہر پھینکتے ہیں۔

اگر ایک جاہل شخص سے کہا جائے کہ تم لائن میں کھڑے ہوتا کہ سب لوگوں کی باری وقت پر آئے مگر وہ پھر بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ایک ان پڑھ شخص کے ساتھ گزارا ہو سکتا ہے مگر ایک جاہل شخص کے ساتھ قطعی ممکن نہیں۔ پھر سونے پہ سہاگا یہ کہ جن لوگوں کے پاس اچانک حرام کا پیسا آجاتا ہے، وہ سب سے پہلے واسکٹ سلواتے ہیں اور معتبر بننے کی کوشش کرتے ہیں، پھر گھر بدلتے ہیں اور لوگوں میں بے وجہ پیسا خرچ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں تعلیم حاصل کرنے کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ اچھی نوکری مل جائے گی اور جب نوکری مل جاتی ہے تو ''علمی دہشت گردی'' پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں آج تک جتنی بھی معاشی دہشت گردی ہوئی ہے، وہ پڑھے لکھے لوگوں ہی نے کی ہے۔ ہمارے ملک کا نظام تعلیم بہت منتشر ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ نائیجیریا کے بعد ہمارے ملک میں سب سے کم بچے اسکول جاتے ہیں۔ ڈھائی کروڑ بچے تعلیم سے محروم ہیں اور عالم یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں بھی بچوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے کم ہو رہی ہے۔ تعلیم اگر کہیں دی جا رہی ہے تو پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں مگر وہاں فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ عام آدمی کے بچے ان مہنگے اسکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ پرائیویٹ اسکولوں میں منافقت بہت زیادہ ہے۔ ایک اسکول کا دوسرے اسکول سے نصاب ہی نہیں ملتا۔ جس طرح ہمارے مسلک مختلف ہو رہے ہیں، اسی طرح پرائیویٹ اسکولوں کے نصاب بھی مختلف ہو رہے ہیں۔

تعلیم ہمارے ملک کا بنیادی مسئلہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے جی ڈی پی کا صرف دو فی صد تعلیم پر لگا رہے ہیں یعنی ہم اپنی تعلیم کو بس تھوڑی سی اہمیت دے رہے ہیں۔ اسی لیے اس کا نیٹ رزلٹ صفر ہے۔ اگر ہم اپنے جی ڈی پی کا دس فی صد ہی تعلیم پر لگا دیں تو یہ بنیادی مسئلہ تھوڑے ہی عرصے میں حل ہو سکتا ہے۔ خیبر پختون خوا میں اس وقت دو کام بہت اچھے ہو رہے ہیں، ایک پولیس ریفارمز اور دوسرا ایجوکیشن ریفارمز۔ ایک بات یاد رکھنے والی ہے کہ لیڈر وہ ہوتا ہے جو اپنی قوم کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے، وہ نہیں جس کی نظر اگلے الیکشن پر ہو۔ اس لیے ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ تعلیم کا مقصد صرف پڑھے لکھے بے روزگاروں کی کھیپ تیار کرنا نہیں بلکہ ملکی اور بین الاقوامی ضروریات کے مطابق پیشہ ورانہ مہارت کے حامل افراد تیار کرنا ہو۔

☆.....☆.....☆

صحافت، ریاست کا چوتھا ستون

صحافیوں نے ہمیشہ عوام کی خدمت کے لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اپنے فرائض ادا کیے ہیں۔ایک ذمے دار صحافی بہت مشکل مراحل سے گزر کر چھپے ہوئے حقائق عوام کے سامنے لاتا ہے۔ایک صحافی ہی یہ جان سکتا ہے کہ اس کے رات اور دن کیسے گزرتے ہیں۔ یہ میں اُن صحافیوں کی بات کر رہا ہوں جو صحافت کو عبادت اور اہم فریضہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ایک ذمے دار صحافی، جسے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوتا ہے، وہ عوام ہی کو اپنا خاندان اور اپنے ملک ہی کو اپنا سب کچھ تصور کرتا ہے۔صحافی، وہ مظلوم طبقہ ہے جو اپنے قلم سے دوستوں سے زیادہ دشمن پیدا کرتا ہے۔ پولیس گردی کے خلاف لکھے تو پولیس دشمن ہو جاتی ہے، جرائم پیشہ افراد کے خلاف آواز اٹھائے تو وہ دشمن ہو جاتے ہیں۔صحافی اگر کرپشن کو بے نقاب کریں تو عتاب کا شکار ہو جاتے ہیں، حکم رانوں پہ تنقید کریں تو سازشی قرار دیا جاتا ہے اور اگر حکم رانوں کی تعریف کریں تو ''لفافہ صحافی'' قرار پاتے ہیں۔ایک ذمے دار صحافی کی اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوتی ہے اور کیمرہ، مائیک یا قلم ہاتھ میں، کیوں کہ یہی ان کا ہتھیار ہے۔

صحافیوں پر پابندیاں لگتی ہیں، تشدد ہوتا ہے، ان کا قتل ہوتا ہے مگر وہ وطن عزیز کی خاطر کبھی ہڑتال کر کے اخبار یا چینل بند نہیں کرتے اور نہ ہی کبھی کسی صحافی نے کسی احتجاج میں توڑ پھوڑ کی ہے۔صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے جسے صحافی اپنی محنت، لگن اور جاں فشانی کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں صحافیوں کے لیے کسی قسم کے حفاظتی انتظامات نہیں ہیں۔ادارے جب چاہیں، نوکری سے نکال دیتے ہیں۔اگر انہیں کوئی مرض لاحق ہو جائے تو بھی کوئی پُرسان حال نہیں ہوتا۔غیر محفوظ ہونے کے باوجود وہ اپنا کام پوری ایمان داری سے کرتے ہیں اور عوام کو ہر خبر سے باخبر رکھتے ہیں۔تاہم، کچھ صحافی ایسے بھی ہیں جنہوں نے صحافت کے نام پر کاروبار کر کے اس پیشے کو بدنام کر دیا ہے۔ ہر چور، اچکا، فراڈیہ، بدمعاش، قاتل، ڈکیت آسانی سے ذمے دار صحافیوں کی صفوں میں کھڑا ہو کر معاشرے کا ایسا فرد ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو معاشرتی برائیاں اجاگر کر کے معاشرے میں سدھار لانے کے لیے کوشاں ہے۔اس طرح وہ نہ صرف اپنا کرمنل ریکارڈ صاف

کرواسکتا ہے بلکہ آنے والے دنوں میں کسی پر بھی کیچڑ اچھالنے کا حق رکھتا ہے۔

ایسے چند صحافیوں کے بارے میں میرے ایک محترم استاد کاشف بشیر کاشف شارٹ اسٹوری میں لکھتے ہیں۔

''میں گھر سے باہر نکلا تو اس کی گاڑی پر سبز رنگ کی بڑی سی پلیٹ آویزاں تھی جس پر جلی حروف میں پریس لکھا ہوا تھا۔تم کب سے صحافی بن گئے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

بولا، آج سے۔ پوچھا، وہ کیسے؟ یار! تم تو جانتے ہو، میرا زرعی ادویہ کا کاروبار ہے۔شہر کے سارے صحافی مجھے جعلی ادویات کی دھمکیاں دے کر ہراساں کرتے تھے۔انہیں منہ بند رکھنے کے لیے چھے ماہ میں ساٹھ ہزار روپے دیے۔

مگر تم صحافی کیسے بنے؟

تم جیسے کسی دوست نے مشورہ دیا، لاہور جا، پچاس ہزار روپے دے اور کسی اخبار کی نمائندگی لے لے، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔بس پھر کیا تھا، پچاس ہزار روپے خرچ کیے، ایک اخبار کا کارڈ لیا اور بن گیا صحافی۔

مگر وہ جعلی ادویات کا معاملہ؟

چھوڑو یار! اب سب ''پیٹی بھائی'' بن گئے ہیں۔آؤ چلیں۔

مگر کہاں؟ میں نے پوچھا۔

اُدھر ایک فیکٹری ہے مرچوں کی، سنا ہے وہ مرچوں میں پھوک ملاتے ہیں۔اس کے مالک سے ملنا ہے۔

پاکستان میں اب کسی بھی اخبار کی نمائندگی لینا کوئی مشکل بات نہیں، صرف ایک فون کال پر حاصل کریں، ڈیل ہونی چاہیے۔ادارے کی پالیسی کے مطابق دو ہزار روپے سے لاکھوں تک کی ڈیل ہے۔پھر ایک بڑا سا اعلان تقرری لگا دیا جاتا ہے اور نمائندگی آپ کے مقدر کا حصہ بن جاتی ہے۔جن صحافیوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں اور اپنی ڈیوٹی پوری ایمان داری سے ادا کی ہے، میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں۔ مجھے آج بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑھ رہا ہے اور میری یہ تحریر میرے کچھ صحافی دوستوں کو پسند بھی نہیں آئے گی، جو چند پیسوں کی خاطر اپنا ضمیر بیچ دیتے ہیں۔میرا سوال ان صحافیوں سے ہے جنہوں نے پیسے کے لالچ میں صحافت شروع کی۔صحافت کا لفظ کہاں ایجاد ہوا اور کتنے اداروں نے صحافیوں کے خون سے لت پت لاشوں پر اپنی بنیاد رکھی؟ ان کے قاتلوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی بلکہ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان قاتلوں کو سزا کے بجائے پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ادارے ان صحافیوں کو موت کی طرف دھکیل رہے ہیں جو شب و روز جان جوکھوں میں ڈال کے خبر تلاش کرتے ہیں اور اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں۔اللہ پاکستان اور پاکستان میں بسنے والے صحافیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

☆.....☆.....☆

سرسبز و شاداب، ساہیوال

ساہیوال پنجاب کا خوب صورت اور سرسبز و شاداب شہر ہے۔ ساہیوال شہر ''ساہی'' قوم کا مسکن تھا اسی لیے ساہیوال کہلایا۔ انگریز دَور میں پنجاب کے ایک گورنر ''منٹگمری'' کے نام پر اس کا نام منٹگمری رکھ دیا گیا۔ 1966 میں صدر ایوب خاں نے اس کا پرانا نام یعنی ساہیوال بحال کر دیا۔ تاریخی حوالے سے بھی ساہیوال شہر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ساہیوال ایک پُرامن شہر ہے۔ ''جوگی چوک'' شہر کا انتہائی مصروف علاقہ ہے جس کی اہم جگہیں امام بارگاہ، قصر بتول، ویگنوں کا اڈہ ہیں۔ اس کے علاوہ لیاقت چوک، مشن چوک، کالج چوک اور باہر والا اڈہ ایسی جگہیں ہیں جہاں دن رات رونق رہتی ہے۔ کینال کالونی، کنان پارک اور اسٹیڈیم کے آس پاس کا علاقہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ''نیا فرید پارک'' کو خوب صورت بنایا گیا جو ساہیوال کو اور بھی خوب صورت بناتا ہے۔

ساہیوال کو 2008 میں ضلع اوکاڑہ اور ضلع پاک پتن سے ملا کر ساہیوال ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا۔ اب یہ صوبہ پنجاب کا نواں ڈویژن ہے۔ بعد ازاں اسے ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ ساہیوال بہت گنجان آباد شہر ہے جو دو دریاؤں، راوی اور ستلج، کے درمیان آباد ہے۔ ساہیوال کے جنوب مغربی جانب اٹھارہ میل کے فاصلے پر قدیم تہذیب ہڑپا اپنی کھوئی ہوئی داستان سنا رہی ہے۔

ساہیوال ڈویژن تین اضلاع ساہیوال، اوکاڑہ اور پاک پتن پر مشتمل ہے جس میں ضلع ساہیوال کی دو تحصیلوں میں تحصیل ساہیوال اور تحصیل چیچہ وطنی نمایاں ہیں جب کہ ضلع اوکاڑہ، تحصیل اوکاڑہ، تحصیل دیپال پور اور تحصیل رینالہ خورد پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ضلع پاک پتن میں تحصیل پاک پتن اور تحصیل عارف والا شامل ہیں۔ ضلع ساہیوال میں ایک بہت بڑا میلہ کمیر پنا لگتا ہے اور اس دن پورے ساہیوال میں ایک دن کی سرکاری چھٹی ہوتی ہے۔

ساہیوال بھی پنجاب کے دوسرے اضلاع کی طرح زرعی ضلع ہے اور اس کا شمار پاکستان کے زرخیز ترین اضلاع میں ہوتا ہے جہاں ہر قسم کی فصل کاشت کی جاتی ہے۔ ساہیوال کے ملحقہ علاقوں میں مکئی اور سبزی کاشت کی جاتی ہے، اس کے بعد چیچہ وطنی کی باری آتی ہے جس کے ساتھ ملحقہ قصبوں میں غازی آباد کا علاقہ ہے۔ اس کی زمین کو پنجابی میں

''پکے وٹ کی زمین'' کہا جاتا ہے جہاں گندم اور چاول کی فصل زیادہ کاشت کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ چیچہ وطنی سے ملحق دیگر قصبوں میں کمالیہ آتا ہے جو کماد (گنّے) کی فصل کے حوالے سے مشہور ہے۔تحصیل چیچہ وطنی کے دیگر قصبوں میں کسووال، اقبال نگر، اوکانوالا بنگلہ، اڈہ فرید نگر اور کماندی شامل ہیں جہاں کپاس اور گندم کی فصل زیادہ کاشت کی جاتی ہے۔حکومت ضلع ساہیوال سے سالانہ کروڑوں روپے کماتی ہے۔ساہیوال چوں کہ زرعی شہر ہے اور یہاں جانور بھی بہت شوق سے پالے جاتے ہیں، اسی لیے ساہیوال نسل کی گائے دنیا بھر میں مشہور ہے۔اس کے علاوہ چھانگا مانگا کے بعد پاکستان کا دوسرا مصنوعی بڑا جنگل بھی تحصیل چیچہ وطنی، ضلع ساہیوال میں واقع ہے۔

سیاسی حوالے سے بھی ساہیوال شہر بہت مشہور ہے۔یہاں کے عوام میں سیاسی جوش وجذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔یہاں دو ہزار سترہ (2017) کی مردُم شماری سے پہلے قومی اسمبلی کی چار اور صوبائی اسمبلی کی سات نشستوں پر انتخاب لڑا جاتا تھا مگر مردُم شماری کے بعد قومی اسمبلی کی ایک نشست کم ہوگئی ہے۔دو ہزار اٹھارہ (2018) کے بعد ساہیوال میں قومی اسمبلی کی تین جب کہ صوبائی اسمبلی کی سات نشستوں پر انتخاب لڑا جائے گا۔میری دعا ہے کہ آئندہ جو نمائندہ بھی ساہیوال سے منتخب ہو، وہ عوام کی فلاح کے لیے کام کر کے ساہیوال کا مقام مزید اونچا کرے۔

پاکستان کی بہت سی مشہور شخصیات کا تعلق ساہیوال سے ہے، جن میں قابل ذکر اردو زبان کے مشہور شاعر مجید امجد، سابق ٹیسٹ کرکٹرز مشتاق احمد، منظور الٰہی، سلیم الٰہی، ٹیلی وژن کے مشہور میزبان طارق عزیز، اردو رائٹر اور اسکالر آتش درّانی، اردو زبان کے شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور پنجابی و اردو زبان کے مشہور شاعر منیر نیازی شامل ہیں۔ان کے علاوہ موجودہ دَور کے کام یاب لکھاریوں میں بچوں کے لیے لکھنے والے کاشف بشیر کاشف، کالم نگاروں میں اختر سردار چودھری اور ارشد فاروق بٹ، شعرا میں بدر سیماب، بہزاد جاذب، سلمان بشیر، وحید رضا عاجز اور امر علی کے علاوہ افسانہ نگار پروفیسر شاہد رضوان بھی ساہیوال کو ادبی دنیا میں روشناس کرانے کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

میرا تعلق بھی ساہیوال کی تحصیل چیچہ وطنی کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے چھیانوے بارہ ایل (96-12L) سے ہے اور میری بھی یہی کوشش ہے کہ ساہیوال کو ادبی وصحافتی دنیا میں روشناس کرانے کا کام جاری رکھ سکوں۔آخر میں میری خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ ساہیوال شہر کی رونقیں ہمیشہ آباد رہیں اور یہ اسی طرح درختوں کے جھنڈ میں اپنی زندگی سرسبز وشادابی میں گزارتا رہے، آمین۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

مشعل اسلام

مشعل اسلام کا سندھ کے شہر لاڑکانہ سے ہے۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد مشعل نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا۔ رائٹرز کلب سے وابستگی کو ایک برس مکمل ہو گیا ہے۔ رائٹرز کلب کے پلیٹ فورم سے ہی کئی ملک کے بڑے پیمانے پر چھپنے والے اخبارات اور رسائل میں اپنی تحریریں چھپوا چکی ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1-اخلاقِ حَسنہ کیا ہے؟

2۔ پیغام اقبال

3۔ حیا ایمان کا حصہ ہے

4۔ خود پسندی

5۔ سیاسی ایمان داریاں

☆.....☆.....☆

اخلاقِ حَسنہ کیا ہے؟

اسلامی تعلیمات میں اخلاقِ حَسنہ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان اپنے آپ کو اخلاقِ حَسنہ سے مزیّن نہیں کر لیتا، وہ صحیح معنوں میں انسان نہیں بن سکتا کہ انسان کو انسانیت کی معراج تک پہنچنے کے لیے اخلاقِ حَسنہ کی ضرورت ہے۔ ہر انسان کا اللہ تعالیٰ سے ایک ایسا رشتہ ہے جو تمام رشتوں سے زیادہ مستحکم اور دائمی ہے، بالخصوص مسلمان کا رشتہ۔ جب انسان کلمہ پڑھ کے مسلمان ہوتا ہے تو وہ ہر کام میں اللہ و رسول ﷺ کے احکامات کو مدنظر رکھ کے اپنے شب و روز بسر کرتا ہے۔

ایک مسلمان کا اللہ سے جو تعلق ہے، وہ جتنے اخلاقِ حمیدہ میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوگا، اس کے درجات اتنے ہی بلند ہوں گے اور اپنے مالک کی نظر میں بہتر عبد قرار پائے گا۔ بحیثیت مسلمان ہمارے شب و روز اس کاوش میں صرف ہونچاہئیں کہ ہم کیسے قربِ الٰہی حاصل کریں۔

بداخلاق، جھگڑالو، ظالم، امانت میں خیانت کرنے والے، جھوٹے، چغل خور اور ناپ تول میں کمی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند فرماتا ہے۔ اس کے برعکس جو اچھے اخلاق والا، سچ بولنے والا، دوسروں کو نفع پہنچانے والا، خدمت خلق کرنے والا، امانت دار، منصف اور سخی انسان اللہ کو پسند ہے۔ فخرِ دو عالم اخلاق مجسم نبی اقدس ﷺ نے فرمایا: ''بے شک میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں''۔ (مسند بزار) اسی طرح ایک مرتبہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''کون سا مومن کامل ایمان والا ہے؟'' فرمایا، ''جو اچھے اخلاق والا ہو''۔ ایک اور جگہ فرمایا، ''بے شک مکارم اخلاق اہل جنت کے اعمال میں سے ہیں''۔

اخلاق اور آداب لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی انسان آداب کی رعایت کرتا ہے تو دراصل یہ اخلاق کا نتیجہ ہے۔ جب ہم اچھے اخلاق اپناتے ہیں تو چھوٹے بڑے، اپنے پرائے، ہمسایوں اور رشتے داروں کا ادب کرنا، ان کے حقوق کا

خیال رکھنا ہماری طبیعت کا حصہ بن جاتا ہے۔سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اخلاق و بداخلاقی کسے کہتے ہیں؟ ایک انسان میں جو اچھی صفات ہونیچاہئیں، وہ سچائی، امانت داری اور سخاوت وغیرہ ہیں۔ان ہی کو اخلاق کہتے ہیں اور جن بری باتوں سے پاک وصاف ہونا چاہیے، ان میں جھوٹ اور غیبت وغیرہ شامل ہیں، جو انسان کو بداخلاق بناتی ہیں۔

اسلام ہمیں اچھے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور انہیں اپنانے پر اجرِ کثیر کا وعدہ بھی ہے یعنی ایک مسلمان اگر سچ بولتا ہے، سچوں کے ساتھ رہتا ہے، اچھی صحبت اختیار کرتا ہے تو ایسا کرنے کا حکم اسے اس کے رب نے دیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''سچ بولنے پر وہ روزِ قیامت صدیقین کی صف میں شامل ہوگا۔صلۂ رحمی وامانت داری، مہمان نوازی، حیاداری، پڑوسی کے حقوق ادا کرنا، حاجت مندوں کی مدد کرنا، احسان کا بدلہ دینا، ساتھیوں کی مدد کرنا وغیرہ، یہ سب مکارم اخلاق ہیں جنہیں اپنے اندر پیدا کرنے کا حکم اللہ اور نبی ﷺ نے دیا ہے۔

آج اکثریت کی سوچ ہی میڈیا کے ذریعہ ہائی جیک ہوچکی ہے۔امت کی اکثریت کی زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف دنیاوی تعلیم وترقی پر صرف ہوتا ہے۔ مادّی زندگی کی سہولیات کا حصول ہمارا مقصدِ حیات بن چکا ہے۔اپنی حیات کا تین فی صد عصری تعلیم، اس کے بعد ذریعۂ معاش اور بعدہٗ ایک خوب صورت ہم سفر کی تلاش، اس کے بعد بال بچوں کا ہونا پھر ان کی پرورش، تعلیم اور ان کی شادی خانہ آبادی میں لگا دیتا ہے۔حتیٰ کہ عمرِ عزیز کی تلچھٹ ہی باقی رہ جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجنے کا جو مقصد بتایا تھا، اسے جب ثانوی حیثیت سے بھی گئی گزری حیثیت ملے گی تو پھر انسان اسلام کا مطالعہ اور علوم قرآنی واحادیث کا علم اور ان کی روشنی میں اپنی زندگی کی گاڑی چلانا کب سیکھے گا؟

آج ہم نے اپنے دین کو صرف بعدِ پیدائش کان میں اذان دینے اور بعدالمرگ نمازِ جنازہ ادا کرنے تک محدود کردیا ہے۔آج جا بجا والدین، اولاد کی نافرمانیوں سے تنگ نظر آتے ہیں کیوں کہ ہم نے اپنی اولاد کی تربیت مذہبی خطوط پر کرنی چھوڑ دی ہے۔ جب ہم نے بچے میں وہ اوصاف پیدا ہی نہیں کیے تو بچہ کیسے فرماں بردار ہوگا۔ہم لوگوں کے نزدیک اخلاقِ حَسنہ کی تعریف فقط دوسروں سے مسکرا کر بات کرنا رہ گئی ہے۔ حالاں کہ بغض، کینہ، حسد، تجسس، نفاق سے پرہیز بھی اخلاق میں شامل ہے۔ہم آخرت میں اللہ کے سامنے سرخ رو ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس دنیائے فانی کی فکر چھوڑ کر آخرت کی تیاری کریں۔

☆.....☆.....☆

پیغام اقبال

ترقی کی ہوس میں تیرے ایماں کی ہے یہ حالت
کہ جیسے کوئی ڈانواڈول ہو کشتی طوفاں میں

اقبال کے شاہین نے اپنی سمت تبدیل کی تو جدید تہذیب کے طوفان نے مادّیت کے سمندر میں جا اتارا، جس سے شاہین کی پرواز بھی گئی اور وہ بھیگی بلی بن کے ان مغربی عالمی استعماری قوتوں کے سامنے میاؤں میاؤں کرنے ہی پر خوش ہو گیا۔ اس وقت شاہین وجود سے عدم آباد سدھار گیا ہے۔ اصلی شاہین والی خوبی کہاں باقی ہے؟ موجودہ دَور میں امت مسلمہ کو دو قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیا گیا۔ پہلی آزمائش مغرب کے مادّہ پرستانہ نظام تعلیم کو اس کی روح کے ساتھ اختیار نہ کرنے اور دوسری آزمائش، سوشل میڈیا و الیکٹرانک میڈیا یعنی ٹی وی کے ذریعے ہر گھر کو ناچ گانے اور بے حیائی کے مرکز میں تبدیل نہ کرنے کی تھی۔ افسوس کہ ہم اجتماعی طور پر ان دونوں آزمائشوں میں ناکام ثابت ہوئے۔

اقبال کا شاہین جنس پرستی کی دلدل میں دھنس چکا ہے۔ جدید تعلیم و مغربی تہذیبِ جدید سے مرعوب ہو کر مادّے کو اپنی محنت کا مرکز بنا لیا اور اپنے حقیقی نصب العین یعنی انسان کی پیدائش کا مقصد، اللہ کی بندگی، بھلا بیٹھا۔ مغربی نظام تعلیم کو معیار سمجھا جانے لگا اور اپنے بچوں کو بڑھ چڑھ کے جدید تعلیم سے بہرہ ور کیا جانے لگا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ جدید تعلیم کا حامل نوجوان، خدا اور دین سے بے اعتنائی، فکرِ آخرت سے غافل، سرکش، اپنی روایات سے بغاوت اور دنیا ہی کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔

جدید تہذیب کے طوفان بدتمیزی و بے حیائی میں اقبال کا شاہین اپنی سمت بھلا بیٹھا ہے۔ اہل مغرب نے سوشل میڈیا، جدید نظام تعلیم اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے آزادی و روشن خیالی کا جو جال عالم اسلام کی طرف پھینکا

تھا، اقبال کا شاہین اس خوب صورت جال میں بری طرح پھنس چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلم نوجوان کی بلاتفریقِ جنس اپنی پاکیزہ اسلامی اقدار و روایات سے نفرت و بے زاری راسخ ہوتی گئی اور مادّیت و حیوانیت پر مشتمل تہذیب سے محبت اس کے دل میں گھر کرنے لگی۔ غلامی کے طوق اسے آزادی لگنے لگے، ذہنی و عملی غلامی پر فخر محسوس کیا جانے لگا۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام کی روشن، خوب صورت تہذیب پر جو اعتراضات اہل مغرب کرتے رہے تھے، وہ جدید تعلیم سے آراستہ اہل دانش و حکم رانوں کی طرف سے ہونے لگے۔

دیکھا جائے تو مسلم معاشرہ، مغربی طرزِ زندگی ہی کو معیارِ زندگی سمجھنے لگا ہے۔ وہ ذہنی طور پر ان سے مرعوب ہو کر خود کو مغلوب سمجھ بیٹھا ہے۔ شاہین پہاڑوں کو بھول چکا ہے، وہ اپنے پر کاٹ کے غلامی قبول کر چکا ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ کا شاہین مادّہ پرستی کے جال کا شکار ہو کر اپنی اصلیت نسیا نسیا کر چکا۔ اب اسے پھر سے اپنا آپ پہچاننے کی اور اس سازشی جال سے نکلنے کی ضرورت ہے، جو اس کے لیے موت و حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

تم نے خود کو جدید تہذیب کے رنگ میں کیا رنگا، خود کو پست و ذلیل کر دیا۔ دَورِ جدید کی تہذیب کے سحر نے تیرے پر ہی کاٹ دیے۔ مادّہ پرستی، حیوانیت اور شہوت کے شراب سے تو اُڑنا ہی بھول بیٹھا ہے۔ اب بھی وقت ہے، خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنی تہذیب، روایات اور دین سے مخلص ہو کر محبت کرنے لگ جا، اپنے حقیقی نصب العین سے والہانہ محبت کر اور اپنے نصب العین کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہ، کیوں کہ قوموں کی زندگی میں اصل اہمیت ان کے نصب العین کی ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

حیا ایمان کا حصہ ہے

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اللہ رب رب العزت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر فطری خوبیوں سے مزیّن کیا۔ ان خوبیوں میں سے ایک خوب صوت خوبی حیا ہے۔ جتنے انبیائے کرام مبعوث کیے گئے، ان تمام میں کچھ صفات یکساں تھیں۔ ان ہی میں سے ایک صفت حیا بھی ہے جس کی تعلیم تمام انبیائے کرام علیھم السّلام نے دی۔ آج ہم جس روشن خیال دَور سے گزر رہے ہیں، اس میں بے حیائی جیسی قبیح عادت، جسے اب عیب نہیں سمجھا جا رہا بلکہ باقاعدہ اس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ کیا نوجوان، کیا بوڑھے، کیا بچے، سب ہی اس بے حیائی و فحاشی کی بارش میں بصد شوق غسل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مسلم معاشرہ ہو یا ایک عام معاشرہ، اس کا اصل حُسن باحیا نوجوانوں ہی سے ہے۔ مگر افسوس.... کل جو امراضِ باطنہ بے حیائی، فحاشی و عریانی، عاداتِ بد، غیر مسلم و کفار کا خاصہ تھیں، آج طوفان بن کر ٹی وی، سوشل میڈیا، انٹرنیٹ کی شکل میں مسلم ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ مسلم نوجوان اپنی اصل بھول چکا ہے۔ یہ تو وہ قوم ہے جس کے نوجوان ذکر و تلاوت سے اپنی زبان تر رکھتے تھے۔ جن کی جبینیں سجدوں کے نشانوں سے چمکتی تھیں۔ جو قیام اللیل کے شوق اور علم کے ذوق و عمل کے شیدائی تھے۔ جو چھوٹی سی عمر میں محمد بن قاسم بن جاتے تھے اور فاتح بن کر لوٹتے تھے مگر آج بے حیائی کے زہر نے ان کے دلوں سے نورِ ایمانی چاٹ لیا ہے۔ ان کی جبینیں سجدوں کی نعمت سے عاری تو روح حلاوتِ ایمانی سے محروم ہے۔ ان کے چہرے عبادت کے نور کی نورانی چمک اور معرفت کے نور کی دمک سے محروم ہیں۔

ہنسی آتی ہے جب ہم محمد بن قاسم اور سلطان صلاح الدین جیسے فاتح یا عمر بن عبدالعزیز ایسے حکمران کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ہم نے اپنی نسلوں کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اپنی اولاد کو وہ ماحول

دیا نہ ان کو ان کی اصل سے جوڑا۔ ہم نے انہیں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے حوالے کر دیا۔ خود ان کی تربیت سے یکسر غافل ہو گئے۔ ہم نے موبائل کی صورت میں ان کے ہاتھوں میں بے حیائی کا ڈبا تھما دیا۔ ہم نے بچپن سے ان کے دل میں کتے، بلی کا ڈر تو ڈال دیا مگر موبائل، ٹی وی، سوشل میڈیا کی تباہ کاریاں، موسیقی کے زہریلے اثرات اور بدنظری کے تباہ کن اثرات کی سمجھ بوجھ نہ دی۔

الا قلیل مگر تھوڑے ہیں وہ والدین، جو اس فتنۂ بے حیائی و بدنظری کو غارت گرِ ایمان سمجھتے اور اس کا سدِّ باب کرنا جانتے ہیں اور اس سے اپنی اولاد کو بچانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ آج پوری دنیا میں امتِ مسلمہ پٹ رہی ہے۔ وہ مار کھاتی ہے، اپنی بہن، بیٹیوں کی عزتیں نیلام ہوتے دیکھتی ہے، اپنے بچے کٹتے دیکھتی ہے مگر کیا سبب ہے کہ وہ بے جان ہے۔ وہ زندہ لاش کیوں ہے؟ باوجود اکثریت کے اس میں دم نہیں کہ دشمن کے پر کاٹ سکے۔ روئے زمین پر اس وقت مسلمان وہ واحد قوم ہے، اُمہ ہے، جس کا خون سستا اور ہر کافر کے واسطے بہانا آسان ہے۔

کبھی ہم نے سوچا، ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ معزز قارئین! اس کی جہاں بہت سی وجوہ ہیں، وہیں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امت کی بہن بیٹیاں و نوجوان، کفار کی جانب سے پھینکے گئے بے حیائی کے جال میں پوری طرح پھنس چکے ہیں۔ امت کا ایمان کم زور ہو چکا ہے۔ باطل اپنے ظاہری اسباب پہ اُچھلے گا اور اسی کے بل بوتے پر میدان میں اترتا ہے، جب کہ مسلم اُمہ تب کام یاب ہوتی ہے، جب وہ قوتِ ایمانی سے مالا مال ہوتی ہے۔ پھر وہ اللہ ان کا حامی و ناصر ہوتا ہے جس کے نام پر یہ میدان میں کود پڑتے ہیں اور بالآخر فتح و نصرت ان کا مقدر بنتی ہے۔

خدارا! اپنے اندر حیا کی صفت پیدا کریں۔ نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کو ذہن نشین کر لیں، ''حیا ایمان کا حصہ ہے''۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم سب سے پہلے اپنی آنکھوں، کان اور دل کی حفاظت کریں۔ بدگوئی، بدنظری اور فحش پروگراموں سے دُور رہیں۔ نیکی کو اپنا شعار بنائیں، ہمیشہ خیالات کو پاک رکھیں۔ فسادِ قلب سے بھی بچیں۔ جب ایسا ہوگا تب ہی ہمارے نیک اعمال میں وزن ہوگا اور ایمان طاقت ور ہوگا۔ جب ایمان طاقت ور ہوگا تو پھر اقبالؒ نے جس خودی کا پیغام دیا ہے، اس کی حیاتِ نو کے آثار پیدا ہو جائیں گے، جس کے بعد ہی تبدیلی آئے گی۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالم مجبور ہے، تو عالم آزاد

☆.....☆.....☆

خود پسندی

خود پسندی ایک ایسی بیماری ہے جو انسان کو تباہی کے دہانے تک لے آتی ہے، جس میں انسان اپنی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی تباہ کر بیٹھتا ہے۔ خود پسندی میں انسان اپنے نفس سے راضی ہو جاتا ہے اور نفس سے راضی ہونے کے باعث اس میں بے شمار کوتاہیاں اور امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر انسان اپنے کسی بھی عمل کی وجہ سے خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے، سمجھتا ہے کہ اس عمل کے کرنے میں اس کی قوتِ ارادی کا دخل ہے یعنی اس کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے جو نری جہالت ہے، کیوں کہ اس کائنات میں اللہ کی مرضی کے بغیر ایک پتا تک نہیں ہل سکتا اور ہم خود کو اپنے نفع و نقصان کا مالک سمجھ لیتے ہیں۔ جب تک اللہ کی جانب سے اشارہ نہ ہو، ہم سانس بھی نہیں لے سکتے۔ ہم اس قدر اس ذات کے محتاج ہیں۔

کبھی انسان اپنے حُسن و جمال، قوت و ہیبت اور تناسبِ اعضا کی وجہ سے عُجب یعنی خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو کبھی اپنی عقل و دانائی اور ذہانت اسے خود پسند بنا دیتی ہے۔ کبھی انسان اپنی اولاد، خاندان، عزیز و اقارب، مال و اسباب یا نوکروں وغیرہ کی وجہ سے بھی خود پسندی کا شکار ہو جاتا ہے، جیسے کفار نے کہا تھا: ''ہم زیادہ مال دار ہیں اور زیادہ اولاد والے ہیں''۔ (سورہ سبا) رسول اللہ صلہ اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں مہلک ہیں: ''وہ بخل، جس کی پیروی کی جائے۔ وہ خواہشات، جن کی اتباع کی جائے اور انسان کا اپنے نفس پر عُجب میں مبتلا ہونا''۔ (طبرانی)

جب انسان کے ذہن میں یہ بات مکمل طور پر راسخ ہو جاتی ہے کہ میں دوسروں سے بہتر ہوں، میں اعلیٰ و افضل ہوں تو وہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو خود سے حقیر جانتا ہے اور ان سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایسا شخص خود بھی ذہنی طور پر مطمئن نہیں رہتا اور بہت جلد ڈپریشن میں چلا جاتا ہے۔ خود پسندی اگر دنیاوی اعتبار سے ہو تو انسان دوسروں کو کم تر اور خود کو برتر ظاہر کرنے کے لیے بسا اوقات وہ کام بھی کر گزرتا ہے جو اس کی شخصیت کو زیب نہیں

دیتے۔

خود پسندی دین میں تو اور بھی زیادہ مہلک ہے، ایسا انسان خود کو برتر سمجھنے کے ساتھ ساتھ ریاکاری میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ہر نعمت کے حصول کو اپنی ذات سے منسوب کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ نیکی کی سعادت ملنے کو بھی اپنی خوبی جانتا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان خود پسندی سے خود فریبی میں مبتلا ہو کر اپنے گناہوں کو بھول جاتا ہے اور عبادت ایسے کرتا ہے گویا اللہ پر احسان کر رہا ہے۔ وہ اللہ کی نعمتیں بھول جاتا ہے کہ یہ عبادت کی توفیق اور قدرت اللہ ہی نے بخشی ہے۔ سورہ نجم میں اللہ تعالی فرماتا ہے: ''پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی نے خود پسندی سے منع فرمایا ہے کیوں کہ خود پسندی مرض ہی اس قدر مہلک ہے کہ جس انسان میں پیدا ہو جائے اور اس کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو تکبر جیسے موذی مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ خود پسندی کی کوکھ ہی سے تکبر جیسا مہلک مرض پیدا ہوتا ہے۔

خود پسند انسان اپنے نفس کی تعریف میں مگن رہتا ہے۔ اپنی رائے کو حرف آخر سمجھنا اور خود کو عقل کُل سمجھنے کی وجہ سے کسی اور سے رائے یا مشورہ طلب نہیں کرتا۔ غرض یہ کہ خود پسندی انتہائی مہلک مرض ہے، جس کی آفات و تباہ کاریاں بہت زیادہ ہیں۔ ہم سب کو چاہیے کہ اپنے نفس کو ٹٹولیں، اگر کسی بھی قسم کی خود پسندی محسوس ہو تو جلد از جلد اس کا کسی مصلح سے علاج کروائیں کیوں کہ کل، قیامت کے دن، ماتم بے قیمت ہوگا۔ آج ہی کوشش کریں، محنت کریں کیوں کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ جلد ہی اس فانی دنیا کو چھوڑ کر کچھ وقت کے لیے قبروں میں روزِ قیامت، یوم الدین کا انتظار کرنا ہے۔ روزِ قیامت ایک اٹل حقیقت ہے۔ سب کو ان کے اعمال کی بنیاد پہ انعامات و سزا ملے گی۔ جنت یا جہنم ہی انسان کا اصل ٹھکانا ہے۔

انسان کو ہمیشہ اپنے نفس سے محتاط رہنا چاہیے اور جب بھی خود پسندی یا عُجب کا شائبہ محسوس ہو تو فوراً توبہ، استغفار کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ جس نعمت کی وجہ سے مجھے عُجب محسوس ہوتا ہے وہ نعمت درحقیقت اللہ کا فضل ہے، میرا کوئی کمال نہیں۔ جو اللہ دے سکتا ہے، وہ لے بھی سکتا ہے اور دنیا میں کسی بھی نعمت یا صفتِ کمال کا ہونا، کوئی کمال نہیں اس لیے کہ بہت سے مومن بھی مرتد ہوئے اور بہت سے فاسق و فاجر بھی توبہ کر کے نیک بنے ہیں۔ اس قسم کے دھیان کے بعد ان شاءاللہ خود پسندی کے مرض سے بچا جا سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

سیاسی ایمان داریاں

سیاست ایک قسم کی عبادت ہے۔اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔کہا جاتا ہے کہ ''قوم کا امیر ان کا خادم ہوتا ہے''۔مگر افسوس....صد افسوس! آج اگر سیاسی جماعتوں پہ نظر دوڑائی جائے تو سیاست کی مسخ شدہ صورت ہی نظر آتی ہے۔حیرت ہے، کتنے عظیم رہنما، قائد و حکم ران گزرے ہیں۔ ہماری تاریخ روشن ہے۔آسمانِ سیاست پر نگاہ ڈالیں تو آقا علیہ السّلام و خلفائے راشدین کے بعد بھی عمر ثانیؒ اور ہارون الرشیدؒ جیسے نیک فرماں رواؤں سے سیاسی فلک جگ مگ جگ مگ کرتا نظر آئے گا۔

عدالت ہو تو ایسی ہو

سیاست ہو تو ایسی ہو

مسلم ممالک کے حکم ران، لازم نہیں کہ عالم ہوں مگر ان کو اتنا علم ضرور ہو جس سے ان کے ظاہر و باطن پہ اسلام کا رنگ نکھر آئے۔آج سیاست دان، سیاست کے نام پر جو کھیل کھیلنے میں طاق ہو چکے ہیں، یہ سیاست ہرگز نہیں۔ یہ تو اپنے اپنے مفادات کے حصول کی جنگ بن چکی ہے۔ دھوکا، جھوٹ، کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب، گالم گلوچ، دین بے زاری، بے حیائی، بدگمانی، غیبت، غرض کون سا گناہ ہے جو سیاست دانوں کے دونوں ہاتھوں کا کھیل نہیں؟

سیاست خود اپنی لاش پہ آنسو بہا رہی ہوگی

یہ سیاست ہے جسے دیکھ کے شرمائے شعور

کم از کم اسلامی ملک کے سیاست دان کو دیکھ کے کوئی سمجھ تو لے کہ یہ مسلم سیاست دان ہیں۔آہ! یہ سیاست دان ایمان داری سے رب اور اپنے پیغمبر ﷺ سے سچے اور مخلص ہوتے تو عوام سے بھی مخلص رہتے۔ جو اپنے حقیقی محسن اور رہبر کو بھول بیٹھا ہو وہ بھلا عوام کو کیسے یاد رکھے گا؟ ہماری سیاست کرسی و اقتدار کے سوا اب کسی دوسری چیز کا نام

نہیں۔ جو بھی اس بحرِ سیاست میں اترتا ہے، ایمان داری کا لباس کنارے رکھ کے، بے ایمانی، لوٹ کھسوٹ، ظلم وزیادتی کے بدبودار تالاب میں اتر جاتا ہے اور اپنے ناپاک فیصلوں سے ظلم، جبر اور ناانصافی کے گند سے سیاسی بحر میں مزید تعفن پھیلا دیتا ہے۔

یہ آج کی سیاست ہے، ایمان داری جس سے باہر ہے، بے ایمانی صاف ظاہر ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ارض پاک و مسلم ممالک کے سیاست دان اپنے اپنے ملکوں میں وہ عدل وانصاف قائم کرتے کہ لوگ جان لیتے کہ واقعی! یہ آسمانی مذہب، آخری کتاب کے حاملین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہی خلافتِ ارضی کے لائق ہیں۔ اسلام سچا دین ہے۔ مسلمان امن، عدل اور محبت کا استعارہ بن جاتے۔ لیکن ہمارے مسلم حکم ران وعام مسلمان نے اسلام کی تعلیمات بھلا دیں۔ وہ طور طریقے، جو ان کا خاصہ تھے، ان سے منہ موڑ لیا۔ سازشی ذہنوں کی سازشیں اپنی جگہ لیکن ہر وقت امریکا واسرائیل اور بھارت کو الزام دینا دانش مندی نہیں ہے۔

اللہ نے عقل دی ہے کیا وہ بھی رہن رکھ لی؟
عمل سے عاری ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

یہ سب کچھ اپنی جگہ مگر اب بھی ہم چاہیں تو سیاسی تالاب سے گندی مچھلیاں نکال کے بہتری کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔

نہ جب تک مسلمو! تم حالت دینی سنوارو گے
کرو گو لاکھ تدبیریں ہمیشہ سب سے ہارو گے
گناہوں کا یہ جب بارِ گراں اپنا اتارو گے
جبھی قعرِ مذلت سے تم اپنا سر ابھارو گے
تمہاری قوم کی تو ہے بِنا ہی دین وایماں پر
تمہاری زندگی موقوف ہے تعمیل قرآں پر
تمہاری فتح یابی منحصر ہے فضل یزداں پر
نہ قوت پر نہ کثرت پر نہ شوکت پر نہ ساماں پر
مسلمانو! اٹھو بہرِ عمل تیار ہو جاؤ
نہیں یہ وقت غفلت کا بس اب بیدار ہو جاؤ

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

فخر الدین پشاوری

فخر الدین پشاوری بن صلاح الدین حافظ قرآن ہیں اور درس نظامی کی تعلیم جاری ہے۔عصری تعلیم میں انٹر میڈیٹ کے طالب علم ہیں۔ستمبر 2017 سے تقریباً 18 سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔رائٹرز کلب سے ایک برس سے وابستہ ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1-بہترین لوگ

2-اسلام اور آج کا معاشرہ

3-مدرز ڈے اور ہم

4-سوشل میڈیا پر شیئرنگ کے وقت ذرا سوچیے

5-یومِ شہدائے پولیس

☆.....☆.....☆

بہترین لوگ

''بہترین لوگ وہ ہیں جو دوسروں کو فائدہ پہنچائیں''۔ زندگی کا حق ہے کہ اسے تقسیم کرو اور جو تقسیم کرو گے، اس کی تمہارے ساتھ فراوانی ہوگی۔ چاہے وہ دولت ہو، علم ہو، محبت ہو، آسانیاں ہوں یا خدانخواستہ کسی کو دی ہوئی پریشانیاں۔ اسے جتنا تقسیم کرو گے اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو گے تو خدا تمہاری زندگی آسان فرمادے گا۔ مال تقسیم کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں غیبی خزانوں سے مال عطا فرمائے گا۔ دوسروں کی مدد کیا کرو، اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ دوسروں کو سکون دو، اللہ تمہیں سکون دے گا۔ جو چیز لینا چاہتے ہو، وہ دوسروں کو دینا شروع کردو۔

انسان کو ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنی چاہیے لیکن بغیر کسی غرض کے، کیوں کہ جو بدلہ اسے اللہ کے ہاں ملے گا، وہ دنیا میں کوئی نہیں دے سکتا۔ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں قحط پڑ گیا۔ آسمان نے پانی برسانا چھوڑ دیا تھا اور زمین نے اناج اگانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس قحط کی وجہ سے پورے شہر میں غربت پھیل گئی تھی، لوگ دانے دانے کے لیے محتاج ہو گئے تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کی تجارت پورے عرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس دوران اُن کا ایک تجارتی قافلہ شام سے لوٹا۔ اس قافلے میں ایک ہزار اونٹ تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ جب یہ قافلہ مدینے پہنچا تو لوگوں کو تھوڑی راحت ہوئی۔ بچے، بوڑھے خوش ہوئے لیکن جیسے ہی یہ قافلہ مدینہ پہنچا، تاجروں کا ایک وفد بھی وہاں پہنچ گیا۔

اس وفد نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا وہ اپنا مال فروخت کرنا چاہیں گے؟ ان کا ارادہ تھا کہ سارا مال خرید لیں اور قحط سے مجبور لوگوں کو مہنگے داموں فروخت کر کے بہت سارا نفع کمائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ اس کی کیا قیمت لگاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، ہم آپ کو دُگنا نفع دیں گے۔ یعنی ایک دینار کا مال دو دینار میں خریدیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اتنا نفع تو مجھے پہلے ہی مل رہا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر انہوں نے نفع اور بڑھا دیا۔ پھر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا کہ اتنا تو مجھے پہلے ہی مل رہا ہے۔ انہوں نے نفع اور بڑھا دیا لیکن اب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہی کہا کہ اتنا تو مجھے پہلے ہی مل رہا ہے۔

یہ سن کر وہ تاجر حیران ہوئے۔ انہوں نے کہا، عثمان! (رضی اللہ عنہ) ہم اہل مدینہ کو خوب جانتے ہیں، یہاں کوئی تاجر ایسا نہیں جو تمہارے مال کو ہم سے زیادہ قیمت میں خریدے۔ آخر وہ کون ہے جو تمہیں ہم سے زیادہ نفع دے رہا ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، ''اللہ، جو نفع تم مجھے دے رہے ہو، میرے رب نے مجھے اس سے بہت زیادہ دینے کا وعدہ کیا ہے''۔ یہ کہہ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ تمام مال اہل مدینہ اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے اس وقت قرآن کی یہ آیت تھی، ''جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس میں سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے، وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی''۔ (البقرہ 261)

آج کل لوگ ایک دوسرے کی مدد اس لیے نہیں کرتے کیوں کہ انہیں اپنے اچھے سلوک کا بدلہ نہیں ملتا۔ تاہم، ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمیں جس کی بھی مدد کرنی ہے بغیر کسی غرض کے کریں اور اس کے اجر کی امید صرف اللہ سے رکھیں کیوں کہ جو کچھ ہمیں اللہ دے سکتا ہے وہ اس دنیا میں کوئی نہیں دے سکتا۔ ارشاد باری تعالی ہے کہ ''جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم پہنچے گا''۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی سائل کسی سے مانگے اور وہ کسی وجہ سے دے نہ سکتا ہو تو اس سے نرم الفاظ میں معذرت کر لے نا کہ دے اور بعد میں احسان جتلائے یا اسے ذلیل کر کے تکلیف پہنچائے۔

☆.....☆.....☆

اسلام اور آج کا معاشرہ

خدا کا بھیجا ہوا پسندیدہ آخری دین ''اسلام'' ابدی اور لازوال ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں شامل ہے۔ اس دین میں زندگی کے ہر گوشے کے لیے ہدایات موجود ہیں۔ پیدائش، کھانے پینے، چلنے پھرنے، خلوت جلوت، عبادات معاملات، ہر ایک کو اسلامی طریقے کے مطابق ڈھالنا ''اصلاحِ معاشرہ'' کہلاتا ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کی حدود بہت وسیع ہیں۔ اسلامی معاشرے کی پہلی بنیاد لباس، اخلاق و ایمان اور ماحولیات کی تطہیر و تنصیف ہے۔ دوسری بنیاد، عبادات کی اصلاح ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کی تیسری بنیاد ''شادی بیاہ'' کی اصلاح ہے اور چوتھی بنیاد ''سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے''۔

اصلاحِ معاشرہ کی ذمے داری کس پر ہے؟ ہر کلمہ گو مسلمان پر اصلاح معاشرہ کی ذمے داری ہے۔ کیا معاشرے میں بگاڑ پہلے سے موجود تھا یا بعد میں رونما ہوا؟ ایسے چند سوالات کا اگر جواب ڈھونڈا جائے تو یقیناً یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ اصلاح کیسے ممکن ہے؟ معاشرے میں بگاڑ پہلے سے موجود نہیں تھا، یہ رفتہ رفتہ پیدا ہوا اور اب بھی جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، ویسے ویسے معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ایک طرف جدید ٹیکنالوجی کا دَور دَورہ ہے تو دوسری طرف نوجوان نسل بگڑتی چلی جا رہی ہے۔ اس خرابی اور بگاڑ کے ذمے دار میں اور آپ ہیں۔ ہمارا پسندیدہ مشغلہ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ذمے دار ٹھہراتے رہتے ہیں، معاشرے کی اصلاح کے لیے خود کوئی عملی اقدام نہیں کرتے۔ دوسروں کے حق میں ہم بہترین جج اور اپنے حق میں بہترین وکیل ہیں۔ دوسروں پر جھٹ سے کفر، شر پسند یا فسادی ہونے کا فیصلہ سنا دیتے ہیں اور اپنی ہر چھوٹی بڑی غلطی کی ہزاروں تاویلیں، دلائل پیش کر کے اپنا دفاع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

معاشرے کی اصلاح کے لیے واحد کام، جو ہم کرتے ہیں وہ دوسروں کو نصیحت ہے۔ ہم ہر اچھے کام کے لیے

دوسروں کو نصیحت کر کے سمجھتے ہیں کہ ہمارا فرض پورا ہو گیا اور اسی نصیحت پر خود عمل پیرا ہونا بھول جاتے ہیں۔ جب کہ عمل، قول سے زیادہ تاثیر دیتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح خود ہماری اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ (ایک مفتی صاحب سے کچھ سادہ لوح افراد نے مسئلہ معلوم کیا کہ ایک کنویں میں کتّا گر کر مر گیا ہے، اس صورت میں کیا حکم ہے؟ مفتی صاحب نے مسئلہ بتایا کہ کنویں کا تمام پانی نکال دیا جائے۔ عوام نے کنویں کا تمام پانی نکال کر مفتی صاحب سے کہا کہ پانی تو نکال دیا ہے مگر بدبو اب بھی باقی ہے۔ وجہ معلوم کی گئی تو پتا چلا کہ پانی تو نکال دیا گیا پر کتا اب بھی کنویں میں موجود ہے۔) آج ہمارے معاشرے میں یہی ہو رہا ہے۔ ہم دنیا کی بدبو ختم کرنے کے درپے ہیں لیکن اپنے اندر کی بدبو دُور کرنے پر ہماری کوئی توجہ نہیں ہے۔ جب تک اپنے گردوپیش کی سدھار اور اصلاح سے پہلے ہم خود کو سدھارنے اور سنوارنے کی کوشش نہیں کریں گے، معاشرہ نہیں سدھر سکتا۔

اسلام نے انسان پر نہ صرف اس کی اپنی اصلاح کی ذمے داری عائد کی ہے بلکہ اس کے اہل وعیال کی اصلاح کی ذمے داری بھی اسی پر ڈالی ہے۔ اولاد، عزیز واقارب اور اپنے خاندان کو راہ راست پر لانے کا فریضہ بھی گھر کے سربراہ پر عائد کیا ہے۔ خود انبیاء علیہ السلام بھی اس فریضے سے مستثنیٰ قرار نہیں دیے گئے، حتیٰ کہ امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پہلا حکم دیا گیا، وہ یہ تھا، ''اور اپنے قریبی رشتے داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایئے''۔ یعنی تذکیر وترغیب اپنے گھر سے شروع کریں، چناں چہ اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عزیز واقارب اور اپنے خاندان کو کھانے پر جمع کیا اور خطبہ ارشاد فرمایا: ''اے بنی عبدالمطلب! مجھے اللہ کی طرف سے تمہارے حق میں کوئی اختیار نہیں۔ تم میرے مال میں سے جتنا چاہو مجھ سے لے لو، خدا کی قسم جو چیز میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں، مجھے عرب میں کوئی ایسا جوان معلوم نہیں جو اپنی قوم کے پاس اس سے بہتر کوئی چیز لایا ہو۔ میں تمہارے پاس دنیا وآخرت کی بھلائی لایا ہوں اور مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ تم میں سے کون ہے، جو اس کام میں میرے ہاتھ مضبوط کرے اور اس کے نتیجے میں میرا بھائی بن جائے؟'' (تفسیر ابن کثیر)

اسی طرح ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین سے خطاب کے ذریعے اسی بات کی تنبیہ فرمائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، ''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے''۔ اس آیت میں گھر کے سربراہ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ خود بھی دوزخ کے عذاب سے بچے اور اپنے ماتحتوں کو بھی بچائے۔

بقول ایک داعی اور مفکر: ''آپ کے لیے فکر کی بات یہ نہیں ہے کہ سماج بگڑ رہا ہے، فکر کی بات یہ ہے کہ آپ بگڑ رہے ہیں۔ آپ سدھر جائیں تو سماج سدھر جائے گا۔ خرابی سماج میں نہیں، خرابی آپ میں ہے۔ حیرت ہے کہ آپ باہر کی خرابیوں کے تذکرے کر رہے ہیں اور اپنی خرابی کی کچھ خبر نہیں۔ تعجب ہے کہ آپ دوسروں کی اصلاح کے لیے بے

چین و بے قرار ہیں حالاں کہ اصلاح کی ضرورت آپ کو ہے۔ آپ کو دوسرے لوگ مریض نظر آ رہے ہیں جب کہ سب سے بڑے مریض آپ خود ہیں۔ آپ کی اپنی کشتی بھنور میں ڈانواڈول ہے لیکن آپ کو دوسروں کی کشتیاں ساحل سے لگانے کی بے تابی ہے۔ آپ کے گھر کا کل اثاثہ راکھ کا ڈھیر بنتا جا رہا ہے لیکن آپ دوسروں کی لگی آگ تلاش کرنے میں مصروف ہیں کہ اسے بجھا دیں۔

اس طرزِ فکر و عمل میں آپ تنہا نہیں ہیں۔ ہر ایک آپ ہی کی طرح سوچ رہا ہے۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ اصلاح ہو لیکن دوسروں کی، ہر ایک چاہتا ہے کہ برائیاں ختم ہوں لیکن دوسروں کی زندگیوں سے، ہر ایک کی تمنا ہے کہ نیکی اور بھلائی کا چلن عام ہو لیکن یہ سب کچھ دوسرے کریں۔ ہر ایک سارے جہاں کا جائزہ لینے کے لیے نہایت چاق و چوبند ہے لیکن اپنے جہاں سے بے خبر ہے اور یہی اس بشر کی پستی کا اصل سبب ہے''۔ جب ایک شخص اپنی اصلاح کی طرف پوری توجہ مبذول کر دے گا تو اس سے ایک اچھا معاشرہ وجود میں آئے گا اور جب ایک معاشرہ صحیح راہ کی طرف چل پڑے گا تو دھیرے دھیرے اس کے اچھے اثرات پوری قوم میں منتقل ہوں گے اور پوری قوم میں اصلاح کا جذبہ بیدار ہوگا۔

آخر میں معاشرے کی اصلاح کی طرف ذہن و دل متوجہ کرتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا دردِ دل ملاحظہ ہو: ''اگر آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کا دین برحق ہے اور مرنے کے بعد سزا و جزا کے مراحل پیش آنے والے ہیں تو خدا کے لیے اپنی اولاد کو بھی اس سزا و جزا کے دن کے لیے تیار کیجیے۔ انہیں ضروری تعلیم دلوائیے، ان کے ذہن کی شروع ہی سے ایسی تربیت کیجیے کہ ان میں نیکیوں کا شوق اور گناہوں سے نفرت پیدا ہو۔ ان کی صحبت اور ماحول درست رکھنے کا اہتمام کیجیے۔ اپنے گھروں کو تلاوت قرآن اور اسلافِ امّت کے تذکروں سے آباد کیجیے، گھر میں کوئی ایسا وقت نکالیں، جس میں تمام گھر والے اجتماعی طور پر دینی کتب کا مطالعہ کریں، اپنے ذاتی عمل کو ایسا دل کش بنائیے کہ اولاد اس کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرے۔

☆.....☆.....☆

مدرز ڈے اور ہم

ماں! اولاد کی زبان سے نکلا ہوا لفظ ''ماں'' ایک ایسا اظہار ہے جس سے دل و دماغ کو سکون ملتا ہے۔ جس کا ذکر لبوں پر آتے ہی خوشی چھا جاتی ہے۔ لفظ ماں اپنے اندر کائنات کی تمام تر مٹھاس اور نرماہٹ لیے ہوئے ہے۔ یہ دنیا کا سب سے پُرخلوص اور چاہت والا رشتہ ہے۔ ماں کی محبت کی طاقت کا اندازہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا۔ ماں کے لبوں کی ایک جنبش بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ اسی لیے حضور نبی کریم ﷺ کائنات کے سب سے بہتر انسان ہونے کے باوجود اپنی دودھ پلانے والی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ نبوت ملنے کے بعد بھی جب حلیمہ سعدیہ آپ ﷺ سے ملنے آتی تھیں تو آپ ان کے لیے اپنی رحمتوں سے بھری مقدس چادر بچھا دیا کرتے تھے، ان کی استقبال کے لیے اٹھتے اور انہیں واپس چھوڑنے کے لیے دُور تک ان کے ساتھ جایا کرتے تھے۔

ماں کا مقام تو اتنا بڑا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا، جب کہ آج کل اکثر دیکھا جاتا ہے کہ والدین بچوں کو کوئی کام یا بیماری کی حالت میں دوا کے لیے کہتے ہیں تو وہ لاپروائی کرتے ہوئے ان کا کہنا نہیں مانتے بلکہ گھنٹوں فون پر دوستوں سے گپ شپ لگانے یا کرکٹ و دیگر کھیل کود سے فراغت کے بعد ہی بات ماننے پر راضی ہوتے ہیں۔ بچے، خاص طور پر نوجوان، ٹی وی پروگرامز، موبائل یا کمپیوٹر پر اس قدر مگن رہتے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے نظام سلطنت کا بوجھ انہیں کے کندھوں پر آ پڑا ہے اور اگر کسی کام کے لیے اٹھ گئے تو پورا نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ ''عورت پر سب سے زیادہ حق اس کے شوہر کا ہے جب کہ مرد پر سب سے زیادہ حق اس کی ماں کا ہے''۔ ماں کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ ہے ماں کی عظمت اور آج کل سال میں صرف ایک دن ماں کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس ماں کے لیے،

جس نے تمام زندگی اپنے بچوں کے نام کر دی ہو۔ جس نے اپنی خوراک، نیند، آرام، غرض یہ کہ سب کچھ اپنے بچوں کے نام کر دیا ہو۔ وہ صرف ایک دن اپنی ماں کو یاد کرتے ہیں، ان سے ملتے ہیں پھر پورا سال ان کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔

پاکستان میں بھی ''مدرز ڈے'' منانے پر کروڑوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں۔ مہنگے ترین ہوٹل کے ہالوں میں تقریبات ہوتی ہیں۔ سرکاری و غیر سرکاری این جی اوز اور تنظیمیں بڑے بڑے فلیکس اور بینرز آویزاں کر کے، مارننگ شوز میں بیک گراؤنڈ میں تھیم سونگ ''ماں! تیری عظمت کو سلام'' اور ''ماواں، ٹھنڈیاں چھاواں'' چلا کر ماں کو خراج تحسین و عقیدت پیش کرتے ہیں۔

مگر یہ صریحاً ناانصافی ہے کہ پورے سال میں صرف ایک دن ماں کو یاد کیا جائے۔ صرف ایک دن، ان کی خدمت کی جائے۔ اولاد کے لیے تو ہر دن ''مدرز ڈے'' ہونا چاہیے۔ ہر روز ان سے ملنا چاہیے، ہر روز ان کی خدمت کرنی چاہیے۔ ورنہ سال میں صرف ایک دن یاد کرنے سے وہ دن بھی جلد آ جائیں گے، جو آج کل مغرب میں چل رہے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں کہ انہیں پورے سال میں ماں کے لیے ایک دن بھی نکالنا گوارا نہیں ہوتا۔ اخبار میں 'ڈائجسٹ' صفحے پر انگلینڈ کی عدالت میں جاری ماں اور بیٹے کا ایک کیس دیکھ کر آنکھوں سے آنسوؤں کو نہ روک پایا کہ ایک ماں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا تھا کہ میرا سگا بیٹا میرا حال تک نہیں پوچھتا اور سارا وقت اپنے کتے کو دیتا ہے، اس کے ساتھ مگن رہتا ہے۔ پھر وہ عورت کیس ہار گئی۔ فیصلہ اس کے بیٹے کے حق میں ہوا کہ وہ جوان ہو چکا ہے، اگر چاہے کہ پورا وقت اپنے کتے کو دے اور ماں کو نہیں، تو اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

☆.....☆.....☆

سوشل میڈیا پر شیئرنگ کے وقت ذرا سوچیے

ایک مسلمان جب کوئی نیک کام کرتا ہے تو ان کے اعمال نامے میں نیکی لکھی جاتی ہے اور اگر گناہ کرتا ہے تو اعمال نامے میں بدی لکھی جاتی ہے۔اس کے برعکس کچھ ایسی نیکیاں اور ایسے گناہ ہیں، جو ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار اور مسلسل لکھے جاتے ہیں۔اس کی مثال وہ نیکی یا بدی ہے جو آپ خود کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ایسے میں اگر وہ نیکی کرتا ہے اور دوسروں کو بھی نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو اس سلسلے میں ایک تو اس کی خود کی نیکی لکھی جاتی ہے اور دوسرے وہ لوگ، جو اس کی ترغیب پر راہ راست پر آجاتے ہیں، ان کی نیکی میں بھی وہ برابر کا شریک ہوتا ہے اور اس کے ثواب میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔یہی مثال برائی کی بھی ہے۔

ارشاد ربانی ہے کہ ''اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلو اور قیامت میں تمہارے گناہ ہمارے ذمے رہے۔حالاں کہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں ذرا بھی ذمہ نہیں لے سکتے۔یہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں اور (البتہ یہ ہوگا کہ) یہ لوگ اپنے گناہ اپنے اوپر لادے ہوں گے اور اپنے (ان) گناہوں کے ساتھ (ہی) کچھ گناہ اور (لادے ہوں گے) یہ لوگ جیسے جیسے جھوٹی باتیں بناتے تھے، قیامت میں ان سے بازپُرس (اور پھر سزا) ضرور ہوگی''۔

آیت کریمہ کے اس ترجمے سے آپ سمجھ چکے ہوں گے۔اس مسئلے پر اس لیے لکھا کہ یہی مسئلہ ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے۔آپ اپنے اردگرد کے ماحول میں دیکھیں گے کہ کوئی کسی برائی میں مبتلا ہے تو وہ دوسرے کو بھی اس میں شامل کر لیتا ہے، گویا جس کو شامل کیا ہے اس کی برائی کا صلہ اس کو بھی ملتا رہے گا۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک گناہ گار جب توبہ کرتا ہے تو اس کے گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں لیکن جن لوگوں کو اس نے اس گناہ پر اکسایا تھا اور وہ اب بھی وہ گناہ کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے گناہ میں یہ برابر کا شریک ہے اور قیامت کے دن اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے گا۔

آج کل سوشل میڈیا کا دَور دَورہ ہے، ہر کسی کے ہاتھ میں موبائل ہوتا ہے اور موبائل میں جو سب سے عام ہے وہ فیس بک ہے۔ اس میں ہر قسم کی ویڈیوز آتی ہیں، جن میں زیادہ تر فحاشی اور گندی قسم کی ہوتی ہیں۔ کچھ صحیح اور دین اسلام کی تبلیغ وغیرہ کی بھی ہوتی ہیں، میں اس سے منکر نہیں لیکن اس کی طرف بعد میں آتا ہوں، پہلے گناہ کی ویڈیوز کی مثال دیتا ہوں۔ آپ کے نیوز فیڈ پر ایک گانا آیا جس کے ساتھ ڈانس وغیرہ بھی تھا، آپ نے اسے دیکھ لیا تو آپ کو اپنے حصے کا گناہ مل گیا لیکن جس نے یہ گانا شیئر کیا تھا، اسے دُگنا گناہ ملے گا اور اگر آپ نے اسے شیئر کیا تو کم از کم سو، دو سو لوگ تو دیکھیں گے، تو ان سب کے گناہ میں بھی آپ برابر کے شریک ہوں گے۔ پھر فرض کریں کہ آپ نے توبہ کر لی تو آپ کے گناہ تو معاف ہو جائیں گے مگر جو گناہ آپ نے پھیلایا ہے، اس کا کیا کریں گے، اسے کیسے روکیں گے؟ میرے تجربے کے مطابق اس ویڈیو کو روکنا ناممکنات میں سے ہے کیوں کہ اگر آپ کی وہ ویڈیو سو بندوں نے دیکھی اور ان میں سے صرف دس بندے بھی آگے شیئر کر دیں اور ان کے بھی کم از کم سو، سو دوست دیکھیں تو ہزار بن جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ آگے جاتی رہتی ہیں، تو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور غلط کام یا غلط بات کو آگے پھیلانے کے بجائے نیکی کو آگے پھیلانا چاہیے جس کا ثواب آپ کو ملتا رہے گا۔ کسی کو غلط کام کی طرف بھی نہیں اکسانا چاہیے کہ پھر قیامت کے دن اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ بھی آپ کے سر ہوگا۔ اُن کے گناہوں میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوگی اور اتنا ہی بوجھ ان کے سر پر بھی ہوگا۔

ہم نیک کاموں کی ترغیب دیں گے، نیکی پھیلائیں گے تو ان شاء اللہ یہ ہمارے لیے صدقۂ جاریہ ہوگا۔ جب تک وہ بندہ نیک عمل کرتا رہے گا، اس کا ثواب ہمیں بھی ملتا رہے گا اور اُس کے ثواب میں بھی ذرّہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی۔

☆.....☆.....☆

یومِ شہدائے پولیس

4 اگست کو ''یومِ شہدائے پولیس'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس دن تمام شہدائے پولیس کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ رسمی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں، شہدا کے لیے فاتحہ خوانی کی جاتی ہے، ان کی قربانیوں کا تذکرہ کر کے ان کے خاندان والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اگر سنجیدگی سے لیا جائے تو یہ کام بہت بڑا ہے۔ عام طور پر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ بس تقریب ہے، ہم جائیں یا نہ جائیں، ہو ہی جائے گی۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ اس حقیقت کو دیکھنا چاہیے کی تقریب کس سلسلے میں ہے۔

شہادت ایک ایسا عظیم مقام ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر پولیس مین، جو ہماری خدمت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، نہ گرمی کی فکر نہ سردی سے بچاؤ کا کوئی خاص انتظام، پھر بھی کھڑے ہو کر ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ فرض کیجیے، آپ اپنے بچے گھر میں چھوڑ کر عید کے دنوں میں کسی تفریحی مقام پر ڈیوٹی انجام دے رہے ہوں تو دوسرے بچوں کو ان کے والدین کے ساتھ گھومتے پھرتے، کھیلتے کودتے دیکھ کر آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ آپ کے لیے کتنا مشکل ہوگا، کیا آپ کو اپنے بچوں کی یاد نہیں رُلائے گی؟ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں، آپ تو بس صرف تنقید کرنا جانتے ہیں۔ سردی کے موسم میں ہاتھ میں 30 ہزار روپے کا موبائل لیے، گرم بستر میں لیٹ کر، بیوی بچے بھی سامنے، بس صرف پولیس والوں کے خلاف پوسٹ شیئر کرتے رہیں۔ ذرا باہر نکل کر اس سردی میں پہرا تو دیں۔ کیا خیال ہے، دے پائیں گے؟ مشکل تو کیا ناممکن ہے۔ جب آپ قربانی نہیں دے سکتے تو پھر جو لوگ آپ کے لیے قربانی دیتے ہیں، ان کی فکر اور عزت کریں، انہیں اپنے دل میں جگہ دیں۔ آپ کا کچھ بھی جائے بغیر انہیں بہت کچھ ملے گا، ان کی حوصلہ افزائی ہوگی، ان کے حوصلوں کو تقویت ملے گی۔ وہ اپنے آپ پر فخر محسوس کرنے لگیں گے اور ان کا کام ہے بھی فخر کرنے کے لائق۔

بعض لوگ پولیس کو کم زور سمجھتے ہیں۔ ان کی شہادت کو شہادت نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک تو وہ شہادت کے مفہوم سے بھی صحیح طرح سے واقف نہیں ہیں۔ پولیس والے تو ایسی جنگوں میں شہید ہو رہے ہیں جو ان کی اپنی ہے بھی نہیں۔ اصل جنگ ہماری ہے مگر انہوں نے اپنے سر لے لیا ہے۔ قربانیاں دیتے ہیں تو قوم کی خاطر، عوام کی خاطر، ہمارے اور آپ کی خاطر، چوری، ڈکیتی ہمارے ساتھ ہوتی ہے اور چور کا پیچھا وہ کرتے ہیں، جانی نقصان ان کا ہوتا ہے، صرف ہماری خاطر۔ انہیں گرمی سردی کی کوئی پروا نہیں۔ ان کے اپنے بچے یتیم ہوتے رہے اور وہ ہمارے بچوں کو یتیم ہونے سے بچاتے رہے۔ افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جو اتنی بڑی قربانیوں سے انکار کرتے ہیں اور یہ جان کر بھی کہ یہ ہمارے ہی محافظ ہیں، انہیں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ہمیں تو ان پر فخر ہونا چاہیے، انہیں سیلوٹ کرنا چاہیے، ان کی شہادتوں سے ہمارے دلوں میں بھی شہادت کا جذبہ بیدار ہونا چاہیے۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ جب کبھی دینِ اسلام یا وطنِ عزیز پر جان قربان کرنے کا وقت آجائے تو ہم سینہ تان کر اپنے آپ کو صفِ اوّل میں پیش کریں۔

آج جو یہ عظیم دن منایا جا رہا ہے، اس میں اگر ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ ہم اپنے اُن شہید بھائیوں کے لیے فاتحہ خوانی کریں، ان کے لیے دعائیں مانگیں، ان کے یتیم بچوں سے مل کر ان کے حوصلے بڑھائیں، ان سے ہر قسم کا تعاون کریں اور تمام شہداٗ کے لیے خصوصی دعائیں مانگیں۔

آخر میں میں حکومت سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ جس طرح ہماری نصابی کتابوں میں فوج کے شہداٗ کے ناموں سے اسباق و مضامین آتے ہیں، اسی طرح پولیس کے شہداٗ اور بہادر سپوتوں کے بارے میں بھی مضامین نصاب میں شامل کیے جائیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں پولیس کی عزت و احترام مزید بڑھ جائے اور ملک و قوم کی خدمت کا حقیقی جذبہ پیدا ہو۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

عائشہ یاسین

عائشہ یاسین کا تعلق کراچی سے ہے۔اردو ادب میں ایم اے کیا ہے۔میڈیا، کمپیوٹر گرافکس اور مارکیٹنگ میں سرٹیفیکشن کیا ہے۔عائشہ یاسین ملک کے نامور اخبارات اور رسائل کے لیے تحریریں لکھ چکی ہیں۔رائٹرز کلب سے ایک برس سے وابستہ ہیں اور نئے سال سے بطور ایڈمن اپنی ذمے داریاں سرانجام دے رہی ہیں جبکہ رائٹرز کلب مشاورتی باڈی کی بھی رکن ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔بابے لوگ

2۔سفید چھڑی

3۔آگہی

4۔کامیاب بیوی

5۔بند مُٹھی

☆.....☆.....☆

بابے لوگ

تپتی زمین پر جب تلوے ہی کیا روح تک سلگنے لگے، ایسے میں آسمان سے ٹپکا پانی کا اک قطرہ، اک لمحے کے دسویں حصے میں جسم و جاں میں امید اور شادابی بھر دیتا ہے۔ ناتواں جسم میں جیسے جان سی آ جاتی ہے اور نقاہت سے چور آنکھیں آسمان کی طرف دیکھنے لگتی ہیں۔ آسمان کو تکنے کے اس عمل کو ''توکل'' کہتے ہیں۔ توکل ہی اک ایسی گانٹھ ہے جو بندے اور خالق کو اک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیتی۔

عام لوگوں کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ بڑے سے بڑے لوگوں کی زندگی بھی اونچ نیچ سے عبارت ہے۔ کبھی رشتے میں کھچاؤ، کبھی روزگار میں مشکلات، کبھی ایمان میں تشکیک اور کبھی زندگی کے دیگر عروج و زوال۔ بندہ چلتے چلتے جب کسی موڑ پر تھک جاتا ہے، بظاہر ناامیدی کی اتھاہ گہرائی اس کی منتظر و مقدر دکھائی دیتی ہے، اس لمحے یہ ''بابے'' لوگ امید کا چھینٹا مار کر بندے کا توکل بحال کرتے ہیں۔

بابے کون ہوتے ہیں؟ ہر وہ بشر، جو کسی جان دار کو امید کی رمق دے، بابا ہے۔ ہمارے اردگرد بے شمار بابے گشت عمل رہتے ہیں۔ بابا کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ آپ، میں یا وہ سامنے کھیلتا ہوا شرارتی بچہ، یا کونے میں بیٹھا نحیف سا بوڑھا یا پیٹھ پر وزن لادے توانا نوجوان۔ بابا لوگ کسی خاص رنگ و روپ اور نسل کے نہیں ہوتے بلکہ ان کا کام صرف ناامید خلق کو امید دلانا ہوتا ہے اور پیٹھ پر ایک تھپکی دینا اور کہنا، ''جاؤ... تمہارا کام ہو جائے گا۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا''۔ یقین کا یہ جملہ وٹامن کی گولی کا کام کرتا ہے اور بندہ اپنے رب سے دوبارہ جڑ جاتا ہے اور کن فیکون ہو جاتا ہے۔

اللہ اپنے بندوں سے، اپنے پیار کے اظہار کے لیے ہر قدم پر آسانی فراہم کرتا ہے تاکہ بندہ رب سے جڑا رہے۔ بابے لوگ ناخوشی اور اداسی کی دھند کو چاک کر کے، ذہن کے دریچوں کی گرد صاف کرتے ہیں۔ ان کی فقط ایک تھپکی ہی جادو کا کام کرتی ہے اور بندہ زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ بابا بننا کوئی مشکل کام نہیں۔ بس ایک توکل کی

پریکٹس ہے۔کسی کے لب پر ہلکی سی مسکان لانے کا جتن ہے۔آنکھوں میں چمک لانے کا گر ہے۔جیسے ایک روتے دھوتے بچے کو اس کا ہاتھ تھام کر، آسمان کی طرف متوجہ ہو کے، انگلی کے اشارے سے بتانا کہ وہ ہے ہمارا رب....ہمارا پالن ہار۔وہ ہر چیز پر قادر ہے۔بس یہی ڈیوٹی ہے بابا لوگ کی۔اللہ ہم کو بھی ایسی عادات سے نوازے، جو دوسروں کے لیے باعث رحمت ہوں، جو خلق خدا کی خوشی کی وجہ ہوں، جو ہمارے ہونے کے مقصد کو سامنے لا سکیں، آمین۔ بلھے شاہ نے کہا تھا:

کجھ بغض تی ریت وچ نئیں ملدا
کجھ ہار تے جیت وچ نئیں ملدا
مخلوق خدا نال پیار تو کر
رب صرف مسیت وچ نئیں ملدا

☆.....☆.....☆

سفید چھڑی

پھولوں کے جھرمٹ میں روز کچھ تتلیاں ایک پھول سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پھول پر منڈلاتی پھرتی تھیں۔صبح صادق کا وقت بڑا پُرسکون ہوتا تھا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ سے پورا باغ گونج رہا ہوتا۔شہد کی مکھیاں،شہد بنانے کے کاروبار میں جتی نظر آتیں اور اپنے من پسند پھول سے رس حاصل کر رہی ہوتیں۔کبھی کبھی یہ اندیشہ بھی ہوتا کہ آیا یہ مکھیاں رنگ بھی اپنے پسند کا چنتی ہوں گی؟ مگر میں یہ خیال ہنس کے یوں جھٹک دیتا کہ اس سلسلے میں نہ میرے پاس کوئی مطالعہ ہے اور نہ سائنسی ریسرچ۔ باغ میں بنے ٹریک پر چالیس منٹ کی برسک واک میرا روز کا معمول تھی۔کھلی فضا اور تازہ ہوا، میری کم زوری تھی۔اس واک کے ساتھ ساتھ ورزش بھی ہو جاتی اور قدرت کے رنگوں کو دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا۔'کتنا سکون سے بھرپور ہے یہ ماحول۔' میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے اردگرد کی تازگی جذب کرتے ہوئے سوچا۔ایک دم نرم ہواؤں کے ساتھ ایک دل فریب مہک نے میرے وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کسی کی مترنم سی ہنسی نے میرے بدن کے راگ کو چھیڑ دیا۔

میں اپنی بند آنکھوں سے بھی اس کو دیکھ رہا تھا۔ بند آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب بڑے دل کش اور حَسین ہوا کرتے ہیں۔اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے لیے میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی پلکیں اٹھائیں اور خوشبو کے تعاقب میں اس حسین دوشیزہ کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سب سے منفرد اور ہٹ کے تھی۔معصوم اور نازک سی، گوری رنگت،سنہری بال اور گہری گہری آنکھیں۔ وہ سادگی کا خوب صورت امتزاج تھی۔میری نظر جیسے جم سی گئی۔ مجھے اس کے وجود کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیسے میری تلاش کو منزل مل گئی تھی۔ جیسے وہ، وہی تھی جس کے انتظار میں مَیں ایک ایک لمحہ گنتا رہا تھا۔کتنا اچھوتا اور دل فریب احساس تھا۔

میں اپنی محبوبہ کے مل جانے پر اندر ہی اندر جشن مناتا رہا اور وہ حُسن کا پیکر، اپنی سہیلیوں کے ہم راہ باغ کے ایک کونے سے نمودار ہو کے دوسرے کونے میں اوجھل ہو گئی تھی۔ جب میں اپنے حواسوں میں آیا تو باغ کے کونے تک

بھاگا، پر وہ پری زاد گلی کے کونے پر واقع کالج کے دروازے میں داخل ہو چکی تھی۔ میں بے چینی کے عالم میں واپس پلٹا۔ سخت بے زاری محسوس ہو رہی تھی۔ اسی الجھن کے عالم میں گھر پہنچا اور کچھ کھائے پیے بغیر ہی آفس چلا گیا۔ آفس پہنچ کر اپنا دھیان کام کی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرتا رہا، پر میرا ہر داؤ بے سود رہا۔ جیسے تیسے دن گزارا اور پھر گھر آتے ہی اپنے کمرے میں قید ہو گیا۔

میرا یہ روپ ماں کو بڑا اجنبی لگا۔ ''چائے پی لو بیٹا!'' ماں نے اپنی مامتا کے پر کھول کر مجھے سمیٹتے ہوئے کہا۔ میں، جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے سونے کی ہر ممکن کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ کمرے میں ماں کے آتے ہی ماں کا پیار پھوار بن کر مجھ پر برسنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا تو انہوں نے پوچھا، ''کیا بات ہے۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟'' میں نے جواب میں ماں کے نرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے رکھ کے ان کے خدشات کی لو کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

ساری رات آنکھوں میں گزر گئی۔ میں خیال اور بے خیالی میں مبتلا رہا۔ اس انجان حسینہ کا خیال آتے ہی بدن میں جل ترنگ سے بجنے لگتے اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ 'یہ محض ایک سراب بھی تو ہو سکتا ہے؟' میں نے سوچا، پر دل، دماغ کی دلیل کو ماننے سے انکاری تھا۔ دل و دماغ کی اس جنگ میں جیت بالآخر دل کی ہوئی اور رات کے کسی پہر یہ فیصلہ ہوا کہ آگے کا لائحہ عمل کل طے کیا جائے اور اس حُسن لامتناہ کی جانب پیش رفت بڑھائی جائے۔

اگلی صبح کافی الگ تھی۔ ایک لمحہ خوابوں سے مزین تھا اور دوسرا لمحہ خدشات کو ساتھ لاتا۔ انتظار کیا شے ہے اور وقت کی رفتار کتنی بے مروت ہوتی ہے، اس کا احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اچانک دل کے دربار میں دربان نے صدا بلند کی۔ ''باادب، باملاحظہ، ہوشیار.... حُسن کی ملکہ آیا چاہتی ہیں''۔

میں، جو اپنے خیالوں کی دنیا میں محبت کے گل دستے بنا رہا تھا، اچانک چوکنا ہو گیا۔ وہ حسینہ ہوا کے دوش پر خراماں خراماں سہیلیوں کی جھرمٹ میں آ رہی تھی۔ ''تم ہی ہو میری منزل''۔ میرے دل نے صدا دی۔ ''میری تلاش، جس کی کھوج میں میری روح نہ جانے کتنے ڈگر گم نام پھرتی رہی، آج اس جستجو، اس حَسین تخیل کو تعبیر مل جائے گی''۔ میری سوچ گہری ہوتی گئی۔

وہ جیسے جیسے قریب آتی جا رہی تھی، میری سانسیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔ فضا میں اس کی خوشبو بس چکی تھی۔ اس کی کلکاریاں میری سماعت میں رس گھول رہی تھیں۔ وہ ان تمام لڑکیوں میں منفرد اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ کِھلی کِھلی سی، اُجلی اُجلی سی۔ اس کی آنکھوں کی چمک چار سُو پھیل رہی تھی، جن میں شرارت جھلملا رہی تھی۔ وہ بہتی ندی کی مانند زمانے سے بے خبر، اپنی دُھن میں چل رہی تھی۔ لہراتی، بل کھاتی، موج و مستی میں چلتی ناؤ کی طرح۔ پانی کی لہروں سے کھیلتی ہوئی وہ معصوم سی لڑکی۔ میں نے خود کو اس کے سحر سے آزاد کروایا۔

آج ان شاء اللہ فتح محبت کی ہو گی۔ میں نے خود کو مضبوط کیا۔ ''میں تم کو حاصل کر کے رہوں گا''۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا عزم دہرایا کہ اچانک چڑیوں سی چہچہاتی لڑکیوں کے لہجوں میں پریشانی سی امڈ آئی اور سب مل کر

کسی کا نام زور زور سے پکارنے لگیں، ''صبا! سنبھل کے، کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' میں نے موقع غنیمت جان کے اپنے دل کی بات کہنے کا ارادہ کیا اور جیسے ہی اپنی آنکھ کھولی، سامنے اس حوروں کی ملکہ کو پایا جو پیر مڑ جانے کے باعث زمین پہ بیٹھی ہوئی تھی اور سہیلیاں اسے سہارا دے کر اٹھانے میں مصروف تھیں۔ میں نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ دوسرا قدم جیسے پتھر کا ہو گیا۔ میرے قدم ہی کیا، میرا تو پورا وجود ہی منوں بھاری ہو چکا تھا۔

میرے سارے خواب، سارے دعوے زمین بوس ہو چکے تھے۔ میں مہ جبین، نازنین کے عشق میں جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا پر اب سارا خمار بھاپ بن کر اُڑ چکا تھا۔ میں نے ایک دن میں جتنی تیزی سے محبت کی منزلیں طے کیں، اس سے زیادہ تیزی سے واپسی کا سفر طے کیا۔ میں خود سے کیے ہوئے وعدوں کا پاس نہ رکھ سکا۔ میرا سارا عشق روئی کے گالوں کی طرح میری نظروں کے سامنے اُڑنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھوں میں سفید چھڑی دیکھی تو میرے قدم ہی کیا، آنکھیں بھی پتھر کی ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

آگہی

آگہی کے معنی جاننا، علم رکھنا اور ادراک کے ہیں۔ یہ محض ایک لفظ نہیں بلکہ ایک فارمولا ہے جس میں کائنات کے رموز پنہاں ہیں۔ آگہی زندگی کا فلسفہ بیان کرتی ہے۔ یہ زندگی کے مختلف مراحل سے گزرنے کا نام ہے اور زندگی کے تجربے سے یہ بات سامنے آئی کہ آگہی اصل میں آدھی موت ہے۔ لڑکپن میں ہر بات کو جاننے اور سمجھنے کی جستجو تھی۔ جب تک باتیں اور ان کے معنی پوشیدہ رہے، زندگی اتنی ہی دل کش اور رنگوں سے سجی معلوم ہوتی تھی۔ سب کچھ جان لینے کی لگن میں نہ جانے کن کن مراحل سے گزرتے رہے اور بعد میں آگہی واقعی آدھی موت ثابت ہوئی۔

انسان جب تک لاعلم اور انجان رہتا ہے، بہت سی سوچوں اور اذیتوں سے آزاد رہتا ہے۔ جیسے جیسے علم کے مراحل طے کرتا جاتا ہے ویسے ویسے ذمے داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ سوچ کی یلغار اور ان کے لغوی معنی ہمارے ذہن اور دل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سارے سوالات کے جوابات ملتے جاتے ہیں اور ہم ''دانا'' ہوتے جاتے ہیں۔ مگر دراصل آگہی ایک بہت ہی خوب صورت مرحلہ ہے جہاں عقل وشعور اور رہبری کا احساس ہوتا ہے۔ آگہی انسان کی سوچ کو وسعت اے سرنفی میں ہلا کر دوسرے ہاتھ میں چائے کا کپ اٹھالیا اور ماں کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو رواں ورتقویت بخشتی ہے۔ ذہن کے خالی کینوس پر سیاہی کے اک نقطے سے شروع ہو کر قوس قزح کے رنگ بکھیرتی ہے اور ایک منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہمارے اردگرد کا ماحول پُرنور ہو جاتا ہے۔ انسان پر زندگی کے معنی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

بے شک انسان معراج سے متعارف ہوتا ہے اور اس پر علم وفہم کے دریچے کھلنے لگتے ہیں۔ کائنات کے تمام راز اس جانے جانے پر منحصر ہیں۔ ایک خیال کا مادّی مظہر تک کا سفر آگہی کی بدولت ہے۔ کیا، کیوں، کب اور کیسے؟ کی تھکن، انسان کو کائنات کے اسرار ورموز کو سمجھنے، جاننے اور آزمانے کے گُر سکھاتے ہیں۔ اسی لگن کی بدولت انسان ترقی

کے تمام تر اونچائیوں کو چھو رہا ہے۔ کھوج کا یہ سفر آدم کی تخلیق سے جاری ہے۔ اسی کیا اور کیوں کی پاداش میں ہونے والی تمام ایجادات نے انسان کو چاند پر قدم رکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ رب کا دیا ہوا علم ہی تو تھا جس سے انسان کو برتری ملی۔ شعور اور تحت الشعور تک رسائی ملی اور اسی علم کی بدولت جب رب نے آدم کو مٹی سے تخلیق کیا اور روح پھونکی تو پوچھا۔

''کیا میں تمہارا رب ہوں؟'' تو کانوں نے سنا، آنکھوں نے دیکھا اور جب شعور و عقل نے قبول کیا تو آدم نے گواہی دی، تو ہی میرا رب ہے۔ علم و آگہی کا سلسلہ آدم کی تخلیق سے جاری ہوا اور اس کو سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی طاقت ملی۔ سوچنے سمجھنے کی یہ خصوصیت ہی انسان کو انسان بناتی ہے۔ اس کو دوسرے حشرات الارض و سماوات سے الگ اور بالاتر کرتی ہے۔ اسی لیے اللہ نے انسان کو عدل و منزلت کی تعلیم دی تا کہ وہ اپنی عقل اور دانائی کو بروئے کار لا کر تکوینی نظام کو سنبھالے اور اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت دے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ بے شک ہم نے ترقی کو مسخر کر لیا۔ ٹائم اینڈ اسپیس پر قابو پا کر خلاؤں میں آنے جانے لگے۔ ٹیکنالوجی اور سائنس میں بے تحاشا ترقی کر ڈالی، پر اپنے اصل کو سراسر فراموش کر دیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آگہی، عقل و شعور کی منزلوں کے ساتھ ساتھ اپنی اصل یعنی روح تک، کے سفر میں آگے بڑھنے میں کس قدر معاون ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اس ترقی نے ہمارے جسموں کو صرف آسانی دی ہے۔ ٹائم اینڈ اسپیس کو کم کیا ہے، ہماری ذہنی و جسمانی تفریح کو فروغ دیا ہے، پر سکون و راحت کو معطل کر دیا ہے۔ انسان نے علم کا یہ وجدان صرف جسمانی ترقی میں صرف کر ڈالا اور ذہنی سکون کو سلیپنگ اور انٹی ڈپریشن پلز سے مشروط کر کے روحانی بقا کو نظر انداز کر دیا۔ علم و آگہی کا سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ جب تک ہم اپنے رب اور اس کی ربوبیت کو جان اور پہچان نہ لیں، تب تک آگہی کی ضرورت رہے گی۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ

☆.....☆.....☆

کامیاب بیوی

انسان نے جب کرہِ زمین پر قدم رکھا، اس کی زندگی غم وخوشی، کامیابی ناکامی اور نفع نقصان سے عبارت ہوگئی۔ زندگی دو ادوار میں بٹ گئی، ہاں یا نہ۔ کوئی چیز ہوتی ہے یا نہیں ہوتی، گناہ ثواب وغیرہ وغیرہ۔ دنیاوی اعتبار سے کسی شے کے مثبت اصول کو کامیابی کا نام دیا گیا اور کسی شے کو کھو دینا ناکامی کہلایا۔ کامیابی کا دارومدار بڑا وسیع ہے۔ اس کو وسیع پیرائے میں بیان کرنا فی الحال ممکن نہیں۔ تاہم، اسے مزید دو پہلوؤں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ معاشرتی یا جنسی اعتبار سے دو اشخاص کامیاب یا ناکام ہوتے ہیں، کامیاب مرد یا کامیاب عورت۔

ہر وہ شخص، جو معاشی و معاشرتی تقاضے پورے کرتے ہوئے دوسروں پر سبقت لے جائے، کامیاب کہلاتا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ کامیابی کا تعلق شہرت اور دولت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مشروط ہے۔ کہتے ہیں، جب کوئی انسان کامیابی کی منزل پاتا ہے تو اس کے پیچھے ایک پورا طریقہ کار فرما ہوتا ہے۔ اَن تھک محنت اور کاوشوں کے بعد ہی کوئی ترقی کی سیڑھیاں چڑھ پاتا ہے۔ یہ ایک پورا عمل ہوتا ہے، جس کی بِنا پر شخصی اور ذہنی تعمیر ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اونچائیوں کی طرف بڑھتا ہے۔ کبھی اس کے موثر نتائج وقت سے پہلے سامنے آجاتے ہیں اور کبھی انسان کو سالوں وقت کی چکی میں پسنا پڑتا ہے۔

ہم بات کر رہے تھے، ایک مرد و عورت کی کامیابی کی۔ جیسا کہ یہ بات سب پر واضح ہے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے کئی وجوہ ہوتی ہیں۔ مشہور قول بھی ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مگر کیا ہم نے کبھی سوچا کہ ایک عورت کی کامیابی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟ اور اگر وہ عورت کسی کی بیوی بھی ہو تو اس کی کامیابی کا ذمے دار کون ہوتا ہے؟

یوں تو ہر شادی شدہ عورت کامیاب ہوتی ہے، اس کی کامیابی کا ثبوت اس کا اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا گھر، آشیانہ

اور اس میں چہچہاتے بچے ہوتے ہیں لیکن معاشرے میں سے اکثر تعداد ان عورتوں کی بھی ہے، جو گھر کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی شعبے میں بھی اپنے جوہر منواتی ہیں اور کامیاب کہلاتی ہیں۔ ان خواتین کی قابلیت اور اہلیت اپنی جگہ مگر ان کی پُر اعتماد اور پُر وقار شخصیت صرف اور صرف ان کے شریک حیات کی دین ہوتی ہے۔ ہم کتنی ہی ایسی خواتین سے بھی ملتے ہیں جو اپنی ازدواجی زندگی میں توازن نہیں رکھ پاتیں پھر بھی کامیاب ہوتی ہیں۔ تاہم، ان کی کامیابی اور اُن خواتین کی کامیابی، جن کے شریک حیات ان کے ہم قدم بنتے ہیں، یکسر مختلف ہوتی ہے۔

شوہر کا ساتھ عورت کو نڈر اور بہادر بناتا ہے۔ جب کوئی عورت اپنے شوہر کو اپنا ہم قدم پاتی ہے تو اُڑتی پتنگ کی طرح لہراتی ہے کیوں کہ اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ڈور انتہائی محفوظ اور مخلص ہاتھوں میں ہے۔ وہ عورت، جو کسی بھی طرح کی ازدواجی رکاوٹ کا سامنا کرتے ہوئے بڑھتی ہے، اس عورت کی نسبت اس قدر پُر اعتماد اور مکمل نہیں ہوتی، جسے اپنے شوہر کا ساتھ حاصل ہو۔ اس کے اعتماد کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی تیز رفتار ہوتی ہے کیوں کہ اس کا شوہر محافظ ہونے کے ناتے اس کی راہوں سے دشواریاں ہٹاتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں اس پر انگلی اٹھنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور وہ اپنی قابلیت کو صحیح سمت اور بروقت بروئے کار لاتی ہے۔ دوسری جانب، جب شوہر ہی بیوی کا ساتھ نہ دیتا ہو تو اسے معاشرے اور معاشرے سے وابستہ لوگوں کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کی تنقید کا بھی سامنا رہتا ہے اور اس کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ خوش نصیب ہوتی ہیں وہ خواتین، جنہیں ایسا جیون ساتھی نصیب ہو۔ کیوں کہ جب عورت خود کو محفوظ اور مکمل محسوس کرتی ہے تب ہی معاشرے میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتی ہے۔ وہ اپنی کاوشیں ملکی اور معاشرتی تعمیر میں استعمال کرتی ہے نہ کہ ایک بے حس معاشرے کے بے تکے الزامات پر خود کو صحیح ثابت کرنے میں ضائع کرتی رہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک بیمار اور محکوم ذہن کبھی صحت مند سوچ کو پروان نہیں چڑھا سکتا۔ جہاں رشتوں میں عدم اعتماد ہو اور ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو، وہاں ایک ایسی سوچ کی رمق کیسے جنم لے سکتی ہے جو تن درست ہو اور معاشرے کی تعمیر کا باعث بھی بنے۔

یہ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے رشتوں کو مضبوط کریں۔ ایک دوسرے کی عزت نفس کو اوّلیت دیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی اہمیت سمجھیں، ایک دوسرے کی عزت کا پاس کریں اور احترام کو لازم کریں۔ ایک دوسرے کا احترام ہی وہ واحد جُز ہے جو ہر خواہش کو پروان چڑھانے میں مددگار ہوگا اور محبت کی بنیاد بنے گا۔ جس خاندان میں والدین ایک دوسرے کا لحاظ اور ادب روا رکھتے ہیں، ان کی اولاد بلکہ نسلیں بھی اس روایت کو قائم رکھتی ہیں اور جن خاندانوں میں عورتوں کی عزت کو اوّلین اہمیت اور ترجیح حاصل ہوتی ہیں، ان ہی خاندانوں سے بڑے بڑے گوہر نایاب پیدا ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی پرورش ایک سازگار ماحول میں کی گئی ہوتی ہے، جو اُن کی شخصیت کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ اور عملی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔

یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ جس طرح ہمارا معاشرہ کسی مرد کی کامیابی کے پیچھے کسی عورت کے ہونے کو مشروط رکھتا ہے، اسی طرح ایک شادی شدہ عورت کی کامیابی بھی اس کے شوہر کے عطا کردہ سکون، اعتماد اور رواداری سے مشروط ہوتی ہے۔ یہ اس کا شوہر ہی ہوتا ہے جو اس کی مضبوط اور پُر وقار شخصیت استوار کرتا ہے، اسے تحفظ دیتا ہے۔ اس کی ترقی اور کامیابی کو سراہتا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ایک بیوی کی کامیابی کے پیچھے صرف اور صرف اس کے شوہر نام دار کا ہاتھ ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

بند مُٹھی

اس ساری بحث میں نہ جانے کتنی دیر پہلے سلامت کا جسم روح کی قید سے آزاد ہو کر ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک نہ پولیس آئی اور نہ اسے آنا تھا۔ سلامت کی ماں بھاں بھاں روئے جا رہی تھی۔ جب اس کو سلامت کے زخموں کی تاب نہ لا کر مرنے کی خبر ملی تو اس کے جسم میں جیسے کرنٹ سا بھر گیا اور وہ اپنے تن سے لپٹے تین بچوں اور ایک گود میں سوئے ہوئے بچے کو زمین پہ بٹھا کر سلامتے کی لاش پر لپکی۔ ''اٹھ! سلامتے اٹھ جا بیٹا!'' صغراں چلّائی۔ ''تیری ماں کو تجھ سے کچھ نہیں چاہیے''۔ وہ تڑپ اٹھی۔ ''تیری کوئی کمائی نہیں چاہیے، بس تو اٹھ اور گھر چل۔ اٹھ، سلامتے اب اٹھ بھی جا!'' صغراں کب سے سلامتے کی لاش کو جھنجھوڑ رہی تھی، منّتیں کر رہی تھی پر سلامتے اٹھ کر نہیں دے رہا تھا۔

اچانک کمرے کے باہر اللہ دتّا کی دُہائیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کمرے سے باہر کوئی بیگم صاحبہ بار بار ٹشو پیپر سے اپنا چہرہ صاف کرتی جا رہی تھیں اور اللہ دتّا کبھی ان خاتون کو اللہ کا واسطہ دے رہا تھا تو کبھی ان کی اولاد کا، ساتھ ساتھ ہاتھ جوڑ کر روتا بھی جا رہا تھا۔ کمرے کے کونے میں ایک نوجوان اپنے موبائل فون پہ کسی سے محوِ گفتگو تھا پر اس کے چہرے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں تھا کہ وہ پریشان ہے یا کسی بات پر افسردہ بلکہ وہ تو آپ اپنی بنائی دنیا میں بڑا پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ غالباً یہ وہی لڑکا تھا، جس کی تیز رفتار گاڑی کی زد میں آ کر سلامتے اجل کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی ماں معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے پولیس کی آمد سے پہلے ہی ہسپتال پہنچ چکی تھی اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے عملے سے اتنی مہلت مانگ لی تھی کہ پولیس کو رپورٹ کرنے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا جائے، جس کے عوض وہ ہسپتال اور اس کے عملے کو خوش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنے کا وعدہ بھی کر چکی تھی۔ بس اسی وعدے کے پیشِ نظر تمام عملہ اس سے تعاون کر رہا تھا۔ اللہ دتّا کو روتا دیکھ کر صغراں تو جیسے آدھی مر ہی گئی تھی۔

جب بیگم باری سے معاملہ قابو میں نہیں آ سکا تو انہوں نے ہائی بی پی کا بہانہ کر کے آرام دہ کرسی پر نشست جمالی

اوران کے سامنے منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتل رکھ دی گئی۔ان کی خرابیٔ طبیعت کی اطلاع جیسے ہی حکام بالا تک پہنچی تو فوری طور پران کو ایئر کنڈیشنڈ روم میں بٹھا دیا گیا۔بیگم باری کے کمرے میں جانے کے کچھ ہی دیر بعد سنیئر ڈاکٹر مونس باہر آئے اور عملے سے سارے واقعے کی پوچھ گچھ کر کے سلامتے کے اسٹریچر کے پاس آ کے ٹھہر گئے، جہاں اس کے گھر والے آہ وبکا کر رہے تھے۔ڈاکٹر مونس اللہ دتّا کو کونے میں لے جا کے کچھ سمجھانے کی کوشش میں لگ گئے، دوسری طرف صغراں اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے روتی رہی۔تھوڑی دیر بعد اللہ دتّا ہاتھ جوڑے کمرے میں واپس آ گیا اور ڈاکٹر مونس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے مٹھی بند کر دی اور کہا۔

''اللہ دتّا!تم بھلے آدمی ہو،میری بات مانو تو معاملہ ختم کرو۔کہاں پولس کچہری جاتے رہو گے؟اگر کیس عدالت تک گیا بھی تو وکیل اور دوسرے خرچے کیسے پورے کرو گے؟''ڈاکٹر مونس اصل بات کی طرف آئے۔''دیکھو!ابھی کفن دفن کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا؟ جانے والا تو چلا گیا''۔انہوں نے معاملہ رفع دفع کرنے کی پوری کوشش کی۔صغراں تمام منظر دیکھ رہی تھی۔اس کی نظر جیسے ہی اللہ دتّا کی نظروں سے ٹکرائیں،اللہ دتّا نے پھر رونا شروع کر دیا اور ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹر مونس سے کہنے لگا،''میں تو سمجھ جاؤں گا صاحب!پر اس کو کون سمجھائے گا؟ یہ تو ماں ہے۔ماں کیسے اپنے بچے کا قتل بھول سکے گی؟''یہ کہہ کر اللہ دتّا اک بار پھر رونے لگا۔

یہ سنتے ہی ڈاکٹر مونس پھر دفاعی انداز میں آ گئے۔''ارے بھائی! یہ قتل تھوڑی ہے، ایکسیڈنٹ ہے ایکسیڈنٹ''۔وہ چلّائے۔''کتنی دیر سے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اَن جانے میں یہ سب ہو گیا۔گاڑی بے قابو ہوئی اور بے چارہ تیرا لڑکا بیچ میں آ گیا۔کوئی جان کے تھوڑی ماری گاڑی''۔ان کے لہجے میں جھنجھلاہٹ آ گئی۔''بس....اللہ کی یہی مرضی تھی۔موت کو تو بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا''۔ڈاکٹر مونس نے بظاہر روہانسا منہ بنا کے کہا مگر اندر ہی اندر ان کو بھی یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اگر بات نہیں بنی تو نہ صرف بیگم باری اور ان کے بیٹے بلکہ ان کے ہسپتال کی بھی بدنامی ہو گی اور چارج الگ لگے گا،میڈیا اور پولیس کے چکر میں بھی پڑ جائیں گے۔ابھی ڈاکٹر مونس اسی شش وپنج میں مبتلا تھے کہ بیگم باری نے دُور سے معاملہ بھانپ لیا اور سلامتے کی لاش پہ لگی آنسو بہانے کہ ان کو اس میں سے اپنے بیٹے کی سی خوشبو آ رہی ہے۔

ڈاکٹر مونس معاملہ سمجھ چکے تھے اور اب ان کو اپنا اگلا داؤ پتا تھا۔بیگم باری! پلیز....ریلیکس کریں اور فوراً نرس کو ہدایت کی کہ وہ انہیں روم میں لے جا کے ان کا بی پی چیک کرے اور ضرورت ہو تو ڈرپ بھی لگا دے۔لیکن بیگم باری جانے کو راضی نہ ہوئیں اور صغراں کا ہاتھ پکڑ کر معافیاں مانگنے لگیں۔مجبوراً صغراں کو بیگم باری کے ساتھ وارڈ میں آنا پڑا۔ہسپتال کا عملہ جیسے ہی ان کے چیک اپ کے انتظامات میں مصروف ہوا،اسی وقت بیگم باری نے صغراں کے ہاتھوں کو پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈی سے بھر دیا اور اس کی منّت کرنے لگی کہ وہ اپنا بیان پولیس میں ریکارڈ نہ کروائے۔اس

کے بدلے وہ سلامتے کی تدفین اور تیجے کے سارے اخراجات خود کریں گی اور ہسپتال کا سارا خرچ بھی ان کے ذمے ہوگا۔صغراں اتنے سارے نوٹ دیکھ کر بت سی بن گئی۔اتنے پیسے تو سلامتے ساری عمر کام کر کے بھی اس کے ہاتھوں میں نہ دے سکتا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا فیصلہ کرے؟ مگر....فیصلہ تو ہو چکا تھا۔

صغراں کے آنسو تھم چکے تھے۔پولیس آ چکی تھی اور اللہ دتّا اپنا بیان ریکارڈ کروا رہا تھا۔اسٹاف کا ایک اہل کار صغراں کو بلانے وارڈ میں آ چکا تھا، جہاں بیگم باری رو رو کے ہلکان ہو رہی تھیں اور بار بار اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے رہی تھیں۔''ہاں بی بی! اپنا بیان درج کرواؤ''۔پولیس نے بڑی بے زاری سے کہا۔''یہ دشمنی یا قتل تو نہیں ہے؟''''نہیں صاحب!'' صغراں نے کس کے اپنی مٹھی بھینچ لی۔''کوئی قتل نہیں''۔اس کی زبان لڑکھڑائی۔''یہ....یہ تو....ایکسیڈنٹ تھا جی۔سلامتے غلطی سے گاڑی کے نیچے آ گیا''۔مامتا کا ایک آنسو لڑھک کر اس کے گال پر آ گیا۔''ساری غلطی سلامتے کی تھی جی''۔

اسی وقت سلامتے کی لاش کا اسٹریچر ایمبولینس کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔صغراں نے سلامتے کی طرف دیکھا، جس کا ایک ہاتھ سفید چادر سے باہر نکل چکا تھا اور اُس کی بند مٹھی میں سے اس کے کمائے ہوئے کچھ روپے جھانک رہے تھے۔صغراں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی، سلامتے! تو سلامت رہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

علینہ فاطمہ

علینہ فاطمہ کا تعلق پنجاب کے ضلع رحیم یار خان سے ہے۔ تعلیم ایم سی ایس ہے۔ 2017ء میں ایک بین الاقوامی آن لائن میگزین کے لیے بھی تحریریں لکھیں۔ ایک برس سے رائٹرز کلب سے وابستہ ہیں۔ علینہ فاطمہ کی رائٹرز کلب کے پلیٹ فورم سے ملک کے صف اول کے اخبارات میں تحریریں چھپ چکی ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ الیکشن اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی

2۔ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں

3۔ مقصدیات

4۔ پنجاب، یو پی ٹارگٹ کے نام پر اساتذہ کا استحصال

5۔ مان

☆.....☆.....☆

الیکشن اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی

ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو کون نہیں جانتا؟ پاکستان کی یہ مظلوم بیٹی پچھلے کئی سالوں سے امریکا کی جیل میں امریکی فوجیوں پر ان کی بندوق چھین کر فائرنگ کرنے کے الزام میں سزا کاٹ رہی ہے۔ اس الزام کی حقیقت سے ہر کوئی واقف ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے حکم رانوں کی طرف سے کبھی واضح طور پر اس کیس کے بارے میں امریکی حکومت سے بات نہیں کی گئی۔

ہمارے حکم رانوں کے پاس ایسے کئی مواقع آئے جب وہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی ممکن بنا سکتے تھے لیکن افسوس ہمارے حکم ران جب بھی کسی منصب پر فائز ہوئے، اپنی ''رنگینیوں'' میں ڈوب گئے اور اپنی اس قوم کی مظلوم بیٹی کے لیے کبھی آواز نہیں اٹھائی۔ ہمارے حکم ران بس امریکا کے آگے ''جی حضور!'' کی رٹ لگا کر اپنی مدت پوری کر لیتے ہیں۔

ریمنڈ ڈیوس کیس میں سب کچھ سامنے ہونے کے باوجود، کہ یہ جاسوسی، ٹارگٹ کلنگ کے ایکسپرٹ اور ایک کانٹریکٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تین افراد کا قتل ہوا، ہمارے حکم رانوں کی طرف سے نہ صرف اسے رہا کروا کر امریکی حکومت کے حوالے کیا گیا بلکہ یہ تک کہا گیا کہ مرنے والوں کے لواحقین سے ان کے معاملات طے پا گئے ہیں اس لیے ریمنڈ ڈیوس کو رہا کر کے امریکی حکومت کے حوالے کیا گیا۔

میرے خیال میں پاکستانی حکم رانوں کے پاس امریکی حکومت سے مطالبہ کرنے کا اس سے بہتر وقت نہیں تھا کہ اگر پاکستان نے اپنے تین شہریوں کے قاتل کو چھوڑ دیا ہے تو بدلے میں عافیہ صدیقی کو رہا کیا جائے، جن پر صرف فائرنگ کا الزام ہے۔ پچھلے دنوں امریکا میں پاکستانی قونصل جنرل عائشہ فاروقی نے عافیہ صدیقی سے ملاقات کی، جس میں انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ دوران حراست ان پر جسمانی اور جنسی تشدد کیا جاتا ہے۔

عائشہ فاروقی کے مطابق یہ ملاقات دو گھنٹوں تک جاری رہی جس میں انہوں نے عافیہ صدیقی سے مختلف قسم کے سوالات کیے اور وہ ان سب سوالات کے جواب دیتی رہیں۔ پاکستانی خاتون سفارت کار عائشہ فاروقی نے اپنی دستاویزات میں لکھا ہے، انہوں نے اس گفتگو کے دوران بتایا کہ وہ ہر وقت خوف کا شکار رہتی ہیں کیوں کہ جیل کے عملے کی طرف سے انہیں جسمانی تشدد کے ساتھ جنسی زیادتی کا بھی خطرہ لاحق ہے۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ابھی تک کسی سیاسی جماعت کی طرف سے اس مسئلے پر بات نہیں کی گئی۔ اگر یہ سیاست دان اپنے ملک کی مظلوم بیٹیوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو اور کیا کریں گے۔

گزشتہ حکومت نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی کے وعدے پر ووٹ لیے تھے مگر ایسا کچھ ہوا نہیں۔ اس بار بھی کچھ لوگ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی کی باتیں کر رہے ہیں۔ ایک تو دکھ کی بات یہ ہے کہ کسی مظلوم پر اپنی سیاست چمکانا ظلم ہے۔ پھر جب یہ لوگ اقتدار میں آجاتے ہیں تو نشے میں ایسے دُھت ہوتے ہیں کہ ان کو قوم کی بیٹی نظر ہی نہیں آتی۔ خدارا! اس بار الیکشن میں جو بھی جیتے، وہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی کا نہ صرف عزم کرے بلکہ اسے ملک میں لے کر آئے۔

☆.....☆.....☆

دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں

پچھلے ہفتے ملتان ائیر پورٹ جانے کا اتفاق ہوا تو وہ ایک نیا ماحول، ایک الگ دنیا کی طرح محسوس ہوا۔لیکن جہاں یہ دیکھ کر دل کو خوشی ہوئی وہیں ائیر پورٹ پر موجود کچھ لوگوں کو دوسروں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے دیکھ کر افسوس بھی ہوا۔ ہوا یہ کہ اتنے لمبے سفر کی وجہ سے تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ سب کو پیاس بھی لگی ہوئی تھی چناں چہ سب نے پانی کی بوتلیں اور جوس لینے کے لیے دکانوں کا رخ کیا۔ وہاں جا کے پتا چلا کہ دُکان دار تمام اشیاء دُگنی قیمت پر بیچ رہے ہیں۔ 20 روپے والی چیز 40 میں اور 40 والی چیز 80 روپے میں بیچی جا رہی ہے۔لوگ ان چیزوں کو مجبوراً خرید رہے ہیں۔ پانی کی بوتلوں سے لے کر چپس اور باقی کھانے پینے کی سب ہی اشیاء مہنگے داموں میں مل رہی تھیں۔

یہ صورت حال دیکھ کر سب نے صرف ایک ایک پانی کی بوتل اور جوس پر گزارا کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ گرمی کی شدت بڑھنے کی وجہ سے جب دوبارہ پیاس لگی تو بڑے کزن نے دیکھا کہ دُکان کے اندر ٹھنڈے پانی کا کولر رکھا ہے۔ وہ گئے اور نہایت احترام سے پوچھا کہ کیا میں ایک گلاس پانی لے سکتا ہوں؟ جس کے جواب میں دُکان دار نے نہایت درشتی سے منع کر دیا، جس پر کزن کو غصہ آ گیا اور حیرت بھی ہوئی۔ انہوں نے دُکان دار سے پوچھا، کیا آپ مسلمان ہیں؟ جس پر دُکان دار نے چُپ سادھ لی اور کزن واپس آ گئے۔

یہاں اس بات کا ذکر اس لیے کیا جا رہا ہے کیوں کہ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی مہنگائی اپنے عروج پر ہے اور رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں تاجر حضرات قیمتوں میں کمی کرنے کی بجائے مزید اضافہ کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے غریب طبقہ کئی چیزیں خرید ہی نہیں پاتا۔غریب طبقہ اشیاء خریدنے کی استطاعت سے محروم ہو جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یورپ اور دیگر ممالک میں رمضان المبارک کے مہینے میں اشیاء کی قیمتوں میں نہ صرف کمی کی جاتی ہے بلکہ مختلف قسم کے پیکجز بھی متعارف کروائے جاتے ہیں، جس سے وہاں

موجود تمام لوگ استفادہ کرتے ہیں اور ہمارا ملک.... جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے پہچانا جاتا ہے، اس میں ہی اس بابرکت مہینے میں تاجر حضرات عوام کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔

روزہ صرف بھوکے پیاسے رہنے کا نام نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے لیے احساس پیدا کیا جائے۔ اپنی خوشیوں میں اردگرد کے لوگوں کو بھی شامل کیا جائے لیکن بدقسمتی سے اس مہینے میں قیمتوں میں ہوش رُبا اضافے کی وجہ سے لوگوں کی زندگیوں میں مشکلات کا مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے، جب کہ ہمیں چاہیے کہ سارا سال نہ سہی لیکن اس بابرکت مہینے میں لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کرنے کا سبب بنیں کیوں کہ جو دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے، اللہ پاک اس کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے اور جہاں تک ہو سکے، اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کریں۔

اپنے اردگرد نظر ڈالیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے رشتے دار یا ہمسائے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مشکلات کا شکار ہوں۔ اگر ایسا ہے تو جہاں تک ممکن ہو، ان کی مالی امداد کریں۔ عید کی خریداری کے وقت زیادہ نہیں بس تھوڑی سی خریداری اپنے غریب رشتے دار یا ہمسائے کے لیے بھی کر لیں۔ آپ کی طرف سے کی گئی چھوٹی سی کوشش آپ کے لیے دنیا اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

مقصدِ حیات

وہ ایک سرکاری اسکول میں استاد تھا۔ اس کا باپ کسان تھا۔ کسان ہونے کے باوجود اس کے باپ کو اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے پیار سے، سختی سے، کوشش کی کہ اس کے بچے پڑھ سکیں۔ اپنے بہن بھائیوں اور پورے خاندان میں سے یہی تھا جس نے تعلیم حاصل کی اور استاد کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس نے تعلیم حاصل کرنے سے نوکری کرنے تک بہت مشکلات کا سامنا کیا۔ چالیس کلومیٹر سے زیادہ تک کا سفر پیدل طے کیا تھا لیکن ہمت نہیں ہاری اور کامیابی حاصل کی۔ ایک دن اس کے دل میں خیال آیا، اس نے جس طرح تعلیم حاصل کرنے کے لیے اتنی مشکلات کا سامنا کیا، کیوں نہ اپنے بچوں کو ان سب مشکلات سے نکالنے کے لیے کوئی اقدام کرے، تاکہ اس کے بچے اپنی آنے والی زندگی میں آسانیاں حاصل کر سکیں۔ اس نے اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر اپنا آبائی گاؤں چھوڑنے کا سوچا۔

رات کو اس نے اپنی شریک حیات سے بات کی۔ یہاں کوئی اسکول نہیں ہے جس میں ہم اپنے بچوں کو تعلیم دلوا سکیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انہیں شہر جانا پڑے گا۔ شہر بہت دُور ہے اور ہمارے بچے اتنے بڑے نہیں ہیں۔ انہیں روز پیدل اسکول جانے میں مشکل ہوگی۔ میں سوچ رہا ہوں، کیوں نہ ہم یہ گاؤں چھوڑ دیں۔ اپنا آبائی گاؤں، اپنا گھر چھوڑنا، وہ گھر جسے بہت محنت اور مشقت سے بنایا گیا ہو، مرد کی نسبت عورت کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ اسی طرح کی صورت حال تھی۔ پہلے تو اس کی بیوی نے کہا، ہم سفید پوش لوگ ہیں۔ ہمارے اتنے ذرائع نہیں، جن سے ہم یہ گھر چھوڑ کر شہر میں گھر لے سکیں اور میں اپنے خاندان، بہن، بھائیوں اور ماں کو چھوڑ کر شہر میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ جس پر اس نے بیوی کو اس طرح قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہم تھوڑی سی قربانی سے، جو گھر کو چھوڑنے کی صورت میں ہم اپنے بچوں کے لیے دیں گے، اپنے بچوں کا مستقبل بنا سکتے ہیں۔ تم اس پہلو کو دیکھو، اس میں ہمارے

بچوں کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ ضد نہ کرو، میرے ساتھ شہر چلو۔

ٹھیک ہے، تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن ایک شرط ہے۔ ہم شہر میں جب تک اپنا گھر نہ بنالیں، میں یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے خاندان کو باتیں بنانے کا موقع نہیں دی سکتی کہ ہم یہاں اپنا بنا بنایا گھر چھوڑ کر شہر میں کرائے کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ یوں اس نے بیوی کے مشورے سے شہر میں ایک پلاٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ دن گزرتے گئے لیکن وہ بھی اپنی دُھن کا پکا نکلا۔ اس نے اپنے اسکول کے ساتھیوں کے مشورے سے شہر میں ایک پلاٹ خرید کے اس میں ایک چھوٹا سا کمرہ بنالیا۔

گھر چھوڑنے کی گھڑی آئی تو وہ چپ تھا، بالکل خاموش۔ کیوں کہ شاید اس کے پاس اب وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے ماں اور باپ، دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ بڑا بھائی اپنے بیوی بچوں میں خوش تھا، اسے اس کے وہاں رہنے یا نہ رہنے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ایک بیوہ بہن، جو اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں رہتی تھی، اس کی ذمے داری سے وہ پہلے بھی نہیں بھاگا تھا اور شہر میں رہ کر بھی ان سے غافل ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اب اس کے پاس کچھ بچا تھا تو یہی بیوی بچے، جن کے بہتر مستقبل کے لیے اس نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اس کی بیوی کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس کے لیے اپنا آبائی گاؤں، اپنا گھر چھوڑنا ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ اس لمحے سے بھی زیادہ مشکل، جب وہ بیاہ کر ایک گھر سے دوسرے گھر میں آئی تھی۔ باپ کے بعد بہن بھائیوں اور خاص طور پر ان چھوٹے دو بھائیوں کو چھوڑ کر آنا، جن کے سر پر باپ کے بعد اس بہن کا سہارا تھا لیکن اپنے بچوں اور بہن بھائیوں کے لیے اسے بھی قربانی تو دینی تھی، سو وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ شہر آ گئی۔

وقت گزرتا گیا۔ دن مہینے اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ اس نے دن رات محنت کر کے اپنے بچوں کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ انہیں تعلیم دلوائی، اچھا انسان بنایا۔ وسائل کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو بہت اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تو نہیں بھیج سکا لیکن کوشش جاری رکھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کے بچوں نے نہ صرف تعلیمی کامیابی حاصل کی بلکہ وہ اچھی نوکریاں حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے اور ایک دن ایسا بھی آیا جب اس کی سب سے بڑی بیٹی اس کے پاس قریباً دوڑتی ہوئی آئی۔

ابو! ابو! یہ دیکھیں۔ میرا نام فائنل لسٹ میں آ گیا ہے۔ میری سلیکشن ہو گئی ہے استاد کے طور پر اور پتا ہے میری پوسٹنگ کہاں ہوئی ہے؟ کہاں ہوئی بیٹا؟ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ ابو! آپ کے اپنے آبائی گاؤں میں۔ اس گاؤں میں، جسے کبھی آپ نے ہمارے اچھے مستقبل کے لیے دل پر پتھر رکھ کے چھوڑا تھا۔ میں اب اس گاؤں میں جا کر بچوں کو پڑھایا کروں گی تا کہ وہ گاؤں میں رہ کر بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہو سکیں۔

اس کے بعد اس کا ایک بیٹا اور چھوٹی بیٹی بھی تدریس جیسے مقدس پیشے سے وابستہ ہوئے اور یوں صحیح معنوں میں

اس نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی۔اس نے یہ بات ثابت کر دی کہ ضروری نہیں، بہت اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونا ہی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے مترادف ہو۔اپنے بچوں کو ایک اچھا انسان بنا کر بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔کیوں کہ بقول شاعر:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

☆.....☆.....☆

پنجاب، یو پی ٹارگٹ کے نام پر اساتذہ کا استحصال

یک انار، سو بیمار'' کا نعرہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا، یعنی ایک انار سو بیماریوں کے علاج کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح پاکستان میں ایک ڈیپارٹمنٹ ایسا بھی ہے جس میں کام کرنے والوں کے لیے بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اصلی فرائض انجام دینے کے ساتھ دوسرے کام کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔

امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ جی ہاں! میں بات کر رہی ہوں، اساتذہ کرام خاص طور پر پرائمری اسکول کے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹرز کی، جن پر نت نئے طریقے سے دباؤ ڈال کر نہ صرف ان سے کام نکلوائے جاتے ہیں بلکہ ان کی بے عزتی کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ گویا، انہوں نے نوکری کر کے ان کا کوئی حق مار دیا ہے جس کی سزا انہیں اس طرح دی جاتی ہے۔

پہلے بات کرتے ہیں ہیڈ ماسٹرز کی، جن کے ذمے اسکول کے سارے انتظامات کے ساتھ ''ڈاک'' کا کام بھی ہوتا ہے، جس کے لیے کبھی کبھی تو ان بے چاروں کو اسکول کی چھٹی ہو جانے کے بعد بھی دفتروں میں پابند کیا جاتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ ان دفاتر میں ایک کرسی تک نہیں ہوتی کہ جس پر یہ تھوڑی دیر بیٹھ ہی سکیں۔ چنزں چہ اس کے لیے انہیں کھڑا رکھا جاتا ہے یا پھر کسی خیراتی ادارے میں بچھائی جانے والی دری سے کام چلا لیا جاتا ہے۔

یہی نہیں.... آج کل رہی سہی کسر رمضان کے بابرکت مہینے میں گھر گھر سروے کے لیے بھیج کر پوری کی جا رہی ہے۔ سخت ترین گرمیوں میں روزے کی حالت میں ہیڈ کے ساتھ باقی اساتذہ کی بھی شامت آئی ہوئی ہے۔ مزید ستم یہ کہ ایک کلومیٹر کے فاصلے پر، جہاں دس اسکول موجود ہیں، وہاں ڈیڑھ سو تک کا ٹارگٹ دے کر ان اساتذہ کو مزید ذلیل کیا جا رہا ہے۔

ایک پرائمری اسکول کی ہیڈ اور ٹیچر نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ رمضان کے مہینے میں، روزے کی

حالت میں، ان سے آج بھی سروے کروایا گیا اور سروے رپورٹ کے بعد بھی اے ای او اور ڈپٹی نے ان کی ہمت کی داد دینے کے بجائے یہ حکم نامہ جاری کیا ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ بچے اسکول میں داخل کریں اور نئے بچے داخل نہ کرنے کی صورت میں ان کی تنخواہ کاٹی جائے گی۔ پھر بھی اگر مزید بچے نہ داخل کیے گئے تو نوکری سے فارغ ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔

یہ سب بتاتے ہوئے انہوں نے کہا، ہماری تو اب نیند بھی اُڑ چکی ہے کہ ہم بچے لائیں تو کہاں سے لائیں؟ میں اس منیجمنٹ سسٹم کے سربراہان سے صرف اتنا سا سوال کرنا چاہتی ہوں کہ سارا دن اے سی کے نیچے بیٹھ کر احکامات صادر کرنے کی بجائے صرف ایک دن ہمارے ساتھ سروے کر لیں تا کہ آپ کو بھی اصل حقیقت کا پتا چلے۔ تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح ذلیل ہو کر ایک آپ لوگوں کی طرف سے دیے گئے ٹارگٹ پورے کیے جاتے ہیں اور اس پر بھی نوکری سے فارغ کرنے کی جو دھمکیاں دی جاتی ہیں کم از کم یہ تو بند ہی کر دی جائیں۔ حکومتوں کو چاہیے، اساتذہ کرام کی مشکل کو سمجھیں اور انہیں عزت دیں۔

☆.....☆.....☆

مان

وہ بالکل میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح مجھے اپنے آپ پر کنٹرول ہی نہیں تھا۔ آج وہ عام روٹین سے ہٹ کر لگ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے دوران اچانک دوست کی چھوٹی بہن نے کہا، آج تو آپ تیار ہو کر آئی ہیں۔ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ پہلے کبھی تیار ہو کر نہیں آئیں ناں، آپ تیار ہوا کریں، بہت اچھی لگتی ہیں۔ مجھے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ تک بھول گیا۔ میں نے بے ساختہ نگاہیں اس کی طرف کیں، ایک نظر دیکھا پھر دوبارہ نظریں جھکا کر کھانے کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی ناکام کوشش شروع کر دی۔ دوست کی بہن متواتر بولے جا رہی تھی اور میرا دل خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

میرے ذہن میں ایک دن پہلے اس سے کہے ہوئے الفاظ ایک کے بعد ایک کر کے گھوم رہے تھے۔ میرا دل چاہتا ہے جب میں تم سے ملوں تو تم تیار ہو کر آؤ۔ آئندہ وہ سوٹ پہن کر آنا، جو میں نے لے کر دیا تھا اور جو رنگ پہنی تھی ناں کچھ دن پہلے، وہ پہن کر آنا۔ ہاں.... ساتھ میں بریسلیٹ بھی، دیکھو لپ اسٹک تو تم پر اچھی لگتی ہی ہے، ساتھ میں کاجل بھی ہو تو کیا بات ہے اور آج اس نے وہ سب کیا تھا، جو میں نے اس سے کہا تھا۔ میرے کانوں میں کچھ دیر پہلے اس کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے، جو اس نے دوست سے فون پر کہے تھے، میں نہیں آ سکتی۔ میں نے جو پچھلے ہفتے سوٹ پہنا ہوا تھا، میرے پاس بس وہی ایک سوٹ پریس کیا ہوا ہے اور لائٹ نہیں ہے۔ آپ کے گھر والے کیا کہیں گے۔

جس پر دوست نے غصے سے کہا، کوئی کچھ نہیں کہتا، بس آ جائیں اور مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی کیوں کہ وہ پچھلے ہفتے وہی سوٹ اس لیے پہن کر گئی تھی کہ اسے لگا، مجھے ضرور آنا ہے۔ جیسے بھی سہی پر اس نے آج میری ساری باتوں کا مان رکھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہمارے درمیان ہونے والی لڑائی کے باوجود اس نے میری ساری خواہشیں پوری کیں اور

ہمیشہ کی طرح آج بھی جتائے بغیر اپنی محبت کا مان رکھا۔ وہ ایسی ہی ہے، اسے جتانا نہیں، نباہنا آتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں، جو جتانا نہیں نباہنا جانتے ہیں۔ قدر کیا کریں ایسے لوگوں کی، یہ کھو جائیں تو ان جیسا کوئی ملنا بھی نہیں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

ساحر مرزا

مرزا عبدالباسط مغل کا قلمی نام ساحر مرزا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے الیکٹرونکس انجینئر ہیں جبکہ تجزیہ کار اور کالم نگار ہیں۔ رائٹرز کلب سے بطور ممبر وابستگی کو 2 برس مکمل ہونے ہو چکے ہیں۔ اپنے خیالات بذریعہ قلم لوگوں تک پہنچانے کی سعی کر رہے ہیں۔

سالنامے میں شامل تحریریں:

1۔ پڑھا لکھا پنجاب

2۔ دلچسپی کا امتحان

3۔ پرانی رنجشیں

4۔ نئے دور کی اُداسی

5۔ محبت راکھ بن گئی

☆.....☆.....☆

پڑھا لکھا پنجاب

ماسٹر صاحب نے لسّی پیتے ہوئے حیرت زدہ نگاہوں سے اس بھرے ہوئے صفحے کی جانب دیکھا، جس پر انہی کے قلم سے لکھے اعداد و شمار تھے، جب کہ دوسری طرف ان کے اداراتی شناختی کارڈ کی ایک کاپی تھی، جس پر لکھا ایک جملہ انہیں مزید ایک ہی خیال میں اُلجھا رہا تھا۔ وہ صبح بلکہ پچھلے چار ہفتوں سے روزانہ اپنا رجسٹر اور بستہ پکڑے نکلتے اور رجسٹر کے صفحات پر ایک ہی طرح کے سوالات کے صرف ایک ہی طرح کے جوابات لکھتے لکھتے تھک گئے تھے، جسمانی طور پر نہیں بلکہ ذہنی و اعصابی طور پر۔

جو کچھ سوچا تھا، سنا تھا، پڑھا تھا، سب حقیقت کے منافی تھا۔ اب ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ جو دِکھ رہا ہے، وہ سچ ہے یا جو الفاظ سنے تھے، پڑھے تھے اور سمجھے تھے، وہ سچے ہیں۔

ابھی وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھے کہ پاس کھڑے فوجی جوان نے کہا، ''ماسٹر جی! دوپہر کے کھانے سے پہلے یہ اگلا گھر بھی رجسٹر پر اُتار لیں، گرمی زیادہ ہے، جلدی کیجیے''۔ ماسٹر جی اپنے خیالوں کی باگ کو دوبارہ سمیٹ کر اپنا بستہ اُٹھائے چل پڑے۔ اگلے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، رجسٹر کھولا، پھر سے وہی ہزار بار دہرائے سوالات کو دہراتے ہوئے، صفحے پر بنے مختلف خانے پُر کرتے ہوئے اس گھر کے سربراہ سے پوچھ رہے تھے۔

''کتنی بیٹیاں ہیں؟''

جواب آیا، ''پانچ بیٹیاں''۔

''اور بیٹے؟''

''جی ماسٹر صاحب! اللہ کا بڑا کرم ہے، سات بیٹے ہیں''۔

''اچھا.... بیٹے کتنا کتنا پڑھے ہیں؟'' ماسٹر صاحب روانی سے پوچھتے ہوئے کسی معجزے کو سوچ رہے تھے۔ جواب میں وہ شخص کہنے لگا، ''ماسٹر جی! ہمارے بچوں کو کہاں نصیب یہ کتابیں، کاپیاں اور اسکول کی پڑھائی، بس برا بھلا نام لکھ لیتے ہیں''۔

ماسٹر جی نے تاسف سے اگلا سوال پوچھا، ''اور بیٹیاں؟'' کہنے لگا، ''بس جی! گاؤں کی بی بی خیراں سے قرآن پاک پڑھ چکی ہیں، باقی کے خرچ کہاں سے لاتے ہم غریب لوگ؟''

ماسٹر جی نے رجسٹر بند کیا اور تاسف سے اپنے اداراتی شناختی کارڈ کی پشت پر لکھا جملہ دہرایا۔ ''ہمارا پنجاب، پڑھا لکھا پنجاب''۔

☆.....☆.....☆

دلچسپی کا امتحان

چلو اپنی اپنی کتابیں بند کرو اور آج کا سبق سناؤ۔ استادِ محترم شفیق مراد صاحب کی ٹھہری ہوئی آواز کمرۂ جماعت میں گونجی۔ تمام طلبا اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے، کتابیں بستوں میں بند کر دی گئیں۔ اب سبق سننا شروع کیا گیا۔ قاسم کی باری آئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے کہا، استادِ محترم! غلطی ہو گئی، مجھے آج سبق یاد نہیں۔ استاد نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پوچھا، ''کیوں.... آج پھر سبق یاد نہیں، ایسا کیوں؟'' قاسم نے شرمندگی سے کہا، ''استادِ محترم! قسم لے لیں، رات دیر تک یاد کرتا رہا مگر یاد نہیں کر پایا''۔ استاد نے تاسف سے اسے دیکھا پھر کچھ دیر بعد کہا۔ ''چلو! ایک طرف ہو جاؤ اور مجھ سے آدھی چھٹی میں ملنا''۔

تمام بچوں سے سبق سنا گیا۔ قاسم نے اس کے بعد کا تمام وقت ڈرتے ڈرتے گزارا کہ نہ جانے آدھی چھٹی کے وقت استاد کیا کہیں گے؟ الغرض آدھی چھٹی ہوئی اور وہ ڈرتے ڈرتے کمرۂ جماعت سے نکل کر ڈھیروں دعاؤں اور 'جل تو جلال تو....' کا ورد کرتا ہوا لائبریری میں استاد شفیق مراد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سلام کر کے وہ مؤدب سا ایک جانب کھڑا رہا۔ استاد نے آہستگی سے جواب دیا۔ میز کے دوسری طرف سے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا اور سامنے رکھے رجسٹر پر کچھ لکھنے لگے۔ کچھ دیر میں اپنا کام ختم کر کے رجسٹر ایک جانب رکھا اور اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

کچھ لمحے اسے غور سے دیکھتے رہے۔ معصوم صورت، بڑی بڑی اور گہری آنکھیں، جن سے ذہانت اور خوف جھلک رہا تھا۔ چہرے کی رنگت اُڑی ہوئی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے آہستگی سے، پیار بھرے لہجے میں اس سے گویا ہوئے۔ ''قاسم میاں! تمہیں سبق آخر کیوں یاد نہیں ہوتا؟'' قاسم کچھ دیر خاموش رہا۔ استاد نے پھر سے میٹھے و نرم لہجے میں پوچھا۔ ''میاں! کچھ کہو تو ماجرا سمجھ میں آئے، خاموش رہو گے تو کیا پتا چلے گا؟''

قاسم نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا، ''استادِ محترم! میں سبق یاد کرنے تو بیٹھتا ہوں مگر میرا دھیان نہیں لگ پاتا۔

میں پھر سے بھول جاتا ہوں''۔

استاد شفیق مراد دھیرے سے مسکرائے اور کہنے لگے،''قاسم میاں! ایک تو تم ڈرتے بہت ہو، جب سبق یاد کرنے سے ڈرو گے تو کیا خاک یاد ہوگا۔ بیٹا! تم سبق اس لیے یاد نہیں کرتے کہ تم وہ پڑھو، سیکھو یا اسے سمجھو کہ یہ کیوں لکھا ہے؟ اس سبق میں کیا ہے جو یاد کرنا ہے؟ بلکہ تم ہمہ وقت اسی سوچ میں رہتے ہو کہ اگر یاد نہ کیا تو صبح کمرۂ جماعت میں سزا ملے گی اور تمہیں شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔ بولو....ایسا ہی ہے ناں''۔

قاسم نے ڈرتے ڈرتے استاد کی جانب دیکھا اور نم آنکھوں کے ساتھ ہلکے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

استاد شفیق مراد مسکرائے اور اُٹھ کر قاسم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے،''بیٹا؟ تمہارے ذہن کے لیے یہ سبق بہت معمولی ہے، تمہیں سبق اس لیے یاد کرنے کو نہیں کہا جاتا کہ تمہاری یادداشت کا امتحان مقصود ہے بلکہ درحقیقت یہ تمہاری دلچسپی کا امتحان ہے۔ علم تو بہت وسیع ہے، یہ انسان کو اس وقت عطا ہوتا ہے جب وہ اس میں دلچسپی کا امتحان پاس کرتا ہے اور پھر اسے پانے کے لیے شوق کی منزلیں طے کرتا ہے۔ بیٹا! تم سزا سے مت ڈرو، شرمندگی کے ڈر کو ساتھ لیے سبق یاد کرنے نہ بیٹھو بلکہ اسے دلچسپی سے پڑھو، سمجھو، پھر تمہیں یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی اور وہ خود بہ خود تمہیں یاد ہو جائے گا۔ بس یادداشت کا سہارا مت لو بلکہ دلچسپی لو تاکہ کل تم بہت سا علم حاصل کر سکو''۔

قاسم حیرت و استعجاب سے استاد کی بات سن رہا تھا، جو بظاہر بہت آسان مگر در پردہ پیچیدہ بھی تھی مگر وہ اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے بمشکل جی کہا۔ استاد نے مسکراتے ہوئے کہا،''جاؤ، آدھی چھٹی کا وقت کم ہے، کچھ کھا لو اور کھیل لو پھر جماعت میں جانا ہے''۔ قاسم انہیں سلام کر کے سست قدموں سے باہر نکل گیا۔ استاد اسے جاتا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

اگلے دن استاد شفیق مراد کمرۂ جماعت میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھے ہیں۔ حاضری کے بعد انہوں نے بچوں سے کہا،''بچو! آج کا سبق دہرا لو، پھر میں سنوں گا''۔ چند لمحوں بعد استاد نے پھر اسی طرح کہا،''بچو! اپنی کتابیں بند کرو''۔ پھر مسکراتے ہوئے پوچھا،''آج پہلے کون سبق سنائے گا؟'' اور سب نے دیکھا کہ سب سے پہلے ہاتھ اُونچا کرنے والا بچہ قاسم تھا۔ استاد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

پرانی رنجشیں

''مجھے کچھ یاد نہیں، کچھ بھی نہیں، پرانی باتیں مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں رہتیں''۔

اتنا سننا تھا کہ عبدالمنان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور درد کے دریا کے سارے بند ٹوٹتے گئے۔ وہ بہت مشکل سے خود کو گھسیٹتے ہوئے اپنے آنسو چھپاتا قبرستان سے نکل آیا۔

اٹھارہ سال پہلے گھر میں اُس وقت خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، جب بابا جان نے گھر آ کر بتایا تھا کہ آج عبدالہادی بھائی آ رہے ہیں۔ یوں تو وہ چچازاد بھائی تھا مگر اس گھر کے بچوں کا ماموں زاد، چچازاد ہونے کے علاوہ بڑا بھائی بھی تھا اور بچے اس کے آنے کی خوشی میں پھولے نہ سما رہے تھے۔ بابا جان بھی خوش تھے کہ ہزار اختلافات و ناراضی کے باوجود میرے اپنے بھائی کا بیٹا، وہ بچہ، جسے بچپن سے اپنے بچوں سے زیادہ چاہا تھا، آج بھرے شہر میں بہترین ہوٹلوں کی رہائش ٹھکرا کر ان کے ہاں رہنے آ رہا ہے۔

شام کو مغرب کے بعد عبدالہادی گھر پہنچا۔ اپنے تایا اور بڑے خالو کے رشتے کے علاوہ وہ بابا جان کو بڑے پیار سے بڑے ابا کہا کرتا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے کہا، ''السّلام علیکم بڑے ابا! کیسے ہیں آپ؟

الحمدللہ بیٹا! تم سناؤ کیسے ہو؟ دیکھو تو! ماشاءاللہ اب تو ہمارا عبدالہادی باریش ہو گیا ہے۔ بابا جان نے اس کا چہرہ بہت پیار سے چومتے ہوئے بے جی سے کہا۔ 'بے جی' نے اپنی سگی بہن اور دیور کے بیٹے کو اپنے بیٹوں کی طرح جانا تھا، تو اسی پیار سے انہوں نے اسے پیار دیا اور ماتھا چوم کر کہا، ''عبدالہادی بیٹا! سفر سے تھک گئے ہو گے۔ منہ ہاتھ دھولو، فریش ہولو، پھر میں کھانا لگاتی ہوں''۔ عبدالہادی مسکراتے ہوئے بابا جان کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ بابا جان ہمیشہ اپنے رشتے داروں سے خاص انداز میں پیش آتے، انہیں اپنا بستر، اپنا کمرہ پیش کیا کرتے اور خود مہمان خانے میں سویا کرتے۔

عبدالہادی بھی فریش ہو کر دستر خوان پر پہنچ گیا۔ کھانے کے دوران بابا جان اس سے اپنے بھائی، بھاوج اور بچوں کے احوال کے علاوہ اپنے آبائی محلے کے نئے قصے سن رہے تھے جب کہ بے جی کبھی کبھی اس سے اپنی بہن اور اس کی بہنوں کا احوال اور ان کی مصروفیات پر کوئی مختصر سا سوال کر لیتیں۔

عبدالمنان گھر میں سب سے چھوٹا تھا، کچھ کچھ لاڈلا بھی تھا۔ عبدالہادی اس کے لیے بہت خاص تھا، چوں کہ عبدالہادی اس سے بہت پیار اور شفقت سے پیش آتا، پھر عبدالہادی کا لیپ ٹاپ اس کے لیے سب سے دلچسپ چیز تھی۔ عبدالمنان کا تو بس نہ چلتا کہ عبدالہادی کی گود ہی سے نہ اترے۔

عبدالہادی اپنے چھوٹے بھائیوں اور عبدالمنان کو اپنے لیپ ٹاپ پر چھوٹی چھوٹی گیمز کھلاتا اور خود بھی خوب انجوائے کرتا۔ عبدالمنان اکثر اسے کام کرتے دیکھتا، لیپ ٹاپ پر عجیب وغریب بڑی بڑی مشینوں کی تصویریں دیکھتا اور پھر بہت کچھ لکھتے دیکھتا۔ اس وقت اسے پتا ہی نہ چلا کہ یہ کیا ہے؟ وہ کبھی کبھی سوچتا اور پھر نہ سمجھ پانے کے باعث ذہن سے جھٹک دیتا۔ عبدالہادی کا دو ہفتوں کا قیام عبدالمنان کے لیے یادگار اور تفریح سے بھرپور تھا۔ پھر ایک رات عبدالمنان کو بابا جان کے کمرے سے بے جی، بابا جان اور عبدالہادی بھائی کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ عبدالہادی بھائی کا لہجہ کسی قدر احترام لیے مگر گستاخانہ تھا۔ بابا جان اسے کچھ سمجھا رہے تھے مگر وہ بار بار کہتا کہ ''بڑے ابا؟ میرے بابا یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گے، آپ آئندہ ایسی بات مت کہیے گا''۔ بے جی بھی کچھ کہہ رہی تھیں مگر وہ ان چاہتوں سے بھرپور رشتوں کی رنجشیں و ناچاقیاں نہ سمجھ سکتا تھا، نہ ہی اسے ان سے آگہی تھی۔ عبدالمنان سوچتے سوچتے پھر سو گیا۔

اگلی صبح عبدالہادی بھائی زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجائے الوداع کہتے ہوئے چلے گئے۔ عبدالمنان کی زندگی واپس اپنی ڈگر پر آ گئی۔ اس نے میٹرک پاس کر لیا تو خاندانی معاملات بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔

چچا، خالہ اور پھپھو، الغرض ددھیال اور ان سے جڑے ننھیالی رشتوں کی ایک جنگ تھی، جس کی بنیاد میں نہ جانے کیا وجوہ تھیں مگر عبدالمنان کو تو یہ انا، بغض وعناد اور حسد کی جنگ لگتی تھی۔ تاہم، وہ ان تمام معاملات سے دور رہ کر پڑھائی کرتا رہا۔ ایک روز جب وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، اس میں موجود ایک تصویر پر چونک گیا۔ یہ تصویر تو بالکل اسی تصویر کی طرح ہے جیسی عبدالہادی بھائی کے لیپ ٹاپ میں تھی۔ اس نے یاد ہونے کے باوجود کتاب کا سرورق دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ عبدالہادی بھائی انجینئر تھے اور وہ بھی میکینکل کی ایک خاص شاخ ''مشین ٹیکنیکل سروس'' میں ڈگری یافتہ۔ وہ بہت حیران ہوا۔ الغرض زندگی چلتی گئی۔

اسے رشتوں میں غلط فہمیاں بالکل پسند نہیں تھیں اسی لیے بڑوں کے معاملات نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ہم عمر پھپھو زاد، ماموں زاد اور تمام کزنز سے اسی چاہت سے ملتا۔ ایک روز بابا جان نے بتایا کہ چچا کی جانب سے مکمل

لاتعلقی ظاہر کی گئی ہے تو عبدالمنان نے کہا۔ بابا جان! رہیں گے تو وہ ہمارے چچا ہی، پھر یہ لاتعلقی کیسی؟ رشتے تعلق کے محتاج نہیں ہوتے، رشتے تو رشتے ہوتے ہیں اور وہ بھی خون کے۔ خون کے رشتے تو اٹوٹ ہوتے ہیں۔ ابھی عبدالمنان کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ بابا جان نے اسے ٹوک دیا، بیٹا! تم ابھی چھوٹے ہو، ایسی باتیں مت سوچا کرو، یہ سب بڑوں کے معاملات ہیں، تم ان سے دور رہو اور اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اسے بہت افسوس ہوا۔ آج اسے بچپن میں سنی وہ تمام باتیں یاد آئیں جو عبدالہادی بھائی نے اس گھر میں گزرنے والے آخری رات کو بابا جان اور بے جی سے کی تھیں۔ اسے آج بھی ان باتوں کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا، وہ غصے میں اُٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

اٹھارہ سال بعد، عبدالمنان رات ہی گھر آیا تھا، اسے اپنی نوکری سے چھٹی بہت مشکل سے ملی تھی۔ وہ ایک جاپانی کمپنی میں میکینکل انجینئرنگ کی ایک شاخ مشین ٹیسٹنگ سروس کے شعبے سے منسلک تھا۔ صبح ناشتے کے بعد بے جی اس سے باتوں میں مصروف تھیں کہ اس کا فون بجنے لگا۔ السّلام علیکم! عبدالمنان نے فون اُٹھایا، فون سنتے سنتے وہ خاموشی سے اُٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آیا تو چہرے پر سختی اور سنجیدگی رقم تھی۔ بے جی! ذرا میرے ساتھ آیئے گا۔ اس نے بے جی سے ذرا دھیمی آواز میں کہا اور خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ بے جی بھی فکرمندی سے اس کی سنجیدگی کو سوچتے ہوئے اندر کی جانب چل پڑیں۔ کچھ دیر بعد بے جی بھی فکرمندی سے باہر آئیں اور بہو کو آوازیں دیتی کہیں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔

بہو زرینہ، بے جی کی بھانجی اور عبدالمنان کی سب سے چھوٹی خالہ کی بیٹی تھی۔ عبدالمنان، بھابھی اور والدہ کو لے کر گھر سے نکلا اور جب سب سے چھوٹی خالہ کے دروازے پر پہنچا تب زرینہ کو پتا چلا کہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس پر تو غشی طاری ہوگئی۔ عبدالمنان اور بے جی، زرینہ کو سنبھالتے ہوئے اندر لے گئے۔ کچھ وقت تکفین و تدفین کے انتظامات میں گزرا۔ نمازِ جنازہ پڑھ کر جب عبدالمنان کی نظر قبر کے قریب کھڑے عبدالہادی بھائی پر پڑی تو اسے حیرت و استعجاب کے ساتھ خوشی کا احساس بھی ہوا کہ اتنے عرصے بعد وہ عبدالہادی بھائی سے ملے گا۔ تدفین کے بعد دعا مانگ کر جب اس نے عبدالہادی بھائی کا ہاتھ پکڑا تو وہ حیران ہو کر مڑے، چہرے پر ایک رنگ شناسائی آ کر گزر گیا۔

وہ بہت ہی اجنبی لہجے سے بولے، ''جی؟'' عبدالمنان کو ایک دھچکا لگا۔ اس نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا۔

''میں عبدالمنان.... عبدالہادی بھائی! آپ نے پہچانا نہیں؟'' عبدالمنان سمجھ گیا کہ رنجشوں کا یہ زہر اب اس کی زندگی میں شامل ہو چکا ہے اور وہ اس کی تاثیر بھی محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اُمید کا دامن نہ چھوڑا۔

''عبدالہادی بھائی! میں عبدالمنان.... آپ کا چھوٹا بھائی، آپ کا گڈا، بھول گئے؟'' اس نے ذرا توقف کے بعد کہا تو وہ بولے۔

''گزرتے وقت کے ساتھ یادیں دُھندلا جاتی ہیں۔عمر کے ساتھ ساتھ انسان بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں، کچھ بھی نہیں۔ یوں بھی اب پرانی باتیں مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں رہتیں''۔

وہ انتہائی اجنبی اور کھوکھلے لہجے میں کہے جا رہے تھے اور اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔اس نے تو پڑھا تھا کہ بچپن اور نوجوانی کی باتیں انسان کا دماغ کبھی نہیں بھول پاتا، حتیٰ کہ بڑھاپے میں بھی دماغ کا وہ حصہ پوری طرح جاگتا ہے، جس میں بچپن اور جوانی کے لمحات محفوظ ہوتے ہیں۔انسان کی یادداشت اور دماغ کا سب سے مضبوط اور قوی دَور ہی بچپن اور نوجوانی کا ہوتا ہے، اس دورانیے کی کوئی بات کبھی نہیں بھولی جاتی، وہ تو یادداشت میں راسخ و پیوست ہو جاتی ہے۔

مگر یہ کیا....؟ اسے وہ صبح یاد آئی جب عبدالہادی بھائی آخری مرتبہ گھر سے رخصت ہو رہے تھے۔ بابا جان کے چہرے پر ایک کرب تھا، آنکھوں میں نمی، جسے وہ اس دن نہیں سمجھ پایا تھا۔آج محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے من من بھر وزنی قدم بڑی مشکل سے گھسیٹتا قبرستان کے بیرونی راستے پر چلنے لگا۔آنکھوں سے آنسوؤں کی روانی تیز ہوتی گئی۔ درد بڑھتا گیا۔رشتے بے مول ہو چکے تھے۔

آج بے نام، تنہا، اُداس ہوا ہوں
مجھ سے چھین لیا ہے میرا نسب کس نے

☆.....☆.....☆

نئے دور کی اُداسی

بابا جی بولے جا رہے تھے اور میں انہیں سنے جا رہا تھا، ان کی طرف غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے، ''بیٹا! جب میں جوان تھا تو اس دَور میں پڑھائی اتنی اہم نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ ہم تو اُس جوان سے با قاعدہ متاثر ہوا کرتے تھے، جو کسی فن میں طاق ہوا کرتا تھا، چہ جائیکہ وہ پڑھا لکھا نہیں ہوتا تھا مگر کوئی بھی کام سیکھتا تھا تو اس کی مہارت کو پانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے بھی اپنی نوجوانی ہی میں ایک بڑھئی کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ میرا اُستاد پورے شہر میں اپنے فن کی مہارت میں یکتا تھا، اس کی شاگردی میرے لیے سند کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس دور میں اس کے پاس تمام اوزار بیش قیمت اور جدید ترین تھے''۔

''بابا! وہی پرانے دَور کے اوزار، جو آج کل پرانے ''مستری'' استعمال کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تو بابا جی بولے، ''ہاں بیٹا! وہی اوزار، جو لکڑی کے تنے کو خوب صورت نقش و نگار کے ساتھ مزین فرنیچر میں بدلتے تھے اور آج بھی اس کو فن پاروں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ مگر اب تو مشینوں کا دور ہے''۔ بابا جی نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں ایک کرب دیکھا، نمی دیکھی، میں ششدر رہ گیا۔

''مگر بابا! مشینیں تو بڑی تیزی کے ساتھ فرنیچر بنا دیتی ہیں اور وہ خوب صورت بھی ہوتا ہے، پرانے اوزاروں کے ساتھ تو مہینوں لگتے تھے''۔ میرے سوال پر بابا مسکرا کر کہنے لگے، ''بیٹا! تو بھی صحیح کہتا ہے، پر تجھے پتا ہے، اب ان مشینوں کو چلانے کے لیے پہلے ڈھیر سارا پڑھنا پڑتا ہے، پھر بھی مہارت نہیں آتی۔ نئی مشینیں آئیں، ان کے ساتھ نئے کتابچے، سب کچھ نیا، پھر سے سیکھنا شروع''۔

''مگر بابا! اس سے تو علم بڑھتا ہے۔ پڑھنے میں کیسی قباحت؟'' میں نے جلدی سے توجیہہ پیش کی۔ بابا ہنسے، ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں کی نمی سے دو موتی جھریوں بھرے رُخساروں پر پھسلتے چلے گئے۔ کہنے لگے۔

''بیٹا! پھر جب پڑھتے ہی رہنا ہے تو مہارت کہاں سے آئے گی۔ جب ہر گزرتے دن نئے اوزاروں کی خصوصیات لیے مشین کو سیکھنے بیٹھو گے تو کام میں پختگی تو نہ آئے گی''۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا بابا کہ آپ ان مشینوں سے نفرت کرتے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر دوبارہ اسی پتھر کے دور میں جانا چاہتے ہیں''۔ میں نے تنگ آ کر تلخ لہجے میں کہا۔ بابا نے ہنوز مسکراتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پیار سے بولے، ''نہیں بیٹا! یہ تو نہیں چھوڑی جا سکتیں مگر خود بتاؤ، کیا یہ مشینیں تمہاری ثقافت اور تہذیب سے جڑی وہ مہارت، وہ جذبات رکھتی ہیں؟ ایک بڑھئی جب اپنا کام کرتا تھا، تو وہ اپنے کام میں ڈوب جایا کرتا تھا، اپنی ثقافت، تہذیب سے لگاؤ، اپنے اسلاف سے سیکھے تمام گر آزماتا تھا۔ اسے اپنے فن سے، اپنے فن پاروں سے، محبت تھی، لگاؤ تھا۔ وہ کام سیکھتا تھا تو اپنی تہذیب و ثقافت بھی سیکھتا تھا، اسے اوڑھ لیتا تھا اور پھر جب مہارت آ جاتی تھی تو اپنی ثقافت و تہذیب کو اپنے فن کی بدولت اپنے فن پاروں میں ڈھالتا تھا۔ بس بیٹا! یہ باتیں آج ان مشینوں کو تو سمجھ میں نہیں آتی ناں۔ خیر.... چھوڑ ان باتوں کو، بتا! لسّی پیے گا؟'' اتنا کہہ کر بابا اپنی چوکی سے اُٹھے اور اس پرانی سی ورکشاپ کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگے۔ مگر میں اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ بابا جی یہ کیا کہہ گئے تھے، ان کے آنسوؤں میں ایسا کیا تھا؟ بے چینی، دکھ یا کچھ اور.... ان میں پرانے دور کی یادیں تھی یا نئے دور کی اُداسی!؟

☆.....☆.....☆

محبت راکھ بن گئی

نمرہ کی سسکیوں کی آواز دروزے کی دوسری طرف صاف سنائی دے رہی تھی۔آج پھر سے اس کی خوش گوار زندگی کی ایک اُداس رات تھی۔

نمرہ ایک ادنیٰ درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔اکلوتی ہونے کے باعث مکمل توجہ اور بے تحاشا لاڈ پیار کے باعث کافی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ضدی بھی تھی۔بچپن سے نوجوانی تک کا سفر خوش گوار طریقے سے گزارا مگر نوجوانی میں اس کی زندگی کا ایک ایسا باب کھلا کہ اس کی تمام ضد دھری کی دھری رہ گئی۔جب وجیہہ سے اس کی ملاقات ہوئی تو وہ کالج میں پڑھتی تھی اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔جب وہ اس کے ساتھ ہوتی تو ہر چیز بھول جایا کرتی تھی۔اس کے لیے اپنی ہر ضد کو نیچا دکھاتی، ہر وہ کام کرتی جو وجیہہ کو پسند ہو، وجیہہ بھی اس کے ساتھ اچھا محسوس کرتا۔نمرہ کے لیے شاید اس کے بغیر کچھ سوچنا بھی محال تھا۔وہ سب کچھ بھول سکتی تھی مگر وجیہہ! یہ ناممکن لگتا تھا۔اس کی یہ خوشیاں شاید قدرت کو منظور نہ تھیں یا شاید وجیہہ اس کی بے لوث محبت کے قابل نہ تھا۔بس ایک دن جو وجیہہ گیا تو پھر اس کا کوئی پتا نہ چلا، اس نے نمرہ کا اپنے تک آنے والا ہر راستہ بند کر دیا۔نمرہ کو بے بس کر دیا تھا اور نمرہ! اس کی زندگی میں تو اچانک ہی ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی، سب کچھ اندھیر ہو گیا، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وجیہہ اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے؟ رسوائی و بدنامی کا داغ....، وہ زندگی کے اس غم واندوہ کے پہاڑ میں جا گری، جہاں ہر طرف اندھیرا ہی نظر آتا تھا، وہ مایوس ہو چکی تھی۔جب کبھی آئینہ دیکھتی تو وجیہہ کا ہر ہر لفظ یاد آتا تھا پھر بے مہر آنسو اس کے گالوں کو دھو جاتے تھے لیکن زندگی کی تاش میں ایک بازی اور موجود تھی۔احمر، جو اپنے ماں باپ کا چہیتا بیٹا تھا اور افضل تو ویسے بھی نمرہ کے والد کے بچپن کے دوست تھے، افضل نے ایک دن نمرہ کے والد سے کہا، کیوں نہ دوستی کو رشتے داری میں بدلیں۔زندگی کے اس موڑ پر دوستی کو عزت بخشیں۔

ابھی یہ معاملات چل رہے تھے اور نمرہ کی اُداسی بھی اب چھٹنے لگی تھی۔ اسے اپنی محبت پر پشیمانی تھی۔ حسب عادت نمرہ صبح ناشتے کے بعد لاؤنج میں چائے کی چسکیاں لے رہی تھی، اچانک اماں نے کہا، چلو شاپنگ کے لیے چلتے ہیں۔ وہ حیران و پریشان بدقتِ تمام ان کے ساتھ شاپنگ کے لیے چل دی۔

اچھی خاصی شاپنگ کے بعد وہ واپسی کے لیے بس اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہی تھی، ساتھ ہی اماں سے ہونے والی اچانک شاپنگ کی وجہ جاننا چاہ رہی تھی، جیسے ہی وہ بس اسٹینڈ پر پہنچی، اسے وہ چہرہ دکھائی دیا۔ حزن وملال میں ڈوبا۔ ہاں.... وہ وجیہہ ہی تھا۔ اس کا دل تڑپ اُٹھا، آنکھوں سے آنسو چھلکنے کو بے تاب ہونے لگے، اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ گھر آ کر وہ تھکاوٹ کا بہانہ بنا کر بہت دیر تک روتی رہی، اگلے دن اس کا دل چاہا کہ وجیہہ کو فون کرے مگر دماغ اب بھروسا نہیں کر رہا تھا اور دل تڑپ رہا تھا۔

اس شام اماں نے زبردستی اسے نیا کام دار سوٹ پہنا کر تیار کیا اور ہلکے میک اپ کے ساتھ آرام سے بیٹھنے کو کہہ کر کچن میں کام کرنے چلی گئیں۔ نمرہ کو بے چینی نے آگھیرا، اک عجب گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس نے اماں سے پوچھا تو اماں کہنے لگیں کہ تمہارے افضل چچا کی دعوت ہے آج۔

شام ہوئی، مہمان آ پہنچے، اماں نے بیٹھتے ہی اسے چائے لانے کو کہا۔ وہ چائے بنا کے سب کو پیش کرنے لگی کہ افضل چچا کی بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور بڑے چاؤ سے اماں سے کہا، آج سے یہ ہماری بیٹی ہے، اسے ہم احمر کی دلہن بنائیں گے۔

یہ الفاظ گویا سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں نمرہ کے دماغ میں ایٹم بم سے بھی بھیانک دھماکے کر گئے۔ وہ تو اپنا دل کسی اور کو سونپ چکی تھی، ایک ایسے شخص کو، جو صرف اس کے جسم کا طلب گار تھا، جسے اس کی عزت اور خودداری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے باوجود نمرہ کے تمام تر جذبات اسی کے نام تھے مگر اب.... زندگی کے اس موڑ پر وہ کیا کرے؟ اس کا دل بار بار بغاوت پر اُکسا رہا تھا، اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی مگر اس نے ماضی کا پچھتاوا، اپنی پشیمانی، سب دفن کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے احمر کی عزت قبول کر لی۔ ان کی شادی بڑی دُھوم دھام سے ہوئی۔ سب کچھ جیسے خواب سا تھا اور آج ایک عرصہ گزرنے کے بعد وہ ماں بن چکی تھی، ایک خاندان بنا چکی تھی۔ مگر اسے کبھی کسی چیز کی خواہش نہ ہوئی، نہ کبھی کسی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے تمام جذبات سرد پڑ چکے تھے۔ تاہم، آج بھی دل میں ایک کسک سی اُٹھتی ہے۔ احمر سو رہا ہے مگر نمرہ جاگ رہی ہے۔ احمر کو کبھی پتا ہی نہ چل سکا کہ نمرہ راتوں کو جاگتی رہتی ہے اور نمرہ کو کبھی اسے بتانے کی، اسے احساس دلانے کی ضرورت محسوس نہ ہو سکی کیوں کہ اس کی محبت تو راکھ بن چکی تھی جب کہ احمر کی عزت، حقیقتِ عین ہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

علی عبداللہ

علی عبداللہ پیشے کے لحاظ سے ہیلتھ اینڈ سیفٹی پروفیشنل ہیں۔ کتب بینی اور لکھنے لکھانے کا شوق رکھتے ہیں اور مختلف قومی مجلوں، ویب سائٹس اور اخبارات کے علاوہ ہندوستان کے اخبار میں بھی ان کی تحاریر شائع ہو چکی ہیں۔ ادب، تاریخ، مذہب اور ٹیکنالوجی ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔

فہرست تحریر:

1- برگد سے جڑے توہمات اور حقیقت

2- فلسفہ سقراط پر ایک نظر

3- اسلام ہی کیوں؟

4- منطق الطیر، جدید

☆.....☆.....☆

برگد سے جڑے توہمات اور حقیقت

سرگودھا کے گاؤں موری وال اور ابل کے درمیان برگد کا ایک بہت پرانا درخت ہے جو ساڑھے تین ایکڑ سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق اسے ایک بزرگ مرتضٰی شاہ نے اپنے شاگرد بابا روڈھے شاہ کے ساتھ لگایا تھا۔ اسے روڈھے شاہ کی مائی بوڑھ بھی کہا جاتا ہے۔ اندازاً اس درخت کی عمر چھ سو سے سات سو سال تک ہے۔ اس درخت کے نیچے اتنی وسیع جگہ ہے کہ یہاں نہ صرف لوگ آرام کرتے ہیں بلکہ اپنے مویشی بھی باندھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک قبرستان بھی ہے۔ اس قدیم برگد سے متعلق بہت سے توہمات ہونے کی بِنا پر مقامی لوگ نہ تو اسے کاٹتے ہیں اور نہ ہی اس پر چڑھتے ہیں۔ لوگوں کے مطابق جب بھی کسی نے اس درخت کی کوئی شاخ کاٹی ہے، اسے سخت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ درخت کے بڑھنے کی وجہ سے لوگ اپنی جگہ تو چھوڑ دیتے ہیں لیکن کوئی اسے کاٹتا نہیں ہے۔

دربار کے متولی کے مطابق بوڑھ کے اس درخت کو نقصان پہنچانے والے کو ہمیشہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کبھی اس درخت کے پیچھے چار بھائی رہتے تھے۔ جب برگد کی جڑیں ان کے گھر میں جا پہنچیں تو میرے روکنے کے باوجود انہوں نے وہ جڑیں کاٹ دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چاروں عمر بھر بے اولاد رہے۔ مزار کے متولی نے یہ بھی بتایا کہ لوگ اپنی منّتیں مرادیں پوری کروانے کے لیے بھی یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ کاروبار کی بہتری ہو یا کسی کو بیرون ملک جانا ہو، یہاں آ کر درخت کے تنے اور ٹہنیوں کے ساتھ منّتوں کے دھاگے باندھتے ہیں۔ دعا قبول ہونے کے بعد اپنی منّتیں چڑھا کر دھاگے کھول جاتے ہیں۔

جہالت اور کم علمی کا ایسا مظاہرہ اگر کسی پڑوسی ملک میں ہوتا، جہاں لوگ اسلام کی روح سے نا آشنا ہیں، تو شاید اسے ہضم کیا جا سکتا تھا مگر ایک ایسے ملک میں، جو خالصتاً اسلامی ملک کہلاتا ہے اور جہاں دین کی ترویج میں کسی قسم کی

رکاوٹ بھی نہیں ہے، وہاں ایسے جاہلانہ اقدامات شرکیہ ہونے کے ساتھ لوگوں کی کم علمی اور ہندووانہ رسومات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ درباروں، مزاروں اور ان میں مدفون بزرگان کے بارے تو ہمہ اقسام کے عقائد دیکھنے کو ملتے تھے لیکن ایک قدیم درخت سے لوگوں کے ایسے عقائد اور وابستگی قابل تشویش ہے۔ برگد کا درخت اپنی طویل عمری، چھتنار اور پُر اسرار شکل وشباہت کی بِنا پر صدیوں سے انسان کو اپنی طرف کھینچتا چلا آ رہا ہے۔ ہندومت اور بدھ مت کے علاوہ بھی دیگر کئی معاشروں میں اسے ایک خاص روحانی اہمیت حاصل ہے۔ اسی بِنا پر دیگر مذاہب کے لوگ اس کی پوجا بھی کرتے ہیں اور اسے دیوتا اور بھگوان مانتے ہیں۔ برگد کا درخت ہندومت میں موت اور زندگی کے دیوتا ''یاما'' سے منسوب ہے۔ اسی لیے اسے برصغیر میں زیادہ تر قبرستانوں کے قریب دیکھا جاتا ہے۔

شادی شدہ ہندو خواتین اپنے شوہروں کی زندگی اور حفاظت کے لیے ایک خاص روزہ رکھتی ہیں جسے ''شبھ راتری وراتر'' کہا جاتا ہے، اس کا ایک اہم رکن برگد کے درخت کے ساتھ دھاگا باندھنا ہے۔ مزید.... ہندومت میں برگد کے پتّوں کو ان کے دیوتا کرشن کی آرام گاہ سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ کو جب گیان ملا تو وہ سات روز تک برگد کے درخت کے نیچے مراقبے میں رہا تھا تا کہ اس گیان کو اپنے من میں اتار سکے۔ اسی طرح فلپائن میں برگد کے درخت کو مختلف روحوں اور شیطانوں کا مسکن سمجھا جاتا ہے، جن میں سے ایک ایسا بھی ہے جس کا آدھا دھڑ گھوڑے اور آدھا انسانوں جیسا ہے۔ بچوں کو اس بات سے سختی سے روکا جاتا ہے کہ وہ برگد کے درخت کی جانب کسی بھی قسم کا اشارہ کریں خصوصاً جب وہ کسی نئی جگہ جائیں۔ فلپائن کے لوگ برگد کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ ان کا خیال ہے کہ برگد میں موجود غیر مرئی مخلوق ان کو بخار، موت یا کسی ناگہانی آفت میں مبتلا کر سکتی ہے۔

برگد کا سائنسی نام فائیکس بینگلینسز (Ficusbenghalensis) ہے۔ یہ درخت ایک وسیع علاقے میں پھیلتے ہیں اور ان کی جڑیں بہت دُور دُور تک جاتی ہیں۔ چوں کہ ان کی شاخیں طویل اور وسیع ہوتی ہیں اسی لیے انہیں سہارا دینے کے لیے ان میں سے جڑیں نکل آتی ہیں۔ جی سی یونیورسٹی کے شعبۂ نباتات کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر ظہیرالدین خان کے مطابق، برگد چوں کہ نہایت گھنا اور بڑا ہوتا ہے، اس وجہ سے اسے پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جب انہیں زمین سے مطلوبہ مقدار میں پانی نہ ملے تو یہ اپنی شاخوں سے کچھ جڑیں نکال کر ہوا میں موجود نمی جذب کرنے لگتا ہے۔ کشش ثقل کی بِنا پر پھر یہی جڑیں زمین میں دھنس کر برگد کی شاخوں کے لیے ستون کا کردار ادا کرنے لگتی ہیں۔ برگد کے درخت میں پائے جانے والے دودھیا پانی کو لیٹکس کہا جاتا ہے، جو صدیوں سے مختلف بیماریوں کے علاج میں استعمال ہو رہا ہے۔ وطن عزیز میں اس قدیم درخت کو ایک قومی ورثہ سمجھ کر اس کی حفاظت کرنا اور اس کے غیر معمولی حجم کی بِنا پر اسے خاص اہمیت دینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن دیگر مذاہب کی طرح انہیں مددگار تصور کرنا ایک قبیح عمل ہے۔

غیر اللہ سے کسی بھی قسم کی توقعات رکھنے اور منّتیں، مرادیں مانگنے کا تصور بلاشبہ شرک میں شامل ہے۔ حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان جس درخت کے نیچے ہوئی، حضرت عمرؓ نے اسے کٹوا دیا تھا کیوں کہ لوگوں کی غیر معمولی وابستگی نے یہ اندیشہ پیدا کر دیا تھا کہ کہیں اس درخت کو مقدس سمجھ کر اسے مددگار نہ سمجھا جانے لگے۔ قرآن پاک کی سورت الزمر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے اور تم زیاں کاروں میں ہو جاؤ گے''۔ اسی طرح سورت لقمان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے، ''بے شک شرک تو بڑا (بھاری) ظلم ہے''۔ سورت النسا میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے معاف کر دے اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا، اس نے بڑا بہتان باندھا''۔

شرک کی مذمت میں کئی احادیث بھی موجود ہیں۔ آپ صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک میری امت کے کچھ قبیلے مشرکین سے نہ جا ملیں اور میری امت کے کچھ قبیلے بتوں کی عبادت نہ کرنے لگیں''۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد) ایک اور جگہ عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ آپ صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''جس آدمی کو اس حال میں موت آئی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو پکارے تو وہ جہنم میں داخل ہوگا''۔ (صحیح البخاری)

اس کے علاوہ حیاتِ صحابہ اور بزرگانِ دین کی زندگیوں میں ایسے کئی واقعات موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ توہمات، شرکیہ رسومات اور اس جیسے دیگر عوامل کی کتنی شدت سے تردید کی گئی ہے۔ لہٰذا، ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو اس ہندووانہ رسم سے نکال کر حقیقت کی جانب مائل کیا جائے اور اس درخت کو ایک نایاب وقدیم ورثہ سمجھنے کے سوا، اس سے کسی قسم کی امید اور توقعات لگانے سے گریز کیا جائے۔ وگرنہ یہ بعید نہیں کہ لوگ مزاروں کے بعد قدیم درختوں کو بھی روحانیت کا مظہر سمجھ کر ان سے مدد مانگنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

فلسفہ سقراط پر ایک نظر

سقراط کو مغربی فلسفے کے بانیوں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس نے اہل مغرب کو ایک جدید نظریے اور فلسفے سے روشناس کروایا، اس کی اپنی کوئی باقاعدہ تصنیف موجود نہیں، سوائے افلاطون کے، جس نے سقراط کے نظریات پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایتھنز میں پیدا ہونے والا سقراط ایک سنگ تراش تھا، بعد میں ایتھنز کی فوج میں بھی شامل رہا۔ سقراط نے عوام میں پھیلے گمراہ کُن عقائد پر تنقید کی، جو معاشرے میں سرایت کر چکے تھے۔ سقراط مکالموں کی صورت عوام میں گفتگو کرتا تھا جس کا مقصد عوام کو ان گمراہ کُن عقائد پر غور و فکر کی دعوت دینا ہوتا تھا۔ اس کے مکالمے کچھ یوں ہوتے:

سقراط: کیا دیوتا سب جانتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! بالکل۔

سقراط: لیکن بعض اوقات وہ کچھ معاملات سے غیر متفق بھی ہوتے ہیں۔

جواب: ہاں ایسا ہی ہے، وہ ہمیشہ لڑتے ہیں۔

سقراط: یعنی وہ صحیح اور غلط کی کشمکش میں الجھے رہتے ہیں؟

جواب: جی میرا خیال تو یہی ہے۔

سقراط: اس کا مطلب یہ ہوا کہ دیوتا ہر شے کے بارے میں علم نہیں رکھتے؟

سقراط کا خیال تھا کہ اچھائی یا برائی، کوئی نفسی موضوعات نہیں بلکہ ابدی تصورات ہیں۔ اب یہ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم مسلسل خود شناسی کے ذریعے ان تصورات کو دریافت کریں۔ حکمت اور روح کو نقصان پہنچائے اور دیوتاؤں کو ناراض کرے۔

سقراط موت کو ایک امید سمجھتا تھا۔ ایسی امید کہ جس کے بعد اس کی روح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے گی۔ جہاں اسے وہ تمام خوشی اور دانائی مل سکے گی جو یہاں نہ مل سکی تھی۔ لہٰذا سقراط نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی لیا۔ سقراط کو مغربی تاریخ کا پہلا شہید دانش ور تصور کیا جاتا ہے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اپنی زندگی حکمت و دانائی کی کھوج اور انصاف و خوب صورتی جیسے تجریدی تصورات کے حصول میں وقف کر کے آنے والی دنیا کو علم و حکمت کی نئی راہوں پر گام زن کیا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں، انسان کو سائنسی مشاہدات کی بِنا پر بہت سا علم حاصل ہوا ہے۔ فلیمنگ کی پنسلین ہو یا مارکونی کا ریڈیو، معلومات جس ذریعے سے بھی حاصل ہوں وہ ہمارے علم میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کا تمام علم، عملی مشاہدات کی بِنا ہی پر حاصل ہوا؟ ہمارا جواب ہاں میں ہوگا مگر سقراط کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسیات کسی بھی صورت حقیقت کو نہیں سمیٹ سکتیں۔ روح اور بدن کے مابین ایک تقسیم ہے، جس میں علم حاصل کرنے میں بدن کا کوئی کردار نہیں ہے۔ سقراط کے نزدیک جسم کا تعلق صرف مادّی خوشی کے ساتھ ہے۔ جیسے خوراک، جنسی ضروریات اور دولت وغیرہ۔ لہٰذا، ان تمام وجوہ کی بِنا پر بدن علم کے حصول میں ایک رکاوٹ ہے اور یہ کبھی بھی حقیقی علم سے آشنا نہیں کروا پاتا، بالکل اسی طرح جیسے ایک ہی شے کو دو مختلف لوگ مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں اور ان کا مشاہدہ کبھی بھی یکساں نہیں ہوتا۔ سقراط کا کہنا ہے کہ انسان کو علم کے ذرائع کے لیے اپنی حسیات پر کبھی انحصار نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ہر انسان کی حسیات مختلف ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق علم ایک ابدی، ٹھوس اور کبھی نہ بدلنے والی شے ہے اور اس کے لیے اپنی حسیات پر انحصار کر کے اسے کھوجنا بیکار ہے۔ اس کی مثال سقراط یوں دیتا ہے کہ اگر ایک لکڑی کو آدھی پانی میں ڈبو کر دیکھا جائے تو یہ ٹیڑھی دکھائی دے گی جب کہ حقیقت میں وہ ایسی نہیں ہے۔ تو کیا ہماری حسیات ہمیں دھوکا دیتی ہیں؟

سقراط کہتا ہے کہ جسم کا تعلق ایک ناپائیدار اور حسیاتی دنیا سے ہے جب کہ روح ایک ابدی اور پائیدار دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ حسیاتی دنیا یہی ہے، جو ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں لیکن یہ ایک عکس ہے۔ حقیقی دنیا ہم سے پوشیدہ ہے جہاں ہر شے کی پہلے سے ایک وضع اور ہئیت موجود ہے۔ یہ ہئیت ایک پائیدار، ناقابل تبدیل اور ابدی پیمانہ ہے، جس کی بنیاد پر ہم اس ناپائیدار دنیا میں اشیا کو پہچان پاتے ہیں۔ سقراط کے نزدیک چوں کہ یہ کائنات مسلسل بدلاؤ کا سامنا کرتی ہے، اس لیے یہ حقیقی نہیں ہو سکتی اور اسی بِنا پر کوئی بھی شے یہاں مستقل نہیں ٹھہر پاتی۔ مثال کے طور پر لکڑی کی ایک کرسی، چاہے جتنی اعلیٰ اور مضبوط بنائی گئی ہو، ایک وقت آتا ہے کہ وہ بھی زوال پزیر ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔ اسی طرح جسم بھی اپنی تمام ضروریات اور خواہشات کی بِنا پر ہمیں مختلف طریقوں سے مصروف رکھتا ہے۔ اسی حسیاتی وجود کی بِنا پر یہ انسان کو علم و حکمت سے دور کر دیتا ہے۔

سقراط کے نزدیک اگر کوئی انسان علم و دانش حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے حسیاتی دنیا سے مکمل طور پر توجہ ہٹانی ہوگی کیوں کہ یہ ایک خواب سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ خواب کتنی تیزی سے بدلتے ہیں اور اگر چیزیں اسی طرح بدلتی رہیں تو ہم کیسے کچھ بھی سیکھ سکتے ہیں؟ جسم بدی کا مقبرہ ہے جو ہماری روح کی اچھائی قید کر لیتا ہے اور حکمت کے ہر موقعے کو دھوکے میں بدلنے کی سعی کرتا ہے۔ اس طرح سقراط مختلف دلائل کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ بدلاؤ اور ناپائیداری سے بھرپور اس کائنات میں ہماری حسیات کبھی حقیقت تلاش نہیں کر سکتیں۔ حقیقت اور حکمت صرف اپنی روح میں تلاش کی جا سکتی ہے، جس کے لیے روح تک پہنچنا لازم ہے۔ ہماری پیدائش ہمیں وہ تمام چیزیں بھلا دیتی ہے جو ہماری روح سیکھ چکی ہوتی ہے۔ تاہم، انہیں پہچاننا ممکن ہوتا ہے۔ اسی لیے سقراط کہتا ہے کہ انسانوں کو وہ سب سیکھا ہوا دوبارہ یاد کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے سقراط جدلیاتی طریقہ اپنایا کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے سوالات کرتا تھا اور ان کو غور و فکر کرنے پر اکساتا تھا۔ سقراط کہتا ہے، ''حکمت و دانائی اسی وقت آ سکتی ہے جب انسان کسی بھی منظر یا حسیاتی مشاہدے کو ذریعہ بنائے بِنا خالصتاً اپنے خیالات پر غور کرے۔ آنکھوں، کانوں اور دیگر بدنی عوامل سے آزاد ہو کر ہی روح انسان کو حقیقی علم سے آشنا کروا سکتی ہے کیوں کہ انسان کا بدن ہمیشہ اس کی روح کو کشمکش میں ڈال کر اسے سچائی اور حکمت سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

غور کیا جائے تو سقراط کا یہ فلسفہ دنیا کی ناپائیداری اور ابدی زندگی کے بارے میں واضح اشارات پیش کرتا ہے۔ یہ ہمیں علم و حکمت کے حصول کے لیے جسمانی خواہشات سے دُوری اور مکمل یکسوئی سے غور و فکر کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ لیکن سقراط کی مثال اس شخص سی ہے جو کسی صحرا میں بھٹکتا ہوا اپنی عقل اور وجدان پر غور و فکر سے منزل کی جانب چلنے کی کوشش تو کرتا ہے مگر کسی واضح راستے کی جانب دانائی ہی انسان کو اخلاقیات کی حقیقی روح سے متعارف کرواتی ہیں۔ سقراط کے نزدیک کائنات میں واحد اچھائی علم اور واحد برائی جہالت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو علم کی تلاش کسی بھی قیمت پر جاری رکھنی چاہیے ورنہ جہالت اس کا مقدر بن کر عمر بھر اندھیروں ہی میں بھٹکاتی رہے گی۔ سقراط کے نزدیک جسم اور روح دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر جسم متروک کر دیا جائے تو روح کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ وہ کہیں اور چلی جائے گی۔ سقراط کی نظر میں نقصان صرف وہ ہوتا ہے جو آپ کو روحانی طور پر متاثر کرے اور یہ صرف انسان کے اپنے غلط عمل کی وجہ ہی سے ہوتا ہے۔ سقراط کے سامنے اس کے جرائم پر پانچ سزائیں تھیں جن میں سے اس نے موت کو چنا تھا۔ پہلی قید، دوسری جلاوطنی، تیسری اپنے نظریات سے کنارا کشی، چوتھی جرمانہ اور آخری موت تھی۔

قید سقراط کے لیے ناقابل قبول تھی کیوں کہ اس طرح اسے عمر بھر دوسروں کے تابع رہنا پڑتا۔ سقراط، جو ایتھنز کو دل و جان سے چاہتا تھا، 70 سال کی عمر میں جلاوطنی کا تو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کہیں بھی چلا جائے، لوگ اسے ڈھونڈ کر اس کی محفل میں بیٹھنے لگیں گے اور ان سے بچنے کے لیے اسے مسلسل ایک جگہ سے دوسری

جگہ چلتے رہنا پڑے گا۔ سقراط کے لیے علم وحکمت سے بھرپور مکالموں سے دست بردار ہوکر خاموشی کی زندگی گزارنا موت جیسی تھی۔ خاموش رہنے کا مطلب دیوتاؤں کی نافرمانی تھی۔ سقراط کے نزدیک علم ایک نیکی ہے اور لوگوں تک اسے پہنچانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اُن سے اُن کے عقائد کے بارے میں سوالات کیے جائیں تا کہ وہ جوابات کی تلاش میں زندگی کے نئے اسراروں سے پردہ ہٹا سکیں۔ سقراط کے پاس اتنی دولت بھی نہ تھی کہ وہ جرمانہ بھر کر آزاد ہو سکتا۔ لہٰذا، موت ہی ایک آخری صورت تھی، جسے وہ چن سکتا تھا۔ کیوں کہ سقراط سمجھتا تھا کہ خاموشی، جلاوطنی اور قید، اس کی روح کو نقصان دیں گے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ خود اپنی مرضی سے سے نا آشنا رہتا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے الٰہیات کا تصور شروع ہوتا ہے۔ عقل یہاں پر آ کر بے بس ہو جاتی ہے اور پھر مذہب اسے ایک راستہ دکھا کر منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔

☆.....☆.....☆

اسلام ہی کیوں؟

مہدی رضا حسن ایک ہندوستانی نژاد برطانوی براڈ کاسٹر، صحافی اور مصنف ہیں، جو الجزیرہ چینل کے انگریزی پروگرام ''دا کیفے''، ''ہیڈ ٹو ہیڈ'' اور ''اپ فرنٹ'' کے میزبان بھی ہیں۔ انہیں جنوری 2014 میں میڈیا کے لیے خدمات پر ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

حال ہی میں ان کی تازہ ترین ویڈیو جس کا عنوان ''خلیفہ ڈونلڈ ٹرمپ اور صلیبی طالبان کا ارتقا'' تھا، سامنے آئی، جس میں وہ دائیں بازو کے اُن عیسائیوں کی بات کر رہے ہیں، جو امریکی حکومت کے لیے اپنے گھٹنے ٹیک چکے ہیں۔ کہنے کو یہ ویڈیو ان صلیبیوں سے انتباہ کرنے کے بارے میں ہے لیکن اس میں حسن نے براہ راست اسلامی اصطلاحات کا طنزیہ استعمال کیا ہے اور تمام مذاہب کی شدت پسندی کے لیے اسلام کو سامنے رکھا ہے۔

حسن وہ پہلا شخص نہیں جس نے دوسرے مذاہب میں بڑھتی شدت پسندی کے لیے اسلامی اصطلاحات کا سہارا لیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر لبرل اور بائیں بازو کے نظریات رکھنے والوں کے اس گروپ سے تعلق رکھتا ہے، جن کے خیال میں اسلام اور مسلمانوں کو دنیا بھر میں ہونے والی مذہبی شدت پسندی کے لیے بطور استعارہ استعمال کرنا نہایت سودمند ہے۔

اس موازنے سے ان لبرل اور اعتدال پسندوں کو متوجہ کرنا نہایت آسان ہے، جو عموماً اس بات کے قائل ہیں کہ مذہبی شدت پسندی ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یقیناً کوئی بھی مذہب، اپنے نام پر کسی بھی قسم کی شدت پسندی کا حکم نہیں دیتا لیکن مذہبی شدت پسند اپنے دعووں کو مختلف مقدس صحیفوں اور آیات کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

حسن کی ویڈیو اگرچہ صلیبی شدت پسندی کے بارے میں آگاہی کے لیے ہے لیکن اس میں اسلامی اصطلاحات

کا مسلسل استعمال تباہ کن ہے۔حسن نے ان تمام اصطلاحات کا منفی استعمال کیا، جن کی حقیقی روح اجاگر کرنے کے لیے مسلمان رہنما اور دانش ور سخت محنت کر رہے ہیں، جو مذہبی شدت پسندی کی وجہ سے بگڑ چکی ہے۔جیسا کہ ''ملا'' یہ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اسلامی قانون اور دیگر اسلامی شعائر سیکھتا ہے لیکن اب یہ ''مذہبی شدت پسند'' کے متبادل استعمال کیا جانے لگا ہے۔

''شریعت'' جو مسلمانوں کے لیے ایک راہِ عمل ہے، اسے ''شریعہ لا'' کہہ کر ہر عام وخاص کے حقوق کو مسترد کر دینے والا بنا دیا گیا ہے۔اسی طرح ''خلیفہ'' اس شخص کو کہا جاتا تھا جو ریاستی اور مذہبی رہنما ہو لیکن اب یہ ایک فاشسٹ حکم ران کے متبادل استعمال کیا جانے لگا ہے اور تو اور....''اللہ اکبر'' (اللہ سب سے بڑا ہے) جسے ہر مسلمان اپنی روزانہ کی عبادات میں دہراتا ہے، اسے مذہبی شدت پسندوں کا نعرہ سمجھا جانے لگا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مذہبی شدت پسندی صرف مسلمانوں سے جڑی ہوئی ہے اور اسلام سے پہلے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔لیکن وہ کیوں یہ بھول گیا کہ ''بنیاد پرست'' لفظ بیسویں صدی کے آغاز میں متعارف ہوا اور یہ خاص طور پر سخت عیسائی بنیاد پرستی اور عقائد کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔اب اسلام کے لیے عالمی سطح پر تعصب اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اس طرح کی اصطلاحات کا منفی استعمال کرنے پر کسی قسم کی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔امریکی معاشرتی تربیت کتنی بری ہے کہ معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے اس کے پاس اسلام کو مجازی معنوں میں استعمال کرنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

ماضی میں ''ہندو طالبان'' کا لفظ استعمال کرنے پر ایک برطانوی مجسمہ ساز آنیش کپور کو ہندوستانیوں کی جانب سے سخت مذمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، جس نے کہا تھا کہ ''ہندوستان پر ہندو طالبان حکمرانی کر رہے ہیں''۔اور اس کالم کو شائع کرنے پر امریکی اخبار گارڈین پر بہت تنقید ہوئی، جس کے بعد اخبار کو اس کالم پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ہندوستانی لوگ طالبان کو ہندومت کے لیے استعمال کرنا نہایت قبیح سمجھتے ہیں۔ایک کالم نگار نے لکھا تھا، ''ہندومت ایک پُرامن مذہب ہونے کے ناتے طالبان جیسا معاشرہ نہیں بن سکتا''۔

ہندوؤں کا کہنا تھا کہ ہندومت ایک پُرامن مذہب ہے اور اس کا اسلام جیسے شدت پسند مذہب سے موازنہ نامناسب ہے۔درحقیقت مذہبی شدت پسندی کے اظہار کے لیے مسلمانوں کا حوالہ دینا ہی غلط ہے۔موجودہ سیاسی صورت حال میں مدلل تنقید کے بجائے اسلامی اصطلاحات کا منفی استعمال ہوتا رہا تو ڈر ہے کہ عالمی دنیا اسلام کو فساد کا سبب قرار دے کر مکمل کنارا کشی ہی اختیار نہ کر لے۔بطور مسلمان اس چیز کو گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ عالمی سطح پر ہماری پہچان منفی ہو۔

مسلمان دانش وروں اور مذہبی رہنماؤں پر بھاری ذمے داری عاید ہوتی ہے کہ وہ قوم کو انتشار کے بجائے ایک

پلیٹ فارم پر یکجا کریں، نظریاتی تربیت کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات کیے جائیں اور لبرلز کی ابھرتی ہوئی سازشوں کا شکار نہ ہو سکے۔ عوام الناس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مغربی میڈیا سے متاثر ہونے کی بجائے تحقیق کی جانب راغب ہوں اور مشتبہ نظریات اور مذہبی اختلافات کو ایک طرف رکھ کر علمائے حق سے وابستگی رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میڈیا اور دیگر جدید ذرائع ابلاغ کا مثبت اور مؤثر استعمال کیا جائے تا کہ ہم عالمی سطح پر اپنا نقطۂ نظر بہترین طریقے سے اجاگر کر سکیں۔

☆.....☆.....☆

منطق الطیر ، جدید

مارچ 1939 میں پیدا ہونے والے مستنصر حسین تارڑ کو کون نہیں جانتا؟ یہ ایک ایسا ''بہروپیا'' ہے جو کبھی آپ کو شمال کے پہاڑوں پر کسی جپسی کی مانند قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا اور اٹھکھیلیاں کرتا ہوا دکھائی دے گا تو کبھی اپنا منہ دل کعبے شریف کی جانب کر کے روحانیت سے بھرپور ایک ایسے محبّ کی مانند چلتا دکھائی دے گا، جو دیدارِ یار کی خاطر چلے تو جان سے بھی گزر جانے کو تیار ہوتا ہے۔ یہ وہ مورت ہے جو کبھی ماسکو کی سفید راتوں میں کہر اور جاڑے کو محسوس کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی خانہ بدوش بن جاتی ہے، جو بہتے سندھ کے ساتھ خود تو بہتی ہی ہے، ساتھ اپنے چاہنے والوں کو بھی تاریخ کے دریا میں بہالے جاتی ہے۔

لاہور کی تنگ گلیوں سے جھانکتا یہ آوارہ لاہوری، گزرے وقتوں کی داستانیں سنانے کے لیے اپنے گرد ایک جمگھٹا اکٹھا کیے ایسا ساحرانہ انداز اختیار کرتا ہے کہ اس کا سحر کوبہ کو پھیلتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ ''اندلس میں اجنبی'' بنتا ہے تو غارِ حرا میں یوں آشنا کہ رات گزارے بِنا رہ نہیں سکتا اور پھر اچانک وہاں سے اُڑ کر پورن کے کنویں سے ہوتا ہوا نیشاپور کے عطار کے پرندوں سے متاثر ہوتا ہے اور ٹلہ جوگیاں جانے والے پرندوں سا ایک پرندہ بن کر جستجو، بے نیازی اور خود شناسی کی منازل طے کرتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے قارئین کو بھی مائل بہ پرواز کر دیتا ہے۔

پرندے ہوں یا پرواز.... یا پھر بہاؤ، مستنصر حسین تارڑ اپنی ہر کتاب میں ایک منفرد اسلوب اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی منفرد انداز ایک بار پھر ان کے نئے ناول ''منطق الطیر، جدید'' میں نظر آتا ہے۔ نیشاپور کے خواجہ فریدالدین عطار کی منطق الطیر، جس کے پرندے مولانا روم کی نظروں کو ساکت کرتے ہیں، وہی پرندے تارڑ صاحب کی نظروں کو بھی خیرہ کرتے دکھائے دیتے ہیں۔

مولانا روم نے کہا تھا، ''عطار، عشق کے سات شہروں سے گزرا، جب کہ میں ابھی پہلی گلی کے موڑ پر ہوں''۔

لیکن مستنصر حسین نہ تو رومی ہے اور نہ ہی عطار مگر انہوں نے ناول ''منطق الطیر ، جدید'' میں رومی وعطار کے اس پیوندزدہ نقش پا کو چھونے کی کوشش کی ہے، جو زمانوں سے محبت کی راہ پر گام زن ہے۔ ''منطق الطیر ، جدید'' کے ذریعے گزرے زمانوں کو زندہ کر کے تارڑ صاحب نے اس ناول کا انتساب عطار کے نام ان لفظوں میں کیا ہے،'' پرندوں کی بولیاں میرے کانوں میں پھونکنے والے مرشد، عطار کے نام''۔

اس ناول میں مصنف نے اُن سات پرندوں کا مسحور کن انداز میں تعارف کروایا ہے، جو اپنے اپنے زمانوں سے نکل کر نئے سچ کی کھوج میں محو پرواز ہوتے ہیں۔ ایک پرندہ طور کی سلگتی اس جھاڑی کے اندر موجود تھا جس کا بیج کہیں آسمانوں سے گرا، طُور کی مٹی میں دفن ہو کر پھوٹا اور پھر عشق کی آگ کی تپش میں سلگنے لگا۔ وہ پرندہ اپنی مختصر حیات کے دن اسی جھاڑی میں بسر کر لیتا لیکن طُور کے دامن میں ایک چرواہا عصا ٹیکتا آیا اور اس جھاڑی میں ایسی آگ روشن ہوئی کہ اس کے بال و پر جلنے لگے اور وہ فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ آبائی مسکنوں سے فرار ہونے والے پرندوں میں بدھ کے فاقہ زدہ بدن سے نکلنے والا وہ پرندہ بھی شامل تھا، جس کے دل نے بھی بغاوت کی تھی اور اسے طُور کے پرندے کی پرواز کا الہام ہوا تو وہ بھی مائل بہ پرواز ہو گیا۔

ابنِ مریم کے بائیں ہاتھ میں ٹھونکی گئی میخ کے نتیجے میں نکلنے والے خون کی ایک بوند نے جب اپنے تنہا اور بے یار و مددگار ہونے کی فریاد کی تو اس بوند سے ناخن جتنا ایک پرندہ وجود میں آ گیا اور ابنِ مریم کے پیاسے ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے دریائے اردن کے پانیوں میں، جہاں کبھی یحییٰ نے لوگوں کا بپتسمہ کیا تھا، اپنی چونچ ڈبو کر ایک بوند پانی کی لی اور واپس ابن مریم کے ہونٹوں پر جمی پپڑی کو تر کیا۔ وہ مسلسل حضرت عیسیٰ کی صلیب اور دریائے اردن کے درمیان اُڑان بھرتا رہا اور پھر جب ایک بار واپس آیا تو صلیب پر ابنِ مریم موجود نہ تھا۔ وہ تو بلندیوں کی جانب جا چکا تھا۔ اس پرندے نے صلیب کو مسکن بنا کر اس کی جدائی میں کئی صدیاں بِتا دیں پھر اس کا دل بھی شک کے بوٹے میں اٹکا اور وہ بھی محوِ پرواز ہوا۔

غارِ حرا کے شگافوں میں سے چاندنی کے جزیرے اترتے تھے۔ ان شگافوں میں سے ایک شگاف کے اندر وہ پرندہ ازل سے مقیم تھا، جو فنا سے آشنا نہ تھا۔ غار کی بلند تنہائی میں خلقت سے الگ ہو کر گیان و دھیان میں گم بیٹھنے والوں کے کندھوں پر بیٹھ کر وحدت کے گیت گاتا اور ان کا مونس و غم خوار ہو جاتا تھا۔ پھر ایک دن ''اقرا'' کی شب آئی اور وہ شخص، جس کا سایہ کائناتوں پر محیط ہونے والا تھا اور جس کی آغوش میں ایک زمانہ روپوش ہونا تھا، جب بھی وہاں قدم رکھتا تو اس گپھا میں بے انت چراغ جل اٹھتے اور ہر سو روشنی ہو جاتی۔ پرندے کی آنکھیں چندھیا جاتیں اور وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اپنے شگاف سے نکل کر اس کے پاؤں میں گر جاتا اور اس کی بوسیدہ ہوتی جوتیوں کی ہر گانٹھ میں اپنا دل رکھ دیتا۔ آخری بار جب وہ آیا اور اگر پرندے کو معلوم ہوتا تو وہ اس کی گانٹھوں کے ساتھ ہی جبل نور سے اتر جاتا۔

چودہ سو برسوں تک وہ جدائی کی آگ میں سلگتا، اس کا انتظار کرتا رہا اور پھر اپنے شگاف گھونسلے سے نکلا، جبلِ نور پر بلند ہوا اور خانہ کعبہ کے گرد ابابیلوں کے ایک غول سے بچتا ہوا اُڑ گیا۔ آتش پرست بلخ سے یوں نکالے گئے جیسے مدینے کے یہودی معاہدے کی خلاف ورزی پر نکالے گئے تھے لیکن وہاں موجود وہ پرندہ، جو بلخ کے آتش کدے کی راکھ میں ققنس کی مانند بھسم ہوتا اور اسی راکھ سے جنم لیتا رہا تھا اور اویستا کی قرأت کرتا رہا تا کہ وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں، ایمان نہ لا سکا۔ آتش پرستی سے تائب نہ ہو سکا اور بجھ چکی آگ میں مقیم، بھسم ہوتا اور دوبارہ زندہ ہوتا رہا۔ بار بار مرنے اور بار بار نیا جنم لینے سے وہ پرندہ بے زار ہو چکا تھا۔ وہ اپنی ابدی حیات کو داؤ پر نہ لگاتا اگر اسے بلخ کے کھنڈروں میں ایک عجیب ارتعاش سنائی نہ دیتا۔

اسے خبر ہو گئی تھی کہ اس کے ہم جنس کوہِ طُور سے اُتر رہے ہیں، بدھ کی پسلیوں، عیسیٰ کی صلیب کے شہتیروں اور غارِ حرا کے شگافوں میں سے اپنے آشیانے ترک کر کے نکل پڑے ہیں۔ تو وہ بھی اپنے بال و پر سے اس راکھ کو جھاڑ کر، جو اسے بار بار زندہ کرنے پر قادر تھی، بلخ کے کھنڈروں پر بلند ہوا۔ قرۃ العین طاہرہ، خاتون عجم کا گلا گھونٹنے والے یہ نہ جان سکے تھے کہ اس کے پیراہن میں پرویا ہوا ایک پرندہ اس کے شعروں کا حافظ ہے۔ اس پرندے نے طاہرہ کی ہڈیوں میں سے پھوٹنے والی عشق کی چنگاری سے ہونے والی روشنی میں کنویں کے اوپر تنے ہوئے نیلے افلاک میں چھید کیا اور پرواز کر گیا کیوں کہ اسے بھی ان پرندوں کی خبر ہو چکی تھی۔

حلاج کو جب نذرِ آتش کر کے دریائے فرات میں بہایا گیا تو اسی راکھ سے اُس پرندے نے بھی جنم لیا تھا اور اپنے دل میں پڑی گانٹھ اور کھینچی جانے والی ڈور سے وہ بھی باخبر ہوا اور فرات کے پانیوں سے اٹھا، حلاج کے لہو میں نچڑتا بلند ہوا کہ جہاں جہاں سے وہ پرواز کرتا گزرتا، اس کے پروں تلے سرکتی زمین پر لہو کی بوندیں گرتی گئیں۔ انا الحق کے سرخ پھولوں کی فصلیں پھوٹتی گئیں لیکن سب کی سب سر بُریدہ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان سب کے متوازی ایک کردار موسیٰ حسین بھی ہے، جو اپنی ناتواں کڑکتی ہڈیوں کے ساتھ ٹلہ جوگیاں کا مسافر ہے اور اولاد کی خواہش میں پورن کے کنویں سے ہوتا ہوا بالآخر وجدان اور وارفتگی کو اپنے نصیب میں ڈھونڈنے نکلتا ہے اور اسی ٹیلے پر ان پرندوں سے ملتا ہے، جہاں وہ ساتوں پرندے اپنے اپنے زمانے کا کٹھن سفر کر کے اکٹھے ہوتے ہیں۔

موسیٰ حسین ایک طرف اولاد سے محرومیت کی اذیت برداشت کرتا ہے تو دوسری جانب اپنی بدزبان اور چڑچڑی عورت کے نازیبا الفاظ سے بھی دل برداشتہ نظر آتا ہے۔ مزید ان پرندوں کے ساتھ ہیر، سوہنی اور صاحباں کے نور کے پرندوں کا اترنا ناول کو مزید دلچسپی کا باعث بنا دیتا ہے۔

منطق الطیر، جدید اتنا آسان ناول نہیں ہے۔ علامتی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں تجریدی رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ قاری اگر مذہبی روایات، تاریخ اور اساطیر سے واقف نہ ہو تو وہ یہ ناول دو چار صفحات پڑھنے ہی کے بعد رکھ

دے گا یا پھر یہ اس کے سر سے گزر جائے گا۔صوفیانہ رنگ لیے کئی زمانوں کی سیر کرواتا ہوا یہ ناول، قاری پر ایک عجب رنگ طاری کرتا ہے کہ وہ خود کو جستجو کا پرندہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول کو ایک بہترین ادبی شاہکار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ اتنے حساس موضوع کو فکشن میں ڈھال کر اسے مزید حساس اور پُر اثر بنا دینا سوائے ''چاچا جی'' کے شاید اور کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

عظمیٰ ظفر

عظمیٰ ظفر کا تعلق کراچی سے ہے۔ تعلیم ایم ایس سی ہے۔ لکھنے کا آغاز گزشتہ 2 برس سے کیا، ایک سال سے رائٹرز کلب سے بطور ممبر وابستہ ہیں، ملک کے صف اول کے اخبارات میں اسی پلیٹ فورم سے نمایاں جگہ پائی۔

فہرست تحریر:

1-اے کاش!

2-بارش

3-مستعار

4-جہاد بالقلم

5-روشن رات

☆.....☆.....☆

اے کاش!!!

ایک دل خراش چیخ میرے حلق سے نکلی جو آخری ثابت ہوئی۔ وہ کوہ پیمائی پر نکلنے والے دس کوہ پیما تھے جو سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ طوفانی برفیلی ہوا نے خیمے کے چیتھڑے اُڑا دیے تھے، کسی کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ سگنلز آنا بند ہو گئے تھے اور موبائل کی چارجنگ نیچے کی جانب جا رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے دوست سلیمان کو برف میں دھنستے ہوئے، جان دیتے ہوئے دیکھا تھا اور یقیناً اب میری باری تھی۔ برف، موت کا شکنجہ لیے آگے آگے بڑھ رہی تھی، میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب مذاق مذاق میں شرط لگا بیٹھا کہ اس دفعہ بھی کوہ پیمائی کا ریکارڈ میں ہی قائم کروں گا اور سارے مہم جوؤں کو ساتھ چلنے کے لیے راضی بھی کیا۔ چوں کہ موسم بہت خراب تھا اس لیے انسٹرکٹر نے اجازت نہ دی مگر میں، صفدر حیات، جو اپنے آگے سب کو زیرو مانتا تھا، ہار ماننے والوں میں نہیں تھا۔ آنسو میرے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ کاش! میں نہیں آتا۔ کاش....کاش!!

برف کے اندر میرا وجود سینے تک دھنس چکا تھا۔ میں برف کی آگ میں جل رہا تھا۔ کاش! کوئی مدد کو آ جائے۔ کاش....کاش! میری زندگی میں کاش کا لفظ کبھی نہیں آیا تھا۔ جو چاہا وہ پا لیا، جو نہیں ملا اسے چھین لیا، صفدر حیات جو ناقابل تسخیر تھا، آج بے جان لاشہ بن رہا تھا، برف کی ٹھنڈک نے اعصاب شل کر دیے تھے۔ انگلیاں سوج گئی تھیں اور حرکت کے قابل نہ تھیں۔ برف ہی برف، موت سے زیادہ برف سے خوف آ رہا تھا کیا میں مر رہا ہوں؟ کاش! کاش! میں یہاں نہ آتا۔ کاش! ایک دل خراش چیخ برف کے بے رحم پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آ گئی تھی۔ سلیمان کی لاش برف سے ڈھکنے والی تھی، اس کی کھلی آنکھوں سے مجھے خوف آ رہا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

وہ مر کر بھی اطمینان سے تھا اور میں زندہ ہو کر بھی اذیت میں ہوں۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے تو وہ اپنی موت کو محسوس کر کے اپنی پسندیدہ آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔ ''وہ کہیں گے، اے کاش!'' پر آ کر ہمیشہ کی طرح زار و قطار رونے لگتا تھا۔

کچھ عرصے قبل ایک دوست کے انتقال کے بعد وہ یہی آیت تلاوت کر کے رونے لگا تھا۔تب میں نے جھنجھلا کر بہت بے زاری سے کہا تھا، یار!! تم رونے کیوں لگتے ہو؟ مت پڑھا کرو اگر تم کو رونا ہی ہوتا ہے۔

تو کیا تم نے کبھی اس سورت کو نہیں پڑھا صفدر؟ اس نے نم آنکھوں سے مجھے دیکھا۔کیا....قرآن اور میں؟ شاید....دادی کی وفات پر پڑھا تھا۔یاد نہیں ٹھیک سے۔چل یار! گھر چل۔آج کا دن تو قبرستان میں گزر گیا۔صفدر حیات نے کندھے اچکائے تھے۔سلیمان کو اس سے اس بات کی امید ہرگز نہیں تھی۔دیکھ لو اس جگہ کو، تم آسمان کی بلندی کو چھو لو یا برف پوش پہاڑوں کو، واپس یہیں آنا ہے، قبرستان میں۔اس نے کہا۔ارے میرے باپ! دادا....! میں مر جاؤں تو برف ہی میں دفنا دینا۔صفدر حیات کی موت بھی معمولی نہیں ہوگی سمجھے! صفدر حیات نے شوخی سے کہا۔تمہاری سمجھ میں آئے گا، ضرور آئے گا۔سلیمان نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔اللہ کو بھولنے والوں کو جب اللہ یاد آتا ہے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔دعا کرو تمہیں دیر نہ ہو جائے۔تمہیں پتا ہے، یہ آیت مجھے کیوں رلاتی ہے؟ اس نے سورت فجر پڑھنا شروع کی پھر اس کا مطلب سمجھایا۔صفدر حیات نے لمحے بھر کو سوچا۔ اچھا ابھی تو چل، پھر کبھی غور کروں گا۔

آج ہزاروں فٹ کی بلندی پر صفدر حیات کو اپنی ہی کہی باتیں رلا رہی تھیں۔سلیمان! تم نے ٹھیک کہا تھا، 'اور انسان کہے گا، کاش! میں نے اپنی زندگی (جاودانی) کے لیے آگے کچھ بھیجا ہوتا۔تمہیں واقعی جب اللہ یاد آئے گا تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔' کاش!!! سلمان کی پُرنم آواز اسے رلا رہی تھی۔اے کاش! مجھے ایک موقع مل جائے، میں برف میں مرنا نہیں چاہتا۔میرے اللہ! مجھے معاف کر دے۔ کڑیل جوان صفدر حیات کے صرف ہونٹ ہلے تھے۔ برف متواتر گر رہی تھی اور اسے مکمل طور پر مفلوج کر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

بارش

بارش کی دیوانی چھوٹی سنبل آنگن میں اپنی ہتھیلیاں پھیلائے گرتی بوندوں کو جمع کر کے بہت خوش ہو رہی تھی۔ سات سال کی عمر میں اس نے بارشیں ہی کتنی دیکھی تھیں مگر ایسی رم جھم بھی اس کے لیے نعمت سے کم نہ تھی۔ وہ خوش ہو کر گول گول چکر کاٹتی تو کبھی چمپا کے پتّوں پر ٹھہری بارش کی بوندوں کو اپنے اوپر اُڑا کر خوش ہوتی۔

''چھوٹی آپی!'' سنبل نے آنگن میں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے ایمن کو آواز دی، جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے بہتے آنسوؤں کو کبھی روکتی، کبھی بہنے دیتی۔ بارش کے کچھ چھینٹے اس تک بھی پہنچ رہے تھے۔ ''چھوٹی آپی!'' سنبل کی آواز نے اس کی سوچوں کو توڑا تھا۔ اس نے کاٹ کھانے والی آواز میں کہا، ''کیا ہے؟'' ''آپ کو بارش کی دعا سناؤں؟ سنبل نے انتہائی سنبھل کے پوچھا ورنہ اس کی خوشی بھی سہم گئی تھی۔ ''نہیں.... مجھے نہیں سننا''۔ ایمن یہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ سنبل نے مایوسی سے چمپا کے گرے ہوئے پھول اٹھانے شروع کر دیے۔ کچن میں موجود پھپھو کے لیے یہ منظر بہت تکلیف دہ تھا مگر اس وقت انہیں سنبل سے زیادہ ایمن سے ہمدردی تھی۔ وہ پکوڑے بناتے بناتے رک گئیں اور اس کے کمرے میں آئیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا، ایمن تکیے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اسے لگا، امی پکوڑے لے کر اندر آئی ہیں۔ ''امی!'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ ''امی!'' انہوں نے لائٹ جلا دی۔

''اوہ.... پھپھو! آپ ہیں، لائٹ کیوں جلا دی؟ مجھے خوشبو سے ایسا لگا کہ امی آ گئیں''۔ ایمن نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ''میری جان! چلو اب اٹھ جاؤ پھر ہم پکوڑے کھاتے ہیں۔ جب تک میں سنبل کو بلاتی ہوں''۔ بابا جانی آ گئے۔ سنبل کی آواز خوشی سے بھرپور تھی۔ ''ارے میری گڑیا! یہ آپ سب کے لیے جلیبیاں''۔ سنبل کی خوشی ڈبل ہو گئی تھی۔ ایمن بھی کمرے سے باہر نکل آئی۔ ''ہٹیں پھپھو! میں بنا دیتی ہوں''۔ ایمن نے کہا۔ ''بس.... سب بن گئے، تم یہ میز پر رکھو، سب مل کر کھائیں گے''۔ بارش کی رِمجھِم ابھی تک جاری تھی۔ سب ایک ساتھ تو بیٹھے تھے مگر ایمن کی

اداسی اپنی جگہ تھی، اس کی پلیٹ بھی ویسے ہی رکھی ہوئی تھی۔

''بابا! میں نے آپ سے کہا تھا کہ چمپا کے اس پودے کو کاٹ دیں مگر آپ نے ابھی تک اسے نہیں کاٹا''۔ ایمن نے سرد لہجے سے کہا۔ چائے کی پیالی بابا جانی کے ہاتھ میں لڑکھڑا گئی۔ انہیں تو لگا تھا کہ ایمن اس بات کو بھول چکی ہوگی مگر اس کے زخم ابھی تک ہرے تھے۔

''نہیں بابا جانی! پلیز....! اسے مت کاٹیں، مجھے اس کے پھول بہت پسند ہیں''۔ مگر بابا جانی کچھ جواب دیے بغیر سنبل کا سر سہلاتے ہوئے کمرے کی طرف چل دیے۔ ''چھوٹی آپی! آپ نے دیکھا نہیں، اس کے پھولوں پر تو تتلیاں آتی ہیں، اسے مت کاٹیں''۔ سنبل جلیبیاں کھانا بھول کر چمپا کی فکر میں لگ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ چھوٹی آپی سچ مچ اس پودے کو ابھی کاٹ ڈالیں گی۔ ''تم تو چپ رہو، ہر بات میں بولتی ہو۔ زہر لگتا ہے وہ پودا مجھے۔ وہ پودا بھی اور تم بھی، جاؤ یہاں سے ورنہ تم کو مار دوں گی''۔ غصے سے ایمن نے کہا۔ ''پھپھو جان! آپ مجھے بڑی آپی کے پاس بھیج دیں۔ چھوٹی آپی تو ہر وقت ڈانٹتی ہیں''۔ سنبل بھاگ کر اندر چلی گئی۔ ایمن کی نفرت اتنی تناور بن گئی تھی، اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔

''ایمن! یہ تم کیا کہہ رہی ہو، کچھ اندازہ ہے؟ ایک معصوم بچی سے کیسے بات کر رہی ہو؟ بہن ہے وہ تمہاری''۔ ''کوئی معصوم نہیں ہے، قاتل ہے وہ''۔ ''ایمن!'' وہ ششدر رہ گئیں۔ اس نے برتن اٹھائے اور کچن میں پٹخ پٹخ کر دھونے لگی۔ تھوڑی دیر میں اسے اپنی غلطی کا احساس کچوکے مارنے لگا۔ بابا جانی نے چائے نہیں پی تھی۔ اس نے دوبارہ چائے بنائی اور ان کے کمرے میں آ گئی۔ بابا جانی چائے پی لیں۔ ایمن نے کپ ان کے سرہانے رکھا اور جانے لگی۔ ''ایمن! یہاں بیٹھو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے''۔ ایمن ان کے قریب بیٹھ گئی۔ ''چائے تو بہت اچھی بنائی ہے۔ اچھا.... اس خوشی میں تمہیں ایک انعام دیتا ہوں''۔ بابا جانی نے دراز سے ایک چھوٹا سا ڈبا نکالا اور ایک انگوٹھی اس کی طرف بڑھائی۔

''یہ! یہ تو امی کی ہے۔ مجھے نہیں چاہیے، آپ واپس رکھ لیں''۔ ''کیوں، کیوں نہیں چاہیے؟'' بابا جانی نے اس کی مٹھی میں وہ انگوٹھی رکھی۔ ایمن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ''مجھے ایسی نشانیوں سے امی کی یاد زیادہ آتی ہے، وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئیں اللہ کے پاس''۔ ایمن سسک پڑی تھی۔

''ایمن! آج تک کوئی اس دنیا میں اپنی مرضی سے آیا ہے نہ اپنی مرضی سے جائے گا۔ ہم اس زمین پر اللہ کی امانت ہیں۔ وہ اپنی امانت جب مرضی چاہے، واپس لے سکتا ہے۔ ہمیں تو صبر کرنا چاہیے، شکوہ نہیں''۔

''تم اپنی بہن سے بھی نفرت کرتی ہو، کیوں؟ صرف اس لیے کہ بارش میں سنبل کے ساتھ کھیلتے ہوئے تمہاری امی کا پیر پھسلا اور وہ گریں تو پھر اٹھ نہ سکیں۔ اپنے رب سے جا ملیں''۔ بابا جانی نے رک کر کہا۔ ''بہت دنوں سے میں یہ

بات محسوس کر رہا تھا کہ تمہارا رویہ اس معصوم کے ساتھ درست نہیں''۔

ایمن نے اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں۔ بابا جانی اس کی اضطرابی کیفیت کو سمجھ چکے تھے۔ ذہنی طور پر وہ کچھ سالوں سے جس ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، وہ جانتے تھے مگر آج جس طرح اس نے اپنی بہن کو اس حادثے پر موردِ الزام ٹھہرایا، وہ بھی حیران رہ گئے۔ لہٰذا، وہ چاہتے تھے کہ آج اس سے بات کر کے اس کی الجھن دُور کر دیں۔ ''تم اپنی بڑی بہن سے بھی فون پر بہت کم بات کرتی ہو''۔ بابا جانی رک کر بولے۔ وہ اتنی دُور سے تمہیں فون کرتی ہے اور تم منع کر دیتی ہو۔ کیوں بیٹا؟ اس کی شادی تو ہونا تھی''۔ انہوں نے پوچھا۔ ''وہ بھی تو اتنی دُور چلی گئیں، کینیڈا.... ایک مرتبہ ہی ملنے آئی ہیں''۔ ایمن نے روٹھے پن سے کہا۔ بابا جانی مسکرائے۔ ''اور چمپا کے درخت کو کیوں کاٹ دوں؟''

''اس لیے کہ وہ امی کو پسند تھا''۔ ایمن رو پڑی۔ ''مجھے ہر چیز سے امی کی یاد آتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے، سب چیزیں توڑ دوں''۔ ایمن رک رک کر بول رہی تھی۔ بات کرنے سے وہ اپنے غصے سے باہر آنے لگی تھی۔ ''اور سنبل کیوں بری لگنے لگی آپ کو؟'' بابا جانی نے پوچھا۔ ایمن خاموش تھی۔ ''اس لیے کہ وہ اپنی ماں کی موت کا سبب بن گئی؟'' بابا جانی نے سب سے اہم بات اس کے سامنے رکھ دی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ یہ سب کیوں ہوا، جب بارش ہوتی ہے، میرا ذہن اس واقعے کو یاد کر کے بے چین ہو جاتا ہے پھر مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا بابا جانی''۔ ایمن نے کہا۔

''میری بات غور سے سننا بیٹا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ 'اللہ کسی شخص پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا' (البقرہ) تو تم یہ بھول جاؤ کہ تم اس غم سے نکل نہیں سکتیں۔ دوسری بات یہ کہ کیا تمہیں اللہ پر بھروسا نہیں؟ سورہ فاطر میں اللہ فرماتا ہے، 'کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں'۔ یاد رکھو! دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہم عقل مندی نہیں اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا کہ امی کے جانے کے بعد جس طرح تمہاری پھپھو بیوہ ہو کر اس گھر میں آ گئیں اور اپنی اولاد کی کمی اور مامتا کی محبت سنبل اور تم پر نچھاور کرنے لگیں۔ یہ اللہ کا احسان نہیں ہے ہم پر؟ کسی کے دنیا سے چلے جانے سے کام رکتے نہیں بیٹا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جن پر ہماری جان قربان ہو، ان کی رحلت فرمانے پر صحابہ اجمعین رضی اللہ عنہم مسجد نبوی سے لپٹ کر روتے رہتے اور اسلام کا کلمہ سربلند نہ ہوتا''۔

''دینا کی مادّی چیزیں برتنے کے لیے ہوتی ہیں، انہیں نشانی بنا کر ان سے محبت یا نفرت نہیں کرتے۔ ہرے بھرے درختوں کو بلاضرورت نہیں کاٹتے۔ ہاں! پھر بھی ان چیزوں کو دیکھ کر یا محسوس کر کے تمہیں اپنی امی یاد آتی ہیں تو تم فوراً ان کی مغفرت کی دعا مانگ لیا کرو، سمجھ رہی ہو ناں ایمن!'' ''جی!'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اور سنبل کا خیال رکھا کرو۔ ویسے بھی مجھے پتا ہے، میری بیٹی بہت سمجھ دار اور محبت کرنے والی ہے''۔ ایمن کے ذہن کی گرہیں کھلنے لگی

تھیں۔دل کی گھٹن کم ہو رہی تھی، وہ وہاں سے باہر آ گئی۔سامنے چمپا کا پودا اداس لگ رہا تھا۔بابا جانی کی باتوں کو سوچ کر ایمن نے اپنا جائزہ لیا۔واقعی وہ پرانی باتوں اور یادوں کو دل میں جمع کرتے کرتے زندگی سے نفرت اور لوگوں سے شکوہ کرنے لگی تھی۔اب جب بھی اسے امی کی یاد آتی، وہ ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگ لیتی۔

کچھ دنوں کے بعد پھر بادل گھر کے آئے تھے۔مٹی کی سوندھی خوشبو آنگن میں پھیل گئی تھی۔ایمن کمرے سے باہر نکل آئی۔تیز بارش نے جل تھل ایک کر دیا مگر سنبل اداس بیٹھی تھی۔آنگن خالی تھا۔ایمن نے دیکھا، چمپا کے پھول بھی نیچے گرے ہوئے تھے۔اس نے کچھ سوچا پھر پھولوں کو جمع کر کے ان کا ہار بنایا۔

''سنبل!'' ایمن نے اشارے سے اسے بلایا۔''پھپھو! آ جائیں.... بارش تیز ہو رہی ہے''۔سنبل نے حیرت سے چھوٹی آپی کو دیکھا اور خوشی سے بھاگی۔ایمن نے پھولوں کا ہار سنبل کے گلے میں ڈال دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے گول گول گھومنے لگی۔بارش نے ایمن کے دل کو بھی دھو ڈالا تھا۔چمپا کا پودا بھی جھوم رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

مستعار

سکھ چین کے پیڑ میں لگے جھولے میں جھولے لیتی انوشہ نے ایک لمبی پینگ بھری تو دُور پلنگ پر بیٹھی دادی کے ہاتھ سے سروتا گر پڑا۔ جس سرعت سے وہ چھالیہ کتر رہی تھیں، اس کام میں خلل الگ پڑا تھا تو دل الگ دہل گیا تھا۔ یا الٰہی خیر رکھیو۔ انہوں نے ہاتھ کا چھجا بنا کر دوبارہ انوشہ کو دیکھا کہ وہ واپس زمین پر آئی ہے یا پیڑ ہی میں کہیں اٹک گئی۔

''انوشہ! لوٹھا کی لوٹھا ہوگئی ہے تو مگر جھولے لینا نہیں چھوڑے گی''۔ دادی گھبرا کر چلاّ ئیں۔ ''دادی! یہ تو بتائیں، اس پیڑ کا نام سکھ چین کیوں رکھا؟ یہ بھی کوئی نام ہے''۔ انوشہ نے جھولا نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تو مجھے پتا نہیں، سکھ چین سے کھڑا تھا اچھا بھلا، پر تم نے تو غدر مچا دیا اس درخت میں۔ اس کا نام ہڑبونگ پیڑ ہو جائے گا اب تو''۔ دادی بھی اپنے خیال میں کمال تھیں۔ انہوں نے عینک کے پیچھے سے اسے گھورا مگر انوشہ ہنوز اُڑان بھر رہی تھی۔ اس نے ویسے بھی دادی کی بات کب سننا تھی، ہنس کر ٹال دیا اور رفتار تیز کر دی تھی۔ دادی نے اپنی بڑبڑاہٹ میں جو کہنا تھا، کہتی ہوئی سروتا اٹھا کر دوبارہ چھالیہ کترنے لگیں۔

''دادی! یہ لیں آپ کی چھالیہ۔ پڑوس والا بچہ عبید گھر میں داخل ہوا۔ ''چھالیہ بہت مہنگی ہوگئی ہے، ثابت مت لیا کریں دادی، کٹی ہوئی منگوالیا کریں۔ خواہ مخواہ اتنی محنت سے کترتی ہیں''۔ عبید نے پڑیا انہیں تھماتے ہوئے ان سے ہمدردی کی۔

''آئے ہائے! اللہ جانے کیسی ہوتی ہے وہ موئی کتری ہوئی، سارا رس ہی چوسا ہوا ہوتا ہے ان کا تو، اے نری کھجور کی گٹھلیاں ہوتی ہیں وہ تو، چھالیہ کب ہوتی ہوں گی''۔ انوشہ جب تک جھولے سے نیچے اتر چکی تھی۔ پلنگ کے پاس آ کر اس نے دادی کے پاندان سے تھوڑی سی چھالیہ اچک لیں۔

''انوشہ باجی! ابیا نے کہا ہے، ایک انڈا ہو تو دے دیں''۔ عبید نے بھی نظر بچا کر دادی کی کتری چھالیہ کو مٹھی میں

بھرنا چاہا مگر جب دادی نے ہوں....کرتے ہوئے اسے گھورا تو اس نے مٹھی کھول دی۔

''اچھا دیتی ہوں ابھی۔ انوشہ نے کہا''۔ کیوں.... کیا کرنا ہے تیری بہن کو ایک انڈے کا؟'' دادی حسب عادت بول پڑیں۔ انہیں پڑوسیوں کی یہ عادت پسند نہیں تھی، جب دیکھو کچھ نہ کچھ مانگتے پھرتے ہیں۔

وہ....شاید بالوں میں لگائیں گی۔ دہی اور سرسوں کا تیل مکس کر کے بیٹھی ہیں۔ منہ پر بھی کچھ لگایا ہوا ہے۔ اشارے سے سمجھایا کہ انڈا چاہیے، پہلے تو میں سمجھا ہی نہیں کہ گول گول کیا اشارہ کر رہی ہیں؟ پھر جب سندھی کی کاپی میں میرا ٹیسٹ دکھایا جس میں صفر نمبر تھے یعنی مجھے انڈا ملا تھا، تب جا کر میں سمجھا کہ انڈا چاہیے''۔ عبید نے ایسا نقشہ کھینچا کہ انوشہ تو انوشہ، امی کی بھی ہنسی پھوٹ پڑی۔

''چل ہٹ، مسخرا کہیں کا''۔ بمشکل بول کر دادی پہلو بدل کر رہ گئیں۔ ہنستیں بھی تو ہنستیں کیسے؟ پان کی گلوری منہ کے اندر تھی۔ اگال دان میں پیک بھری اور گویا ہوئیں۔ ''ائی، اپنی اماں اور بہنا سے کہنا، پرچون کی دکان نہیں کھولی ہم نے، ایک انڈا دے دیں۔ ارے....ایک انڈے میں تو پیاز، ہرا دھنیا، ہری مرچ کاٹ کر تو آملیٹ بن جاؤے ہے، چار بندے آرام سے کھالیویں پراٹھے سے اور وہ حسینہ بالوں میں لگا کر ضائع کر دیں، ہونہہ''۔ دادی نے عبید کو مفت میں ترکیب بتادی تھی۔ وہ بھی سر ہلا ہلا کر سننے لگا۔

''یہ لو عبید! انوشہ نے دو انڈے پیالے میں دیتے ہوئے کہا، ایک تم کھالینا آملیٹ بنوا کر، امی نے کہا ہے''۔ عبید خوشی خوشی پیالا تھام کر چلتا بنا۔ ''اے یہ خوب ہے تم ماں بیٹی کا، اس نے ایک مانگا، تم نے اٹھا کر دو دے دیے۔ ہم نے کون سا خزانہ جمع کیا ہے جو لٹاتے پھریں؟ آئے دن کا تماشا....کبھی ماچس، کبھی چینی، تو کبھی پتی۔ ائے میں تو کہتی ہوں، یہیں آ کر چائے کیوں نہیں پی لیتے وہ لوگ؟ پانی اور گیس بھی کیوں خرچ کرتے ہیں؟'' دادی کب کا غبار آج نکال بیٹھی تھیں اور امی، جو ساگ بنانے ان کے پاس آ کر بیٹھی تھیں، دادی نے توپوں کا رخ ان کی جانب کر دیا، وہ ان کی زد میں آ گئیں جب کہ انوشہ اندر بھاگ گئی۔

''کوئی بات نہیں اماں! وہ بھی تو ہمارے کتنے کام آتے ہیں اور عبید بچہ تو بھاگ بھاگ کر چیزیں لا دیتا ہے۔ روزانہ پڑوسیوں کو کچھ دینے دلانے سے کم تھوڑی پڑے گا''۔ امی نے رسانیت سے جواب دیا۔ کیوں کہ جب سے امی نے سورۃ الماعون کا ترجمہ اور تفسیر پڑھی تھی وہ بہت احتیاط کرنے لگی تھیں۔ کسی بھی چیز کے منع کرنے سے انہیں آخری آیت کی تفسیر یاد آئی کہ 'اور معمولی برتنے کی چیزیں (بھی مانگنے پر) نہیں دیتے'۔ 'معن' قلیل چیز کو کہتے ہیں جو معمولی قسم کی ہو، اس سے گھروں میں برتنے والی چھوٹی موٹی چیزیں مراد لی گئی ہیں۔ جیسے برتن، ہنڈیا، کلہاڑی، قینچی، نیل کٹر، ماچس، نمک، پیاز، ٹماٹر، ہری مرچ، ہرا دھنیا وغیرہ وغیرہ۔ جو زیادہ قیمتی بھی نہیں ہوتیں اور کئی مرتبہ پڑوسی ایک دوسرے سے عاریتاً مانگ لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ مال کی ہوس اور آخرت سے انکار نے ان لوگوں کے دلوں میں اتنا

بخل پیدا کر دیا ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کے حق ادا کرنا تو دور، وہ معمولی معمولی برتنے کی چیزیں عاریتاً مانگنے پر بھی دینے سے انکار ہی کرتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گھریلو استعمال کی چیزیں ادھار دے دینا اور اس میں دل کی تنگی نہ محسوس کرنا، اچھی صفت ہے جب کہ اس کے برعکس بخل اور کنجوسی اختیار کرنا قیامت کو نہ ماننے والوں کا شیوہ ہے۔ باقی رہی ان لوگوں کی بات، جو مانگ کر چیز لیتے ہیں اور پھر واپس ہی نہیں کرتے یا اس چیز کا نقصان کر دیتے ہیں، تو ایسی صورت میں ان کو یہ فرمان نبی کریم ﷺ یاد رکھنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ''مانگی ہوئی چیز واپس کرنا، ضامن کو تاوان بھرنا اور قرض کی ادائیگی لازم ہے''۔ (ترمذی) آپ ﷺ نے فرمایا، ''جس ہاتھ نے جو کچھ لیا ہو، اسی پر اس کا ادا کرنا واجب ہے''۔ (نقد رقم ہو یا کوئی اور چیز) (ابوداؤد)

امی کو یہ حدیث بھی یاد رہنے لگی تھی، اس لیے وہ اس بات کا خاص خیال رکھنے لگی تھیں کیوں کہ وہ جانتی تھیں، معمولی برتنے کی چیزیں استعمال کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ سینت سینت کر رکھنے اور چھپانے کے لیے نہیں۔ جھوٹ بول کر، منع کر کے انہیں کس عذاب سے ڈرایا گیا تھا، وہ جان چکی تھیں۔ مگر دادی کو سمجھانا تھوڑا مشکل تھا جب کہ ان کے اپنے پلنگ پر رکھی کئی چیزیں پڑوس سے مستعار لی گئی تھیں۔ عبید کی نانی کا سروتا، آج کا اخبار، اون کا گولا اور چھالیہ، جو عبید لایا تھا۔

''اچھا اماں! سروتے کا کام ہو گیا ہو تو انہیں واپس کر دیجیے گا اور اخبار پڑھ لیں تو انوشہ کے ہاتھ بھجوا دیں، بھائی صاحب شام کو پڑھتے ہیں''۔ امی یہ کہہ کر کچن کی جانب چل پڑیں۔

دادی جان بھی کسی حد تک سمجھ گئی تھیں مگر ماننے کو تیار نہ تھیں۔ ''ائے ہاں! دے دوں گی واپس، کھا تھوڑی جاؤں گی ان کی چیزیں۔ ہائے.... چونا تو بڑا تیز ہے، زبان جل گئی''۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے چشمہ ناک پر ٹکایا، تھوڑا سا منہ بنا کر اخبار دیکھنے لگیں۔ دُور سکھ چین کا پیڑ یہ منظر دیکھ کر مسکرا اٹھا تھا۔

☆.....☆.....☆

جہاد بالقلم

کمرے کی ایک جانب کھڑکی کے ساتھ میز جڑی تھی جس پر کتابوں، دستوں اور اوراق کا ڈھیر لگا تھا۔ ہوا تیز چلتی تو کچھ کاغذ پھڑ پھڑاتے پھر ساکت ہو جاتے۔ قلم، سیاہی اور کچی پینسلوں کا بھی ڈھیر لگا تھا۔ کمرے کی حالت اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ یہ کسی لکھاری کا کمرہ ہے۔ آپ مجھے صحافی بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نقاد بھی تھا، شاعر بھی اور مصنّف بھی لیکن میں اب گم نام تھا یا ہونا چاہتا تھا۔ میری آنکھ رات کے کسی پہر کھلی، کسی نے بہت نوکیلی چیز مجھے چبھوئی تھی۔ میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں، ادھر ادھر دیکھا اور جب یہ اطمینان کر لیا کہ وہاں کچھ نہیں تو کروٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کی کیوں کہ پچھلی دو راتوں سے نیند مجھ سے دُور تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔

دراصل میرے دل و دماغ نے مجھے کچھ لکھنے پر زور ڈالنا شروع کیا تھا کیوں کہ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ لکھنا ضروری تھا۔ (مگر میں اس بار لکھنا چھوڑنے کا ارادہ کر چکا تھا) ویسے بھی اب مجھے پڑھنے والے کون تھے؟ کتابیں بے مول ہو گئی تھیں، لکھاری بے وقعت تھے اور قلم کی طاقت کم زور ہو گئی تھی۔ کاغذ، قلم اور کتاب سے دوستی کرنے والے لوگ جدت پسندی کی دوڑ میں لگ گئے تھے۔ دنیا انگلیوں کی پوروں میں سمٹ آئی تھی۔ ٹیکنالوجی کے دور میں سب سے زیادہ لات میرے رزق پر پڑی تھی۔ میں جو ایک نام ور قلم کار تھا، اب اس شعبے سے عرصہ ہوا کنارہ کشی اختیار کر چکا تھا۔ کئی مضامین ادھورے تھے، کتنی کہانیاں منظرِ عام پر آنے کے لیے بے چین تھیں۔ کئی تلخ حقائق تھے، جو اگر چَھپ جاتے تو بہت سے مکروہ چہرے لوگوں کے سامنے آ جاتے مگر رفتہ رفتہ میرے جذبے سرد پڑ چکے تھے۔ اب میں ایک عام انسان بن کر جینا چاہتا تھا۔ جذبات سے عاری بے حس انسان بننا چاہتا تھا، عام تماشائی بن کر موج مستی کرنا چاہتا تھا۔

یوں میں دوبارہ نیند آنے کی کوشش میں لگا رہا اور کامیاب بھی ہو گیا مگر ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پھر چبھن کا

احساس ہوا۔اس مرتبہ اور زیادہ نوکیلی چبھن تھی۔ میں تلملا کر چیخ پڑا۔ ''کون ہے؟'' میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا۔

''میں ہوں تمہارا قلم''۔ لیمپ کے قریب رکھے قلم نے سر اٹھایا۔ ''اوہ! تو تم ہو۔مگر نوک کیوں چبھو رہے تھے؟ صبح بات کر لیتے، ابھی تو سونے دو''۔ میں نے بے زاری سے کہا۔ ''ایک مردِ مومن ہو کر تم سو کیسے سکتے ہو؟'' قلم حیرت سے بولا۔ ''کیا مطلب! میں کیوں نہیں سو سکتا؟ پوری قوم سو رہی ہے، میرے سونے سے تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''دکھ تو اسی بات کا ہے کہ ایک حسّاس دل لے کر بھی تم سو رہے ہو۔قلم کی طاقت ہوتے ہوئے بھی تم نے اس کا استعمال چھوڑ دیا؟ یہ صلاحیت تو عطیۂ خداوندی ہے، تمہیں اس کا حق ادا کرنا ہے''۔ قلم نے پھر میرے جذبات کو جھنجھوڑا۔ (اب قلم میرے سینے پر چڑھ آیا) اپنے قلم کی اس جسارت پر مجھے شدید غصہ آیا مگر چوں کہ یہ قلم مجھے میرے استاد نے دیا تھا، اس لیے اسے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر سوچا پھر کہا، ''تم کچھ بھی کہو مگر اب میں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ میرے لکھنے سے کوئی انقلاب نہیں آ سکتا، نہ ہی میرے لفظوں کی کاٹ سوئے ہوؤں کے ضمیر جگا سکتی ہے۔ بہتر ہوگا تم بھی سو جاؤ''۔

میں نے اسے سینے سے اتار کر واپس سرہانے رکھ دیا مگر اس نے اس مرتبہ میرے سینے کو نشانہ بنایا اور اپنی نوک گھسا دی۔ میں نے غصے سے اسے دیکھا، کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے میز کی جانب دیکھا اور چھلانگ لگا کر وہاں پہنچ گیا جہاں میرے اثاثے، میری تحریریں، مسودے، کتابیں، سب اداس پڑی تھیں۔ اچانک ان سب پر قلم نے اپنی روشنائی چھڑکنا شروع کر دی۔ ''ارے! ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ مت کرو، رکو....رک جاؤ''۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اسے روکنا چاہا۔ ''میری عمر بھر کی محنت، ریاضت، میرے خواب ہیں یہ سب، اسے خراب مت کرو''۔ میں نے التجا کی۔

''کیوں! اب کیوں تمہیں دکھ ہو رہا ہے؟'' قلم وہیں سے چلّایا۔ ''جب تم نے ان تمام کاموں سے ہاتھ اٹھا لیا تو ان ردّی کاغذوں کا کیا کرنا ہے؟ ایسے بھی تو پڑے ہیں سالوں سے، دھول مٹی میں اٹ گئے ہیں، دوات سوکھ گئی، قلم خشک ہو گئے، الفاظ مٹ گئے۔ جب تک تم تعریف کے گل دستے سمیٹ رہے تھے، سب بہت اچھا لگتا تھا۔ جب تک تمہیں تقاریب میں بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا جاتا تھا، تم خوش ہوتے اور مجھے بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ میری طاقت کو، قلم کی طاقت کو، جہاد سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور آج، جب زمانہ اپنی چال بدل رہا ہے تو تم نے ہار مان لی۔ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے بجائے پیچھے ہٹ گئے۔ تم تو ہمیشہ حق کی آواز بنتے تھے اور آج تم نے لکھنا چھوڑ دیا۔ کیا تم اس طرح اپنے فرض سے بری الذمہ ہو جاؤ گے؟ تم کوئی فحش گو افسانہ نگار تو نہیں تھے یا پیسوں کی خاطر سب اچھا ہے، لکھنے والے

بھی نہیں تھے۔تم تو ایک ایسے مرد مجاہد ہو جو اپنی تحریروں سے ہر محاظ پر جہاد کرتا ہے۔اپنے لفظوں کی کاٹ سے جوش جگاتا ہے،لہو گرماتا ہے''۔

قلم بولتے بولتے روہانسا ہو گیا۔''اور تم کہتے ہو کہ تم عام انسان بن کر جینا چاہتے ہو،ضمیر کو سلا کر چین سے جینا چاہتے ہو؟ جہاد بالقلم نہیں کرنا چاہتے؟'' میرا سر ندامت سے جھک گیا۔میں ساکت تھا، جامد تھا۔سارے لفظ مجھ سے ناراض، ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ میں کیا کہوں؟ سچ تو یہ تھا کہ قلم نے حرف بہ حرف درست کہا تھا۔ ''ٹھیک ہے،تم خاموش رہو، عالم اسلام کی طرح۔ چاپلوس ایوانوں کی طرح، گونگے بہرے حکمرانوں کی طرح، اندھی رعایا بن کر جیتے رہو مگر یاد رکھو! یوم حساب تمہیں اپنی صلاحتیوں کے استعمال کا جواب دینا ہوگا۔میں وہاں تمہارا گریبان پکڑوں گا''۔قلم بولا۔

''ہم بھی''۔کاغذوں، کتابوں نے بھی صدا بلند کی۔''اب میں بھی جینا نہیں چاہتا''۔قلم یہ کہہ کر زمین کی طرف لڑھک گیا۔''نہیں....رکو!'' میں بستر سے بمشکل اٹھا اور اپنے مفلوج نچلے دھڑ کو نیچے اتارتے اتارتے گر گیا پھر بھی اپنا بے جان وجود گھسیٹتے گھسیٹتے قلم تک پہنچا اور اسے اٹھا کر چوم لیا۔میں جسمانی طور پر ضرور معذور تھا مگر ذہنی طور پر بیدار تھا۔ سرحدوں پر نگہبان نہیں بن سکتا تو کیا ہوا؟ قلم کے ذریعے تو لڑ سکتا تھا۔لہٰذا، میں نے قلم کو پھر مضبوطی سے پکڑ لیا۔میں مردِ مجاہد ہوں، مجھے جہاد بالقلم کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

روشن رات

رات دھیرے دھیرے اپنی چادر پھیلا رہی تھی۔ کالی سیاہ چادر، جس میں سب کچھ چھپ رہا تھا، سب کچھ۔ یہاں تک کہ اس کے گناہ بھی۔ وہ کس گناہ کو یاد کرتی، کسے بھولتی۔ کس گناہ کی معافی پہلے مانگتی، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ گناہ کوئی ایک تھا؟ گناہوں کا تو انبار تھا، تعفن تھا، ڈھیر تھا۔

''حولہ! آ جاؤ، کنسرٹ شروع ہونے والا ہے''۔ زوہا نے آواز لگانی شروع کر دی۔ ''جسٹ کمنگ، تم انجوائے کرو، میں آتی ہوں''۔ لپ اسٹک کا ایک کوٹ اور گہرا کرتی حولہ نے اپنے خوب صورت ہونٹوں کو مزید نمایاں کیا۔ جدید تراش خراش کے لباس نے اس کے حسین سراپے کو گویا ہائی لائٹ کر دیا تھا۔ ہائی ہیل پہن کر ٹھک ٹھک کرتی لاؤنج میں آ گئی جہاں زوہا، ٹی وی پر ایک مشہور سنگر کے گانے کی پرفارمینس دیکھ رہی تھی۔

ایک ہاتھ سے ٹی وی کے ریموٹ کو ہلا ہلا کر گلوکار کو داد دینے والی زوہا نے جب حولہ کو دیکھا تو سب بھول گئی۔

''تم کہاں جا رہی ہو حولہ اور اتنی ڈارک لپ اسٹک؟ امی نے دیکھ لیا تو شامت ہے تمہاری''۔ زوہا نے گھسا پٹا ڈراوا دیا۔ جب کہ اسے پتا تھا کہ یہ میں تھی، ''حولہ فاروق'' جو دل چاہتا، وہ کرتی، جس کو کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ چاہے ابو کی عزت پہ حرف آئے یا گھر میں طوفان کھڑا ہو، میری مرضی سب سے مقدم تھی کیوں کہ میں بچپن سے بہت لاڈلی تھی۔ ضدی، اکھڑ، مزاج میں تیز، منہ پھٹ الگ۔ مگر میری خوب صورتی کے آگے سب دب جاتے تھے۔

یوں حولہ تعریفوں کے جملے سن سن کر بڑی ہوتی گئی۔ سب کے الگ الگ جملے تھے، جو اس کی سماعتوں سے گزرتے تھے۔ کوئی کہتا، ''حولہ تو باربی ڈول ہے، حولہ پڑھائی میں سب سے آگے ہے، حولہ پر ہر رنگ جچتا ہے''۔ یوں حولہ نے اپنا دماغ ساتوں آسمان پر رکھ لیا۔ معمولی شکل وصورت اور کم عقل بھائی بہن کسی گنتی میں نہیں آتے تھے۔ بچپنا جیسے ہی لڑکپن میں کودا، بلا کا غرور حولہ کے مزاج میں سما گیا۔

حولہ نے جوانی میں قدم کیا رکھا، شرم وحیا کی چادر ایک کونے میں ڈال دی۔ آزادی کا ناجائز استعمال ایسے کرنا شروع کیا کہ سب نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی مگر حولہ تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ رات گہری کالی ہو کر بھی پتا نہیں کیوں اس جگہ مکمل طور پر روشن تھی، جگمگا رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ اسے اس جگہ کوئی نہ دیکھے، بس جس کو حال دل سنانے آئی ہے، اس کی ایک بار نظر کرم ہو جائے ورنہ اسے ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس جگہ کیسے آسکتی ہے؟ ایسی جگہ جہاں کوئی اپنی مرضی سے نہیں آتا۔ حولہ نے گھر سے قدم کیا نکالا، خواہشوں کے جنگل میں گویا پنچھی بن کر اُڑنے لگی۔ جہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ مگر اسے اس کی پروا کب تھی۔ ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے سب کا دل دکھایا۔ ماں ہاتھ پہ ہاتھ مَل کر سوچتی رہ جاتی، لاڈ پیار کا غلط استعمال کیوں کر کیا حولہ نے۔ تایا کے گھر سے پہلا رشتہ کیا آیا، حولہ نے گھر میں طوفان کھڑا کر دیا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی رشتہ کیوں لے کر آیا۔ معمولی شکل والے محبّ کو اس نے فوراً انکار کر دیا۔ ''میں اس داڑھی والے سے شادی نہیں کروں گی۔ اس کو کیا لگتا ہے، میرے قابل ہے جو آ گیا منہ اٹھا کر''۔ محبّ کو حولہ کی اونچی آواز کمرے تک بآسانی سنائی دی۔ اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور فخر سے مسکرا دیا۔ ''یہ تو سنّت ہے، نبی ﷺ سے نسبت ہے''۔ اور چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔

آج سب کو ڈگری ملنے والی تھی۔ وہ آئی آر کے میدان میں سب سے آگے نکلنے کے لیے اپنی ڈگری لینے آئی تھی۔ جب اس نے شہر کے ایک رئیس باپ کے اکلوتے بیٹے فواد حسن کا دوستی کے لیے بڑھتا ہاتھ ایک بار پھر پوری کلاس کے سامنے بڑی نخوت سے جھٹک دیا۔ ایسا فواد حسن نے کب دیکھا تھا؟ بدلے میں اس نے پارکنگ سے نکلتی گاڑی پر حولہ کو تحفے کے طور پر تیزاب کے چھینٹے دیے، جس نے اس کے حَسین چہرے کو جھلسا دیا تھا، جہاں اس کی چیخ وپکار سن کر سب پیچھے ہٹے تھے، وہاں ایم بی اے ڈیپارٹمنٹ سے مدد کے لیے محبّ ہی آگے بڑھا تھا۔ خوب صورت حولہ کا ایک رخ داغ دار ہو گیا تھا، اتنا کہ جب اس نے ہسپتال سے آ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو آئینہ توڑ ڈالا اور پھر کبھی آئینہ نہیں دیکھا۔ رات کی تنہائی میں تنہا ہو کر بھی وہاں کوئی تنہا نہیں تھا۔ عجیب گہما گہمی تھی، سب مصروف تھے۔ سب کو ضروری کام تھا مگر وہ چاہتی تھی کہ سب سے پہلے وہ آگے بڑھ جائے اور اس کالی چادر میں چھپ جائے، اس دیوار پر لگ جائے اور خود کو مل مل کر صاف کر ڈالے۔

کئی مہینے گزرے، حولہ کا چہرہ تو بگڑ کر ٹھیک ہو گیا مگر اس کا دل بدل گیا کیوں کہ اس حادثے کے بعد اس نے اپنا کریہہ چہرہ ہی نہیں بلکہ اپنا مکروہ دل بھی دیکھ لیا تھا۔ اوپر کمرے سے آتی محبّ کی تلاوت کی آواز ہر روز اسے بدل رہی تھی۔ وہ رات کو معافی مانگتی، صبح کا انتظار کرتی اور جب آیت، آیت اس کے دل پر اترنے لگی تب اس کا دل تڑپنے لگا، بدلنے لگا۔

ایک شام تایا جان نے اسے محبت سے محبّ کے لیے پھر مانگ لیا اور حولہ چند دنوں بعد حولہ محبّ بن گئی۔ داغ

دار حولہ ایک وجیہہ چہرے والے محبّ کے ساتھ بچتی نہیں تھی مگر محبّ نے اسے یوں تھاما کہ وہ سچ مچ موم کی گڑیا ہو۔ محبّ نے نکاح کی محبت کا وہ ثمر دکھایا، جو پہلے حولہ نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ محبت دل سے تھی، جو اللہ نے ڈالی تھی، صرف چہرے کی محبت نہیں تھی۔ محبّ اللہ کے لیے اس سے محبت کرتا تھا۔

وہ اس دیوار کے بالکل قریب تھی، اتنی قریب کہ اسے ہاتھ لگا کر چھو رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچی؟ وہ خود نہیں آئی تھی۔ اسے لگا کہ کسی نے دھکا دے کر یہاں تک پہنچا دیا۔ وہ ورطۂ حیرت میں تھی، شرمسار تھی، گناہ گار تھی۔ وہ پہلے سسکی پھر رونے لگی، پھر اس کی آنکھیں زار و قطار برسنے لگیں۔ مگر یہاں سب آئے ہی اسی لیے تھے، اپنے ہی اشکوں سے دھلنے آئے تھے۔ یہاں سب ہی رو رہے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھی اس دیوار میں لگ جائے اور مَل مَل کر اپنے گناہوں کو صاف کر لے، دھو لے۔ بیت اللہ کا جلال اس پر ہیبت طاری کر رہا تھا۔ اللہ کی کبریائی کے آگے سب جھکے تھے، وہ بھی جھک گئی۔ ماضی آہستہ آہستہ دھندلا ہو کر اس سے دور جا رہا تھا، منظر شفاف ہو گیا تھا۔

حولہ نے حرم کے ٹھنڈے فرش پر، پُرسکون نماز ادا کی۔ اس کے سامنے خانۂ کعبہ اپنی پوری حرمت کے ساتھ موجود تھا۔ اندھیرے میں ڈوبی کائنات اور وہ، ایک تھے مگر ان کا رب روشن دلیل تھا۔ اس کے نور نے حولہ کے دل کو بھی روشن کر دیا تھا۔ حولہ نے سر سجدے میں رکھ دیا۔ کتنی ہی دیر سجدے میں گزری تھی کہ اس نے اپنے برابر میں محبّ کو بیٹھے دیکھا۔ وہ بھی دعا مانگ رہا تھا۔ آنسو اس کے چہرے کو بھگو کر داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ حولہ نے اس وجیہہ چہرے کے آنسوؤں کو دیکھا، جو اسے موتی سے کم نہ لگے۔ اس نے جلدی سے ایک موتی اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا۔ محبّ کی تلاوت کی آواز متواتر آ رہی تھی۔ حولہ نے ایک بار ایسے ہم سفر کے ملنے کا سجدۂ شُکر ادا کیا۔ رات رفتہ رفتہ گزر رہی تھی، اندھیرا چھٹ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

طیبہ شیریں

طیبہ شیریں کا تعلق راولپنڈی سے ہے۔تعلیم بی ایڈ ہے۔رواں سال لکھنا آغاز کیا۔رائٹرز کلب سے ایک برس سے منسلک ہیں،قومی اخبارات میں کئی کہانیاں،کالم اور مضامین چھپوا چکی ہیں۔

فہرست تحریر:

1- محنت سے ہی کامیابی ملتی ہے

2- تعلیم کا درجہ و مقام

3- عورت کا مرتبہ

4- بیٹی....اللہ کی رحمت

5- فیس بک

☆.....☆.....☆

محنت سے ہی کامیابی ملتی ہے

''دیکھو بیٹا! محنت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں، اگر تم محنت کرو گے تو دنیا کی ہر چیز تمہارے لیے ہوگی''۔احمد کی امی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔''محنت سے جی چُرانے والا کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کے دل کو سکون ملتا ہے۔تم جو چیز محنت سے حاصل کرو گے، اس کی قدر کا اندازہ بھی تمہیں اچھی طرح ہوگا''۔انہوں نے اب احمد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔مگر احمد وہیں کا وہیں بیٹھا گیم کھیلتا رہا۔اس پر امی کی باتوں کا گویا کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

احمد اپنے ماں باپ کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔سب کی آنکھوں کا تارا، سبھی گھر والے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔وہ جو بھی بات کہتا، اس کے گھر والے اسے لازمی پورا کرتے تھے۔وہ اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے تھے۔یوں تو احمد بہت ہی پیارا بچہ تھا مگر کاہلی اس کی عادت کا حصہ بن چکی تھی۔وہ محنت سے جی چراتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ وہ ہر چیز اسے بغیر محنت کے مل جائے، ذہین ہونے کے باوجود پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ جماعت میں ہمیشہ اوّل پوزیشن حاصل کرے۔لیکن ایسا کیسے ہوسکتا تھا؟ کیوں کہ وہ محنت تو کرتا ہی نہیں تھا۔

ایک دن اسکول سے واپسی پر احمد کے کچھ دوستوں نے کہا کہ آج ہمارے ساتھ کھیلنے چلو۔مگر احمد نے اپنی کاہلی وجہ سے منع کر دیا۔ارشد نے اس سے کہا بھی کہ''استاد جی نے کہا تھا، ہمیں اپنے دماغ کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی فٹنس کا بھی خیال رکھنا چاہیے، ویڈیو گیمز سے دماغ بوجھل ہوتا ہے''۔مگر احمد نے صاف انکار کر دیا اور دوستوں کو خیر باد کہہ کر گھر کی طرف چل دیا۔

امتحانات میں کچھ روز باقی تھے۔سب بچے خوب محنت کر رہے تھے۔مگر احمد کا دل چوں کہ پڑھائی سے مکمل طور پر اچاٹ ہو گیا تھا لہٰذا، وہ بوجھل دماغ کے ساتھ کتابیں تکتا رہتا تھا۔اس کا دوست ارشد جب اسے اپنے ساتھ پڑھنے کو کہتا تو کندھے اچکا کر جواب دیتا کہ مجھے نہیں پڑھنا، میں تو ایک دن پہلے ہی سب فٹافٹ یاد کر لوں گا۔ارشد نے اس

سمجھایا بھی کہ ایسے نہیں امتحان دینا ہوتا، اس کے لیے کچھ حاصل بھی ہونا چاہیے مگر احمد اسے اس کا جیلس پن سمجھتے ہوئے مزید انکار کر دیتا۔

بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا جب اگلے روز سے امتحانات شروع ہونے تھے۔ احمد نے تیاری کی بہت کوشش کی مگر اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا یاد کرے اور کیا نہیں۔ اسی پریشانی میں وہ پوری رات کچھ بھی نہ پڑھ سکا اور نہ ہی ٹھیک سے سو سکا۔ اسی کیفیت میں احمد نے پیپرز تو دے دیے مگر اسے معلوم تھا کہ وہ فیل ہو جائے گا اور وہی ہوا، یعنی جب رزلٹ آیا تو وہ بری طرح فیل تھا۔ اس پر گھر میں بھی اسے خوب ڈانٹ پڑی۔

اس دن سے وہ چپ چپ رہنے لگا۔ ایک دن دادا نے اسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا، ''کیا بات ہے بیٹا! آج کل بہت چپ رہنے لگے ہو؟'' احمد، جو اتنے دن سے دل ہی دل میں اداس تھا، رو پڑا۔ ''کیا کروں دادا جان! میں نے بہت پڑھا تھا پر مجھے نہ یاد ہوا اور نہ میں پیپر میں کچھ لکھ پایا''۔ اس پر دادا جان نے کہا، ''ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم نے یاد کیا اور وہ یاد نہیں ہوا، تمہارا طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ کیا تم نے کچھوے اور خرگوش کی کہانی پڑھی یا سنی ہے؟ خرگوش کو لگتا تھا کہ وہ کچھوے سے جیت جائے گا کیوں کہ کچھوا تو اس کے مقابلے میں بہت آہستہ چلتا ہے، جب کہ وہ تو قلانچیں بھر کے چشم زدن میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ مگر وہ ہار گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سست اور کاہل تھا۔ جب کہ اس کے مقابلے میں کچھوا اگرچہ کم زور تھا، اس کی چال دھیمی تھی مگر وہ محنتی تھا۔ وہ نہ رکا اور نہ آرام کیا بلکہ اپنے ہدف کی جانب بس چلتا رہا''۔

دادا جان کی بات سن کر احمد کو اپنے وہ الفاظ یاد آ گئے، جو اس نے اپنے دوستوں سے کہے تھے۔ 'میں ایک رات ہی میں سب یاد کر لوں گا' اور وہ ایسا نہیں کر پایا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ سستی سے انسان ہمیشہ ہارتا ہی ہے۔ اس نے دادا جان سے وعدہ کیا اب وہ کبھی سستی اور کاہلی نہیں دکھائے گا۔ اگلے ہی روز سے احمد نے اپنی کلاس میں پڑھائی کا آغاز کر دیا۔ اس بار احمد کلاس کا بہترین طالب علم تھا۔ سال کے اختتام پر احمد نے نہ صرف پہلی پوزیشن حاصل کی بلکہ کم چھٹیاں کرنے پر اسٹوڈنٹ آف دی ایئر کا ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

☆.....☆.....☆

تعلیم کا درجہ و مقام

تعلیم ہر انسان کی، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ یہ انسان کا بنیادی حق ہے، جو کوئی اس سے نہیں چھین سکتا۔ دیکھا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق تعلیم ہی کی بدولت ہے۔ تعلیم کسی بھی قوم یا معاشرے کے لیے ترقی کی ضامن ہے۔ تعلیم قوموں کی ترقی اور زوال کا سبب بنتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز بانٹنے سے گھٹتی ہے مگر تعلیم ایسی دولت ہے، جو بانٹنے سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھ جاتی ہے۔

انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ تعلیم ہی کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنا ہر مذہب میں جائز ہے۔ اسلام میں تعلیم حاصل کرنا فرض کیا گیا ہے۔ خالق کائنات کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ انسان کی پہلی درس گاہ اس کا گھر ہی ہوتا ہے جہاں اس کی پرورش کی جاتی ہے۔ بچہ ماں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس میں عزت نفس اور غیرت کی وہ تمام خوبیاں موجود ہوتی ہیں، جو خود اس کی ماں میں موجود تھیں۔ انسان میں موجود جہالت صرف تعلیم سے نہیں بلکہ پرورش سے بھی ختم ہوتی ہے۔

دین اسلام میں تعلیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اسلام سراپا علم و عرفان کے حصول کا درس دیتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں بھی علم اور ذرائع علم کی اہمیت کے بارے میں واضح فرامین موجود ہیں۔ سورۃ العلق کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا پہلا اور سب سے اہم مقصد خدا کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اس کے بغیر علم اپنے حقیقی جوہر سے خالی ہے۔ تخلیق آدم علیہ السّلام کے وقت اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس دولت سے نوازا تھا وہ 'علم الاسما' تھا، جس کی بِنا پر حضرت آدم علیہ السّلام کو تمام فرشتوں پر فوقیت ملی اور انسان اشرف المخلوقات کہلایا۔

انسان بننے کے لیے صرف انسانوں کے ہاں پیدا ہو جانا ہی کافی نہیں بلکہ اس میں انسانیت کا جوہر ہونا بھی ضروری ہے۔ لفظ 'انسان' کا اصل معانی 'انس' ہے، جس کا مطلب محبت، پیار، الفت اور چاہت ہے۔ پس جس میں

'انس' ہوگا وہی انسان کہلانے کا حق دار ہوگا اور جس کا اندرون 'انس' سے خالی ہوگا اسے کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کا تیسرا بڑا مقصد انسانیت پیدا کرنا ہے۔ حصول تعلیم کے فرض کیے جانے پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں لگ بھگ پانچ سو مقامات پر بالواسطہ یا بلاواسطہ، حصولِ تعلیم کی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔

علم کی فرضیت کا براہِ راست بیان بے شمار احادیث میں بھی آیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے''۔ ایک اور روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص طلبِ علم کے لیے کسی راستے پر چلا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیا''۔ اور یہ بات واضح کر دی گئی کہ قرآنِ مجید سے حصول علم، خواتین کے لیے بھی اسی طرح فرض ہے جیسے مردوں کے لیے ہے، اس لیے تعلیم ہر صورت حاصل کرنی چاہیے۔

انسان کی زندگی میں تعلیم کا مقام بہت اونچا ہے۔ تعلیم ہی ہمارے طرزِ زندگی کا معیار اعلیٰ بنا سکتی ہے۔ ہمیں اگر خود کو مضبوط بنانا ہے تو تعلیم کو بطور ہتھیار اپنانا ہوگا۔ ہمارا یہ قدم نہ صرف ہمارے لیے ترقی کا باعث بنے گا بلکہ ملک بھی ترقی کی راہ میں نئی منزلیں طے کر سکے گا اور اسی تعلیم کی وجہ سے زندگی میں خدا پرستی، عبادت، محبت، خلوص، ایثار، خدمت خلق، وفاداری اور ہمدردی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ آج تک جن قوموں نے ترقی کی ہے، وہ صرف علم کی بدولت کی ہے۔ علم کی اہمیت سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔

زمانۂ قدیم سے دَورِ حاضر تک، ہر متمدن و مہذب معاشرہ علم کی اہمیت سے واقف ہے۔ فطرتِ بشری سے مطابقت کی بِنا پر اسلام نے بھی علم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے ابتدائی آثار ہمیں اسلام کے عہدِ مبارک میں ملتے ہیں چناں چہ غزوہ بدر کے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ کی رقم مقرر کی گئی تھی۔ ان میں سے جو نادار تھے وہ بلا معاوضہ ہی چھوڑ دیے گئے لیکن جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، انہیں حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیے جائیں گے۔

چناں چہ سیّدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے، جو کاتبِ وحی تھے، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیم کی کیا اہمیت ہے اور اس کا حصول کتنا ضروری ہے۔

جو لوگ معاشرے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ دینی ہو یا دنیاوی، ان کا معاشرے اور اپنے گھر میں ایک الگ مقام ہوتا ہے۔ بزرگ ایک نوجوان بچے کی قدر صرف تعلیم کی وجہ سے کرتے ہیں۔ تعلیم کے حصول کے لیے جتنی بھی کوشش کی جائے کم ہے۔ تعلیم کی وجہ سے ہم نہ صرف معاشرے بلکہ پوری دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر حکومت، پاکستان کی ترقی چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ بچوں، خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیں اور اس تعلیم کا استعمال بھی اچھے طریقے سے کروائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ دن دور نہیں جب ہم بھی دنیا کے ان ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہو جائیں گے جو ترقی کی دوڑ میں ہمارے ملک سے بہت آگے ہیں۔

☆.....☆.....☆

عورت کا مرتبہ

''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ'' اسلام دین فطرتِ انسانی کا مظہر ہے، جس کی تعلیمات کے مطابق بنیادی حقوق کے لحاظ سے سب انسان برابر ہیں۔ ہر بچہ اپنی فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے اور سب انسان اولادِ آدم ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام میں جنس کی بنیاد پر عورت، مرد کی کوئی تفریق نہیں۔ اللہ کے نزدیک دونوں ہی اس کی مخلوق ہیں۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں''۔ (النساء 1-4) دین اسلام میں عورت کو اتنا اونچا مقام و مرتبہ حاصل ہوا ہے، جو اس سے پہلے کسی قوم کو حاصل نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کوئی اور امت اسے پا سکی۔

پہلے جاہلیت کے دور میں لڑکی پیدا ہونے پر اسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ قرآن پاک میں اس ظلم کا ذکر موجود ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ''جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا اور وہ غم سے گھلنے لگتا۔ اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا اور سوچتا کہ اس ذلت کو ساتھ رکھے یا مٹی میں دبا دے۔ آہ! کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں''۔ (سورۃ النحل 58)

خاتونِ جنت، سردارانِ جنت کی ماں اور دونوں عالم کے سردار کی بیٹی، بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی بھی بے مثال ہے۔ جب وہ جنت کی سردار ہیں تو عورت کا مقام کیسے بلند نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عورت چاہے ماں، بہن، بیوی یا بیٹی ہو، اس کا ہر روپ قدرت کا قیمتی تحفہ ہے جس کے بغیر کائناتِ انسانی کی ہر شے پھیکی اور ماند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو اس کا محافظ اور سائبان بنایا ہے۔ عورت اپنی ذات میں ایک تناور درخت کی مانند ہے جو ہر قسم کے سرد و گرم حالات کا دلیری سے مقابلہ کرتی ہے۔ اسی عزم و ہمت اور حوصلے کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو اس کے قدموں تلے

بچھا دیا۔

اسلامی لحاظ سے عورت کے معاشرتی مقام سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خطبۂ حجتہ الوداع میں عورت کو پہلی دفعہ بلند معاشرتی مقام عطا کیا گیا۔ عورت کے وجود کی اہمیت گھر سے واضح ہو جاتی ہے۔ ایک مرد کبھی گھر کو وہ مقام نہیں دے سکتا، جو ایک عورت دیتی ہے۔ عورت کا وجود ہر جگہ لازم و ملزوم ہے۔ گھر، باہر، انفرادی، اجتماعی، ہر جگہ عورت کے بن ادھوری ہے۔ عورت معاشرے کا ایسا ستون ہے جس کے بغیر کوئی بھی معاشرہ ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ نہیں ہو سکتا۔ معاشرے میں جب تک عورت کو اس کا مقام اور عزت نہیں دی جائے گی تب تک اچھی قوم سامنے نہیں آ سکتی۔ اس لیے تعلیم بہت ضروری چیز ہے۔ عورت کے لیے بھی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے جتنی مرد کے لیے۔ ایک عورت ہی پورے خاندان کی پرورش کرتی ہے۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک اچھی اور نیک عورت گھر کو محبت، الفت، انس و پیار اور اپنی اسلامی تربیت سے سنوار دیتی ہے، تو اللہ کے فضل و کرم سے اس گھر میں برکات ہی برکات ہوتی ہیں۔

☆.....☆.....☆

بیٹی....اللہ کی رحمت

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے، ''آسمانوں اور زمین کی سلطنت و بادشاہت صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دنوں عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ اس کے ہاں نہ لڑکا پیدا ہوتا ہے اور نہ لڑکی۔ وہ لاکھ کوشش کرے مگر اولاد نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے۔ وہ جس کے لیے جو مناسب سمجھتا ہے، اسے عطا فرما دیتا ہے''۔ (القرآن)

لڑکیاں اور لڑکے، دونوں اللہ کی نعمت ہیں۔ انسان کو دونوں کی ضرورت رہتی ہے۔ عورتیں مردوں کی محتاج ہیں اور مرد عورتوں کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے دنیا میں ایسا نظام قائم کیا ہے کہ جس میں دونوں کی ضرورت ہے اور دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

ہم میں کچھ ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کے یہاں لڑکے کی بڑی آرزو کی جاتی ہے، پھر جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو بہت خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو خوشی کا اظہار تو درکنار، بعض اوقات بچی کی پیدائش پر شوہر اپنی بیوی پر اور گھر کے دیگر افراد بھی عورت پر ناراض ہوتے ہیں حالاں کہ اس میں عورت کا تو کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کی عطا ہے۔ اس میں کسی کو ذرّہ برابر بھی اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ یاد رکھیں! لڑکیوں کو کم تر سمجھنا زمانۂ جاہلیت کے کافروں کا عمل ہے۔ لہٰذا، ہمیں بیٹی کے پیدا ہونے پر بھی اتنی ہی خوشی و مسرت کا اظہار کرنا چاہیے جتنی بیٹے کی پیدائش ہر کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹیوں کی پرورش پر جتنے فضائل بیان فرمائے ہیں، بیٹے کی پرورش پر اس قدر بیان نہیں فرمائے۔ لڑکیوں کی پرورش کے فضائل سے متعلق کچھ احادیث: حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ''جس شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں، یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے زندگی گزارے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے تو اللہ

تعالیٰ اس کی بدولت اسے جنت میں داخل فرمائے گا''۔(ترمذی)

یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے مگر اس میں اتنا اضافہ ہے کہ ''آپ ﷺ کے ارشاد فرمانے پر کسی نے سوال کیا کہ اگر کسی کی ایک بیٹی ہو تو کیا وہ اس ثواب عظیم سے محروم رہے گا؟ آپ نے ارشاد فرمایا، ''جو شخص ایک بیٹی کی اسی طرح پرورش کرے گا، اس کے لیے بھی جنت ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ''جس شخص پر لڑکیوں کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمے داری ہو اور وہ اسے صبر و تحمل سے انجام دے تو یہ لڑکیاں اس کے لیے جہنم سے آڑ بن جائیں گی''۔(ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ''جس شخص کی دو یا تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان کی اچھے انداز سے پرورش کرے (اور جب شادی کے قابل ہو جائیں تو ان کی شادی کر دے) تو میں اور وہ شخص جنت میں اس طرح داخل ہوں گے جس طرح یہ دونوں انگلیاں ملی ہوئی ہیں''۔(ترمذی)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں، ایک خاتون میرے پاس آئی جس کے ساتھ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ اس خاتون نے مجھ سے کچھ سوال کیا، اس وقت میرے پاس سوائے ایک کھجور کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے وہ کھجور اس عورت کو دے دی۔ اس اللہ کی بندی نے اس کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا دونوں بچیوں کے ہاتھ پر رکھ دیا، خود کچھ نہیں کھایا حالاں کہ خود اسے بھی ضرورت تھی پھر وہ بچیوں کو لے کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے اس خاتون کے آنے اور ایک کھجور کے دو ٹکڑے کر کے بچیوں کو دینے کا پورا واقعہ سنایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کو دو بچیوں کی پرورش کرنے کا موقع ملے اور وہ ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرے تو وہ بچیاں اسے جہنم سے بچانے کے لیے آڑ بن جائیں گی''۔

ایسی بے شمار احادیث اور اللہ کے واضح حکم کے باوجود کچھ لوگ اپنی بیٹیوں کو وہ مقام اور درجہ نہیں دیتے جو ان کا حق ہوتا ہے۔ لوگ اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔ دیکھا جائے تو کچھ سال پہلے رشتوں میں محبتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی تھیں، سب مل جل کر رہتے تھے۔ جب کہ آج کے دَور میں محبت ناپیدسی ہوگئی ہے۔ گویا اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کل کے لڑکے لڑکیاں زیادہ باشعور ہیں پھر بھی محبت سے، جو ہماری پہچان تھی، محروم ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دلوں میں گنجائش اور تحمل کا مادّہ باقی نہیں رہا۔

باپ اور بیٹی کا رشتہ اللہ رب العزت نے بہت مقدس بنایا ہے اور اس رشتے کو بہت خوب صورت احساس سے نوازا ہے۔ بیٹیاں باپ کے آنگن کی رونق ہوتی ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مائیں بیٹوں سے زیادہ پیار کرتی ہیں جب کہ باپ بیٹیوں سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ باپ اپنی اولاد کے لیے گھنے درخت کی مانند ہوتا ہے جو اپنی بیٹیوں کو

زمانے کے سرد و گرم سے بچا کر رکھتا ہے، جس کے سائے میں بیٹیاں پروان چڑھتی ہیں اور لاڈ پیار میں رہتی ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گھل مل کے زندگی سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ خدارا! اپنی بیٹیوں کی قدر کریں۔ ان کے جذبات، احساسات کو سمجھیں۔ یہ اَن مول رشتے ایک بار کھو جائیں تو واپس نہیں ملتے۔

☆.....☆.....☆

فیس بک

علی! یہ کیا ہر وقت تم فیس بک میں گھسے کرتے رہتے ہو؟ یہ بہت غلط بات ہے، اس سے نہ صرف تمہاری پڑھائی متاثر ہوتی ہے بلکہ موبائل کے زیادہ استعمال کرنے سے آنکھوں پر بھی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم فیس بک بالکل ہی چھوڑ دو مگر گھر کے لوگوں کو بھی کچھ وقت دیا کرو ناں، اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا کرو۔ سب تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔

فیس بک کے دوست بھی مجھے گھر والوں سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ میری کوئی پوسٹ گروپ میں نہ لگے تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ ایک پل بھی نہیں رہ سکتے وہ۔ صبح جب آنکھ کھولتے ہی میں فیس بک آن کرتا ہوں تو بہت سے لوگ، جن سے میری رات کو بات نہیں ہوئی ہوتی، ان کے میسجز کی بھرمار ہوتی ہے۔ پوسٹ پہ بے شمار کمنٹس ہوتے ہیں۔ وہ میری ہر پریشانی اور دکھ میں میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ گھر والے تو ہر وقت ہی ڈانٹتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کرنا، وہ نہیں کرنا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، میرا بھائی احمد مجھ سے کہتا ہے، آؤ بھائی! گیم کھیلتے ہیں۔ میرا دل نہیں کر رہا تھا تو میں نے منع کر دیا۔ گھر والوں نے مجھے خوب ڈانٹا۔ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا، جب موڈ نہیں کھیلنے کا تو کیسے کھیل سکتا ہوں۔ ان سے اچھے میرے فیس بک فرینڈز ہیں، میرے موڈ کو سمجھتے تو ہیں۔

علی، میرے بھائی! تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اپنی فیملی کے علاوہ کوئی کسی کا ہمدرد نہیں ہوتا اور برے وقت میں بھی صرف اپنے ہی ساتھ دیتے ہیں۔ عادل یار پلیز! لیکچر دینا بند کرو۔ تم جاؤ، مجھے فیس بک پر پوسٹ لگانی ہے۔ عادل اسے دیکھ کر سوچنے لگا، کبھی تو میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ ہی جائیں گی۔ وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی فیس بک کا اتنا شیدائی ہے کہ کبھی کبھی تو اپنا ہوم ورک کرنا بھی بھول جاتا ہے۔ اسکول سے بھی اس کی

شکایتیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔گھر والے بھی بہت پریشان تھے۔وہ ہر طریقے سے اسے سمجھا چکے تھے مگر نشہ تو پھر نشہ ہی ہوتا ہے۔علی کو بھی چوں کہ فیس بک کا نشہ ہو گیا تھا، جواب مشکل ہی سے ختم ہونے والا تھا۔

آج رات کو بھی علی بہت دیر تک جاگتا رہا۔صبح دیر سے اٹھنے کی وجہ سے اس کی نماز بھی رہ گئی اور اسکول سے بھی لیٹ ہو گیا۔وہ سوچنے لگا، کیوں نہ آج اسکول سے چھٹی کر لی جائے۔سارا ٹائم فیس بک پر دوستوں کے ساتھ گزار کے مزے کروں۔وہ ناشتے کی میز پر نہیں آیا تو اس کی امی اس کے کمرے میں گئیں اور پوچھا کہ بیٹا! آج سکول نہیں جانا کیا؟

نہیں امی جان! میرے سر میں بہت درد ہے۔میں آج ریسٹ کروں گا۔

دیکھو بیٹا! اگر تم ساری رات موبائل فون یوز کرتے رہو گے تو صبح ایسے ہی ہوگا ناں۔

افففف....امی! آپ بھی ناں....صبح ہوتے ہی میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔آپ لوگوں سے اچھے میرے یہ فیس بک کے دوست ہیں جو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔اگر میں ابھی اپنی بیماری کی پوسٹ کروں ناں! تو سارے اتنے پریشان ہو جائیں۔وہ سب میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔

امی نے مسکراتے ہوئے کہا، ''بیٹا! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔تمہارے یہ دوست صرف فیس بک تک ہی ہیں اور جب تک تم ان کے پیچھے بھاگتے رہو گے، یہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔اگر دن تم فیس بک نہ یوز کرو اور کوئی پوسٹ نہ لگاؤ تو یقین مانو، یہ تیسرے ہی دن تمہیں پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ان کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔فیس بک کی دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور زیادہ تر صرف وقت گزاری کے لیے آتے ہیں۔بیٹا! یہ فون کے رشتے بس ٹائم پاس کے لیے ہوتے ہیں، یہ خون کے رشتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو تم اپنی فیس بک صرف تین دن کے لیے بند کر کے دیکھ لو، یہ لوگ تمہیں ایسے بھولیں گے جیسے تم کبھی تھے ہی نہیں۔

نہیں امی! ایسا ناممکن ہے۔میرا اتنا خیال رکھنے والے دوست مجھے تین دن میں نہیں بھول سکتے۔

بیٹا تم آزما کر دیکھ لو۔

تین دن بعد علی نے اپنی فیس بک آن کی۔اس کے کسی دوست نے ایک میسج بھی نہیں کیا تھا نہ ہی کہیں کوئی پوسٹ لگی کہ علی! تم کہاں ہو؟ ہم تمہیں مِس کر رہے ہیں۔وہی دنیا تھی مگر اس میں علی نہیں تھا۔علی نے ایک پوسٹ لگائی اور جب کچھ گھنٹوں کے بعد دیکھا تو ایک دو لائکس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔اس نے اپنے سب سے اچھے دوست کو میسج کیا تو اس نے میسج کا جواب نہیں دیا۔اسی طرح اپنے باقی دوستوں کو میسج کیے مگر سب ہی اپنے کاموں میں مصروف تھے، کسی نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ علی! تم تین دن کدھر غائب تھے؟

تب علی کی سمجھ میں آیا کہ اپنے خاندان سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔فون کے رشتوں سے زیادہ اہم خون کے رشتے

ہوتے ہیں۔اس وقت اسے یہ احساس بھی ہوا کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یہ ایک فرضی دنیا ہے جس میں کوئی بھی کسی کی خبر نہیں رکھتا سوائے اپنوں کے۔اس نے اسی وقت فیس بک سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی ماں سے معافی بھی مانگی، جن کی وجہ سے وہ اپنی فیملی کی قدر جان پایا تھا۔باقی سب فیملی ممبرز سے بھی معافی مانگی اور اپنے بہت سے ادھورے کام مکمل کرنے کے لیے بھی خود کو تیار کیا۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

عائزہ ظہیر چغتائی

عائزہ ظہیر چغتائی پنجاب کے شہر گجرات کی رہائشی ہیں۔میڈیکل ایم بی بی ایس کے سال اوّل کی طالبہ ہیں۔ تقریباً5 سال سے لکھ رہی ہیں۔عرصہ ایک سال سے رائٹرز کلب سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- عورتوں کا استحصال

2- کشمیر....وادی جنت نظیر

3- دور حاضر کا فتنہ....مذہب انسانیت

4- دہرا نظام تعلیم

5- خوشی اور سکون

☆☆☆☆☆

عورتوں کا استحصال

لفظ ''عورت'' کی تشریح کئی برسوں سے کی جارہی ہے بلکہ ہر زمانے میں کی گئی۔اس بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں، کئی فلسفے پیش ہوتے رہے۔مگر حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب فلسفے عورت کی تعریف کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔عورت ایک کبھی نہ سمجھ آنے والی پہیلی ہے جسے جتنا سلجھایا جائے، اتنی ہی الجھ جاتی ہے۔اس کے کئی روپ، کئی کردار اور کئی شکلیں ہیں۔مگر داد دینی پڑے گی کہ ایسی منجھی ہوئی اداکارہ ہے، جو ہر روپ، ہر کردار میں ڈوب کر اسے اپنا بنالیتی ہے۔

کہیں یہ ماں بن کر جھوٹ بولتی ہے، تو کہیں بہن یا بیٹی کے روپ میں مکر کرتی رہتی ہے۔ ہر ماں کہیں نہ کہیں اپنی اولاد سے جھوٹ بول رہی ہوتی ہے۔کبھی خالی پیٹ بھی کہتی ہے، مجھے بھوک نہیں ہے، تم لوگ کھالو۔تو کبھی اس کی خاطر قربان ہونے کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہر دکھ، ہر درد کو اپنی مسکراہٹ تلے چھپا لیتی ہے۔اسے اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹنا بھی خوب آتا ہے۔ وہ اپنی گھٹتی ہوئی تمناؤں کی سسکیوں کو قہقہوں سے دبانا بھی جانتی ہے۔ کہیں اس خیال سے بھی ڈر جاتی ہے کہ اس کے بچوں کو کچھ ہو نہ جائے۔اپنی ذات کی نفی کر کے اپنے بچوں کو سینچتی ہے، بالکل کسی باغبان کی طرح۔دل کو جھوٹے بہلاؤں سے بہلاتی رہتی ہے۔کہیں بیٹی بن کر باپ کی لاج پر قربان ہو جاتی ہے اور بہن بن کر بھائیوں کی عزت پہ صدقے واری جاتی ہے۔غرض عورت ہر روپ میں قربانی دینا اپنا فرض سمجھتی ہے۔

یہ سوچ کر میری روح ہمیشہ کانپ اٹھتی ہے کہ کیسے کوئی باپ اپنی بیٹی کو، کیسے کوئی بھائی اپنی بہن کو محض زمین، جائیداد کے نام پر قربان کرسکتا ہے۔مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج بھی بہت سی بیٹیاں الٹی چھری سے ذبح ہو رہی ہیں۔ہاں آج بھی باپ محض خاندانی تنازعات کی بِنا پر اپنے جگر کے ٹکڑے بیچ دیتے ہیں۔کبھی زمین، جائیداد کا جھگڑا،

کبھی قتل کا خوں بہا تو کبھی مالی نقصان کا تاوان۔کوئی خاندانی جھگڑا ہو یا پنچایت کا فیصلہ،تمام معاملات میں حوا کی بیٹی ہی ''کام'' آتی ہے اور اس کی قیمت بھی بہت ارزاں لگائی جاتی ہے۔

اس فعل نا گفتہ کو ''ونی'' کا نام دے کر اس سے تمام حقوق چھین لیے جاتے ہیں۔اس کے احساسات، جذبات،خواب،سب مرد کی انا تلے روندے جاتے ہیں۔وہ گونگی، بہری، جذبات سے عاری زندہ لاش بن جاتی ہے۔ پھانسی سے قبل بھی مجرم سے آخری خواہش پوچھی جاتی ہے مگر افسوس کہ ونی ہونے والی کو یہ حق بھی حاصل نہیں۔شرم آتی ہے مجھے ان غیرت مندوں کی غیرت پر، جو غیرت کے نام پر اپنی ہی غیرت بیچ دیتے ہیں، جو عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں کہ جب تک چاہا کھیل لیا اور جب چاہا گردن مروڑ کر پھینک دیا۔مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں پیدا کرنے والی بھی ایک عورت ہی ہے۔

آج کا معاشرہ خود کو بہت پڑھا لکھا اور مہذب سمجھتا ہے مگر افسوس کہ اس ''مہذب معاشرے'' کے ''مہذب شہریوں'' نے عورت کی قدر نہیں جانی۔ چناں چہ اب عورت کو اٹھنا ہوگا کہ مزید خود سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔کب تک....آخر کب تک،خود سے نظریں چراتی رہے گی۔کبھی تو عورت کو اس کا اصل مقام ملے گا، جو اس کا مذہب اسے دیتا ہے۔اس کے حصول کے لیے ہمیں ہر اس عورت کا ساتھ دینا ہوگا جو ابھی تک جنوبی پنجاب کے کسی پس ماندہ گاؤں میں کسی کے ظلم وزیادتی کا نشانہ بن رہی ہے، جو ابھی تک اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے، جو ابھی تک خاموش رہ کے سب سہہ رہی ہے۔

آج کی عورت بظاہر زمانۂ جاہلیت کی طرح زندہ درگور تو نہیں کی جا رہی مگر پل پل مر ضرور رہی ہے۔روز مرتی ہے اور روز پھر سے مرنے کے لیے زندہ ہوتی ہے۔ہم جو آج کے ماڈرن معاشرے میں جی رہے ہیں،انسانی حقوق کے علم بردار بنے بیٹھے ہیں،ایک پل کے لیے بھی اس عورت کی زندگی کے بارے میں نہیں سوچتے۔ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں انسانی حقوق کی عدم دست یابی پر آواز اٹھاتے ہیں مگر....اپنے ہی ملک میں ہونے والی زیادتیوں سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ہم وہاں بہتری لانے کی بات کرتے ہیں، جو ہمارے اختیار میں نہیں۔اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

☆.....☆.....☆

کشمیر....وادی جنت نظیر

ہم اکثر اپنی بے سکون، تلاطم خیز زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آ کر کہیں بھاگ جانا چاہتے ہیں، اس مشینی اور پُر تکلف زندگی سے بہت دُور۔ کسی ایسی جگہ جہاں راحت ہی راحت ہو۔ جہاں ہم اپنی آواز سن سکیں، خود سے خود کی وہ باتیں کہہ سکیں، جو اس برق رفتار زندگی میں کہیں اَن کہی ہی رہ گئیں۔ اس مقصد کے لیے زمین پر جنت کہلائی جانے والی وادیٔ کشمیر سے بہتر اور کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ جہاں مہکی مہکی، دھوئیں سے پاک ہوائیں، نکھری نکھری، گھٹن سے پاک فضائیں، اُجلی اُجلی ملاوٹ سے پاک کرنیں ہماری راہ تک رہی ہیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور معصوم سرگوشیاں سماعت کو لذت بخشتی ہیں۔ سرمئی بادل اٹھکھیلیاں کرتے کبھی پہاڑ کی اوٹ میں چھپ جاتے ہیں تو کبھی سورج کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ جہاں بادل زمین کو چھوتے اور پہاڑ آسمان کو چومتے ہیں۔ گرتے جھرنوں کی آواز کسی مدھر ساز کی طرح کانوں میں رس گھولتی ہے۔

لفظ کشمیر دراصل سنسکرت کے الفاظ ''کا'' یعنی پانی اور ''شمیرا'' یعنی خشکی سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں خشک سرزمین۔ کشمیر کو یہ نام اس لیے دیا گیا کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ یہ سارا علاقہ پہلے پہل ایک خوب صورت جھیل پر مشتمل تھا۔ بعدازاں یہ جھیل خشک ہوگئی اور اپنے بطن سے اس طلسماتی وادی یعنی کشمیر کو جنم دیا۔ وادیٔ کشمیر کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ وادی زمانۂ قدیم میں ہندومت کا گڑھ ہوا کرتی تھی۔ چودھویں صدی کے وسط میں مسلمان سلاطین نے فتوحات کے سلسلے میں اس وادی میں قدم رکھا۔ مغل بادشاہ اکبر نے 1586 سے 1592 کے درمیان اس علاقے کو فتح کیا۔ مغل بادشاہ جہانگیر نے جب اس حسین وادی کی خوب صورتی دیکھی تو یہ تاریخی الفاظ کہے:

اگر فردوس بروئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

''اگر روئے زمین پر کہیں جنت ہے تو وہ یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے''۔ بعد میں یہ خطہ افغان، سکھوں اور انگریزوں کے قبضے میں بھی رہا۔ ہندو راجہ اس پر چار ہزار سال تک قابض رہے۔ 1846ء میں ڈوگرا راجہ گلاب سنگھ نے اسے 75 لاکھ ہندوستانی روپے میں فروخت کر دیا۔ اس وقت وہاں 80 فی صد مسلمان آباد تھے۔ 26 اکتوبر 1947ء کو اس کا بھارت کے ساتھ زبردستی الحاق ہوا۔ ابھی تک آزادی کی جنگ جاری ہے۔ وادیٔ کشمیر جغرافیائی اعتبار سے بھی قابل قدر ہے۔ اس کا رقبہ 69547 مربع کلومیٹر ہے جب کہ 39102 مربع میل حصہ مقبوضہ ہے اور 25 ہزار میل آزاد کشمیر پر مشتمل ہے، جو پاکستان کا حصہ ہے۔ اس کی کل آبادی ایک کروڑ ہے جس میں سے 25 لاکھ آزاد کشمیر میں آباد ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کا دارالحکومت سری نگر ہے۔ آزاد کشمیر میں مظفر آباد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

یہ وادی ہمالیہ کے ہیبت ناک پہاڑی سلسلوں کے جنوب، برصغیر پاک و ہند کے شمال اور جنوبی ایشیا کے وسط میں واقع ہے۔ اسی نسبت سے اسے ایشیا کا دل اور جنت نظیر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے شمال میں چین، افغانستان اور مشرق میں تبت واقع ہے۔ کوہ قراقرم اور ہمالیہ اہم پہاڑی سلسلے ہیں۔ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے یہ جنت گھری ہوئی ہے۔ ریشم کی بُنائی اور قالین بافی اہم گھریلو صنعتیں ہیں۔ کشمیر کی دست کاریاں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ کشمیری دوشالے، قالین اور ظروف سوغات سمجھے جاتے ہیں۔ سادہ زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے دل نہایت کشادہ ہیں۔

مظفر آباد کے شمال مشرق میں دریائے نیلم کے کنارے ایک نہایت پُرکشش وادی ''نیلم'' ہے جو 144 کلومیٹر طویل ہے۔ وادیٔ نیلم کے دل فریب مناظر اور اس کی طرف سفر کرتے دریائے نیلم کی ہم رکابی بہت حسین منظر پیش کرتی ہے۔ سڑک کی ایک جانب ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا اور دوسری جانب سنگلاخ چٹانیں ہیں۔ گرتے جھرنے عجیب دل موہ لینے والے سُر چھیڑتے رہتے ہیں۔ اَٹھ مقام اور شاردہ اس کی دو تحصیلیں ہیں۔ سرسبز جنگلات اور ان میں بہتے آبشار سیّاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔

کشمیر کی خوب صورتیوں میں اگر راؤلا کوٹ اور اس میں موجود ''بَن جوسہ جھیل'' کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ بَن جوسہ جھیل میں کوہ نوردی کا اپنا ہی لطف ہے۔ حسین نظارے، ہرے بھرے پہاڑ، طلسماتی جھیل کے سبز اور نیلے رنگ کے پانی میں متلون لہریں۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت کے سارے رنگ اس جھیل کی خوب صورتی دیکھنے اُتر آئے ہوں۔ رات کے وقت شمال کی سمت واقع جنڈالی کے پہاڑوں کی اوٹ سے جب چاند نکل کر جھانکتا

ہے تو چاند کا نقرئی عکس ساکت پانیوں میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔اس جھیل میں کشتی رانی کا بھی اپنا مزہ ہے۔نیلگوں پانی میں نہاتی، تیرتی رنگ برنگی مچھلیاں اس جھیل کے حسن کو بڑھاوا دیتی ہیں۔جھیل کے اردگرد آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے والے سبزہ زار ہیں جہاں اکثر طائفے لیٹ کر ساکت فضاؤں میں سُر چھیڑتے رہتے ہیں۔جھیل پر گھلتی گھٹائیں، گرتے جھرنے، بہتے آبشار، جھیل کی سطح پر ہچکولے کھاتا سنہری چاند، جھیل کی نگیں آفریں سرگوشیاں کسی دوشیزہ کی طرح کسی کی بھی نیندیں غارت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

کشمیر میں واقع وادیٔ جہلم، قلعہ رام کوٹ، ٹولی پیر، وادیٔ لیپا اور پیر چناسی وغیرہ کی خوب صورتی بھی قابل ذکر ہے۔کشمیر قدرت کے حسین شاہ کاروں میں سے ایک ہے۔اگر جنت دیکھنی ہو تو کشمیر دیکھ لیں۔

☆.....☆.....☆

دورِ حاضر کا فتنہ....مذہبِ انسانیت

آج ہمارے معاشرے میں ایک بہت ہی حسّاس اور پیچیدہ موضوع گردش میں ہے۔ مذہب کے کچھ بیوپاری اور انسانیت کے علم بردار ایک عام ذہنی سطح کے آدمی کو مذہب اور انسانیت کی جنگ میں الجھا کر اس کے عقائد و خیالات کو منتشر کرنا چاہ رہے ہیں۔ مذہب ایک بہت ہی نازک اور اہم معاملہ ہے، اسے اس قسم کی ناپائیدار اور ابہام پیدا کرنے والی دلیلوں سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔

دورِ حاضر میں انسانیت کے نام پر ایک نئی ہوا چلی ہے کہ ختم کرو تمام مذہبی نظریات و عقائد کو، ختم کرو ان نظریاتی سرحدوں کو، توڑ ڈالو ان بندشوں کو، مذہب کی دیواریں پھلانگو اور چلو ایک نیا مذہب تشکیل کریں، جو انسانیت کی قدرِ مشترک پر مبنی ہو۔ جہاں نہ کوئی مسلم، نہ ہندو، نہ سکھ، نہ عیسائی ہو۔ صرف اور صرف انسان ہوگا۔ اس نئے مذہب کو ''مذہبِ انسانیت'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس مذہب کے حامی بڑی بڑی جذباتی اور دل گیر تقریریں کرتے ہیں۔

اس طبقے کا خیال ہے کہ مذہب کی ریکھائیں دلوں میں دراڑیں ڈال رہی ہیں۔ مذہب فساد اور لڑائی جھگڑے کو فروغ دیتا ہے۔ دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے عقائد و نظریات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان بغض، دشمنی اور عناد جیسے جذبات بیدار ہو رہے ہیں۔ ان کے نزدیک مذاہب انسانوں کا بٹوارہ کر رہے ہیں۔ اختلاف رائے کی بِنا پر لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھے ہیں اور خون بہا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کے عقائد درست کیے جائیں۔ اوّل تو یہ کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب امن کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں، یہ اس مذہب کے ماننے والے ہیں، جو امن کے دشمن بن بیٹھے ہیں۔ رہی بات انسانیت کی.... تو اسلام بذاتِ خود ''دینِ انسانیت'' بھی ہے۔ اگر کوئی شخص خود کو مسلمان کہتا ہے تو اس کے لیے اسے پہلے اچھا انسان بننا پڑے گا۔ جو شخص اچھا انسان نہیں، وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص اچھا انسان تو ہے مگر اسلام قبول نہیں

کرتا، تو یہ اس شخص کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان، انسان سے تو محبت کرے، انسانیت کے تقاضے پورے کرے لیکن اُس انسان کو بنانے والے کی بندگی نہ کرے۔ مخلوق کے حقوق پہلے ہیں یا خالق کے؟ یقیناً خالق کا حق ہم پر زیادہ ہے۔

اگر کوئی مسلم شخص انسانیت کے تقاضے پورے نہیں کرتا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ دین اسلام میں کوئی خامی ہے، ہرگز درست نہیں بلکہ یہ اس شخص کا ذاتی عمل ہے۔ جیسے آج اقوام عالم میں مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ چند لوگوں کی وجہ سے ہمارا تصور دنیا کی نظروں میں برا بن چکا ہے۔ یہ لوگ، جو خود کو مذہب کا ٹھیکے دار سمجھتے ہیں، دراصل خرابی ان لوگوں میں ہے۔ اگر کسی کو اسلام کے بارے میں معلومات چاہیے تو وہ قرآن اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھے، جو آئے ہی انسانیت کے لیے رحمت بن کر تھے۔ لہٰذا، ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اسلام انسانیت کی فلاح کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ اسلام تو امن و آشتی کا دین ہے۔ اسلام کسی کو بھی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی ذاتیات پر حملے کرے۔ لہٰذا، یہ ''مذہبِ انسانیت'' ایک باقاعدہ سوچی سمجھی سازش کے تحت دَورِ حاضر کے لوگوں کے ذہنوں میں پیوست کیا جا رہا ہے۔ ہمارے نظریات و عقائد کو اس گھناؤنی سازش کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کاوش ہو رہی ہے۔ یہ مذہبِ انسانیت ایک ایسا زہر ہے جسے ہم گڑ کی شکل میں بڑے مزے سے چوس چوس کر اپنے اندر اتار رہے ہیں۔ عام ذہن کے مالک اور کم زور عقائد کے حامل افراد ہر نئے فتنے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ نہ تو اسے مذہبی عقائد کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور نہ عقل کی۔ انسانیت کے رشتے، انسانیت کا مذہب، انسانیت کا راج، کی باتیں دیکھنے میں بڑی دل فریب اور خوش آئند لگتی ہیں مگر شاید وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ یہ باتیں صدیوں سے ہمارے دین کا حصہ رہی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ باتیں نئی نہیں ہیں۔ تاہم، مذہبِ انسانیت کے نام پر ہونے والے اس ڈھونگ کو دَورِ حاضر کے لیے فتنہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ہمیں اپنے مذہبی نظریات کو ختم ہونے سے بچانا ہوگا اور اسلام کی راہ پر چلتے ہوئے انسانیت کی خدمت کے فرائض سرانجام دینے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے عقائد و نظریات کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆.....☆.....☆

دہرا نظام تعلیم

علم ایک ایسا چراغ ہے جو عقل کے دریچوں کو روشنی بخشتا ہے، جو انسان کو حق و باطل میں فرق سمجھاتا ہے، جو انسان کو انسان سے ملواتا ہے، جو انسان کو اس کے رب سے روشناس کرواتا ہے۔

کسی بھی ملک کی ترقی و خوش حالی میں اس کا تعلیمی نظام کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی اس معاشرے کے خواندہ افراد اور تعلیمی نظام کی مرہونِ منّت ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شہری ملک و قوم کو درپیش مسائل کے حل اور ان کی ترقی میں معاون ثابت ہوسکتا ہے مگر افسوس کہ آج ہمارے ملک کا تعلیمی نظام بدترین حالات سے دوچار ہے۔ ناخواندگی بذاتِ خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے مگر آج ہم اس سے بھی زیادہ خوف ناک صورت حال سے دوچار ہیں اور وہ ہے دُہرا نظام تعلیم۔ ہمارے ملک میں تعلیم کے مختلف معیار بن چکے ہیں۔ یہ طبقاتی کشمکش دیگر شعبوں سے ہوتی ہوئی اب نظام تعلیم کی بنیادیں کھوکھلی کرنے آ پہنچی ہے۔

ایک وہ طبقہ ہے جو اسکول، کالج کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور ایک طبقہ محض مذہبی تعلیم تک ہی محدود رہنا چاہتا ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ کے اوراق کھنگالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت میں خلفائے راشدین کے زمانے میں ہر شخص کے لیے یکساں نظام تعلیم اور مواقع موجود تھے۔ کوئی وزیر ہو یا عام آدمی، دونوں کے لیے ایک ہی طرح کی سہولیات اور نصاب کی فراہمی یقینی بنائی جاتی تھی، جس میں صرف دین ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی سمجھ بوجھ بھی دی جاتی تھی۔ اسلام انسان کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ دین کے لیے دنیا سے بالکل کنارہ کرلے اور نہ ہی یہ اجازت دیتا ہے کہ دنیا کی خاطر دین کو بھلا دیا جائے۔ اسلام متوازن زندگی گزارنے کا حکم دیتا ہے تاکہ مسلمان دین کی راہ پر چلتے ہوئے دنیاداری کے تقاضے پورے کرے۔ لیکن جب انگریز ہم پر قابض ہوئے تو انہوں نے ہمیں اس انگریزی نظام تعلیم سے روشناس کروایا، جو صرف اور صرف دنیاداری کے اصول سکھاتا ہے۔ اس نظام نے دین اور دنیا کے درمیان ایک

بہت اونچی دیوار کھڑی کر دی ہے جسے ہم آج تک عبور نہ کر سکے۔ ہم آزادی کے بعد بھی لارڈ میکالے کے بتائے ہوئے نظام تعلیم کی پیروی کر رہے ہیں، جس کے بارے میں خود لارڈ میکالے نے نہایت واضح الفاظ میں کہا، ''اس نظام کا مقصد ایسے مسلمان پیدا کرنا ہے جو اپنی نسل اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر ذہنی طور پر انگریز ہوں''۔ آج یہ تمام باتیں ہماری نسلوں میں ثابت ہو رہی ہیں۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

آج ہم نے انگریزوں کے تسلط سے تو چھٹکارا حاصل کر لیا مگر ذہنی طور پر آج بھی غلام ہیں۔ بظاہر ہم بالکل آزاد پھر رہے ہیں مگر ہماری سوچ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہم دین سے دُور مگر اس دنیا اور اس کی مادّہ پرستی سے قریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر ہم نے صرف انگریزی نظام اور مدرسے کے نظام ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریز کی لگائی ہوئی آگ کو بھی خوب ہوا دی۔ آج اس آگ میں ہمارا پورا ملک جل رہا ہے۔ انگریزی نظام تعلیم مزید دو طبقوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک نظام ہے امراء اور اعلیٰ افسران کے بچوں کے لیے، جو آکسفورڈ کے نصاب پر چلتا ہے۔ ان اسکولوں میں اردو بولنے پر پابندی ہے۔ موسیقی اور رقص کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ یہ نظام آئندہ نسلوں کو اپنی روایات اور عقائد سے دُور کرنے کے لیے کافی ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کو انگریزی بولتا دیکھ کر تالیاں بجا بجا کر ان کی مذہبی و نظریاتی اقدار کے قتل پر جشن مناتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے اس پر کہا:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا لیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

دوسری طرف غریب کا بچہ سرکاری اسکول میں ناقص سہولیات کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ امیر جہاں او۔ لیولز کرتا ہے، وہاں غریب میٹرک کرتا ہے۔ طبقاتی کشمکش ہماری رگوں میں خطرناک حد تک سرائیت کر چکی ہے۔ ہمارا ہمسایہ ملک چین، جو ہم سے دو سال بعد آزاد ہوا، ترقی میں ہم سے صدیوں آگے ہے۔ وہ اس لیے کہ اس نے نہ صرف

جسمانی بلکہ ذہنی طور پر بھی خود کو غلامی کے طوق سے آزاد کروالیا۔صرف چین ہی نہیں بلکہ کوریا، ویت نام اور ایران وغیرہ نے بھی اپنے نظریے کو ختم نہیں ہونے دیا۔تب ہی وہ اقوام عالم میں مضبوط اور منظّم قوموں کی طرح سامنے آئیں جہاں نہ طبقاتی کشمکش کی جگہ ہے نہ دو، دو تعلیمی نظام کی۔آج بھی ہم اگر اپنے نظریے کو مضبوطی سے تھام لیں اور اپنے اسلاف کے عقائد و روایات کی پیروی کریں تو ایک مضبوط قوم بن کر اُبھر سکتے ہیں۔اگر ہم طبقاتی کشمکش سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور ہر ایک کے لیے یکساں معیار قائم کر لیں تو وہ دن دُور نہیں جب سامراجی طاقتیں ہمارے نام سے لرزہ براندام ہوں گی۔(ان شاءاللہ)

☆.....☆.....☆

خوشی اور سکون

خوش رہنے اور مسکرانے کے لیے کوئی بڑی وجہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ہم دنیا کی ہر خوشی پا لینے کے بعد بھی خوش نہیں ہوتے اور کسی نئے سراب کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ ہماری تمام عمر اسی کھیل کو کھیلتے کھیلتے گزر جاتی ہے اور زندگی ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ہمیں خوش رہنا ان سے سیکھنا ہوگا،جن کے پاس خوش رہنے کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے پھر بھی وہ خوش اور مطمئن ہیں، بھوکے پیٹ بھی مسکرا رہے ہیں۔

ایک دن میرا گزر ایک جھونپڑ پٹی سے ہوا۔اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔اچانک میری نظر ایک عورت پر پڑی، جو سارا دن دھوپ میں جل کر چلی آ رہی تھی۔ وہ سر پر گٹھری رکھے، ہاتھ میں ایک تھیلا پکڑے، جس میں ایک سیب اور چند کیلے تھے، اپنے بچوں کی طرف چل دی۔ بچے اسے دیکھ کر دُور سے بھاگتے ہوئے آئے اور اس سے لپٹ گئے۔اس سے وہ تھیلا لیا اور کھانے کی چیزیں نکال کر اس طرح کھانے لگے جیسے صدیوں سے بھوکے ہوں۔ ننگے پاؤں اور پھٹے کپڑوں سے تو یہی لگتا تھا جیسے واقعی صدیوں کے بھوکے ہوں۔اس وقت ان کے چہروں پر جو اطمینان اور خوشی تھی، وہ شاید بڑی سے بڑی خواہش کے پورا ہو جانے پر بھی نہ ہوتی ہو۔اگر کوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں اور ننگے پیر بھی خوش رہ سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں؟ وہ خوش تھے اپنی غریبی سے، وہ خوش تھے اپنی زندگی سے، وہ خوش تھے اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے حسرت بن جانے پر۔وہ اپنی ماں سے صرف اتنا ہی چاہتے تھے جتنا وہ پورا کر سکتی تھی۔

غریب کا بچہ پیدائشی قاتل ہوتا ہے، جو بچپن ہی سے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتا چلا آ رہا ہوتا ہے۔کیا وجہ ہے کہ امیروں کو نرم بستر اور تمام تر آسائشوں کے باوجود نیند کی گولی کھانی پڑتی ہے اور غریب فٹ پاتھ پر سو کر بھی خواب دیکھ سکتا ہے۔ہم ایک ایسی دوڑ میں لگے ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔ دنیا کی ہوس میں ایسے اندھے ہوئے ہیں کہ ہمارے پیروں تلے غریب کے خواب ٹوٹ رہے ہیں۔ان خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے سمیٹتے وہ خود لہولہان ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے رک کر دیکھو تو سہی کہ کتنے خواب دَم توڑ گئے ہیں اور کتنے خالی پیٹ سو گئے ہیں۔ باہر نکل کر دیکھو تو سہی، ان کی سوالی نظریں تمہاری منتظر ہیں۔ اگر تمہاری تھوڑی سی بھی مدد ان کے چہروں پر مسکان لے آتی ہے تو توڑ دو یہ قسم، اتار پھینکو اَنا کی دستار۔ تمہیں اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی، سکون کیوں نہیں ملتا؟

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

صبیح الحسن

صبیح الحسن کا تعلق پھالیہ ضلع منڈی بہاؤالدین سے ہے۔ تعلیم انٹرمیڈیٹ ہے۔ مطالعہ کا شوق وراثت میں ملا اور مختلف رسائل اور کتب کا ساتھ بچپن سے ہی رہا۔ لکھنے کی جانب اسکول کے چند اساتذہ نے مائل کیا۔ پھر قسمت گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی ماحول میں لے گئی جہاں سونے پر سہاگہ کا کردار اقبال ہاسٹل کی لائبریری نے ادا کیا۔ رائٹرز کلب سے کچھ ماہ سے بطور ممبر وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر

1- ٹیلنٹ کی تو کوئی قدر ہی نہیں

2- مستقبل کی یادیں (ڈی جاوو)

3- تبرک (افسانچہ)

4- زرخیز زمین

5- موجودہ سے سابق تک کا سفر

☆.....☆.....☆

ٹیلنٹ کی تو کوئی قدر ہی نہیں

یوں تو ہم اکثر بزرگوں سے سنتے ہی رہتے تھے کہ اگلا دَور اچھا تھا لیکن اس تلخ حقیقت کا ادراک ہمیں کچھ عرصہ قبل ہی ہوا۔ واقعی آج کے دور میں تو ٹیلنٹ کی کوئی قدر ہی نہیں۔ ہوا کچھ یوں کہ ہمارے والدین کی 'مجلس شوریٰ' نے فیصلہ دیا کہ آج کل کے بچوں کو زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہیے، جس کے لیے انگریزی تعلیم بہت ضروری ہے۔ لہٰذا، ہمیں اور ننھے میاں کو انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروانے کا اعلان کیا گیا۔ ہم بھی یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور نئے اسکول کے کئی سہانے خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیے۔ لیکن پتا چلا کہ اسکول والے داخلے سے قبل انٹرویو لیتے ہیں۔ یہ خبر گھر والوں کے لیے تو پریشان کن نہیں تھی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہم کافی لائق فائق واقع ہوئے ہیں اور ہر سال کلاس میں پوزیشن لیتے ہیں لیکن اندر کی بات سے تو ہم اور ننھے میاں ہی واقف تھے مگر اب کیا کرتے۔ خیر.... ہمیں اپنے ٹیلنٹ پر پورا بھروسا تھا اور ہم پورے اطمینان سے انٹرویو دینے پہنچے۔ ہمیں اور ننھے میاں کو اکٹھے ہی طلب کیا گیا۔ انٹرویو والے کمرے میں داخل ہوئے تو پرنسپل صاحب ایک میز کے پیچھے براجمان تھے۔ ہم کو سامنے والی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند رسمی سوالات کے بعد ننھے میاں کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا۔

''بیٹا! چاندنی کی انگلش تو بتایئے''۔ ہم ابھی جواب سوچ ہی رہے تھے کہ ننھے میاں جھٹ سے بولے۔ ''مونی'' اور پھر کچھ ایسی نظروں سے ہماری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھا! ایسے جواب دیتے ہیں۔ لیکن ہماری توجہ تو پرنسپل صاحب کی طرف تھی جو منہ کھولے ہمیں گھور رہے تھے۔ ہم بھی سمجھے کہ شاید وہ ہم سے اتنے مشکل سوال کے درست جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے، اس لیے حیران ہیں۔ خیر.... چند لمحے بعد انہوں نے ہماری طرف توجہ کی اور پوچھا۔

''بیٹا! اب آپ اس فقرے کا انگلش میں ترجمہ کیجیے۔ صدر میں گولیاں چل رہی تھیں''۔ ہم نے چند منٹ سوچ

کر دماغ میں فقرہ ترتیب دیا اور جواب میں کہا۔

"The bullets were walking in the president"

یہ سن کر پرنسپل صاحب چند لمحے ہمیں گھورتے رہے پھر شاید انہوں نے ہماری انگلش کو قابل اطمینان سمجھتے ہوئے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کی اور پوچھا۔ ''چار جمع دو کتنے ہوتے ہیں؟''

''قریباً چھے''۔ ننھے میاں نے جواب دیا۔ ''قطب شمالی کہاں ہے؟'' ''جی قطب شمالی کا تو پتا نہیں لیکن قطبی ستارہ شمال میں ہوتا ہے تو یہ بھی وہیں کہیں ہوگا''۔ پرنسپل صاحب نے اپنے بالوں سے بے نیاز سر پر ہاتھ پھیرا پھر ہم سے پوچھا۔ ''بیٹا جی! سالانہ امتحان میں اردو کا مضمون کون سا لکھا تھا؟''

ہم نے جواب دیا، ''علامہ اقبال پر''۔ پرنسپل صاحب نے کہا، ''ذرا سنایئے تو''۔ ''علامہ اقبال صبح کے وقت سیالکوٹ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں پیدا ہوئے تھے''۔ ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ انہوں نے چپ کرا دیا اور جانے کی اجازت دے دی۔

ہم نے باہر آ کر سب کو خوش خبری سنائی کہ بہت ہی اچھا انٹرویو ہوا ہے اور داخلہ تو ایک طرف خصوصی وظیفہ بھی ملنے کی امید ہے۔ سب نے یہ سن کر خوشی کا اظہار کیا اور ہم سب گھر واپس آ گئے۔

ہم بے صبری سے داخلے کی اطلاع کا انتظار کرنے لگے۔ چند دن بعد اسکول سے لیٹر آیا۔ چچا نے کھولا اور جیسے جیسے پڑھتے گئے، ان کا رنگ سرخ ہوتا گیا۔ ہم نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے باہر کا رخ کیا ہی تھا کہ ان کی گرج دار آواز نے واپس آنے کا حکم دیا۔ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں، جو کچھ ہوا ہوگا۔ پس.... یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہاں ٹیلنٹ کی تو کوئی قدر ہی نہیں۔

☆.....☆.....☆

مستقبل کی یادیں (ڈی جاوو)

انسان، اللہ تعالیٰ کی صناعی اور کاری گری کا شاہ کار ہے۔ اللہ کریم بلاشبہ خالقِ ارض وسما ہے اور اس میں موجود ہر شے اسی کی ایک ''کن'' کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن وہ کون سی خوبیاں ہیں جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہیں؟ یہ جاننے کے لیے یہ بات سمجھنی ضروری ہے کہ اللہ کریم نے دنیا کے ہر جان دار کو کوئی نہ کوئی انفرادیت بخشی ہے۔ کسی کے حصے بے پناہ طاقت آئی تو کوئی بے مثال رفتار کا حق دار ٹھہرا اور جب بات آئی اشرف المخلوقات یعنی حضرتِ انسان کی، تو ہر شے میں کمال کا توازن رکھتے ہوئے اللہ کریم نے انسان کے ذہن کو اوجِ کمال عطا کیا۔

انسانی ذہن ایک ایسی گتھی ہے جسے سلجھانے کی کوشش عشروں سے جاری ہے۔ لیکن ہر کھلنے والی گرہ آپ کے سامنے لاکھوں نئی گرہیں پیش کر دیتی ہے۔ آج کئی برس کی تحقیق کے بعد بھی لاتعداد عوامل ہیں جن کی کوئی بھی توجیہہ پیش کرنے سے انسانی عقل قاصر ہے۔ انہی عوامل میں سے ایک ''ڈی جاوو'' ہے۔

ڈی جاوو، جسے ستم ظریف لوگوں نے مستقبل کی یادوں کا بھی نام دیا، معاشرے میں جتنا عام ہے اتنا ہی ہم اس کے بارے میں کم جانتے ہیں۔ ڈی جاوو فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے 'دیکھا ہوا' یہ اصطلاح اس عمل کے لیے سب سے پہلے ایک فرانسسی پیراسائیکولوجسٹ ایمل بائیریک نے اپنی کتاب "The Future of Psychic Sciences" میں استعمال کی جس کے بعد سے یہ زباں زدِ عام ہوگئی۔ ڈی جاوو اتنا عام ہے کہ ایک تحقیق کے مطابق تمام آبادی کا کم از کم ایک تہائی حصہ، زندگی میں کبھی نہ کبھی اس کا سامنا ضرور کرتا ہے۔

آخر یہ ڈی جاوو ہے کیا؟ اگر اس کی تعریف چند الفاظ میں کی جائے تو اس کا مطلب ہے 'لاشعوری شناسائی' (famalirity without awareness) تاہم، اسے مکمل طور پر سمجھنے کے لیے چند مثالوں پر غور کیجیے۔

فرض کیجیے، آپ شام کو کسی دوست کے ساتھ لان میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ آپ کا دوست ہنستے ہوئے کچھ کہتا ہے اور اسی لمحے آپ کا دماغ سگنل دیتا ہے کہ یہی الفاظ، یہی لہجہ، یہی ماحول، یہی بات، آپ پہلے اسی دوست سے سن چکے

ہیں۔ حالاں کہ یہ ممکن نہیں، کیوں کہ وہ پہلی بار آپ کے گھر آیا ہے۔ آپ حیران ہوتے ہوئے دماغ کے سبھی گوشے کھنگال ڈالتے ہیں لیکن آپ کو یاد نہیں آتا کہ ایسا پہلے کب ہوا تھا۔ پھر بھی آپ کا دماغ مسلسل یقین دلا رہا ہے کہ یہ سب پہلے بھی کبھی ہو چکا ہے۔ لیکن کب، کہاں اور کیسے؟ ان سب سوالوں کے جواب دینے سے قاصر ہے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے آپ پہلی بار کسی دوسرے شہر جائیں اور کوئی منظر یا کوئی عمارت دیکھ کر آپ کو بہت ہی شدت سے احساس ہو کہ یہ تو آپ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں لیکن کہاں؟ یہ یاد نہ آئے تو جان لیجیے آپ 'ڈی جاوو' کا شکار ہو چکے ہیں۔

سائنس ڈیلی میگزین کے 19 نومبر 2008ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک مضمون "The psychology of Deja Vu" میں ڈی جاوو پر ہونے والی ریسرچ کی تفصیل بیان کی گئی اور اس سلسلے میں ہونے والے کچھ تجربات بتائے گئے، جن میں سے ایک تجربہ کچھ یوں تھا کہ ایک سو سے زائد والنٹیئرز اکٹھے کیے گئے اور انہیں چند مشہور شخصیات کے ناموں کی ایک فہرست دی گئی۔ بعد میں تصاویر کی ایک البم دی گئی جس میں بہت سی دیگر تصاویر کے علاوہ ان لوگوں کی تصاویر بھی شامل تھیں، جن کے ناموں کی فہرست پہلے ہی دی جا چکی تھی۔

نتائج میں حیران کن بات یہ تھی کہ اگرچہ والنٹیئرز، فہرست میں شامل بہت سے افراد کو تصاویر سے نہیں پہچان پائے لیکن فہرست میں شامل اکثر شخصیات کی تصاویر دیکھ سب کو ایک عجیب سی شناسائی کا احساس ضرور ہوا جسے وہ کوئی نام نہیں دے پائے۔ ایک اور تجربے میں جب شخصیات کی تصاویر کی جگہ مشہور مقامات کی تصاویر استعمال کی گئیں تب بھی یہ نتائج یونہی برقرار رہے۔

لیکن گھبرائیے مت۔ ڈی جاوو کوئی بیماری نہیں، بس ہمارے کرشماتی دماغ کا ایک شعبدہ ہے اور اس کا جسم یا دماغ پر کوئی بھی مضر اثر نہیں ہوتا۔ ڈی جاوو کسی اجنبی مقام، کسی بات، کسی واقعہ سے آپ کی ایسی شناسائی ہے، جسے آپ خود کوئی معنی نہ پہنا سکیں۔ لیکن یہ ہوتا کیوں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ ڈی جاوو پر تحقیق برسوں سے جاری ہے لیکن یہ عمل اتنا پیچیدہ اور گنجلک ہے کہ آج بھی ہمارے پاس اس کی وضاحت کے لیے چند غیر مصدقہ تھیوریز کے سوا کچھ نہیں اور یہ تھیوریز کیا کہتی ہیں؟ آیئے دیکھتے ہیں۔

ایک نظریہ یادداشت سے متعلق ہے، جو کہتا ہے کہ انسان جب بھی کچھ سنتا ہے یا دیکھتا ہے یا کسی بھی اور حس سے محسوس کرتا ہے تو اس کے سگنلز دماغ کے دو حصوں کو جاتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے پہچان کا سینٹر، جہاں آنے والی اطلاعات کو پرکھ کر بتایا جاتا ہے کہ یہ سگنلز کیا کہتے ہیں۔ دوسرا حصہ ہوتا ہے یادداشت کا سینٹر، جو انسان کی یادداشت ترتیب دیتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آنے والے سگنلز، پہچان کے سینٹر کی بجائے یادداشت کے سینٹر میں پہلے پہنچ جاتے ہیں، جس کی وجہ سے جب پہچان کا سینٹر ان سگنلز کو پرکھ کر یادداشت کو کھنگالتا ہے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہوتے ہیں اور

دماغ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب ہو بہو ایسے ہی، انہی حالات میں، پہلے رونما ہو چکا ہے۔ حالاں کہ ایسا حقیقت میں نہیں ہوتا۔

دوسرا مشہور نظریہ، نظر کے متعلق ہے، جو یہ کہتا ہے کہ انسان جب کوئی چیز دو آنکھوں سے دیکھتا ہے تو دونوں آنکھوں کے سگنلز کی دماغ تک پہنچنے کی رفتار میں فرق آجاتا ہے۔ اگرچہ یہ فرق ایک سیکنڈ کے انتہائی چھوٹے حصے جتنا ہوتا ہے لیکن یہ ڈی جاوو کی صورت حال پیدا کر سکتا ہے۔ اس صورت میں ایک آنکھ سے آنے والے سگنلز پہلے ہی یادداشت میں رقم ہو چکے ہوتے ہیں، پھر جب کم رفتار والی آنکھ کے سگنلز پہنچتے ہیں تو دماغ یہی سمجھتا ہے کہ یہ سب دوسری بار وقوع پزیر ہو رہا ہے۔

یہ نظریہ زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر پایا کیوں کہ یہ ڈی جاوو کو صرف ایک حِس تک محدود کر دیتا ہے۔ جب کہ ڈی جاوو میں نظر، سماعت اور قوتِ شامہ سمیت تمام حِسیں شامل ہوتی ہیں۔

ایسا ہی ایک مشہور نظریہ ڈی جاوو کو خوابوں سے جوڑتا ہے۔ تاہم، خوابوں کے متعلق جاننے سے قبل ہمیں نیند کا تھوڑا سا تعارف جاننے کی ضرورت ہے۔ انسانی نیند دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

Rapid Eye Movement Sleep / REM Sleep اور Non Rapid Eye Movement Sleep / NREM Sleep

نیند کی یہ دونوں اشکال ہماری رات کی نیند کو تشکیل دیتی ہیں۔ ریم سلیپ کا دورانیہ قریباً نوے منٹ کا ہوتا ہے، اس کے بعد تیس منٹ نان ریم سلیپ کے ہوتے ہیں، جس کے بعد پھر سے ریم سلیپ شروع ہو جاتی ہے۔ یہی چکر تمام رات جاری رہتا ہے۔ ڈی جاوو کا اس سے تعلق کچھ اس طرح بنتا ہے کہ انسان کو عام طور پر وہی خواب یاد رہتے ہیں جو نان ریم سلیپ کے تیس منٹ کے دوران دیکھے جائیں۔

ریم سلیپ میں بھی خواب ہوتے ہیں لیکن ریم سلیپ کے دوران شارٹ ٹرم میموری کو لانگ ٹرم میموری میں تبدیل کرنے والا نظام کام نہیں کر رہا ہوتا۔ اس لیے عموماً ریم سلیپ کے دورانیے میں دیکھے جانے والے خواب شعوری یادداشت کا حصہ نہیں بنتے۔ تاہم، لاشعور میں ان کا احساس موجود رہتا ہے۔ اس لیے جیسے ہی ہمارے سامنے کسی خواب سے ملتا جلتا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو خواب تو ہمیں یاد نہیں آتا لیکن اس منظر کو پہلے دیکھا ہوا ہونے کا احساس موجود رہتا ہے۔

ان نظریات سے بڑھ کر سائنس کا علم بھی ڈی جاوو کے بارے میں ہمیں کچھ بتانے سے قاصر ہے۔ اگرچہ اللہ کریم نے زمین و آسمان کی ہر شے انسان کے لیے تسخیر کر دی لیکن تسخیر کے اس سفر میں ڈی جاوو جیسی لاتعداد رکاوٹیں اب بھی موجود ہیں اور انسانی عقل اپنی تمام تر ترقی کے باوجود ڈی جاوو جیسی لاتعداد گتھیوں کے سامنے بے بس نظر آتی

ہے۔ مستقبل میں شاید ایک وقت ایسا آئے جب ہم اسے مکمل طور پر سمجھ پائیں لیکن موجودہ حالات میں ڈی جاوو ایک راز ہے اور کب تک راز ہی رہے گا؟ اس کے بارے میں کچھ بھی کہنا ناممکن ہے۔

☆.....☆.....☆

تبرک (افسانچہ)

محفل پر وجد طاری تھا۔ پورا پنڈال پیر صاحب کی آواز کے زیر و بم میں کھویا ہوا تھا۔ میدان کے سرے پر موجود گھروں کی دیواروں سے ٹکرا کر جب آواز کی بازگشت دوبارہ کانوں میں گونجتی تو ایسا لگتا جیسے ایک ایک لفظ دل پر نقش ہوا جا رہا ہو۔ پیر جی مانے ہوئے مقرر تھے۔ یہ فن انہیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد صاحب ایک بہت بڑے بزرگ کے سجادہ نشین تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ گدی پیر صاحب کو مل گئی تھی۔ وراثت میں گدی اور شہرت تو ملی ہی تھی لیکن اسے چار چاند لگانے میں پیر صاحب کے اپنے فن خطابت اور دینی معاملات پر دسترس کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ تقریر کی شروعات ہی سے ایسا سماں باندھتے کہ آخر تک لوگوں کی توجہ بھٹکنے نہ پاتی۔ لوگ ہر ہر لفظ اپنے اندر جذب کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایسا ہی کچھ سحر آج بھی محفل پر طاری تھا۔

معظم نے گردن موڑ کر ساتھ بیٹھے ساجی کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خود اس کی آنکھ بھی خطاب کے دوران کئی موقعوں پر نم ناک ہوئی تھی لیکن ساجی کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دیکھ کر اس کے دل کو عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ ساجی کو آج وہ زبردستی یہاں کھینچ کر لایا تھا، اس یقین کے ساتھ کہ وہ سدھر جائے گا۔ اس کا یقین بے جا نہ تھا۔ اس کے دل پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں یہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔

اسٹیج پر مولانا صاحب اختتامی کلمات کہہ رہے تھے۔ وہ خاموش ہوئے تو چند لمحے سکوت چھایا رہا پھر پنڈال مرحبا اور نعرۂ تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا۔

''کیسا رہا؟'' معظم نے مڑ کر مسکراتے ہوئے ساجی سے پوچھا۔

''یار! بہت ہی اچھا بیان تھا۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ مولانا صاحب اتنا اچھا بولتے ہوں گے''۔ ساجی نے بھرائے ہوئے سے لہجے میں جواب دیا۔

معظم اور ساجی ایک ہی گلی کے رہنے والے تھے اور ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں میں بے تکلفی بھی

بہت تھی۔ معظم شروع سے نماز روزے کا پابند تھا اور باقاعدگی سے دینی محافل میں جایا کرتا تھا۔ لیکن ساجی ان سب چیزوں سے دور بھاگتا تھا۔ آج کی محفل میں بھی معظم اسے زبردستی کھینچ لایا تھا اور اس کی ایک بہت بڑی وجہ تھی۔ لڑکپن میں ساجی کے پاؤں غلط راہوں پر چل نکلے تھے اور اسے چوری چکاری کی عادت پڑ گئی تھی۔ لیکن وہ کوئی بڑا چور نہیں تھا، بس چھوٹی موٹی چیزیں چرایا کرتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ مزہ جوتیاں چوری کرنے میں آتا تھا۔ بقول ساجی کے، جوتی چوری پر نہ تو کسی مقدمے یا پولیس کا ڈر ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی چور کا پیچھا کرتا ہے۔ اس لیے جمعے کے جمعے وہ قریب کے چند گاؤں کی مساجد میں 'حاضری' دیا کرتا تھا۔ معظم اس کی اس عادت سے بہت تنگ تھا اور اکثر اسے سمجھاتا رہتا تھا۔ ساجی پر کچھ دن اثر رہتا پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ مگر آج اس کے اندر تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ معظم نے اطمینان کی سانس لے کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''میں تو کب سے تمہیں آنے کا کہہ رہا تھا پر تم مانتے ہی نہیں تھے''۔

''ہاں بھائی!'' ساجی نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ اسٹیج کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں مولانا صاحب عقیدت مندوں سے ہاتھ ملانے میں مشغول تھے۔

''معظم یار! تم بیٹھو، میں ذرا پیر جی کا ہاتھ چوم کر دعا لے آؤں''۔ ساجی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، تم جاؤ، میں یہیں بیٹھا ہوں''۔ ساجی لوگوں کے درمیان جگہ بناتا ہوا اسٹیج کی جانب چل دیا، جہاں لوگ پیر جی کو گھیرے ہوئے تھے۔

معظم کو بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ساجی واپس آتا دکھائی دیا۔ معظم بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں پنڈال کے دروازے کی جانب چلے۔ معظم کی نظر ساجی کی چادر پر پڑی تو دیکھا کہ اس نے چادر میں کچھ لپیٹ رکھا ہے۔

''یہ کیا ہے؟'' معظم نے پوچھا۔

''تبرک''۔ ساجی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ معظم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مڑ کر اسٹیج کی جانب دیکھا جہاں پیر صاحب چند عقیدت مندوں کے ساتھ پریشان سی صورت بنائے اپنی جوتی تلاشنے میں مصروف تھے۔

☆.....☆.....☆

زرخیز زمین

ہشششش....سنو!

کیا ہے؟ ایک ناراض سی آواز ابھری۔

یار! ہم کب تک یہاں پڑے رہیں گے؟ افففف....ایک تو تم بھی ناں.... پتا ہے باہر کتنی سردی ہے؟

ہاں۔ یہ تو پتا چل ہی رہا ہے، تو پھر؟ اس وقت باہر نکل کر اپنی قلفی جمانی ہے کیا؟ پڑے رہو چپ چاپ۔ اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

پڑے رہ کر کیا کروں؟ مجھے نیند نہیں آ رہی۔

تو ملکی حالات پر غور و فکر شروع کر دو۔ لیکن خدا کے لیے مجھے تو سونے دو۔ اکتائی ہوئی آواز آئی اور وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو کروٹ بدل کر گزرے ہوئے دنوں پر غور شروع کر دیا۔ ہمیں یہاں آئے دو ہفتے ہونے کو تھے۔ یہاں آنے کی وجہ وہی ناسمجھ بچہ اور اس کے بوڑھے دادا جی تھے، جو آج کل بار بار میری نیند خراب کرنے کا باعث بن رہے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ میرے دوست یا تو ان کی آواز سن نہیں پاتے تھے یا سننا نہیں چاہتے تھے لیکن مجھے ان کا ہر ایک لفظ بخوبی سنائی دیتا تھا۔ وہ دونوں ہم سے ملنا چاہتے تھے اور خواہش مند تو میں بھی تھا۔ لیکن انہیں کون سمجھاتا۔ ابھی موسم ہماری ملاقات کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ ہماری نازک جان اس قابل نہیں تھی کہ ٹھنڈی بے رحم ہوا کے تھپیڑے برداشت کر پاتی۔ ہمارے نرم پیر سنگ ریزوں کی چبھن نہیں سہ سکتے تھے۔ اس موسم اور ان حالات میں باہر نکلنے کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا۔ یقینی موت اور یہ انجام میرے سب دوستوں اور مجھے بھی تھوڑا سا خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

یہی وجہ تھی کہ یہاں آ کر حالات کا جائزہ لیتے ہی میرے سب دوست لمبی تان کر سو چکے تھے۔ گوشہ نشینی، موت سے تو ہزار درجہ بہتر تھی ناں۔ لیکن کیا کرتا اس بچے کا، جو روزانہ دادا کو کھینچتا ہوا ہمارے دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ امید کا ایک سمندر آواز میں سموئے دادا سے کہتا، دادا جی! خوب غور سے دیکھیں، آج وہ ضرور باہر نکلے ہوں گے۔ مجھے پورا یقین ہے۔ میں اس کو دیکھ تو نہیں پاتا تھا لیکن اس کی آواز میں ہلکورے لیتا جوش اور یقین مجھے افسردہ سا کر دیا کرتا۔ میرے تصور میں اس کی چمک دار آنکھیں آ جاتیں، جو امید کی جوت جگائے ہمیں تلاشتی رہتی تھیں۔ دادا جی بچے کا دل رکھنے کو چند لمحے یہاں وہاں دیکھتے اور پھر کہتے۔ رازی بچے! میں نے پہلے بھی کہا تھا ناں.... یہ زمین ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں یہ جگہ پسند نہیں آئے گی۔ ہر طرف تو پتھر اور جھاڑ جھنکار بکھرا ہوا ہے۔ اوپر سے موسم دیکھو۔ ایسے میں وہ کیوں کر باہر آئیں گے۔ اس پر بچہ تھوڑی دیر خاموش رہتا لیکن اس کا معصوم دل ہار ماننے کو تیار نہ ہوتا۔

نہیں دادا جی۔ آپ دیکھ لیجیے گا، وہ ایک دن ضرور باہر آئیں گے۔ اس کی آواز میں کم زوری کی ہلکی سی جھلک مجھے افسردہ کر دیا کرتی۔ اس کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی تھوڑا ڈوب سا جاتا۔ یہ سب پچھلے دو ہفتوں سے تواتر سے دُہرایا جا رہا تھا۔ لیکن آج کچھ ہوا تھا۔ آج جب بچہ اور دادا جی حسب معمول جائزہ لینے آئے تو وہی پرانے حالات دیکھ کر دادا جی نے ایک بار پھر زمین اور حالات کی خرابی کو الزام دیا۔ میری سماعتیں منتظر تھیں کہ آج پھر بچہ امید کا دیا روشن کرے گا لیکن یہ انتظار، انتظار ہی رہا۔ دونوں اسی اداس خاموشی کا حصہ بن کر لوٹ گئے۔

وہ تو چلے گئے تھے لیکن میں تب سے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ صبح سے شام ہونے کو تھی اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے اپنا اضطراب اپنے دوستوں سے بھی بیان کیا تھا۔ لیکن ان سب نے یک زبان ہو کر باہر نکلنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ زندگی سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ بھلا وہ کیوں ایک ناسمجھ بچے کے لیے اسے داؤ پر لگاتے۔ سب کا فیصلہ مجھے بھی ماننا ہی پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ سب نیند کی حَسین وادیوں میں کھو گئے تھے لیکن میں جاگ رہا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود نیند نہیں آ سکی تھی۔ میں سوچوں کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی کوئی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ باہر کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔

اس وقت کون آ گیا؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ کیا وہی بچہ اور دادا جی....؟ لیکن نہیں، یہ جو کوئی بھی تھا، اکیلا تھا۔ قدموں کی نرم سی آواز ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ سنو! تم سن رہے ہو ناں؟ یہ تو وہی بچہ تھا لیکن یہ آج اکیلا کیوں تھا، وہ بھی اتنی شام کو۔ شاید سن ہی رہے ہوں گے۔ اس کی آواز پھر سے ابھری۔ میں سن رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر بتانا چاہا لیکن شاید وہ مجھے سن نہیں سکتا تھا۔ شوں شوں.... یہ کیا؟ وہ رو رہا تھا کیا؟ لیکن کیوں؟ میں پریشان سا ہو گیا۔ دادا جی نے آج مجھے ڈانٹا۔ اوہ.... اچھا! تو یہ بات تھی۔ میں نے اپنے پورے مہینے کی پاکٹ منی تم لوگوں پر خرچ کر دی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنے پیسے ضائع کر دیے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز نہ نکلی اور کہنے کے لیے

میرے پاس تھا ہی کیا۔ بچہ سسکیوں کے بیچ اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

میرا بہت دل کرتا تھا کہ یہاں بھی رونق ہو۔ میرے سب دوستوں کے گھر کے آس پاس اتنی خوب صورتی ہوتی ہے۔ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ یہاں بھی ویسے ہی رنگ بکھریں، تو دادا جی سے ضد کر کے میں تم لوگوں کو یہاں لے آیا۔ لیکن دادا جی کہہ رہے ہیں کہ میں نے اپنے پیسے ضائع کر دیے۔ وہ تھوڑا سا رکا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں۔ یہاں کوئی خوب صورت اور اچھی چیز پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور وہ اب مجھے یہاں ضائع کرنے کو اور پیسے نہیں دیں گے۔ اگر مجھے یہی کرنا ہے تو پھوپھو کے گھر میں کوشش کرنی چاہیے، وہاں کی مٹی اچھی ہے۔

اس کی آواز ایک بار پھر سسکیوں میں ڈوب گئی۔ میں دَم سادھے سن رہا تھا۔ لیکن میں تو اپنے گھر کو خوب صورت بنانا چاہتا تھا۔ مجھے کسی اور کے گھر سے کیا لینا۔ اس سے آگے اس کی آواز ڈوب گئی اور چند لمحوں کے بعد اس کے واپس جاتے قدموں کی آوازیں میری سماعت پر دستک دے رہی تھیں۔

میں نے ایک لمبی سانس لے کر پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھرنے کی کوشش کی۔ چہرے پر ہوا کا لمس بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ موسم کافی ٹھنڈا تھا لیکن اندر کے جوش اور عزم کے سامنے یہ ٹھنڈ کچھ نہ تھی۔ مشرق کی جانب دُور افق پر سپیدۂ سحر آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد سورج نے انگڑائی لے کر اندھیرے کی چادر سے باہر جھانکا اور میرے نومولود وجود کو دیکھ کر سراپا اشتیاق بن گیا۔ اس کی روشن کرنیں مجھے چھو کر میرے وجود کا یقین کرنے لگیں۔ اوس کے جمے ہوئے قطرے سورج کی حرارت پا کر جھرجھری لے کر بیدار ہوئے اور آنکھوں کے کٹوروں میں حیرت بھر کر مجھے دیکھنے لگے۔ شاید انہیں بھی دادا جی کی طرح اس زمین کے بانجھ پن کا یقین ہو چکا تھا۔

باہر روشنی اپنا تسلط جما رہی تھی لیکن اندھیرے کی فوج کے بچے کھچے سپاہی ابھی گھر کی چار دیواری میں قید خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ میں اس نظارے میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہی چھوٹا سا بچہ ایک چادر لپیٹے، سر پر سرخ پھندنے والی ٹوپی پہنے آ رہا تھا۔ قریب آ کر وہ رک گیا۔ اس کی ناک کی نوک خنکی کے باعث سرخ ہو رہی تھی اور آنکھوں میں ابھی کچی نیند کا خمار باقی تھا۔ وہ یہاں وہاں دیکھتا رہا۔ میں خاموش کھڑا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ تحیّر اور بے یقینی سے بے پناہ مسرت تک کا سفر اس کے چہرے نے ایک ہی لمحے میں طے کر لیا۔

دادا جی ی ی ی ی ی ی۔ اس کے ٹھٹھرے ہوئے ہونٹوں سے ایک چیخ کی سی صورت میں برآمد ہوا۔ اس نے پلٹ کر واپس گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔ افراتفری میں چادر اور ٹوپی وہیں گر گئے لیکن ان کی پروا کسے تھی۔ دادا جی.... جلدی اٹھیے! اس نے گھر میں گھستے ہی چیخ سے لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔ اندھیرے کی آخری فصیل بھی گر چکی تھی۔

چلیے میرے ساتھ باہر۔آپ ایویں کہتے تھے کہ یہ زمین بنجر ہے۔ یہاں جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں اُگ سکتا۔ اب اٹھیں ناں۔چل کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ایک بیج اُگ آیا۔

باقی بھی اُگیں گے۔دادا جی کی خوابیدہ سی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ بچے کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ اب دیکھتا ہوں،آپ مجھے کیسے اور پیسے نہیں دیتے۔میں یہاں گلاب،موتیا،پینزی اور ڈھیر سارے دوسرے پھول بھی لگاؤں گا۔ پورا باغ بنے گا یہاں۔ ہوا کے کاندھوں پر سوار ہو کر اس کی چہکتی آواز مجھ تک بخوبی پہنچ رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر سوچا۔آگے سفر مشکل سہی ناممکن تو نہیں تھا ناں۔

☆.....☆.....☆

موجودہ سے سابق تک کا سفر

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اگرچہ ابھی اکتوبر کا مہینہ چل رہا تھا لیکن بارش کے بعد چلنے والی یخ ہوا نے ابھی سے جنوری کی راتوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ کئی دن کے بعد آج جا کر سورج کا درشن نصیب ہوا تھا۔ آج وہ اور اس کا بیٹا، ڈیرے پر باجرے کے کھیت کے کنارے چارپائیاں ڈالے مزدوروں کی نگرانی کر رہے تھے۔ پاس ہی اینٹوں کا چھوٹا سا چولہا بنا ہوا تھا، جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ایک مزدور پاس بیٹھا کوئلوں پر باجرے کے سٹّے بھون رہا تھا۔

تاج اور اس کا بیٹا آپس میں باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک موٹر سائیکل آ کر ڈیرے پر رکی۔ بسم اللہ۔ شاہ جی آ گئے؟ تاج جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آنے والا علاقے کا پٹواری سبطین شاہ تھا۔ تاج نے جلدی سے اٹھ کر چارپائی جھاڑی اور بیٹے کو آواز دی۔ اوئے سلیم! جا بھاگ کر ڈیرے میں سے تکیے نکال کر لا۔ آؤ شاہ جی! ادھر بیٹھو۔ تاج نے اپنی جگہ شاہ جی کو دی اور خود چارپائی کی پائنتی کی جانب ٹک گیا۔

شاہ جی نے سلام کا جواب دیا اور سلیم کے لائے ہوئے تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اوئے! یہ سٹّہ دے ادھر۔ تاج نے سٹّے بھوننے والے مزدور کو آواز دی اور بھنا ہوا سٹّہ ہاتھ میں مسل کر اس میں سے دانے نکالنے لگا۔

تاج! اس بار فصل تو بہت شان دار ہوئی ہے تمہاری۔ شاہ جی نے کھیت پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ اللہ نے کرم کیا ہے شاہ جی! ورنہ اس بار محکمے والوں نے بڑا ہی گندہ بیج دیا تھا۔ ہوں.... تم لوگوں نے محنت بھی تو بہت کی ہے۔ بس شاہ جی! محنت کو بھی اللہ رنگ لائے تو لگتے ہیں۔ ورنہ سب کیتی کرائی ضائع جاتی ہے۔ تاج نے فلسفیانہ سے انداز میں جواب دیا۔ دانے نکل چکے تھے۔ تاج نے ہتھیلی کا چھجا سا بناتے ہوئے دو تین ہلکی سی پھونکیں مار کے چھلکے صاف کیے اور دونوں ہاتھوں سے بڑے ادب کے ساتھ دانے شاہ جی کو پیش کیے۔ فصل کا پہلا جھاڑ چکھیں شاہ جی۔ شاہ جی نے دانے پھانکے اور مزے سے کھانے لگے۔ تاج ایک اور سٹّہ لے کر اسے مسلنے لگا۔

شاہ جی! وہ تارڑوں کی زمین کا کیا بنا؟ سنا ہے، کیس پھنس گیا ہے؟ ہاں کیس تو پھنس گیا ہے پر شُکر ہے میری

جان چھوٹی۔ ہیں....وہ کیسے شاہ جی؟ تاج نے سٹّہ مسل کر پھونک مارتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ میرا تبادلہ ہوگیا ہے ناں۔ تاج نے دانوں سے سر اٹھا کر حیرانی سے شاہ جی کو دیکھا۔ تبادلہ ہوگیا آپ کا؟

ہاں بھئی....کل ہی ہوا ہے۔ شکر ہے اس لڑائی سے میرا سر چھوٹ گیا۔

یہ تو ٹھیک کہا شاہ جی آپ نے، تاج نے، جو شاہ جی کو بڑے ادب و آداب سے دانے صاف کر کے دے رہا تھا، مختصر سا جواب دیا، پھر ایک نگاہ ہتھیلی پر پڑے دانوں پر ڈالی اور شاہ جی کو دینے کی بجائے خود ہی پھانک لیے۔ ایک پل کو شاہ جی، پٹواری سے سابق شاہ جی پٹواری ہو چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

صدف نایاب

صدف نایاب کا تعلق اسلام آباد سے ہے۔تعلیم گریجویشن ہے۔3 برسوں سے با قاعدہ لکھ رہی ہیں۔ ایک سال سے رائٹرز کلب سے بطور ممبر وابستہ ہیں۔رائٹرز کلب کے پلیٹ فورم سے ملک کے صف اول کے اخبارات اور میگزین میں اپنی تحریریں شائع کروا چکی ہیں۔

فہرست تحریر

1-ایک احساس

2-ڈراما

3-ہم بنے لکھاری

4-میں تو اُمّتی ہوں

5-قاتل پر ایک نظر

☆.....☆.....☆

ایک احساس

آج سب گھر والے ایک رشتے دار کی طرف جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ میں نے چھوٹی بیٹی کو بھی ساتھ ہی بھیج دیا کہ چلو... سیر ہو جائے گی۔ میرا بھی جانے کا ارادہ تھا مگر چھوٹے بیٹے کی طبیعت کی خرابی کے باعث جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے لے کر ہسپتال چلی گئی۔ واپس آئی تو گھر بالکل خالی تھا۔ اگرچہ بالائی منزل پر رشتے دار موجود تھے مگر نچلی منزل میں، میں بالکل اکیلی اپنے دو سال کے بچے کے ساتھ تھی۔ اوپر والوں نے بھی شاید یہ سمجھا کہ میں بھی گئی ہوئی ہوں لہٰذا، ان کا دروازہ بھی بند تھا۔ اب میں بالکل تن تنہا تھی، نیچے کا پورشن ہوتا بھی خوب بڑا اور لمبا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ بچپن ہی سے کوئی بہت زیادہ ڈرپوک تو نہیں رہی کہ بالکل ہی اکیلی نہ رہ سکوں مگر اندھیرے اور اکیلے پن کا ایک نفسیاتی سا خوف بہرحال اعصاب پر طاری ہو ہی جاتا ہے۔ ابھی ساگ بھی رکھا ہے، وہ بھی بنانا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی اور پالک کی گڈیاں اٹھا کر لائی کہ اب کاٹوں گی، اچانک انتہائی زور و شور سے آندھی چلنے لگی۔ سائیں.... سائیں.... کی ہول ناک آواز۔ دروازے، کھڑکیاں، سب تڑتڑ بجنے لگے۔ بجلی ایک جھٹکے سے چلی گئی مگر اللہ کا شکر، یو پی ایس کی بدولت یہ پریشانی بھی ایک لمحے سے کم ہی کی تھی۔ وینٹ میں رکھے کوڑے کے ڈبے لڑکھڑانے لگے۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور بجلی کی کڑک و بادل کی گرج سے میں سہم گئی۔ وینٹ ہی میں لاؤنج کی جالی میں کولر لگا ہوا ہے۔ اس پر کچھ فالتو تھرماپول کی شیٹیں رکھی ہوئی ہیں، جو تیز آندھی کے باعث سر.... سر.... شیشے سے ٹکرا کر ایک عجیب سی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ پورچ میں کھڑی گاڑی بھی گرج چمک کی آواز سے بولنے لگی۔ بیٹھک کا دروازہ اگرچہ بند تھا مگر تند ہوا کے جھونکے اسے دھکا دے رہے تھے، جس کے باعث وہ دھڑ دھڑ بول رہا تھا۔

پانچ دس منٹ کے اس عرصے میں سارا گھر ایک پُراسرار حویلی کا نقشہ پیش کرنے لگا اور ان سب میں کچھ دیر کے لیے ڈر کے مارے میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ بیٹا بھی ان آوازوں سے ڈر کر رونے لگا۔ میں نے اپنے میاں

کوفون کر کے پوچھا کہ آپ کہاں ہیں؟ انہیں کسی جگہ ضروری کام سے جانا تھا جس کے باعث دیر سے گھر لوٹنا تھا۔ میں نے تھوڑا برہم ہوتے ہوئے کہا، ''آج جلدی آجائیں، چھوڑیں کل چلے جایئے گا''۔ مگر ان کا کام ضروری تھا اس لیے مجھے سمجھانے لگے۔ میں نے بھی ''ٹھیک ہے''۔ کہہ کر فون کاٹ دیا۔ ابھی میں اسی ٹینشن کی حالت میں تھی کہ ایک احساس نے دل و دماغ پر دستک دی اور میں اپنے آپ کو انتہائی طاقت ور محسوس کرنے لگی۔ اگرچہ میں ڈر گئی تھی مگر ''حسبنا اللہ'' کا ورد بے اختیار زبان پر جاری ہو گیا۔ ایسے میں اس احساس کا پیدا ہونا کہ چلو....کوئی اور ذی روح نہ سہی مگر اللہ تو ساتھ ہے۔ اس احساس نے مجھے بے پناہ حوصلہ اور ہمت بخشی۔ ایک اور اتفاق یہ ہوا کہ دن میں، میں اپنی بیٹی کو بتا رہی تھی کہ ''بیٹا! چاہے ماما بابا آپ کو دیکھیں نہ دیکھیں مگر اللہ آپ کی ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے''۔ بس اس بات پر عمل کا وقت مجھ پر اس وقت آیا اور اللہ نے شاید مجھے چیک کرنے کے لیے ہی مجھے ان حالات میں رکھا کہ میں اپنے اس کہے پر کتنا ایمان رکھتی ہوں۔

اللہ کے ہونے کا احساس بہت ہی زبردست تھا۔ بالکل ایسا لگا کہ کوئی میرے ساتھ ہے، میرے دل کے بالکل قریب مجھے خود کو سنبھالنے میں مدد دی۔ ڈر و خوف کا ایسا عالم تھا کہ شیطان نے فوراً دماغ میں بسیرا کر لیا۔ بس اس ایک احساس کا آنا تھا کہ 'اللہ دیکھ رہا ہے'۔ میرے حواس بحال کر دیے اور میں نے سکون سے جا کر نماز مغرب ادا کی پھر واپس کچن میں آ کر کام نمٹائے۔ اتنی دیر میں آندھی کا زور بھی ٹوٹ گیا اور ابرِ رحمت برسنے لگا۔ آج کے اس واقعے نے مجھے احساس دلایا کہ اگر آج ہم میں سے ہر کوئی یہ بات سمجھ لے کہ وہ ذات، جسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ وہ ہر پل ہماری نگرانی کر رہا ہے تو ہر انسان اپنے ہاتھوں سے کمائی جانے والی برائیوں کا بیش تر حصہ اپنی زندگی سے ختم کر دے بلکہ اللہ کی توفیق سے حسب استطاعت برائی کو حد درجہ دبا دے، یہاں تک کہ وہ ہماری زندگیوں سے حذف ہی ہو جائے، آمین اور ہر طرف نیکی کا دَور دَورہ ہو۔

☆.....☆.....☆

ڈراما

''طلاق...طلاق....میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔ یہ سننا تھا کہ زوہا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہاتھ میں ریموٹ پکڑے زوہا روئے جا رہی تھی۔اتنے میں اس کی کام والی آئی اور زوہا کے بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی،''نہ رو باجی! عورت کا تو مقدر ہی یہی ہے۔ یہ تو صرف ایک ڈراما ہی ہے۔اس پر کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہو؟''

''ڈراما!؟ یہ محض ڈراما نہیں ہے۔مجھ سمیت ہر عورت کی زندگی کی کہانی ہے۔دیکھا نہیں تم نے،عرفان کس لہجے میں مجھ سے بات کرتا ہے۔اپنے گھر والوں کے سامنے میری بے عزتی کرتا ہے۔ بات بات پر ڈانٹتا ہے۔اپنی بھابھیوں کے برے رویے کو نظر انداز کرتا ہے۔صرف اس لیے کہ وہ کزن ہیں۔تم دیکھنا نوشی! عرفان بھی میرے ساتھ ایسا ہی کرے گا''۔

''نہ....نہ باجی! ایسا کچھ نہیں ہوگا''۔نوشی نے اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ ایک دن زوہا یونہی بیٹھی ڈراما دیکھ رہی تھی کہ بے اختیار ہنسنے لگی۔''نوشی! نوشی! ادھر آؤ جلدی۔ یہ دیکھو، کتنے مزے کا سین چل رہا ہے۔ ہیرو، ہیروئین کیسے ایک ساتھ بیٹھے محبت بھری باتیں کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے۔ ہائے....کاش! عرفان بھی کبھی مجھ سے ایسے ہی پیار سے بات کرے''۔

نوشی بہت چھوٹی سی عمر سے زوہا کے گھر میں کام کرتی تھی،اس لیے وہ گھر والوں جیسی ہی تھی۔زوہا کی بات سن کر اس کے ساتھ ہمدردی جتانے لگی۔زوہا بھی اپنے سارے دکھڑے اسے ہی سنانے لگی تھی۔سوشل میڈیا اور ٹی وی کا حد سے بڑھا ہوا استعمال، زوہا کو حقیقی دنیا سے بہت دُور لے گیا تھا جس کے باعث آج یہ نوبت آ چکی تھی کہ اسے ہر وقت لگتا کہ عرفان اور اس کے سسرال والے انتہائی برے ہیں اور کسی بھی وقت عرفان مجھے گھر سے نکال دے گا۔

ایک دن زوہا نے دیکھا کہ نوشی بڑی تیار ہو کر بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی ہے۔اس نے پوچھا،''کیا بات ہے بھئی! آج تو بہت تیار بیٹھی ہو؟''''زوہا! زوہا! کہاں ہو؟ آؤ بازار چلتے ہیں۔ بہت دن سے کچھ خریدا نہیں تم نے''۔زوہا کے شوہر نے اس سے کہا۔''کیا بات ہے، آج کیسے میرا خیال آ گیا؟''زوہا نے کڑوے سے لہجے میں جواب دیا۔ابھی وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ ساس کی آواز آئی۔''ارے عرفان بیٹا! میرا نظر کا چشمہ ٹوٹ گیا ہے، کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ شاید نمبر بھی بڑھ گیا ہے۔تم مجھے لے جاؤ گے ڈاکٹر کے پاس؟''

''جی امی!''عرفان نے جواب دیا۔''زوہا! میں آتا ہوں تو چلتے ہیں۔تم تیار رہنا،ٹھیک''۔''نہیں رہنے دیں، آپ کی امی کو گوارا نہیں کہ ہم پل دو پل اکٹھے کہیں بیٹھ جائیں۔فوراً آ گئیں اپنا دکھڑا لے کر''۔''زوہا کیا ہو گیا ہے تمہیں، امی کو تو ہمارے پروگرام کا پتا بھی نہیں اور جب میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا، اس وقت بھی تم نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اور اب یہ بدتمیزی کر رہی ہو''۔عرفان حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے بولا۔

''ہاں ہاں....میں ہی بدتمیز ہوں۔کبھی اپنی امی کو نہ دیکھنا''۔زوہا نے شکایتوں کا ایک پلندہ کھول کر رکھ دیا۔پھر جو تماشا لگا وہ ساری دنیا نے دیکھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرفان نے زوہا کو ایک تھپڑ دے مارا۔''دیکھا نوشی! میں نہ کہتی تھی کہ عرفان بھی ویسا ہی کرے گا جو ڈرامے میں ہوا''۔اس بات کو بہت دن بیت گئے۔آج زوہا پھر نوشی کے سامنے اپنے دکھڑے لیے بیٹھی تھی۔''ہاں باجی! صحیح کہا''۔نوشی کی ہمدردی نے جلتی پہ تیل چھڑکنے کا کام کیا۔

دن ایسے ہی گزرتے رہے۔ایک دن رات کے دو بجے زوہا کی آنکھ کھل گئی۔کچن تک پانی لینے گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ بیٹھک کی روشنی جل رہی ہے اور عرفان کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔زوہا نے دروازے کی درز سے اندر جھانکا تو کیا دیکھتی ہے کہ عرفان نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا ہے اور روتا جا رہا ہے۔''یا اللہ! مجھے معاف فرما دینا، میں آپ کی بندی پر رحم نہ کر سکا''۔زوہا یہ سن کر سکتے میں آ گئی۔اس بات کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا، پھر کچھ عرصہ بہت پیار و محبت میں گزرا۔ایک دن زوہا کی جٹھانی کسی ضروری کام سے بازار گئیں، جس کے باعث گھر کی ہانڈی روٹی، برتن سب اسے کرنے پڑے۔اگرچہ نوشی بھی کام کاج کرنے والی تھی مگر کسی وجہ سے جلدی چھٹی لے کر چلی گئی۔جب اس کی جٹھانی آئیں تو بہت تھک چکی تھیں اور پورا دن وہ مزید کچھ نہ کر سکیں۔خیر....وہ دن تو جیسے تیسے کر کے زوہا نے گزار لیا مگر اس کے دل کی کڑھن نہ گئی۔

زوہا اگلے روز ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھی۔ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک پڑوسن ملنے کے لیے آ گئیں۔ ساس کہیں گئی ہوئی تھیں۔زوہا کی جٹھانی نے کہا، میں ہانڈی پکا رہی ہوں۔تم چائے بنا کر لے جاؤ۔یہ سننا تھا کہ زوہا کو شدید غصہ آ گیا۔''اب آپ نے دیکھ لیا کہ میں تھوڑی دیر بیٹھ کیا گئی تو فوراً کام کے لیے اٹھانے لگیں۔میں سب کچھ جانتی ہوں۔آپ نے اس دن بھی یہی کیا تھا، خود تو بازاروں میں گھومتی رہیں اور میرے سر پر کام ڈال کر گھر آ کر

سو گئیں''۔

''زوہا! کیسی باتیں کر رہی ہو؟ گھر میں مہمان آئے ہیں، امی نہیں ہیں اس لیے میں ہانڈی پکا کر ان کے پاس بیٹھتی ہوں۔تم چائے بنا دو، صرف اتنی سی بات ہے''۔آج پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔اتنی سی بات کا وہ بتنگڑ بنا کہ پھر یہی فیصلہ ہوا کہ اب زوہا اور عرفان الگ گھر میں رہیں گے۔ایک دن آیا، جب زوہا اپنے گھر میں تھی۔عرفان ہر کام کے لیے ماسی نہیں رکھ سکتا تھا۔یوں نوشی کا ساتھ بھی چھوٹ گیا، جس سے وہ اپنے دل کا حال کہہ کر اپنا من ہلکا کیا کرتی تھی۔اب ایک چھوٹی بچی کے ساتھ زوہا کو سب کام خود کرنا پڑتا۔

آج زوہا کو بہت تیز بخار تھا۔عرفان کے لیے کھانا بھی بنانا تھا۔وہ آفس سے دوپہر میں آتا اور گھر ہی میں کھانا کھاتا۔ساتھ ہی بچی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی، جس کے باعث وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔زوہا، بیٹی کو سلا کر نماز پڑھنے کھڑی ہوئی تو بے اختیار آنسوؤں کی لڑی جاری ہوگئی۔نماز سے فارغ ہو کر زوہا نے ہانڈی پکانی شروع کی کہ پیاز کاٹتے ہوئے اس کی انگلی کٹ گئی۔جلدی سے پٹی لپیٹ کر گھڑی کی طرف دیکھا اور کھانا پکانا شروع کیا۔اس دوران اسے ایک ایک کر کے وہ سب آسانیاں یاد آنے لگیں، جو اسے اپنی ساس کے گھر میں میسّر تھیں۔جیسے جیسے دن گزرتے گئے اسے وہ سب باتیں، جو اس کی بدگمانی، بغض وعناد پر مبنی تھیں، ایک ایک کر کے یاد آتی جاتیں اور بالآخر ایک دن ایسا آیا، ''مجھے معاف کر دیں عرفان!'' زوہا نے روتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا زوہا! کیا ہوا؟'' عرفان نے گھبرا کے پوچھا۔''میں نے اپنی زندگی کو ڈراما سمجھ لیا تھا اور حقیقت سے منہ موڑ لیا تھا۔آج سمجھ میں آیا کہ رب نے مجھے کن کن نعمتوں سے نوازا ہوا تھا، جن کا میں نے کبھی شُکر ہی ادا نہیں کیا''۔اتنا کہہ کر زوہا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔کچھ برا نہیں ہوا ہماری زندگی میں۔آج بھی سب تم سے ویسے ہی محبت کرتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے اور میں تو صرف تمہارے سکون کی خاطر ہی الگ ہوا تھا اور اس میں تمہارا بھی قصور نہیں ہے۔آج کل کے میڈیا، انٹرنیٹ اور فضول دکھائے جانے والے ڈراموں نے ہم سب کو بہکا دیا ہے۔ہم اپنی زندگی کو کوئی فلم یا ڈراما ہی سمجھتے ہیں۔برائی کو دِکھانا بھی برائی پھیلانے کے مترادف ہے۔ہم جب تک یہ بات نہیں سمجھیں گے، بھلائی نہیں پھیلے گی''۔زوہا کے دل کا بوجھ اب کچھ ہلکا ہو چکا تھا۔''تو پھر چلیں فریال بھابھی اور امی سے ملنے''۔زوہا نے کہا، جس پر عرفان بھی مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

ہم بنے لکھاری

جی تو دوستو! یہ بات زیادہ پرانی نہیں، صرف دو سال پہلے کی ہے، جب ہم پر مضمون نگاری کے ایک مقابلے میں شرکت کا بھوت سوار ہوا۔ اصل میں تو یوں کہہ لیجیے کہ لکھنے لکھانے کا شوق تو بچپن ہی سے تھا مگر کبھی اسے باقاعدہ صلاحیت کے روپ میں نہ جانا تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اپنی اس خداداد صلاحیت کو ہم پہچانتے ہی نہ تھے۔ بہرحال اس مقابلے میں حصہ لیا۔ بڑے چاؤ سے مضمون لکھ کر بھیجا مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

ہم نے اپنے دل ناداں کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ تم ابھی اس میدان میں نومولود ہو۔ یہ تو وہ لوگ ہی میدان مارتے ہیں، جو لکھنے کا فن جانتے ہیں۔ خیر.... وقت گزرتا گیا۔ کراچی سے ہماری خالہ ساس آئیں۔ انہیں جب ہمارے اس شوق کا پتا چلا تو مضمون نویسی کے ایک اور مقابلے سے روشناس کروایا۔ ہم نے اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس بار اللہ نے ہمیں کامیابی بھی عطا کی۔

زندگی کی گاڑی یوں ہی گھر اور بچوں کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ ایک دن ایک خاتون نے ہم سے رابطہ کیا۔ ان کا لکھاری بہنوں کا ایک گروپ تھا جس میں انہوں نے ہمیں بھی شامل کروا دیا۔ اب تو ہم بڑے ہی گھبرائے کیوں کہ لکھنے کا طریقہ وغیرہ تو کچھ آتا نہیں تھا۔ بس جو ذہن میں آتا، تانے بانے بن کر وہ لکھ کر بھیج دیا کرتے۔ پھر ایک وقت آیا جب ہماری تحریریں چھپنے لگیں۔ ہم بڑے خوش ہوتے اور خوش ہونے والی بات بھی تھی کہ ہم بھی کسی قابل ٹھہرے۔

ہر وقت اسی سوچ میں غرق رہتے کس کی تحریر کہاں چھپ رہی ہے۔ ہماری کب چھپے گی؟ ہماری فلاں جگہ کیوں نہیں چھپی؟ کوئی بندہ، مہمان، دوست، ہماری اس حرکت سے محفوظ نہ تھا جسے ہم ضرور بتاتے۔ کبھی فیس بک پر اسٹیٹس لگاتے، کبھی لوگوں کو رسالے تحفے میں دے آتے۔ پھر کئی کئی جگہ ٹانگیں اڑانے لگے۔ مطلب یہ کہ مقابلوں کے لیے بھی لکھا جا رہا ہے تو گروپ میں بھی اور اخباروں میں بھی۔ لکھنے میں اتنا وقت لگانا کہ نماز تک کا ہوش نہیں رہتا پھر بعد میں

اس بات پر بھی کڑھنا کہ نماز رہ گئی۔ پھر تحریروں کا معیار بھی گرنے لگا۔ غرض یہ کہ ایک وقت آیا، جب ہم خود ہی الجھنے لگے کہ گھر، بچے اور لکھنا سب ساتھ ساتھ کیسے چلائیں؟

مگر ہماری ایک استاد اس حوالے سے ہر دم ہماری رہ نمائی کرتی رہیں۔ ہمیں اپنے لکھنے کے مقصد کو دوبارہ سے ذہن نشین کروایا اور صحیح طریقہ بتایا، جس سے پریشان ہوئے بغیر ہم چاق و چوبند ہو کر لکھنے لگے۔ واہ! کیا خبط سوار تھا ہمارے سر پر۔

آج سوچتے ہیں تو اپنی بے وقوفیوں پر خود ہی کھلکھلا کر ہنس دیتے ہیں اور شرمندہ بھی ہوتے ہیں۔ بھئی.... یہ تو تھی ہماری ان حرکتوں کی داستان، جو ہم نے نا سمجھی میں کیں مگر اصل حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں ہم لکھتے تھے، وہ لوگ پہلے دن ہی سے ہمیں یہ بات سمجھاتے تھے کہ لکھو تو صرف اللہ کے لیے یعنی ہمارے لکھے ہوئے اور ہماری تحریروں کے چھپ جانے سے جو لوگ بھی فیض پائیں گے، اللہ انہیں ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بنا دے۔ ہماری نیت خالص اللہ کے لیے ہونی چاہیے اور یہی لکھنے کا اصل مقصد ہے۔

ایک دن ہم یونہی اپنی تحریریں رسالوں میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ ہمارے ذریعے لوگوں کو بھی کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے اور ان شاء اللہ یہ ہمارے لیے صدقۂ جاریہ ہوگا کہ اچانک ایک حدیث ذہن میں گردش کرنے لگی۔ اس کا مفہوم ہے۔ ''جس جگہ کچھ لوگ اکٹھے ہو کر قران کا درس و تدریس کرتے ہیں وہ جگہ فرشتے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیتے ہیں اور سکون نازل کر دیا جاتا ہے''۔ (مسلم شریف)

یہ حدیث ہمیں یہاں اس لیے یاد آئی کہ جب ہم اپنی ناقص تحریروں کا ذکر سن کر اور اس بات کو سوچ کر اتنا خوش ہوتے ہیں کہ اب لوگ اسے پڑھیں گے، تو وہ اللہ، جو اس کل کائنات کا خالق و مالک ہے، جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، جب وہ ہم جیسے گناہ گاروں کے منہ سے اپنا ذکر سنتا ہوگا تو کتنا خوش ہوتا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی عطا دیکھیے۔ اپنے ذکر کیے جانے پر ہمیں انعامات سے بھی نواز دیا۔ ہمارے پیدا ہونے کا مقصد بندگی تھا۔ زندگی کا ہر ہر پہلو، ہر ہر سانس ہمیں اللہ کے دیے ہوئے احکامات کے مطابق گزارنے کا حکم دیا گیا۔

کیوں کہ صبح سے رات تک کی روٹین بھی اگر اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہے، تو یہ بھی اللہ ہی کا ذکر ہے۔ اگرچہ آج ہم اپنا مقصد بھول گئے اور اللہ کو یاد کرنا چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر بھی اس کا احسان اور شکر ہے کہ اس نے اپنے کیے جانے والے ذکر پر ہم جیسوں کے لیے جنت تک کی بشارت رکھ دی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ نے فرما دیا۔ ''تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا''۔ اور اللہ تعالیٰ ذاکرین کا ذکر فرشتوں کے سامنے فرماتا ہے اور ان لوگوں پر فخر محسوس کرتا ہے۔

اس سوچ نے ہمارے اندر کے سارے تکبّر اور غرور کو خاک میں ملا دیا اور ہم ندامت کے آنسو لیے بارگاہِ الٰہی

میں شُکر کے آنسو رو لنے لگے۔ایک جھٹکے میں وہ سارا خمار آسمان سے زمین پر پٹخ دیا اور اپنی اس قابلیت پر، جو ہماری نہیں، اللہ کی دی ہوئی ہے، شُکرانہ ادا کیا اور توبہ واستغفار کو بھی لازم کرلیا۔

ہمارے اللہ کا ہم پر سب سے زیادہ حق ہے۔اس لیے اسے قدم قدم پر ادا کرنے کی فکر کیجیے۔آپ کا حق خود بخود آپ کے پاس چل کر آئے گا۔

☆.....☆.....☆

میں تو امتی ہوں

آؤ، آؤ! ارے آجاؤ یار....! گھبراؤ نہیں۔ کبھی ہمارے ساتھ بھی شام گزار لیا کرو، کب تک اماں ابا کی گود میں جھولتے رہو گے؟ ہاہاہاہا۔ ایک زوردار قہقہہ فضا میں بلند ہوا اور اگلے ہی لمحے عامر شہر کے اوباش، آوارہ لڑکوں کے ساتھ گپیں ہانکنے لگا۔ لو یار! پیو۔ نہیں، میں سگریٹ وغیر نہیں پیتا۔ ارے ایک سُوٹا تو لگا کے دیکھ جگر! مزہ نہ آئے تو کہنا۔ ایک لڑکے نے زبردستی عامر کے منہ میں سگریٹ ٹھونستے ہوئے کہا۔

رات کے 12 بج رہے ہیں۔ مجھے اب جانے دو، پچھلے پانچ گھنٹے سے تم لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ کتنے گندے لوگ ہو تم۔ سارے ہی لڑکے قریباً مدہوش تھے۔ ہاں، ہاں جاؤ۔ ایک لڑکے نے حقارت سے کہا۔ آئندہ نہیں آؤں گا۔ تم لوگ مجھے مار دو گے، میں اب کبھی نہیں آؤں گا۔ عامر نے قدرے چیختے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ گریبان چاک تھا۔ وہ عجب بدحواسی کے عالم میں لڑکھڑایا اور تیزی سے اس نیلے رنگ کی روشنی والے کمرے سے نکل گیا۔

ارے جا جا! کوئی نہیں پوچھے گا تجھے۔ تیرے گھر والے بھی نہیں۔ چل، لوٹ کے پھر یہیں آئے گا اور بھلا کہاں جائے گا۔ ہاہاہاہاہا! ایک بار پھر پورا کمرہ جان لیوا ٹھٹھوں سے گونج اٹھا۔ عامر نے گھر کے راستے میں ایک جگہ رک کر منہ دھویا اور حلیہ درست کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ بیٹا! کہاں جاتے ہو روزانہ؟ اتنی رات گئے تک کہاں تھے؟ جب تک تو گھر نہ آجائے، مجھے نیند نہیں آتی بیٹا۔ ہاتھ میں تسبیح پکڑے ماں نے رندھی ہوئی آواز میں ایک ساتھ ہی سارے سوال کر ڈالے۔ کہیں نہیں ماں! بس دوستوں کے ساتھ ہوتا ہوں۔ آپ انتظار نہ کیا کریں۔

پتا ہے بیٹا! جب تم جھوٹ بولتے ہو ناں.... تو تمہارے چہرے پر صاف نظر آجاتا ہے۔ اس لیے بیٹا! ماں سے کبھی جھوٹ نہ بولنا۔ اچھا ماں! اب مجھے سونا ہے۔ عامر نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔ بیٹا! اسکول والے تجھے نکالنے

کے درپے ہیں۔آج ہی تیرے ابا نے ہیڈ ماسٹر سے بات کی ہے کہ تجھے کچھ وقت اور دے دیں۔بیٹا! پڑھنے میں دل لگا۔ہاں ماں! پریشان مت ہو، پڑھ لوں گا۔اب بس بھی کریں لیکچر۔عامر یہ کہتا ہوا کمرے کی طرف چل دیا۔

حی علی الفلاح....موذن کے الفاظ عامر کے کانوں سے ٹکرائے۔ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تو اسے کچھ متلی سی محسوس ہوئی۔رات کی عیاشی کے بعد اس کا دل بہت خراب ہو رہا تھا۔وہ بھاگتا ہوا واش روم تک پہنچا تو اسے ایک دم قے ہوگئی۔قے کرنے کے بعد اس کا دل کچھ ہلکا ہوگیا مگر بے چینی اب بھی کچھ باقی تھی۔وہ پھر بستر پر آپڑا۔نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو لاؤنج میں رکھا ٹی وی تیز آواز سے چل رہا تھا۔جس پر ایک مناجات لگی ہوئی تھی۔'مرا دل بدل دے، میرا غفلت میں ڈوبا دل بدل دے' مناجات کے الفاظ اس کے دل میں گھر کرنے لگے۔وہ لڑکھڑاتا ہوا نیند کی حالت ہی میں کمرے سے نکلا اور لاؤنج میں جا کر صوفے پر لیٹ گیا۔ارے بیٹا! کوئی اندازہ ہے تمہیں؟ بارہ بج رہے ہیں۔اسکول بھی نہیں گئے۔ماں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ہونٹ کیسے سفید ہو رہے ہیں اور آنکھیں بھی چڑھی ہوئی ہیں؟ ماں! یہ مناجات کتنی اچھی ہے ناں؟ ہاں بیٹا اچھی تو ہے۔بس اللہ واقعی ہمارا دل بدل دے، اس دنیا سے بے نیاز کر دے اور اپنی طرف ہمارا رخ موڑ دے۔پر تو اسکول کیوں نہیں گیا؟

عامر! عامر! کہاں ہے یہ عامر؟ ابا نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔جی ابا! کیا ہوا؟ عامر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔کیا ہوا جی؟ ماں نے بھی گھبرا کر پوچھا۔دیکھو....اپنے لاڈلے کے کرتوت۔آج اخبار میں خبر چھپی ہے، عامر صاحب نے ہیروئن کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔جو اسے پکڑ کر لائے گا، انعام پائے گا۔

یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کوئی اور عامر ہوگا، میرا لعل ایسا نہیں۔میں اسے خود تھانے تک پہنچا کر آتا ہوں۔میری تو ناک ہی کٹوا دی۔مگر ابا! یہ سب میں نے نہیں کیا؟ عامر حواس قائم کرتے ہوئے بولا۔نالائق! زیادہ باتیں مت بنا۔دیکھ....آنکھیں کھول کر دیکھ، تیرا ہی نام اور شکل ہے۔ابا نے اس کا گریبان پکڑا اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔کچھ لمحوں تک عامر کچھ نہ بول پایا مگر جلد ہی اسے کچھ یاد آیا اور اس نے دروازے سے باہر دوڑ لگا دی۔

دروازہ کھول نہیں تو توڑ دوں گا۔عامر نے اپنے ادارے کے ایک دوست عابد کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جو نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا سو رہا تھا۔دروازے کی آواز سے چونک کر اٹھ گیا۔اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا، عامر اس پر کسی بھوکے شیر کی طرح پل پڑا۔بتا! کیوں کیا تو نے میرے ساتھ ایسا۔بتا کیوں کیا؟ عامر نے ایک گھونسا عابد کے منہ پر دے مارا اور اس کے گرتے ہی اس پر چڑھ بیٹھا۔

رکو....رکو، میں نے کچھ نہیں کیا۔عابد گڑگڑایا۔اپنی چوری چھپانے کے لیے تو نے مجھے پھنسوانے کا چکر چلایا؟

اب دیکھ میں تیرا کیا حال کرتا ہوں۔ عامر اسے گھسیٹتا ہوا کمرے تک لے کر گیا کہ اسے بستر کے نیچے پستول پڑی نظر آئی۔ بول، اگر تو نے سچ سچ پولیس کو نہ بتایا کہ اس رات کو تو نے دکان میں ڈاکا ڈالا تھا اور یہ ڈرگز چوری کر کے اسمگل کرانے کی کوشش کی تھی، تو میں ابھی....اسی وقت تیرا خون کر دوں گا۔اچھ....اچھ، اچھا۔ عابد نے کانپتے ہوئے عامر کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ مجھے معاف کر دے۔ میں تجھے بچالوں گا۔

خبردار! کوئی چلا کی نہیں، چل ابھی تھانے۔ عامر نے اسے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے اسی کی گاڑی میں ڈالا اور گاڑی تھانے کی طرف دوڑا دی۔ پولیس نے دونوں کو حراست میں لے لیا۔ ایک ماہ تک دونوں جیل میں پڑے رہے۔ عامر کی ماں اپنے اوسان تک خطا کر بیٹھی مگر زیادہ وقت نہ گزرا تھا جب عابد نے پولیس کی مار کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے اقرار جرم کر لیا اور عامر کو بری الذّمہ قرار دیا۔

عامر ابھی اپنے گھر کے راستے ہی میں تھا کہ اسے ایک مسجد نظر آئی جس پر لکھا تھا۔ ''آؤ کامیابی کی طرف'' وہ بہت عرصے بعد اچانک گھر پہنچا تو سارے گھر والے اس سے لپٹ گئے۔ ابا بھی اس کی جدائی میں بیمار پڑ گیا تھا۔ اب اس کا غصہ بھی اتر چکا تھا۔ آ گیا میرا لعل! میرا بیٹا! کیا حال ہو گیا تیرا؟ اب میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ ماں روتے ہوئے عامر کے سینے سے لگ گئی۔ ہاں ماں! تیرا عامر اب وہ عامر نہیں رہا۔ بہت بدل گیا ہے۔ وقت نے تیرے عامر کو بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ میں اب پڑھوں گا ماں۔

شام کو عامر سو کر اٹھا تو لاؤنج میں رکھا ٹی وی بہت اونچی آواز سے چل رہا تھا۔ 'میں تو اُمّتی ہوں' یہ الفاظ عامر کے دل پر تیر کی طرح لگے۔ آج پہلی بار عامر مسجد میں کھڑا تھا۔ اس نے ایمان کی حلاوت کو پالیا تھا۔ آج سے پہلے سکون کی یہ کیفیت کبھی محسوس نہ کی تھی۔ وہ اللہ کے سامنے جی کھول کر رویا۔ گھر پہنچا تو ماں نے ماتھے پر پیار کیا۔ آج تیرے چہرے پر بڑا نور ہے۔ پہلی بار تجھے اس طرح خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے دیکھا۔ دل جھوم اٹھا، سدا مسکراتا رہے۔ ہاں ماں! میں تو اُمّتی ہوں۔۔۔ عامر کے الفاظ شدتِ جذبات سے لبریز تھے۔ ایک آنسو اس کا چہرہ بھگوتا ہوا گر پڑا۔

☆.....☆.....☆

قاتل پر ایک نظر

آج سے چند ماہ قبل 14 جنوری 2018 کو پاکستان کے صوبے پنجاب کے ایک نواحی علاقے قصور میں دل خراش واقعہ پیش آیا۔ ایک ایسا واقعہ جسے سن کر ہی روح کانپ جائے۔ ایک معصوم کلی کو استعمال کر کے بیکار ٹشو پیپر کی مانند کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا گیا۔ بھولی بھالی سات سالہ زینب اپنے بچپنے میں گم، دنیا کی بے رحمی سے انجان، اپنی زندگی کی بہاروں میں جھولا جھول رہی تھی کہ اچانک انسان کے نام پر دھبا، ایک بھوکا بھیڑیا آیا اور اس کے نازک گوشت پوست کو نوچ کر کھا گیا۔ یا اللہ! کیا گھڑی ہوگی وہ؟ عرش بھی رویا ہوگا اور زمین بھی لرز اٹھی ہوگی۔ مگر خدایا! ہم تیری ان حکمتوں سے لاعلم ہیں۔ اگرچہ دل غم سے دو ٹکڑے ہو گیا، آنسو ہیں کہ رکتے نہیں اور ذہن ابھی تک زینب کی کوڑے میں پڑی لاش، اس تصویر کو تسلیم نہیں کر پایا۔ مگر مولا پھر بھی ہم تیری رضا میں راضی ہیں۔

زینب کا یہ دل دوز واقعہ یقیناً انسانی دل و دماغ قبول کرنے سے عاری ہے۔ مگر اس ایک واقعے کی وجہ سے اللہ نے ان بے شمار، لاتعداد زینبوں کے قاتلوں کا پردہ فاش کر دیا اور ایسے ہی مزید ان گنت بچیوں کو اس ظلم سے مکمل طور پر نہ سہی، کافی حد تک ضرور بچا لیا ہے۔

اب اگر موجودہ حالات کو دیکھا جائے تو ہم آزاد تو ہیں اور کافی حد تک مسائل پر قابو بھی پا چکے ہیں۔ تاہم، جنسی ہوس جیسی خطرناک ذہنیت سے آج تک چھٹکارا نہ پا سکے۔ آج فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت غیروں نے یہ کام کیا اور آج اپنوں نے۔ اب اگر اپنے ہی ملک میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی آبروئیں محفوظ نہ ہوں تو ایسے بھیڑیوں کے لیے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

اب آتے ہیں اس 'بے چارے' قاتل کی طرف۔ ہمیں غصہ تو بہت ہے مگر اس واقعے سے ہٹ کر دیکھا جائے تو وہ قاتل بھی کسی کا بیٹا اور بھائی تو تھا۔ کیا اس کی ماں کا دل کٹ کے نہ رہ گیا ہوگا کہ کیا کیا خواب بنے تھے اس نے اپنے

بیٹے کے بڑا آدمی بننے کے مگر اس کی اس حرکت نے وہ ساری آرزوئیں چکنا چور کر دیں۔ دل اور درد تو ان والدین کے سینے میں بھی ہوگا۔ انہیں بیٹے کی موت کا دکھ تو ہوگا ہی مگر اس بات کا دکھ زیادہ ہوگا کہ جس بیٹے کو ان کا بازو اور سہارا بننا تھا، کسی کا سہاگ بن کر زندگی کی شمع جلانی تھی، اس نے اپنی ہی زندگی برباد کر لی۔

ذمے دار کون؟ سچ پوچھیے تو ذمے دار یہ میڈیا ہے، جو گاڑی سے شیونگ کریم تک کا اشتہار لڑکی کے بغیر نہیں بنا سکتا۔ وہ سب ڈرامے، جو والدین کی نافرمانی سکھاتے ہیں۔ بری صحبت، معاشرے میں پھیلی برائیاں دِکھانا، اصل میں برائی کو مزید پھیلانا ہی ہے۔ یہاں قصور ان تمام لوگوں کا بھی ہے، جنہوں نے دین اور اسلام سے دوری اختیار کی۔ قصور ان تمام لوگوں کا بھی ہے، جنہوں نے اسلامی حدود اور تعزیریں نافذ نہ کیں، قصور ان سب باتوں کا بھی ہے، جو بے حیائی کو فروغ دیتی رہیں اور وہ ان کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قران ہمیں سکھاتا ہے، ''زنا کے قریب بھی نا پھٹکو''۔

17 اکتوبر 2018 کو اس مجرم کو سزائے موت دے دی گئی۔ اس واقعے سے ثابت ہوا کہ اگر ہم اکٹھے ہو جائیں تو جس طرح زینب کے قاتل کو پھانسی دینے کا شور ہر طرف مچایا گیا اور بالآخر اس کے نتیجے میں قاتل کو عبرت ناک سزا سنا دی گئی۔ اسی طرح ٹوئٹر کا ٹرینڈ، فیس بک اور تمام سوشل میڈیا کو اپنے اتحاد سے اسلامی دائرہ کار کے مطابق چلایا جا سکتا ہے اور ایک حد میں رہ کر سوشل میڈیا کی ان باتوں کو بھی اپنایا جا سکتا ہے جو دین سے نہ ٹکراتی ہوں۔

اس ناگزیر واقعے نے لوگوں کو کم از کم اس بات پر سوچنے پہ مجبور کیا کہ اب بچوں کو دینی تعلیم بھی دینی ہے۔ شادیاں بھی جلدی کرنی ہیں اور جہاں تک ہو سکے، حفاظتی اقدامات بھی کرنے ہیں۔ یہاں سب سے بڑی نمایاں کارکردگی حکومت کے عدل وانصاف کی ہے، جس کی بدولت مجرم اپنے انجام کو پہنچا۔ جس ملک وقوم میں انصاف کا قانون عام ہو جائے وہ ملک پھر ترقی اور خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ آج ایک قاتل کی پھانسی نے ہزاروں ان قاتلوں کو یقیناً روک دیا ہوگا، جو شاید کل پھانسی کے تختے پر لٹک سکتے تھے۔ آج اگر اسلامی تعلیمات کے پیشِ نظر حد جاری ہونا شروع ہو جائے تو ان سنگین جرائم کا مکمل خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک طبقہ اللہ کی عائد کردہ سزاؤں کو سخت اور انسان کے لیے بہت برا خیال کرتا ہے۔ مگر زینب کے واقعے نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ اللہ کی لگائی ہوئی حد ہی ہے جو انسانیت کی محافظ ہے۔ ضرورت صرف اپنی طاقت کو پہچاننے اور صحیح جگہ استعمال کرنے کی ہے۔ بے راہ روی ختم کرنے کا واحد ذریعہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو پروان چڑھانا اور ان پر عمل درآمد کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

شافعہ افضل

شافعہ افضل کی تعلیم بی ایس سی اسٹیٹس، میتھس، اکنامکس ہیں۔2 برسوں سے لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔
رائٹرز کلب سے ایک سال منسلک ہیں۔رائٹرز کلب کے پلیٹ فورم سے اخبارات اور میگزین میں اپنی تحریریں شائع کروا چکی ہیں۔

فہرست تحریر:

1- آزمائش (افسانہ)
2- خود کو ناپسند کرنے کی وجوہ
3- بچوں کی تعلیم و تربیت
4- مکافاتِ عمل
5- سوشل میڈیا

☆.....☆.....☆

آزمائش (افسانہ)

نہ جانے کیوں آج دل کی بے چینی اتنی زیادہ تھی کہ کسی طرح چین ہی نہیں آ رہا تھا۔ حالاں کہ ان کا اکلوتا بیٹا اسفر تو روز ہی رات کو دیر سے گھر آتا تھا۔ صفیہ بیگم کی دو ہی اولادیں تھیں، اسفر اور انیلا۔ انیلا بڑی تھی اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک اچھے اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اسفر چھوٹا، ضدّی، لاڈلا اور اپنی مرضی کا مالک تھا۔ صفیہ اور ان کے شوہر اسلم، جو خود بھی درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور عرصہ تیس سال سے پڑھا رہے تھے، انھوں نے اپنے دونوں بچوں سے یکساں محبت کی۔ انیلا پڑھائی میں زیادہ اچھی تھی اس لیے اسے کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اسفر کو پڑھائی سے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لیے اسے بہت جدوجہد کرنی پڑی مگر قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ اس نے ایک بہت اچھی فرم میں صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر نوکری حاصل کی اور دو تین سال ہی میں ترقی کر کے مینیجر آپریشنز کے عہدے تک پہنچ گیا۔ ماں، باپ دونوں اس کی ترقی سے بے حد خوش ہوتے اور اس کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو رہتے۔ انھیں اپنے بیٹے پر بہت ناز تھا۔ اونچا، لمبا، خوب صورت، جب تیار ہو کر نکلتا، ان کے دل سے بے اختیار ماشاء اللہ کے الفاظ نکلتے۔

کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی نہ کبھی ضرور آزماتا ہے اور زیادہ تر لوگوں کو ان کی عزیز ترین شے سے آزماتا ہے۔ صفیہ بیگم کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا، ان کا جو دل گھبرا رہا تھا وہ بلاوجہ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں انیلا گھبرائی ہوئی ان کے پاس آئی، ''امی! اسفر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اسے بہت چوٹیں آئی ہیں۔ وہ ہاسپٹل میں ہے، میں جا رہی ہوں''۔ صفیہ بیگم کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ''میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی''۔ وہ بے ساختہ بولیں۔

انیلا، صفیہ بیگم اور اسلم، بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے۔ اسفر کی حالت تشویش ناک تھی۔ اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ خون بھی خاصا بہ چکا تھا۔ ڈاکٹر آپریشن کے لیے اس کے گھر والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر

ایک بہت تکلیف دہ خبر بھی ان کی منتظر تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق اسفر ایک بہت ہی مہلک قسم کا نشہ استعمال کرتا تھا اور اتنی زیادہ مقدار میں کہ اس کے سارے اعضاء متاثر ہو چکے تھے۔ اگر اس نے فوری طور پر وہ نشہ نہ چھوڑا تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ یہ خبر اس پورے کنبے پر بجلی بن کر گری۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اسفر ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اس کے والد اسلم نے تو آج تک سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا نہ کہ نشہ۔

اس موقعے پر جب کہ اس کے والدین بالکل نڈھال تھے، انیلا نے ہمت کی۔ جب تک اسفر ہسپتال سے گھر آیا، اس نے ری ہیبلیٹیشن سینٹرز کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ اتفاق سے اس کے ایک کولیگ کے بھائی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، وہ بھی وہی نشہ استعمال کرتا تھا جو اسفر کیا کرتا تھا۔ اسے عرفِ عام میں 'آئس' یا 'کرسٹل مِتھ' کہتے ہیں اور یہ وہ پیپرز کے ذریعے سانس سے اندر لی جاتی ہے۔ اس کے کولیگ کے بھائی کا مکمل علاج ہو چکا تھا۔ انیلا نے اس ادارے کا پتا لیا اور فون کر کے سارے معاملات طے کر لیے۔ وہ انتہائی مہنگی جگہ تھی مگر اس بات کی گارنٹی تھی کہ مریض بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ لوگ کسی قسم کی کوئی مار پیٹ بھی نہیں کرتے تھے جیسا کہ عام طور پر اس قسم کی جگہوں پر کیا جاتا ہے۔

اب اصل مرحلہ تھا، اسفر کو وہاں لے جانا، کیوں کہ ری ہیبلیٹیشن سینٹر دوسرے شہر میں تھا اور وہ بہت کم زور تھا۔ اتنی طویل بیماری سے اُٹھا تھا مگر مناسب وقت یہی تھا کیوں کہ خدشہ تھا کہ پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد وہ پھر نشے کی طرف نہ لوٹ جائے۔ اس کے والدین تو صدمے کی میں تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی ساری پونجی خرچ کر کے بھی اپنے لختِ جگر کو صحت منداور تن درست دیکھنا چاہتے تھے۔

اسفر بے انتہا چڑچڑا ہو گیا تھا کیوں کہ اسے نشہ نہیں مل رہا تھا۔ انیلا ہی جانتی تھی کہ اس نے کیسے اسفر کو ری ہیبلیٹیشن سینٹر جانے کے لیے تیار کیا۔ اس نے اسفر سے صرف یہ کہا کہ وہ چیک اپ کے لیے جا رہے ہیں۔ ہسپتال دوسرے شہر میں ہے اس لیے صبح جا کر شام کو واپس آ جائیں گے۔ ماں باپ نے بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور اس کی بہتری کے لیے اسے چھے مہینے کے لیے وہاں بھیج دیا۔ ساتھ ہی پانچ لاکھ روپے ایڈوانس بھی جمع کروا دیا، باقی کے پانچ لاکھ قسطوں میں ادا کیے جا سکتے تھے۔ ایک درمیانے درجے کے پروفیسر کے لیے دس لاکھ بہت بڑی رقم تھی۔ انھوں نے تمام زندگی کبھی کسی سے قرض نہیں لیا تھا۔ بہر حال، کچھ جمع پونجی کام آئی اور باقی زیور بیچ کر پورا کرنے کا ارادہ تھا۔

انیلا اسفر کو لے کر چلی گئی۔ اسے ٹیسٹ کے لیے لے جایا گیا اور پھر بے ہوشی کا انجیکشن دے کر داخل کر لیا گیا۔ جب انیلا اسفر کو چھوڑ کر اس کا بیگ اپنے کندھے پر لٹکا کر اکیلی واپس آ رہی تھی تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ جہاز میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہ اس کی زندگی کا مشکل ترین سفر تھا۔

آگے کے مراحل بھی آسان نہیں تھے۔ ری ہیب میں اسفر کا علاج، اس کے بغیر گھر والوں کا رہنا۔ ان لوگوں کو

بھی وہاں سیشنز کے لیے جانا پڑتا۔ وہاں ان لوگوں نے یہ جانا کہ ایڈکشن یعنی نشے کی عادت کوئی جرم نہیں بلکہ دوسری بیماریوں کی طرح ایک بیماری ہے۔

ہمیں نشے سے نفرت کرنی چاہیے، نشہ کرنے والے سے نہیں۔ انھیں ہماری محبت، توجہ اور صحیح علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم، ایک حد سے زیادہ محبت اور آزادی کے نتائج برے ثابت ہوتے ہیں۔ ہر چیز میں اعتدال ہونا چاہیے۔ یہ ہمارے اور معاشرے کے بیمار رویے ہوتے ہیں جو ہمارے بچوں کو ان ساری برائیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ شروع شروع میں اسفر خود کو ایک قید میں سمجھتا تھا اور اس کے لیے انیلا کو موردِ الزام ٹھہراتا، جس نے اسے اس جگہ آنے پر مجبور کیا پھر آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اسی میں اس کی بہتری تھی اور اس کے گھر والوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر اس کی زندگی بچائی ہے۔

اسفر پہلے کے مقابلے میں کافی حد تک بہتر ہو چکا ہے مگر اس میں پہلے جیسی کوئی بات باقی نہیں رہی۔ ملازمت بھی ختم ہوگئی۔ سچ ہے، اللہ تعالیٰ انسان کو کسی بھی وقت آزمائش میں ڈال سکتا ہے۔ اسفر کو اللہ تعالیٰ نے گرا کر اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ کو اسے ہدایت دینی تھی اسی لیے اسے چوٹ دی۔ پھر صحت اور زندگی بھی دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بری گھڑی اور اولاد کی آزمائش سے بچائے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

خود کو ناپسند کرنے کی وجوہ

ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خود کو شدّت سے ناپسند کرتے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ بھی انہیں پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی بھی کام خود اعتمادی سے نہیں کر پاتے۔ ہر کام کو کرتے ہوئے متذبذب رہتے ہیں کہ صحیح کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس کی بہت ساری وجوہ ہو سکتی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

1۔ ظاہری شکل وصورت اور جسمانی ساخت:

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ لوگوں کو پرکھنے کا پیمانہ ظاہری شکل وصورت اور جسمانی ساخت ہے۔ کوئی شخص، جو ظاہری طور پر خوش شکل ہے، ہماری نظر میں اچھا ہے اور اگر اس میں کوئی کمی ہے یا وہ خوش شکل نہیں ہے، تو وہ برا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جیسے بہت موٹے یا بہت زیادہ دبلے یا سانولی رنگت والے لوگ۔ ان کے آس پاس کے لوگ اور بعض اوقات ان کے اپنے گھر والے، انھیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ اچھے نہیں ہیں۔ اس طرح وہ خود کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔

2۔ اہلیت:

ہمارے معاشرے میں اچھائی کا ایک اور پیمانہ زیادہ مال دار ہونا ہے۔ زیادہ پیسے والے شخص کو لوگ زیادہ قابل سمجھتے ہیں اور غریب کو نااہل۔ چاہے اس کے اندر کتنی ہی اچھائیاں موجود ہوں، وہ معاشرے میں کامیاب فرد نہیں مانا جائے گا۔ عزت ملنے کا ذریعہ بھی پیسہ اور دولت ہے۔ جس کے پاس جتنا زیادہ پیسہ ہے، وہ اتنا ہی عزت دار ہے، چاہے وہ کردار کے لحاظ سے صفر ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کیوں نہ کرتا ہو، اسے عزت دار ہی سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس غریب آدمی کو جینے کا حق بھی مشکل سے ملتا ہے، عزت تو دور کی بات ہے۔ اس طرح کم

حیثیت والے لوگ خود کو مجرم اور ناکام سمجھنے لگتے ہیں۔

3۔ بے جا تنقید:

خود کو ناپسند کرنے کی ایک بڑی وجہ بے جا اور حد سے زیادہ تنقید بھی ہے۔ کچھ لوگوں کو بچپن ہی سے اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثبت تنقید انسان کو سنوارتی ہے، اسے بہتری کی طرف لے جاتی ہے لیکن اگر یہی تنقید حد سے بڑھ جائے تو انسان کا اعتماد ختم کر دیتی ہے اور اسے ایسا لگتا ہے، جیسے وہ زندگی میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہے۔

4۔ ناخوش گوار حادثات:

بعض مرتبہ ہماری زندگی میں ایسے ناخوش گوار واقعات پیش آجاتے ہیں، جو ہمیں خود کو ناپسند کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایسے حادثات ذہن پر ایسے اَن مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو مٹائے نہیں مٹتے۔ کسی قریبی رشتے دار کی بے وقت موت، کوئی گہری چوٹ یا جان لیوا حادثہ ہمیں ذہنی تناؤ کا شکار کر دیتا ہے۔

بہت عرصے اسی کیفیت کا شکار رہنے کی وجہ سے اکثر لوگ بے زار ہو جاتے ہیں اور خود کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ بچپن میں پیش آنے والے واقعات انسان کی نفسیات تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اکثر بچّے مستقل خوف کا شکار رہتے ہیں۔ اجنبیوں سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور ان کے اندر اعتماد کی شدید کمی ہو جاتی ہے جو بڑے ہونے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔

5۔ تشدّد:

تشدّد کی بہت ساری قسمیں ہو سکتی ہیں۔ جسمانی، ذہنی اور جنسی۔ یہ ساری اقسام انسانی شخصیت پر بے انتہا برے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان سے گزرنے والے افراد کبھی نارمل نہیں رہ پاتے۔ وہ آئندہ آنے والی زندگی میں دوسروں کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ اس طرح تعلق نہیں رکھ پاتے جیسے دوسرے لوگ رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے انھیں لوگوں کی نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ انہیں قبول نہیں کرتے اور وہ خود کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس صورت حال کا ذمے دار خود کو سمجھتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایسے کسی واقعے کا ذمے دار اسی شخص کو ٹھہراتا ہے جس پر وہ گزرا ہو۔ خاص طور پر لڑکیوں اور خواتین کو۔ جنسی تشدّد کا شکار ہونے والوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اسے دوسروں پر ظاہر نہ کریں۔ اس طرح اس کا ارتکاب کرنے والوں کو مزید شہ ملتی ہے اور وہ مزید لوگوں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں یا ایک ہی شخص کے ساتھ بار بار یہی عمل دہراتے ہیں۔ بعض دفعہ گھر میں رہنے والے افراد ہی اس مکروہ فعل کے مرتکب ہوتے ہیں اور متاثرہ شخص لحاظ، مروت، کسی قسم کے ڈر یا یقین نہ کیے جانے کے خوف سے کسی سے کچھ کہہ نہیں پاتا۔

انسان کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثر اس کے والدین کا ہوتا ہے۔ والدین کی ذمے داری محض یہ نہیں ہے کہ

وہ بچّے پیدا کر لیں اور انھیں جیسے تیسے پال لیں۔ بچّوں کو تحفظ دینا، ان کی صحیح تربیت کرنا اور ان کی شخصیت سازی بھی والدین کا فرض ہے۔ والدین کو اپنی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ بچوں کو برے حالات اور برے لوگوں سے بچائیں۔ انھیں صحیح، غلط، اچھے، برے کی تمیز کرنا سکھائیں۔ انھیں خود سے محبت کرنا سکھائیں۔

☆.....☆.....☆

بچوں کی تعلیم و تربیت

ایک لڑکی یا عورت کی ہر حیثیت بہت اہمیت رکھتی ہے چاہے وہ بیٹی ہو، بہن ہو یا بیوی۔ اس کی عزت، احترام اور تحفظ اس کے گھر کے مردوں پر فرض ہے مگر جب عورت ماں بن جاتی ہے تو اس کی حیثیت اور شخصیت بالکل بدل جاتی ہے۔ عورت ایک ہی وقت میں بیٹی، بہن اور بیوی ہو سکتی ہے مگر ماں کا رشتہ ہر رشتے پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کے اندر ممتا کے ایسے خوب صورت رنگ سما جاتے ہیں جن کے سامنے ہر رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ وہ ''اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں'' کی تفسیر بن جاتی ہے۔ اپنے بچوں کے لحاظ سے ان کے روٹین کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے۔

دنیا میں ماں سے زیادہ قریبی رشتہ کوئی نہیں ہوتا۔ باقی سارے رشتے تو پیدائش کے بعد بنتے ہیں، یہ واحد رشتہ ہے جو بچے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی بن جاتا ہے۔ ماں کی ہر چیز اولاد سے اور اولاد کی ہر چیز ماں سے جڑ جاتی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے بچہ پیدا کرنا دنیا کا سب سے مشکل عمل ہے۔ مگر دراصل بچوں کو پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ان کو پالنا اور ان کی تربیت کرنا ہے۔ پیدا کرنا تو ایک قدرتی عمل ہے، جو ماں درد کے سمندر سے گزر کر بھی کر ہی لیتی ہے مگر بچوں کی اچھی تربیت کرنا اور انھیں معاشرے کے فعال رکن بنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، خاص طور پر آج کل کے ترقی یافتہ اور ایڈوانس ٹیکنالوجی کے دور میں۔ آج کے دور میں بچوں کو صحیح اور غلط سمجھانا اور برائیوں سے بچانا بے حد مشکل ہے۔

اصولی طور پر ہمیں شروع ہی سے اپنے بچوں کی تربیت اسلامی تعلیمات کے مطابق کرنی چاہیے۔ ان کی تربیت میں توازن رکھنا چاہیے، نہ ہی بہت زیادہ سختی کریں اور نہ ہی بے انتہا نرمی۔ انھیں صحیح اور غلط کا فرق بتائیں اور بار بار بتاتے رہیں یہاں تک کہ وہ اس فرق کو سمجھ جائیں۔ انھیں اپنے مذہبی معاملات سے متعارف کروائیں تاکہ وہ اپنی اصل کو جانیں اور اچھے انسان بن سکیں۔

تجربے کے مطابق، بچّوں سے کوئی بھی کام کروانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ خود وہ کام کریں اور اگر آپ ان کو کسی کام سے روکنا چاہتے ہیں تو بھول کر بھی وہ کام نہ کریں۔ بچوں کے اندر مثبت سوچ پیدا کریں۔ عبادت، خاص طور پر نماز کا اہتمام کریں تا کہ انھیں اس کی اہمیت کا احساس ہو سکے۔ نماز پڑھتے وقت انھیں اپنے ساتھ کھڑا کریں تا کہ مستقبل میں وہ اسے اپنی عادت بنالیں۔ ان کے سامنے ہر وقت حالات کا شکوہ، لوگوں کی برائیاں اور غیبت کرنے سے مکمل گریز کریں۔ مذاق میں بھی ان سے جھوٹ نہ بولیں اور انھیں بار بار یہ احساس دلائیں کہ جھوٹ بولنا ایک غلط عمل ہے۔ انھیں ایمان داری اور لوگوں سے اچھا سلوک کرنا سکھائیں۔ اچھا کام کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی کریں تا کہ وہ ہمیشہ برائی پر اچھائی کو ترجیح دیں۔ اپنے بچّوں کے سامنے رشتوں کو اہمیت، ان کی اصل جگہ دیں تا کہ وہ بڑے ہو کر ان کا احترام کریں۔ دوسروں کے مقابلے میں غلط بات پر کبھی ان کی طرف داری نہ کریں تا کہ ان کے اندر اپنی غلطی ماننے اور برداشت کرنے کی عادت پڑے۔ انھیں یہ احساس دلائیں کہ وہ ہمیشہ صحیح نہیں ہو سکتے اور نہ ان کی ہر بات مانی جا سکتی ہے۔ اگر آپ سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان سے معافی مانگیں اور اچھا عمل کرنے پر ان کا شکریہ ادا کریں تا کہ ان کے اندر بھی شُکر گزاری کا جذبہ پیدا ہو۔ یاد رکھیں! تربیت بالکل چھوٹی عمر ہی سے شروع ہوتی ہے۔ بچپن سے جو عادتیں ڈالی جاتی ہیں وہی بڑے ہو کر پختہ ہوتی ہیں۔

تعلیم اور تربیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں میں تربیت کی کمی ہوتی ہے اور اَن پڑھ لوگ ان پر بازی لے جاتے ہیں۔ ماں کی گود بچّے کی پہلی درس گاہ کہلاتی ہے۔ ایک بچّہ جتنا اپنی ماں سے سیکھتا ہے اور کسی سے نہیں سیکھتا۔ لہٰذا، ایک ماں ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمے داری بہت زیادہ ہے۔ اپنے بچوں کی بہتر تربیت کرنا اور انھیں ایک کامیاب اور اچھا انسان بنانا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ ہم ان کے اچھے اور برے عمل کے ذمے دار ہیں۔ اللہ پاک ہمیں اپنا فرض بہتر طور پر ادا کرنے کی توفیق دے اور ہمیں سرخ رو کرے۔

☆.....☆.....☆

مکافاتِ عمل

''آپا! ہم جا رہے ہیں۔ رات کو دیر سے آئیں گے۔ آپ سو جایئے گا، ہمارے پاس چابی ہے''۔ ارسل نے جاتے ہوئے بلند آواز سے صائمہ کو مطلع کیا۔

''ارے ارسل! سنو تو.... دس تو پہلے ہی بج رہے ہیں، اب جا رہے ہو تو کب آؤ گے تم لوگ؟ مجھے تو ڈر لگے گا اور اگر لائٹ چلی گئی تو....؟'' مگر ارسل یہ سب سننے کے لیے وہاں موجود نہیں تھا، وہ اپنی بیوی ثمرین کے ساتھ جا چکا تھا۔ کیا وقت تھا، جب ارسل اس کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لیتا تھا اور اب پوچھنا تو درکنار بتانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

ارسل اور صائمہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ دونوں کم عمر ہی تھے جب ان کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ صائمہ ارسل سے پانچ سال بڑی تھی۔ ان کے والد نے اچھے وقتوں میں تین دکانیں لے لی تھیں جن کا کرایہ آتا تھا۔ اس طرح والدین کے انتقال کے بعد ان کی گزر بسر ہوتی رہی۔ صائمہ نے ارسل کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور اب وہ ایک پرائیویٹ فرم میں بہت اچھی جاب کر رہا تھا۔ جاب ملنے کے کچھ ہی عرصے بعد صائمہ نے ارسل کی شادی اپنی خالہ زاد بہن طوبیٰ سے کر دی۔ صائمہ بڑے شوق سے طوبیٰ کو اپنی بھابھی بنا کر لائی تھی، سارے ارمان پورے کیے۔ طوبیٰ بھی اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ ارسل اور طوبیٰ دونوں ہی کم عمر تھے۔ چاند، سورج کی جوڑی لگ رہی تھی۔ سارے لوگ بے حد خوش تھے۔ خاص طور پر صائمہ، حالاں کہ ارسل چاہتا تھا کہ پہلے صائمہ کی شادی ہو۔ اس نے اپنے طور پر کوشش بھی کی۔ محلّے کی اور رشتے دار خواتین سے کہہ رکھا تھا کہ صائمہ کے لیے مناسب رشتہ تلاش کریں۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ پہلے تم شادی کر لو، گھر میں ایک اور عورت آ جائے گی تو شاید اس کی قسمت سے صائمہ کے نصیب بھی کھل جائیں۔ لہٰذا، وہ شادی کے لیے تیار ہو گیا۔ صائمہ قبول صورت تھی مگر بے انتہا سلیقہ مند۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، تمام کام خود کرتی تھی۔ دو افراد کا کام اتنا نہیں ہوتا تھا اور اسے اپنے گھر کے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند بھی نہیں تھی۔ ارسل تو تھا ہی اس کا بے دام غلام۔ اسے صائمہ کی قربانیوں کا پورا احساس تھا۔

جب طوبیٰ دلہن بن کر آئی تو بے حد کم عمر اور ناتجربے کار تھی۔ اس نے اپنے والدین کے گھر کوئی خاص کام کاج نہیں کیے تھے۔ ابھی پڑھ ہی رہی تھی کہ شادی ہو گئی۔ سسرال میں وہ جب کوئی کام کرتی تو اس معیار کا نہیں کر پاتی جیسا صائمہ کرتی تھی۔ اسے طوبیٰ کے کیے ہوئے کام پسند نہیں آتے۔ وہ خود بھی اسے احساس دلاتی کہ اسے کچھ نہیں آتا اور

ارسل سے بھی شکایت کرتی کہ طوبیٰ بالکل پھوہڑ ہے، اس سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اکثر ارسل اور طوبیٰ کے درمیان لڑائی ہوتی۔ پہلے پہل تو طوبیٰ کچھ نہیں کہتی تھی، خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی مگر جب یہ معمول بن گیا اور اس نے محسوس کیا کہ صائمہ اس کے کیے ہوئے صحیح کام میں بھی کیڑے نکالتی ہے، تو اس کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ جھنجھلا جاتی، جتنی کوشش کرتی کہ ہر کام صحیح ہو جائے، صائمہ اتنے ہی اعتراضات کرتی۔ یہی وجہ تھی دو سال گزرنے کے باوجود اس کے اور ارسل کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ صائمہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتی۔ چاہے وہ کسی دعوت میں جائیں یا شادی میں، ہر جگہ صائمہ کا ساتھ جانا لازمی تھا۔ جہاں وہ خود نہ کہتی، وہاں ارسل اسے لے جانے پر اصرار کرتا کہ کہیں آپا کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ طوبیٰ ان ساری باتوں سے بیزار ہو چکی تھی۔ اپنے والدین سے کہتی تو وہ اسے ہی سمجھاتے کہ صائمہ بڑی ہے پھر اس نے کم عمری ہی سے بہت تکلیفیں جھیلی ہیں، اسے ہی برداشت سے کام لینا چاہیے۔

آخر سسرال کے نام پر طوبیٰ کا واسطہ ایک نند ہی سے تو پڑا تھا اور کون تھا اس گھر میں۔ مگر یہ وہی جانتی تھی کہ صائمہ نے اکیلے ہی سب کی کسر پوری کر دی تھی۔ اس نے صائمہ کی شادی کروانے کی بھی کوشش کی۔ تاکہ وہ اپنے گھر کی ہو جائے تو طوبیٰ چین کی سانس لے سکے مگر اس کی یہ کوشش بھی بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ جو بھی رشتہ آتا، صائمہ اس میں مین میخ نکال کر انکار کر دیتی۔ کبھی کہتی، ''عمر زیادہ ہے''۔ کبھی کہتی، ''آمدنی کم ہے، گزارا نہیں ہوگا''۔ کبھی کہتی کہ ''خاندان بڑا ہے، مجھے زیادہ لوگوں میں رہنے کی عادت نہیں ہے''۔

طوبیٰ کی نجات کا یہ آخری راستہ بھی بند ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مایوس ہو چکی تھی۔ صائمہ ہر وہ کام کرتی، جس سے طوبیٰ کو تکلیف ہوتی۔

بلا آخر تین سال گزرنے پر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ ایک دن صائمہ کے شکایت کرنے پر ارسل نے اسے بہت برا بھلا کہا، اس دن اس کی طبیعت بھی خراب تھی۔ سر میں شدید درد اور بخار تھا، اس کے باوجود ان دونوں بہن بھائیوں نے اس کا خیال نہیں کیا۔ وہ ساری رات روتی رہی۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔ جب ان دونوں کو اس کی رتی برابر پروا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں سعی لا حاصل کرتی رہے۔ بات صرف صائمہ کی ہوتی تو شاید وہ صبر کر لیتی، دکھ تو اس بات کا تھا کہ ارسل کو بھی اس کی پروا نہیں تھی۔ ارسل نے ان تین سالوں میں اسے سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ کبھی اس کے دل اور خوشی کا خیال نہیں کیا۔ ہمیشہ اس پر آپا کو فوقیت دی۔ پھر کیا فائدہ تھا ایسے شخص کے لیے اپنی زندگی برباد کرنے کا۔ طوبیٰ نے خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے والدین کے گھر چلی گئی اور کچھ عرصے بعد خلع لے لی۔ اس پر بھی صائمہ نے اسے اور اس کے والدین کو بہت برا بھلا کہا۔ سارے خاندان میں ان کے خلاف باتیں کیں مگر ان لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ ہی کوئی صفائی پیش کی۔

بس خاموشی سے قطع تعلق کرلیا۔طوبیٰ نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ بے شک وہ سب سے بڑھ کر انصاف کرنے والا ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کی دوسری جگہ شادی ہوگئی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا انصاف کیا کہ دیکھنے والوں نے کان پکڑ لیے۔ارسل نے طوبیٰ کے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد اپنے دفتر کی ایک لڑکی سے دوسری شادی کر لی۔ثمرین بے حد ماڈرن اور تیز عورت تھی، اس نے پہلے دن سے صائمہ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ پہلی فرصت میں ارسل اور گھر کے تمام معاملات کو اپنی مٹھی میں لے لیا اور صائمہ کو اپنے کمرے تک محدود کر دیا۔

صائمہ کچھ عرصے سے ریڑھ کی ہڈی میں کچھ تکلیف ہونے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی تھی۔ وہ سارا دن بستر پر پڑی رہتی تھی۔ایک ملازمہ اس کی دیکھ بھال کے لیے تھی مگر وہ بھی ارسل اور ثمرین کے ملازمت پر جانے کے بعد ٹی وی دیکھتی رہتی۔ صائمہ بھوک اور پیاس سے چلاّتی رہتی مگر وہ دھیان نہیں دیتی تھی۔ بھائی بھی اب اپنے معاملات کو دوسری بیوی کی آنکھوں سے دیکھتا اور اسی کے کانوں سے سنتا تھا۔صائمہ اس سے کچھ کہتی تو وہ جوب دیتا، ''چھوڑیں آپا! آپ کو تو شکایتیں کرنے کی عادت ہے۔ پہلے طوبیٰ غلط تھی، اب آپ ثمرین اور ملازمہ کو بھی غلط ثابت کرنا چاہتی ہیں''۔ یہ سن کر صائمہ بے بسی سے رو پڑتی۔ اسے بے اختیار طوبیٰ اور اس پر کی گئی اپنی زیادتیاں یاد آجاتیں۔سچ ہے، اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے اور وہ بے حد انصاف کرنے والا ہے۔

اسی حالت میں صائمہ نے تین سال گزارے۔ روز جیتی تھی اور روز مرتی تھی۔ اللہ سے اپنے کیے کی معافی مانگتی۔بلآخر اسی حالت میں اس کی موت ہوگئی۔ دو دن تک وہ گندگی میں پڑی رہی۔ارسل اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ، جو ایک سال کا تھا، صائمہ کو ملازمہ کے ساتھ چھوڑ کر دو دن کے لیے فارم ہاؤس گیا ہوا تھا۔ملازمہ اسے اکیلی چھوڑ کر باہر سے تالا لگا کر چلی گئی۔ جب ارسل واپس آیا تو صائمہ مردہ حالت میں ملی۔اس کے کمرے میں اس قدر بدبو تھی کہ اندر داخل ہونا دشوار تھا۔ وہ دیکھنے والوں کے لیے نشانِ عبرت بن گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سوشل میڈیا

معاشرے میں میڈیا کا کردار بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی طالبِ علم کی زندگی میں استاد کا۔ اگر استاد اپنی ذمے داری اَحسن طریقے سے ادا کرے تو طالبِ علم کی زندگی سنور سکتی ہے اور وہ بہترین تعلیم و تربیت حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر استاد اپنے فرض سے غفلت برتے تو طلبا کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ میڈیا کی دونوں اصناف، پرنٹ و الیکٹرانک، پر معاشرے کو باخبر کرنے اور سنوارنے کی بہت بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اگر میڈیا اپنا کردار مثبت طور پر ادا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا معاشرہ، خاص طور پر نئی نسل بے شمار فوائد حاصل نہ کر سکے۔ آج کل کے دَور میں الیٹرانک میڈیا، خصوصاً سوشل میڈیا اس قدر طاقت ور ہو چکا ہے کہ پرنٹ میڈیا کی اہمیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ تاہم، بنیادی طور پر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کسی بھی ملک میں، جہاں جمہوری نظام رائج ہو، میڈیا کی حیثیت چوتھے ستون کی سی ہوتی ہے۔ میڈیا کی آزادی کو جمہوریت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ مگر آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا بے جا استعمال کیا جائے یا اسے لوگوں کو گم راہ کرنے، چٹپٹی خبروں کے ذریعے مزہ لینے یا کسی کی کردار کشی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس کا اصل مقصد حقائق کو عوام کے سامنے لانا ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے دوسرے شعبوں کی طرح میڈیا، خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا میں بہت سے ایسے لوگ شامل ہو گئے ہیں جن کا مقصد سستی شہرت حاصل کرنا اور لوگوں کو گم راہ کرنا ہے، جس کی وجہ سے میڈیا جیسا طاقت ور ادارہ بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔

کسی بھی چیز کے مثبت اور منفی پہلو ہوتے ہیں۔ میڈیا کے معاملے میں بھی یہی ہے۔ ٹیلی وژن پر آج کل جو کچھ دکھایا جا رہا ہے وہ کسی بھی طرح ہمارے معاشرے کی عکاسی نہیں کرتا۔ وہ ڈرامے ہوں، ٹاک شوز، مارننگ شوز یا دوسرے پروگرام۔ ان میں معاشرے کے کچھ خاص طبقوں ہی کو اجاگر کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ وہ چاہیں تو اصلاحِ

معاشرہ کا کام انجام دے سکتے ہیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا۔ ان شوز میں جس قسم کی چیزیں دکھائی جاتی ہیں، وہ مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ اپنے اندر ہتک کا پہلو بھی لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ ایک دور تھا کہ ٹی وی کے معلوماتی پروگرام نوجوان نسل کے لیے دلچسپی اور معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہوا کرتے تھے مگر اب تو دور دور تک ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس اس قسم کے تمام پروگرام محض ناچ گانے اور لچر پن پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہی حال خبرنامے کا بھی ہے۔ دنیا کی معلومات فراہم کرنے کے بجائے یہ عوام میں اشتعال، فرسٹریشن اور سسپنس پیدا کرنے کا کام کر رہا ہے جو افسوس ناک امر ہے۔ سوشل میڈیا کی طرف آئیں تو وہ اس حد تک طاقت ور اور ہم سب کی زندگیوں پر اثر انداز ہو چکا ہے کہ اس نے ہماری زندگیوں میں بہت ساری چیزوں کی جگہ لے کر اس کا حُسن ماند کر دیا ہے۔ اب ہماری زندگیوں میں رشتوں، لوگوں اور معاشرتی اقدار کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ ہم رشتے نبھاتے بھی ہیں تو فیس بک، ٹوئٹر یا واٹس ایپ وغیرہ کے ذریعے۔ پہلے خوشی یا غم کے موقعوں پر لوگ ایک دوسرے کے گھر جایا کرتے تھے مگر اب فیس بک پر اسٹیٹس ڈال کر اپنی ذمے داری سے بری الذّمہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ فاتحہ خوانی تک سوشل میڈیا ہی پر ہو جاتی ہے۔ اگر اسے مثبت طور پر دیکھا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ ہم باخبر رہتے ہیں اور دور رہنے والے لوگ بھی ہمارے غم اور خوشیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے، سمٹ گئی ہے۔ انٹرنیٹ کے جہاں نقصانات ہیں، وہاں بہت سے فوائد بھی ہیں۔ ہمیں کسی بھی موضوع پر بہت آسانی سے معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ فیس بک کے ذریعے بہت سے اچھے لوگوں سے رابطہ رہتا ہے۔ بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ بس ہمیں اپنی حدود کا اندازہ ہونا چاہیے اور صحیح اور غلط کا فرق کرنا آنا چاہیے۔ یہی چیز ہمیں اپنی نوجوان نسل کو بھی سمجھانی ہے، ان میں منتقل کرنی ہے۔ اگر انھیں صحیح اور غلط کا پتا ہوگا تو وہ کبھی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوں گے۔ یہ کام مشکل تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

کوئی بھی چیز اس وقت تک بری نہیں ہوتی جب تک اس کا بے جا یا منفی استعمال نہیں کیا جائے۔ میڈیا کے حوالے سے بھی ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے، تب ہی میڈیا معاشرے میں اپنا اصل کردار ادا کر سکے گا۔ سوشل میڈیا کو بھی اگر تعلیمی اور اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو بہت سے لوگ اس سے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اصلاح کرنا تو چاہتے ہیں مگر دوسروں کی، اپنی نہیں۔ جو اقوال یا اچھی باتیں ہم سوشل

میڈیا پر شیئر کرتے ہیں، کبھی خود ان پر عمل کرنے کے بارے میں نہیں سوچتے۔

سوشل میڈیا کی وجہ سے لوگوں میں اعتماد پیدا ہوا ہے، انھیں اپنی رائے دوسروں تک پہنچانے کا موقع ملا ہے۔ کیوں کہ سوشل میڈیا کا استعمال اس قدر زیادہ ہے کہ آپ کی بات منٹوں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا، کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم اچھی بات کریں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ یہ ہمارا معاشرتی فریضہ ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

ثناء نوشین

ثنا نوشین کا تعلق خیبر پختونخواہ کے شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ 2006ء سے کالم اور بچوں کی کہانیاں لکھ رہی ہیں اور شاعری بھی کرتی ہیں۔ اردو، پشتو اور سرائیکی زبان میں مقامی اخبارات میں لکھتی رہی ہیں۔ 2016ء سے بطور ممبر رائٹرز کلب سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- قومی تشخص محفوظ کرنے کی ضرورت

2- والدین کا احترام

3- اردو زبان کا المیہ

☆.....☆.....☆

قومی تشخص محفوظ کرنے کی ضرورت

سب سے پہلے تو یہ بات واضح کر دوں کہ کوئی بھی معاشرہ برا نہیں ہوتا، برے تو انسان ہوتے ہیں۔ یوں تو ہمارا معاشرہ اسلامی ہے، بس ایک مسئلہ ہے۔ اس اسلامی معاشرے کے ریپر میں بے دین اور بے صبرے لوگ چھپے ہیں۔ ہماری ذاتی کم زوریاں ہمارے دین پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ جب بھی کسی دین، کسی مذہب کو پڑھنا ہو تو لوگ اس مذہب کی کتاب نہیں پڑھتے بلکہ اس مذہب کے پیروکاروں سے مل کر نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ ایک ہزار سال پہلے البیرونی سال ہا سال تک ہندو معاشرے کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہندو اور مسلمان ہر معاملے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے اور ہمارے عقائد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہندوؤں کا کٹر پن تمام غیر ملکیوں پر مرتکز ہے۔ ہندو انہیں ملیچھ یا ناپاک کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہر قسم کا رابطہ ممنوع قرار دیتے ہیں۔ نہ ان کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ روا رکھتے ہیں نہ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے روادار ہیں کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسا کرنے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔ تحریک آزادی ہند کے جدید مورخ آر۔ سی موجمدار تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ البیرونی کے الفاظ سَن 1800 تک قریب قریب بالکل درست تھے۔

ایک عام تاثر ہے، ہمیں انگریز سے آزادی چاہیے تھی اس لیے پاکستان بنا۔ نہیں جناب! اگر فقط انگریز سے آزادی چاہیے ہوتی تو آج ہم ہندوستان میں ہوتے۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستان اس لیے بنا کہ دو مختلف قوموں کا ایک جگہ اکٹھے رہنا، مسلمانوں کے لیے انتہائی اذیت کا باعث تھا۔ مگر افسوس.... آج ہم اُس ہندوستان کی، جس سے علیحدہ ہوئے تھے، فلموں، ڈراموں اور دیگر پروگراموں کو جدید ٹیکنالوجی کی بدولت اپنے گھروں میں کھینچ لائے ہیں۔ آج جس طرح ہم ہندوستان سے متاثر ہیں، دبے الفاظ میں نہیں بآوازِ بلند ہمیں ایک قوم سمجھا جاتا ہے، جن کی شادی، خوشی غمی، عقائد و سوچ، سب ایک جیسا ہے۔

آج ہمارے بزرگوں کی قربانیاں رائیگاں جا رہی ہیں، جس مذہب اور ثقافت سے ہمارے آباؤ اجداد ہمیں

بہت دور لے آئے۔ ہماری روشن خیالی کہ اس مذہب کو ہم اپنے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم تک لے آئے۔ البیرونی! ہم شرمندہ ہیں۔ آپ کی بصیرت نے ایک ہزار سال پہلے جو تباہی دیکھی تھی، آج ہمارے گھروں میں آ چکی اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد میں میں بیٹھے رہ گئے۔

البیرونی! آپ دیکھ رہے ہیں ناں.... ہمارے مسلمان پوری دنیا میں ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے بچوں کو بھارتی اداکاروں کی جتنی ہسٹری پتا ہے، اتنا تو قرآن بھی نہیں آتا۔ ہماری بچیاں اسٹیج پر آ کر ایک کٹر ہندو کی طرح کتھک رقص کرتیں اور ان کے والدین سامنے بیٹھے تالیاں پیٹتے ہیں۔ ہم نے اپنی اصل پہچان بھلا دی ہے۔ ہم نے اپنے مذہب سے رخ موڑ لیا ہے۔ ہم اقبال کا خواب پورا نہ کر سکے، ہم نے اپنے قائد کی قربانیاں بھی فراموش کر دیں۔ ہم قیامِ پاکستان کا مقصد یکسر فراموش کر چکے ہیں۔ ارے.... ہم تو وہ لوگ ہیں، جو اپنے نبی ﷺ کی تعلیمات بھی بھلا بیٹھے ہیں۔

میرے ہم وطنو! اب کوئی نیا قائداعظم، علامہ اقبال یا البیرونی نہیں آئے گا۔ ہمیں ان ہی کے الفاظ سے مدد لینی ہوگی۔ اصلاح کے لیے ایک اسلامی ریاست قائم کرنی ہوگی۔ ہمیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنی ہوگی۔ تب تمام برائیاں مٹ جائیں گی، ہمیں خود کو پہچاننا ہوگا۔ پوری دنیا ورطۂ حیرت میں غوطہ لگاتی جب دیکھتی کہ ہزاروں سال کی سائنس، جو علم حاصل کرتی ہے وہ قریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے قرآن پاک دے چکا۔ لیکن اب وہ ہمارے اعمال اور قرآن پاک کے احکامات میں تضاد دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیسی قوم ہے، جس کے پاس نسخۂ کیمیا ہے اور اس سے استفادہ نہیں کرتی۔ ہمیں وہ ایثار، وہ درگزر، وہ محبت اور ان تمام تعلیمات کو اپنانا ہوگا۔ ہمیں ایک ایسی اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے جہاں کسی غیر مسلم روایت کا گزر نہ ہو۔

مارچ 1909 میں ہندو رہنما منرو راج امرتسر نے علامہ اقبال کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے متحدہ قومیت کے موضوع پر خطاب کرنے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال نے نہ صرف متحدہ قومیت کا تصور مسترد کر دیا بلکہ مہمان خصوصی بننے سے بھی انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا، ''میں خود اس خیال کا حامی رہ چکا ہوں کہ اس ملک سے مذہب کا امتیاز اٹھ جانا چاہیے مگر اب میرا خیال ہے کہ قومی تشخص کو محفوظ رکھنا مفید ہے''۔

☆.....☆.....☆

والدین کا احترام

ایک بزرگ خاتون میرے گھر آئیں اور بتایا کہ وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں، بڑی مشکلوں سے لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے بچوں کو پڑھایا، میٹرک تک تعلیم دلائی۔ اپنے بیٹے کو رکشا لے کر دیا کہ آگے کی زندگی سکون سے بسر ہوگی۔ ایک دن بیٹا کسی لڑکی کو بھگا کر گھر چھوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد پولیس، کورٹ، کچہری کے چکروں میں گھر بار سب کچھ بیچ دیا اور خود کرائے کے مکان میں آ گئیں۔ ادھر بیٹے کو معلوم ہوا کہ معاملات ٹھنڈے ہو گئے ہیں تو وہ گھر لوٹ آیا۔ ماں نے بیٹے کا شان دار استقبال کیا اور بھرپور کوشش کر کے اسی کرائے کے مکان میں اس کے لیے بھی جگہ بنا دی۔ مگر جب بیٹے کو پتا چلا کہ ماں نے اپنا گھر بیچ دیا تو اس نے خوب برا بھلا کہا۔ پانچ سال تک ماں بیٹے میں نوک جھونک چلتی رہی اور بالآخر ایک دن وہ بھی آ گیا کہ بیٹے کو ماں بری لگنے لگی اور وہ اس کو ماں کہتے ہوئے بھی شرمانے لگا۔

وہ ماں آج میرے سامنے اپنی زندگی کی تلخیاں بیان کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں، جانے ان میں کس بات کے آنسو تھے؟ مگر میں دیکھ رہی تھی کہ ایک ماں، جس کی کل کائنات اس کا بیٹا تھا، مکمل طور پر مر چکی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں بہت پہلے سوچا کرتی تھی کہ وہ کون لوگ ہوتے ہیں، جو اپنے والدین کو اولڈ ہوم میں چھوڑ جاتے ہوں گے۔ اس قدر بد بخت کہ جنہیں اپنی جنت سے نفرت ہوتی ہے۔

دنیا کا ہر مذہب اور تہذیب اس بات پر متفق ہے کہ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا چاہیے۔ اُن کا ادب واحترام ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ اس بارے میں اللہ رب العزت نے ہمیں اپنی آخری کتاب میں اس بات کی تعلیم اس ڈھنگ سے بیان فرمائی ہے، جو اہم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے انفرادی اسلوب کی حامل ہے۔ مثال کے طور پر جب کبھی اللہ رب العزت نے اپنی اطاعت وفرماں برداری کی طرف توجہ دلانی چاہی ہے تو اس کے فوراً بعد والدین کی

اطاعت اور فرماں برداری کی تاکید کی ہے۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کا فرمان ہے: ''اور ہم نے انسان کو، جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے، (پھر اس کو دودھ پلاتی ہے) اور (آخرکار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔ (اپنے نیز) اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی (کہ تم کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ (سورہ لقمان)

جس طرح سے اللہ کے حقوق ہم پر فرض ہیں بالکل اسی طرح انسانوں کے حقوق بھی فرض ہیں اور اتنے ہی اہم ہیں۔ انسانوں میں والدین کے حقوق سب سے بڑھ کر ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے: ''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا''۔ (سورہ الاحقاف)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ''اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں، تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار! جیسا انہوں نے میری بچپن میں (شفقت سے) پرورش کی ہے، تو بھی ان (کے حال) پر رحم فرما۔ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، تمہارا پروردگار اس سے بخوبی واقف ہے۔ اگر تم نیک ہو گے تو وہ رجوع لانے والوں کو بخش دینے والا ہے۔ (سورہ الاسرء)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے بعد دوبارہ والدین کے ادب واحترام کی بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھا دیا ہے کہ ہم بچپن میں کس طرح بے یار و مددگار تھے اور والدین نے ہمیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ ہمارے والدین مکمل خلوص اور محبت کے ساتھ ہماری ہر خواہش پوری کرتے تھے، اسی لیے اولاد پر فرض ہے کہ وہ والدین کا احترام کرے اور ان سے اچھا سلوک کرے۔

☆.....☆.....☆

اردو زبان کا المیہ

اردو زبان کے زوال کا سلسلہ قریباً ایک صدی پرانا ہے مگر گزشتہ دو دہائیوں میں تو مرے پہ سو دُرّے کے مصداق اردو سے زیادتیوں کی حد کر دی گئی ہے۔ ایک دَور تھا جب پاک و ہند انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ تب زیادہ پڑھے لکھے افراد انگلش زبان اس لیے سیکھتے تھے کہ رابطوں میں آسانی ہو سکے۔ وہ انگریز راج کو اپنی بات سمجھانے کے لیے انگلش سیکھتے تھے، تب انگلش زبان کو نصاب میں شامل کیا گیا۔

اصولاً ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب پاکستان آزاد ہوا تو ہم بھی انگریزی سے دامن چھڑا لیتے مگر یہاں تو انگریزی ایک نشے کی طرح ہماری رگوں میں اتاری گئی۔ ہمیں باور کرایا گیا کہ اردو بولنے والے کنویں کے مینڈک ہیں جب کہ دنیا انگلش بولنے والے کا بازو کھول استقبال کرتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں، یہ سب کتابی باتیں ہیں، جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں مگر ہم ہیں کہ اندھی تقلید میں حد سے ہی بڑھ گئے۔ پہلے ہم یہ سمجھے کہ سرکار ایک گھٹیا درجے کی تعلیم دینے والا ادارہ ہے۔ سرکاری علاج، سرکاری تعلیم کا کوئی اسٹینڈرڈ نہیں اور پرائیویٹ اسکول اور ہسپتالوں کو متعارف کرایا گیا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر ان اداروں کے ذریعے اردو کو کامپلیکس کا درجہ دے کر متعارف کرایا گیا۔ اچھے اسکولوں میں اردو بولنے پر پابندی عائد کی گئی۔

پاکستان آزاد تو ہو گیا مگر اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کے باوجود دفتری زبان انگلش کو برقرار رکھا گیا۔ حد تو تب ہوئی جب میری بہن نے، جو ٹیچر ہیں، بتایا کہ بچوں کو اردو اور اسلامیات پڑھنے میں مشکل ہوت ہے، اس لیے بچے دبے الفاظ میں پوچھتے ہیں، مس! ہم اتنی ترقی کب کریں گے جب اردو کا سبجیکٹ بھی انگلش میں آ جائے؟ اس میں قصور بچے کا نہیں ہمارا ہے۔ ہم ہی نے اسے اردو سے دور کیا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آپ بچے سے انگلش میں کوئی سوال کریں تو وہ گرامر کے چکر میں سمجھ نہیں پاتا جب کہ وہی سوال اگر اردو میں کیا جائے تو وہ فوراً جواب تو دے دیتا ہے

مگر لکھ نہیں پاتا۔افسوس....ہم وہ بے وقوف قوم ہیں جس نے کوے کو مور کی چال چلنا سکھائی اور ہمارے مور گر پڑتے ہیں۔ بار بار ہمیں اردو کے فروغ کے لیے کچھ قانون پاس کرنے ہوں گے ورنہ جس طرح اردو سے زیادتی کی جاتی ہے، اس میں سرفہرست رومن اردو نہیں بلکہ وہ گلابی اردو ہے، جو ہمارے گھروں میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ بیٹا! جلدی finish کرو، Door بند کرو، Sit -down ہو جاؤ بیٹا، ہم drive پر جا رہے ہیں، Dinner باہر ہے ہمارا، Tomorrow کا کیا پروگرام ہے؟ میں بہت busy ہوں۔

یہ تو چند مثالیں ہیں ورنہ اس سے بھی زیادہ کچھ ہوتا ہے۔اس طرح کی زبان بول کر ہم بچے کو انگلش میڈیم میں بھی صحیح زبان سیکھنے کا موقع نہیں دے رہے۔ ہمارا بچہ پوری طرح نہ اردو سیکھ سکے گا نہ ہی انگریزی۔کبھی غور کیجیے، ہماری یہ نسل کل جب دوسرے ممالک کے انگریزی دانوں کے ساتھ بیٹھے گی تو کیا تاثر قائم ہوگا؟ ہمارے بچے ڈنگ سے انگریزی بول پاتے ہیں نہ اردو۔ان بچوں کا مستقبل کیا ہوگا، کیسے اپنی بات دنیا کو سمجھا پائیں گے؟ یہاں تو جانور بھی اپنی بولی بولتے ہیں، اگر کچھ پرندے یا جانور ہماری بولی یا عادات سیکھ جاتے ہیں تو ان کا مستقبل پنجرہ اور قید ہوتا ہے، ایسی مخلوق اپنی نمائندگی ہرگز نہیں کر پاتی۔سوچیے، ہمارے توتے جب انگلش سیکھ جائیں گے، بولیں اور سمجھیں گے، تب ہمیں کون سمجھے گا؟ تب یہ توتے صرف انگریزوں کے منورنجن کے کام آئیں گے۔ایسا نہیں ہے کہ انگلش بہت زیادہ بولی جانے والی زبان ہے بلکہ اردو، انگلش سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔اگر ہمارے انگلش بولنے والے رٹو توتے اردو کی نمائندگی کرنی شروع کر دیں، تب ہی ہم خود کو منوا پائیں گے۔

☆.....☆.....☆

بسم اللہ کی برکت

مدیحہ کلاس پنجم میں پڑھتی تھی، رادھا اس کی ہم جماعت تھی۔ رادھا ایک ہندو بچی تھی اس کی ماں کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے والد کی کپڑے کی دوکان تھی۔ رادھا تمام دن گھر میں اکیلی رہتی تھی مگر جب سے مدیحہ سے دوستی ہوئی تھی وہ اپنے ابو جی کے جانے کے بعد مدیحہ کے گھر آ جاتی تھی۔ اپنے والد سے چھپ کے کیونکہ اس کے والد کو رادھا کا مسلمانوں کے گھر آنا جانا زیادہ پسند نہ تھا۔ رادھا بہت ذہین بچی تھی آج بھی رادھا مدیحہ کے ساتھ بیٹھی تھی ، مدیحہ جیسے ہی گوندھنے کے لیے آٹا نکالنے لگی، رادھا ہنس کر بولی مدیحہ بسم اللہ پڑھ کر آٹا نکالو۔ تب ہی مدیحہ کی والدہ کی بھی آواز آئی۔ مدیحہ بسم اللہ پڑھ کر آٹا نکالو اور دونوں زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مدیحہ بسم اللہ پڑھنا بھول جاتی اور رادھا اسے یاد دلاتی۔

ایک روز رادھا نے مدیحہ کی امی سے پوچھا، ''آنٹی آپ مسلمان لوگ بار بار ہر کام سے پہلے بسم اللہ کیوں پڑھتے ہیں''؟ مدیحہ کی والدہ نے رادھا اور مدیحہ کو بتایا، ''بیٹا بسم اللہ کا مطلب ہے، شروع اللہ کے نام سے جو رحم کرنے والا ہے۔ ہم ہر کام سے پہلے جب بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ تو اس کام میں رب کے نام کا واسطہ ہوتا ہے رب یعنی دو جہان کا مالک خوش ہوتا ہے بسم اللہ پڑھنے سے اور ہر کام میں برکت داخل ہو جاتی ہے اور اس طرح ہمارے بگڑے کام بھی سدھر جاتے ہیں۔

یہ بات رادھا کے دل کو لگی اور اس نے ہندو ہونے کے باوجود بسم اللہ کا ورد شروع کر دیا اب وہ ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھتی۔ اب آہستہ آہستہ رادھا کی یہ عادت بن گئی۔ وہ کھانا کھانے سے پہلے، کوئی بھی کام کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھتی اور اللہ کا کرم کہ اس کے تمام کام اچھے ہونے لگے۔ اب تو وہ اسکول میں بھی اول آنے لگی۔ بسم اللہ پڑھ کر جب وہ ہوم ورک کرنے لگتی اس کو تھکاوٹ کا احساس تک نہ ہوتا۔ اب رادھا نے محسوس کیا بسم اللہ کے ورد سے اس کی

زندگی سنور گئی ہے۔ایک روز رادھا کا باپ کرم چند راشن لایا تو رادھا نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سامان لیا۔کرم چند کو تو مانو کرنٹ لگ گیا، کرم چند نے پوچھا، ''رادھا! یہ تم کیا کہہ رہی تھیں ابھی''۔رادھا بولی، ''ابو جی یہ بسم اللہ ہے مجھے مدیحہ نے سکھائی ہے اور جب میں بسم اللہ پڑھتی ہوں تو مجھے اچھا لگتا ہے اور میرے ہر کام میں برکت بھی ہوتی ہے''۔

کرم چند نے اس وقت رادھا کو تو کچھ نہ بولا مگر وہ پریشانی کے عالم میں اپنے ہندو پنڈت کے پاس گیا اور جا کر اسے بتایا کہ، ''میری بیٹی مسلمانوں کے گھر جاتی ہے اور اب انھوں نے پتا نہیں کیا جادو کیا میری بچی ان کی بسم اللہ پڑھتی ہے''۔پنڈت بولا، ''آپ کی بچی پر سخت کالا جادو ہے۔اب آپ کی بچی اپنے دھرم سے دور ہو گئی ہے، اسے مرنا ہوگا۔اسے مرنا ہی ہوگا ورنہ سب تباہ ہو جائے گا''۔یہ سن کر کرم چند جو پکا ہندو تھا اس نے اپنی بیٹی کو جان سے مار ڈالنے کا سوچا اور ہندو سنیاسی سے بہت زہریلا سانپ لیکر گھڑے میں بند کروایا گھڑے کے سر پر کپڑا باندھ کر گھر لے آیا اور آواز دی، رادھا!۔کرم چند نے خود پر قابو پا کر کہا، ''پتر تیرے لیے بہت اچھا تحفہ لایا ہوں۔جو ساتھ والے کمرے میں مٹکی میں پڑا ہے۔بس پتر جا کپڑا تھوڑا سا کھول کر ہاتھ مٹکی میں ڈالنا، آپ کو بہت پسند آئے گا''۔

رادھا ابو جی کی بات پر اعتبار کر کے ساتھ کمرے میں گئی، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر گھڑے میں ہاتھ ڈالا اور چیخ ماری، چیخ سن کر کرم چند کی آنکھ سے ایک آنسو گرا مگر پھر ہندو پنڈت کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔آپ کی بچی پر کالا جادو ہے۔اسے مرنا ہوگا۔کرم چند کو لگا جیسے سب ختم ہو گیا۔مگر یکدم تیزی سے کوئی آ کر کرم چند کے سینے سے لپٹ گیا، کرم چند نے گھبرا کر دیکھا تو رادھا خوشی سے کرم چند کو چوم رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک بیش قیمت ہار تھا۔

کرم چند نے یکدم رادھا کو پیچھے دھکیلا اور اس کے ہاتھ سے ہار لے کر پوچھا، ''یہ یہ، کہاں سے لیا''۔رادھا بولی، ابو جی ابھی تو آپ لائے تھے گھڑے سے نکالا ہے''۔

یہ سن کر کرم چند چیخا مگر اس گھڑے میں میں نے خود سانپ ڈالا تھا، ہار نہیں''۔رادھا بولی، ''مگر میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر ہاتھ ڈالا تھا اور میرے ہاتھ میں یہ قیمتی ہار آیا اور میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔جب اللہ پاک کا نام آ جائے واقعی انگارے بھی پھول بن جاتے ہیں۔یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی برکت ہی تو تھی کہ سانپ ہار بن گیا''۔کرم چند بھی بسم اللہ کی برکت کا معترف ہو گیا۔اس نے فوراً سجدے میں سر رکھا اور مدیحہ کے والد کے ساتھ جا کر اسلام قبول کیا۔پیارے بچو! آپ بھی ہر کام سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اس کی برکت دیکھئے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

شیبا اعجاز

شیبا اعجاز نے بی کام تک تعلیم حاصل کی ہے۔مختلف اخبارات میں کالم لکھتی ہیں۔چند ماہ قبل رائٹرز کلب میں شمولیت اختیار کی۔

فہرست تحریر:

1-مذہب انسانیت

2-زندگی بے کار نہیں (افسانہ)

3-مطالعے کی اہمیت

4-ذرا سی بات

5-سیاست کا رنگین چشمہ

☆.....☆.....☆

مذہبِ انسانیت

دنیا بنی، آدم کی تخلیق ہوئی اور پھر فرشتوں کو حکم ہوا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ ابلیس نے انکار کیا اور خود کو اس خاک کے پتلے سے بہتر جانا۔ اس کے تکبر نے اسے شیطان بنا دیا۔ اس کے بعد سے اس کی انسان سے دشمنی شروع ہوگئی اور انسان کو انسانیت سے گرانے کی کوششوں پر محیط ہوگئی۔ اللہ سے مہلت اور یہ اختیار مانگا کہ میں انسان کو ہر طرح سے بہکاؤں اور صراطِ مستقیم سے ہٹاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے روز حشر تک کے لیے یہ اختیار دے دیا لیکن اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ کہا، ''جو گناہ کے بعد توبہ کر لے، وہ ہمارا''۔

شیطان نے انسان کو ہر طرح بہکانے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی کوشش کی لیکن اللہ کے نیک بندوں کی جانب سے جب ناکامی ہوئی اور ہر وار ناکام ٹھہرا تو اس نے گناہ کو مذہبِ انسانیت کا لبادہ پہنایا تاکہ نہ گناہ کا تصور ہو اور نہ ہی توبہ کی توفیق نصیب ہو۔ مذہبِ انسانیت وہ فتنہ جسے ہمدردی اور خلوص کی پوشاک پہنا کر برابری کے زیور سے آراستہ کیا گیا تاکہ دینی فرائض کی ادائیگی کو رکاوٹ بنا کر سادہ اور سچے مسلمان کو آسانی سے ورغلایا جا سکے۔ سادہ لوح مسلمانوں کو انسانیت کا جھانسہ دے کر یہود و نصاریٰ کے مابین فرق کو مٹایا جا سکے اور مسلمان اپنی عبادت و ریاضت سے بے نیاز ہو کر فقط بندوں کی بندگی ہی کو عبادت تصور کرے اور اس مذہب، انسانیت کا پیروکار بن جائے۔

ہمارے معاشرے کی ایک بڑی برائی یہ بھی ہے کہ بغیر تحقیق کے بات آگے بڑھا دیتے ہیں۔ مذہب سے جان چھڑانے یا اپنی کم علمی چھپانے کے لیے انسانیت کا سہارا لے کر وقتی ہمدردی ہی کو مذہب کا نام دے کر دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ نام نہاد مسلمان انسانیت، انسانیت کا کھیل شروع کر چکے ہیں اور انسانیت کو مذہب سے اونچا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اسے خدا کی خوشنودی کا واحد حل بتاتے ہیں۔ انسانیت دراصل ایک جذبہ ہے ہمدردی کا، جو وقتی طور پہ اپنا بھرپور اثر دکھاتا ہے۔ یوں شیطان کے آلۂ کار بہت خوب صورتی اور آسانی سے اپنا وار کیے جاتے ہیں۔ حالاں کہ جو کام انسانیت یا ہمدردی کے نام پر کیے جاتے ہیں ان سب کی تعلیم ہمارے مذہب نے پہلے ہی دی ہے لیکن اسلامی تعلیمات سے دوری نے مسلمان کو اس فتنے میں ڈال دیا ہے۔

ہم انسان ہیں اور انسانیت ایک بہت بڑی دلیل ہے لیکن اس کو دین اسلام پہ فوقیت نہیں دی جاسکتی کیوں کہ اسلام اللہ کا بنایا ہوا دین ہے اور اس میں جتنا زیادہ حقوق العباد کا خیال کیا گیا ہے اور اس کی تعلیم دی گئی ہے کسی اور مذہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جہاں اللہ خود یہ کہے کہ حقوق اللہ کو تو میں معاف کرسکتا ہوں لیکن حقوق العباد کے لیے خود اپنے معاملات صاف رکھنے ہوں گے۔ وہ تمام کام، جو انسانیت کے نام پر کروائے جارہے ہیں، اسلام نے انھیں فرائض کے درجے میں رکھا ہے۔ عوام کی فلاح و بہبود کے کام کرنا، لوگوں کی دادرسی کرنا، دکھ بانٹنا، پریشانی دور کرنا، غریب لوگوں کی مدد کرنا وغیرہ، ان سب کو انسانیت کا نام دیا جارہا ہے جب کہ اسلام ان کا حکم دیتا ہے اور یہ سب کام نیکی کے درجے میں آتے ہیں، جنھیں حقوق العباد کہا گیا ہ لیکن کوئی بھی شخص فقط حقوق العباد پورے کر کے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا، اِلّا یہ کہ وہ حقوق اللہ بھی ادا کرے، جس کے لیے اسے اسلامی تعلیمات سے آگہی ضروری ہے۔

کچھ این جی اوز بھی اپنا کام چلانے اور کاروبار چمکانے کے لیے اس فتنے کو ہوا دے رہی ہیں۔ امداد حاصل کرنے کے چکر میں انسانیت کی خدمت کو مذہب کا نام دیا جارہا ہے اور مذہب کو ثانوی حیثیت دے کر ذاتی زندگی تک محدود کر کے مذہب سے دور کیا جارہا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور حقوق العباد پر زور دیا جائے۔ اسلام کے احکامات پر عمل کر کے اس دَور کے فتنوں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ انسانیت مذہب نہیں، مذہب کا حصہ ہے۔ اسے کسی طور مذہب کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ انسانیت کی خدمت رضائے الٰہی کے لیے کی جائے تو دنیا اور آخرت، دونوں سنور جائیں گے۔ فتنوں کے اس دور میں اللہ ہمیں ہر فتنے سے بچائے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

زندگی بے کار نہیں (افسانہ)

پورے کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ ساری لائٹس آف تھیں۔ چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ لیزا کو پھر ڈپریشن کا دورہ پڑا تھا۔ وہ صوفے پر آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔

ندا کو کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اندازہ ہو گیا، پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے وہ صوفے پہ جگہ بناتے ہوئے بیٹھی اور لیزا کو زبردستی پانی پلانے لگی۔ ''مرنے دو مجھے، میری اس بے کار زندگی کا کوئی فائدہ نہیں''۔ ''اگر تمہاری زندگی کا کوئی فائدہ نہ ہوتا تو وہ تمہیں پیدا ہی نہ کرتا''۔ ندا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور سہلانے لگی۔ ''میری جان! میری بات مان لو، اس خدا کو مان لو جس نے تم کو یہ خوب صورت زندگی دی ہے''۔

''مجھے اپنی زندگی سے وحشت ہوتی ہے اور تم اسے خوب صورت کہہ رہی ہو؟ گناہوں سے بھری، گندی، غلیظ زندگی، مجھے تو اپنے وجود سے گھن آتی ہے، میری سانس گھٹنے لگتی ہے۔ میرے لیے یہ نشہ ہی اب نجات کا راستہ ہے''۔ ''نجات صرف اللہ کے پاس ہے۔ تم ایک دفعہ اس کی طرف آؤ تو سہی، وہ تم کو پاک صاف کر دے گا''۔ ''اچھا....! تو جب میں اس دلدل میں ڈوب رہی تھی تب کہاں تھا تمہارا اللہ؟'' لیزا جھٹکے سے اٹھی اور گلاس پر ہاتھ مار کے دُور پھینک دیا۔

''وہ تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہوتا ہے، بس ہم ہی اسے نہیں پکارتے۔ آج جب اس بڑھاپے نے تمہیں آئینہ دکھایا ہے تو تم نے اس گندگی کو پہچان لیا اور اب، جب تم اس سے نکلنا چاہ رہی ہو تو اس نے ہم دونوں کو ملا دیا ہے ورنہ بارہ سال پرانی کالج کی دوست کا اچانک ملنا صرف اتفاق نہیں ہے۔ یہ اس رحمٰن کی مدد ہے، جسے تم سمجھ کے بھی سمجھنا نہیں چاہ رہی ہو''۔ ندا نے کہا۔ ''مجھے سونے دو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا''۔ لیزا آہستہ آہستہ غنودگی میں جا رہی تھی۔ ''ٹھیک ہے تم سو جاؤ لیکن کل تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ صرف ایک دفعہ تم استاد نعمان کی بات سن لو، صرف ایک

بار''۔

لیزا اب سو چکی تھی۔ندا نے اسے ٹھیک سے اوپر لٹایا، کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔تازہ ہوا اندر آئی تو کمرے کی گھٹن بھی کچھ کم ہوئی۔اپنے لیے کافی بنا کر وہ کمرے سے ملحق گیلری میں آ کے بیٹھ گئی۔پندرہ سال پہلے جب وہ اپنے والدین کے ساتھ بوسٹن شفٹ ہوئی تھی تو کالج میں اس کی دوستی لیزا سے ہوئی تھی۔وہ جب بھی بے باک سی لڑکی تھی اور اپنے والدین کے درمیان علیحدگی ہونے کے بعد اکیلی ہاسٹل میں رہتی تھی۔پیسہ حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی۔ندا کی اس سے اتنی زیادہ دوستی کی وجہ شاید یہی تھی کہ ندا اسے اکثر اپنے گھر لے آتی۔لیزا کو اس کے گھر کا ماحول، ماں باپ، بہن بھائیوں کا آپس میں پیار اتنا پُرکشش لگتا کہ وہ بار بار وہاں آتی۔کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے کچھ عرصے بعد تک تو دونوں کی بات چیت رہی پھر لیزا اپنی دنیا میں مگن ہوتی چلی گئی اور دونوں میں دوستی قریباً ختم ہوگئی۔ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی جب ندا نے رات کو اپنی گاڑی کے سامنے آنے والی ایک عورت کو خودکشی سے بچایا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ لیزا ہوگی۔لیزا اپنے معاشرے کے منفی رویے کی تصویر تھی۔مادّیت پرست معاشرے نے اس سے اچھے برے کی تمیز چھین لی تھی لیکن جب ڈھلتی عمر نے اسے اکیلا کیا تو اس کو اپنے گناہوں میں ڈوبی زندگی سے وحشت ہونے لگی اور وہ اپنی زندگی ختم کرنے کے درپے ہوگئی۔ندا کو اس وقت لیزا سے شدید ہمدردی ہو رہی تھی۔وہ کافی عرصے سے قرآن کا مطالعہ کر رہی تھی اور استاد نعمان کے لیکچرز بھی سن رہی تھی۔اس کی پوری کوشش تھی کہ اللہ لیزا کو ہدایت دے اور وہ اپنی اس حالت سے باہر آ جائے۔دوسرے دن بڑی مشکل سے وہ لیزا کو استاد کے پاس لے گئی۔

''مایوسی کفر ہے میری بہن! آپ اللہ سے معافی مانگیے، وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ان شاءاللہ آپ کو معافی کے بعد سکون بھی مل جائے گا''۔استاد نعمان بڑے ٹھہرے ہوئے پُراثر لہجے میں سمجھا رہے تھے۔''میری ساری زندگی گناہوں سے بھری ہوئی ہے۔مجھے ایسے بیٹھے بیٹھے کیسے معافی مل سکتی ہے، کیا آپ کا اللہ مجھے یوں ہی سکون دے دے گا؟''لیزا رو رہی تھی، اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔''اپنے اللہ سے کہو، مجھے سکون دے دے، میری سانس گھٹتی ہے لیکن یہ کیسے ہوگا کیسے؟''

''میری بہن! اللہ سب کا ہے۔اپنے گناہوں کا احساس ہونا ہی معافی ہے۔آپ کو اگر سکون چاہیے تو آپ مجبور لوگوں کی مدد کریں۔ہماری ایک ٹیم قحط زدہ علاقے میں جا رہی ہے، آپ ان کے ساتھ چلی جائیں، اللہ آپ کی مدد کرے''۔استاد نعمان کی باتوں سے لیزا کو کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔''یہ کچھ کتابیں ہیں، آپ راستے میں پڑھتی جائیں''۔استاد نعمان نے اس کی طرف کچھ کتابیں بڑھائیں اور لیزا نے خاموشی سے وہ کتابیں لے لیں۔

افریقا کے ملک سوڈان کے گاؤں پہنچ کر لیزا کو لوگوں کی بے بسی کا اندازہ ہوا۔بھوک سے متاثر لاغر جسم والے بچے دیکھ کر اسے رونا آنے لگا۔وہ اپنے آپ سے بے گانہ چلتی جا رہی تھی کہ اچانک ایک بچے کی منحنی سی آواز نے اسے

چونکا دیا۔ شاید وہ بھوکا تھا اور پیاسا بھی۔ لیزا نے اِدھر اُدھر دیکھا، وہ اپنے ساتھیوں سے کافی دُور نکل آئی تھی۔ کھانے کی کوئی چیز تو اس کے پاس تھی نہیں، قریب کے جوہڑ میں پانی ضرور تھا لیکن پلانے کے لیے کوئی برتن نہ تھا۔ بچے کا منہ پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ لیزا کو جب کچھ نہ سوجھا تو اس نے اپنا لال جوتا پاؤں سے اتارا، اس میں پانی بھر کے لائی اور بچے کو پلا دیا۔ جوں ہی بچے نے پانی اپنے حلق سے اتارا، لیزا کو اپنے اندر ایک سکون سا اترتا محسوس ہوا جس کی کیفیت خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ رات، کتاب میں پڑھا ہوا واقعہ اس کی نظروں کے سامنے تھا، جب اللہ نے ایک بدکارہ کو صرف اس لیے بخش دیا تھا کہ اس نے اپنے موزے سے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔ وہ کل سے یہی سوچ رہی تھی کہ اللہ اُسے کیسے معاف کر سکتا ہے؟ اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شُکر بھی ادا کر رہی تھی۔ تاہم، اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی لیکن ایک ٹھنڈک تھی، جو اس کے اندر ہی اندر اترتی جا رہی تھی۔

آج اسے اسلام کی سچائی کا ادراک ہو گیا تھا، اسے ندا کی بات پر یقین آ گیا تھا کہ اللہ نے کسی کی بھی زندگی بے کار نہیں بنائی۔ اب وہ اپنی زندگی انہی لوگوں کے لیے وقف کر دے گی۔ اس چھوٹے سے واقعے نے اس کے لیے اسلام کا دروازہ کھول دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

مطالعے کی اہمیت

انگریزی کا مقولہ ہے، ''مطالعہ سرکردگی اور رہنمائی ہے''۔ جب مطالعہ شروع ہوتا ہے تو ذہن کھلتا ہے اور روشنی کی کرنیں اندر کا اندھیرا چیرتی چلی جاتی ہیں۔ مطالعہ گہرا ہو تو گرہیں کھلتی ہیں اور مطالعے میں تسلسل پیدا ہو جائے تو جیسے آپ زندگی کی شاہ راہ پہ سبک رفتاری سے خراماں خراماں منزل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھر راستے کا کوئی اسپیڈ بریکر آپ کی رفتار پہ اثر انداز ہوتا ہے اور نہ راستے کا کوئی پتھر رکاوٹ ڈالتا ہے۔ ایک کے بعد ایک سنگ میل طے ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہمارا تو مذہب بھی 'اقرا' سے شروع ہوتا ہے، لوح و قلم کا رشتہ بھی انسانیت کی ارتقا سے جڑا ہوا ہے۔ کتاب اور اس کا پڑھنا، لطف ہی کچھ اور ہے اور جو اس کی لذت پا جاتے ہیں انہیں پھر کسی اور بات کا لطف نہیں آتا۔ مطالعے کے فوائد گنوائے نہیں جا سکتے، یہ پڑھنے والے کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ اسے کس حد تک اپنے اندر سموتا ہے۔ اچھی کتابوں کا انتخاب آہستہ آہستہ آپ کی شخصیت نکھارتا ہے اور مختلف موضوعات کی کتب کا مطالعہ الگ الگ اثر دکھاتا ہے۔ مطالعہ، مشاہدے اور زندگی کے تجربات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور کسی بھی امتحان سے گزرنے یا آزمائش سے نبرد آزما ہونے پر مددگار ثابت ہوتا ہے۔

موبائل اور انٹرنیٹ کے اس دَور میں انسان اور کتاب کا رشتہ ختم ہونے کی وجہ ہی سے بے راہ روی بڑھی ہے۔ گو کہ مطالعہ موبائل سے بھی کیا جا سکتا ہے لیکن سوشل میڈیا میں مختلف چیزوں کی بہتات کی وجہ سے مطالعہ بے چارہ ایک طرف دَھرا رہ جاتا ہے اور قاری کسی دوسری ہی چیز میں مگن ہو جاتا ہے، یوں بے کار کی تفریح وقت کے زیاں کا باعث بنتی ہے۔

اچھی کتب کا مطالعہ وقت گزاری اور مشغلے کے لیے بہترین ہے۔ اچھے برے وقت کا ساتھی، دوست، رفیق، غم

گسار اور راز داں بھی ہے۔لیکن جیسا کہ مرزا غالب نے کہا ہے،''شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے'' اسی طرح آپ کی کتابوں کی لائبریری بھی آپ کے ذوق کی آئینہ دار ہوگی۔لکھاری کے لیے مٹی، پانی، ہوا اور دھوپ، سب کام کے لیے ایک مطالعہ ہی کافی ہے۔اب جس کو جتنی زندگی درکار ہے، وہ اتنا ہی مطالعہ کرے۔

اپنی ذات سے ہٹ کے دیکھا جائے تو مطالعہ اس وقت ہماری قومی ضرورت ہے کیوں کہ جس قوم سے علم نکل جائے، اس کی تنزلی شروع ہو جاتی ہے۔ہمیں نوجوان نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کرنا ہوگا اور وہ بھی مادری زبان میں، کیوں کہ مادری زبان تخلیقی صلاحیتیں ابھارتی ہے اور کتاب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

پیدا ہو تیرے ہجر کی موجوں میں تلاطم
تو شاعرِ مشرق کے دیوان پڑھا کر

جب مطالعہ، سوچ کو پختگی دے گا، الفاظ کا ذخیرہ ہوگا، دل میں لگن جاگے گی تو پھر یہی ہوگا کہ

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

☆.....☆.....☆

ذرا سی بات

خالہ بی نے نہ جانے کیوں مجھ سے ضد سی باندھ لی تھی۔ بچوں کے کام آہستہ آہستہ اپنے ذمے لے لیے تھے۔ پہلے پہل تو مجھے اندازہ نہیں ہوا لیکن جب ہر صبح وہ مجھ سے پہلے اٹھنے لگیں تو مجھے تشویش ہوئی۔ کل تو حد ہی ہوگئی۔ میں جان بوجھ کر صبح فجر پڑھنے سے پہلے کچن میں آ گئی اور بچوں کے لنچ کی تیاری شروع کر دی۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ خالہ بی کچن میں۔ ''ارے خالہ بی! آپ سکون سے اپنی تسبیح پڑھیں، یہ میں کرلوں گی''۔ میں نے غصے کے باوجود بڑے تحمل سے کہا لیکن جی.... انہوں نے تو جیسے سنا ہی نہیں اور انڈے پھینٹنے شروع کر دیے۔ میں نے بھی کمرے میں آ کر نماز شروع کر دی لیکن میرا دماغ اسی طرف لگا رہا۔ میں نے سوچ لیا تھا، آج میاں جی سے ضرور بات کروں گی۔

بچے اسکول جا چکے تھے اور خالہ بی دوبارہ سو گئی تھیں۔ میرا دماغ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ سمیع ناشتے کی میز پر آئے تو مسکراتے ہوئے بولے، ''یہ غصہ برتنوں پہ کیوں نکل رہا ہے۔ کیا ہو گیا آج صبح صبح؟'' میں تو جیسے بھری بیٹھی تھی، ''دیکھیں سمیع! میں نے بہت برداشت کر لیا۔ خالہ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں، وہ بچوں کو مجھ سے دُور کر رہی ہیں''۔

''واہ واہ! کیا خیال ہے۔ یہ اچانک کیسے ذہن میں آیا؟'' سمیع نے طنز کیا۔ ''میں مذاق نہیں کر رہی، وہ بچوں کے سارے کام خود کرنے لگی ہیں۔ مجھ سے پہلے سب کچھ کرنے کی فکر رہتی ہے انہیں اور اب تو میں صبح جتنی جلدی اٹھوں، دوسرے دن وہ اس سے پہلے اٹھ جاتی ہیں''۔ میں نے بات کرتے کرتے چائے نکالی اور میز پہ سمیع کے ساتھ ہی ناشتا کرنے بیٹھ گئی مگر کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔

''تم کو وہم ہے، بات کچھ بھی نہیں۔ بھلا وہ ایسا کیوں کریں گی؟'' میں خاموش ہی رہی تو انہوں نے کہا، ''تم ایسا کرو، تھوڑی دیر امی کی طرف ہو آؤ بلکہ میں تمہیں چھوڑتا ہوا آفس چلا جاؤں گا''۔ یہ سن کر مجھے بھی کچھ تسلی ہوئی۔ امی

سے مشورہ کروں گی تو سکون مل جائے گا۔ گھر قریب ہونے کی سہولت بھی کسی نعمت سے کم نہیں۔ ''نہیں....آپ جائیں، میں ماسی سے کام کروا کے چلی جاؤں گی۔ خالہ بی بھی تب تک اٹھ جائیں گی''۔

امی کے گھر میں داخل ہوئی تو دال بگھارنے کی خوشبو سے ایک دم بھوک چمک اٹھی، ویسے بھی اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میکے میں کھانے کا مزہ ہی الگ ہے۔ پلیٹ میں دال چاول نکالے اور امی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''بات کیا ہے؟ کچھ خیریت نہیں لگ رہی''۔ وہ میرے بے وقت آنے پر حیران تھیں۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے انہیں اپنی تشویش سے آگاہ کیا تو میری توقع کے برخلاف وہ پریشان ہونے کے بجائے مسکرانے لگیں۔ ان کے مسکراتے ہی میرا منہ بن گیا۔

''امی! میں نے آپ سے آج تک کوئی شکایت نہیں کی، اب آپ میری بات سمجھ ہی نہیں رہیں''۔ ''یہی تو میں کہہ رہی ہوں بیٹا! کہ اچانک ایسا کیا ہو گیا؟'' امی میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں، ''میں تمہیں غلط نہیں کہوں گی لیکن خود سوچو! شادی سے اب تک کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی تو اب کیوں....؟ اور اگر واقعی کوئی وجہ ہے تو خود سوچو''۔ مجھے امی کی بات سے اتفاق تھا لیکن خالہ بی کو مسئلہ ہی کیا تھا، کوئی ذمے داری تو تھی نہیں ان کی۔ ہم سب ان کا خیال رکھتے تھے، بس آج کل نئے گھر کی شفٹنگ میں تھوڑا مصروف ہو گئے تھے۔ بچے بھی ہر وقت اپنے کمروں کی سیٹنگ کی باتیں کرتے رہتے۔ نیچے خالہ بی کا اور ہمارا کمرہ تھا، بچوں کے کمرے اوپر تھے۔ امی دروازہ کھولنے گئیں تو میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگی۔ سب ہی اپنی اپنی پسند بتا رہے تھے سوائے خالہ بی کے۔ امی واپس آئیں اور ان کے ساتھ محلے کی کچھ خواتین کو دیکھا تو میرے ذہن کی ساری گتھیاں سلجھ گئیں۔ جب سے نئے گھر جانے کا فیصلہ ہوا تھا، تب ہی سے خالہ بی کے رویے میں تبدیلی ہونی شروع ہو گئی تھی۔ ان کے اندر اکیلے پن کا خوف سر اٹھانے لگا تھا اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اب بچے مجھ سے دور ہو جائیں گے۔ تو کیوں نہ میں انہیں اپنا اتنا عادی بنا لوں کہ وہ مجھے چھوڑ کے اوپر کی منزل پر نہ جائیں۔ میں نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بولیں، ''یقیناً تم نے اپنے مسئلے کا حل نکال لیا ہے''۔

''جی امی! آپ کی مصروفیت نے مجھے اس مشکل. سے نکال دیا ہے۔ میری شادی کے بعد جب بھائی نوکری کی وجہ سے جدہ چلے گئے تو امی نے اپنے گھر میں عورتوں کے لیے تدریس قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان کو اکیلے پن کا کوئی خوف نہیں تھا اور اب مجھے خالہ بی کے دل سے بھی یہ خوف نکالنا تھا۔ اپنائیت، محبت اور اس یقین کے ساتھ کہ اگر ساتھ اچھا ہو تو صرف گھر بدلتے ہیں، دل نہیں۔

☆.....☆.....☆

سیاست کا رنگین چشمہ

پرانی بات ہے، عید تہوار پر بچوں کو رنگین چشمے دلائے جاتے تھے، جس رنگ کا چشمہ ہوتا، اسی رنگ کی دنیا نظر آتی۔ آج یہ کام سیاسی وابستگی نے لے لیا ہے، جو جس کے ساتھ جڑ گیا، اسی کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ اپنے لیڈر کو عقلِ کل مان کر اس کی ہر اچھی بری بات کی حمایت کی جا رہی ہوتی ہے، اسے مسندِ خاص پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد....'ہم جو کر رہے ہیں، صحیح کر رہے ہیں۔ یہی ملک کے مفاد میں ہے، باقی سب غلط ہے، وغیرہ وغیر۔' اب اس کے لیے چاہے کتنی ہی بے تکی تاویلیں دینی پڑیں، گریز نہیں کرتے۔ اِدھر اُدھر بات گھما کر الزام تراشی پر آ جاتے ہیں۔

آج لوگوں نے اپنی سیاسی پارٹی کو اپنی عزتِ نفس کا معاملہ بنا لیا ہے۔ چھوٹی سی بات ہو یا معمولی اختلاف، ذرا کی ذرا میں بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور بعض اوقات تو رشتے داریاں اور دوستیاں تک داؤ پر لگ جاتی ہیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ ذرا دیر میں شرافت کا لبادہ اتار پھینکتے ہیں حالاں کہ اگر اس وقت، وہ اپنی وابستگی کا رنگین چشمہ اتار دیں تو اصل حقیقت واضح ہو جائے۔ یوں صحیح بات کو تسلیم کر لینا نہ صرف ان کے بلکہ ان کی پارٹی کے لیے بھی مفید ثابت ہو جائے۔

ہمارا دین ہمیں ہمیشہ سچ بات کہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ من حیث القوم ہمیں ایک دوسرے کی بات سننے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنی انا کو پس پشت ڈال کر صحیح بات کریں، تنقید برائے تنقید نہ کریں بلکہ ملک کے وسیع تر مفاد میں درست فیصلہ کریں۔ ہماری مثبت تنقید قائدین سے درست فیصلے کروائے گی، جو نہ صرف ملک بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے بھی سود مند ثابت ہوں گے۔

اس وقت ملک جن مشکل حالات سے گزر رہا ہے، دشمنانِ اسلام نے ہمارے خلاف ہر طرح کے محاذ کھول

رکھے ہیں۔ان حالات میں خدارا عقل کے ناخن لیں، آنکھیں کھولیں اور سچ بولیں۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور مسلمان ہونے کے ناتے ہمیں سیاسی وابستگی سے ہٹ کر، ایک قوم بن کر فیصلے کرنے ہونگے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

زیبا عظیم

زیبا عظیم کا تعلق پنجاب کے علاقہ چشتیاں سے ہے، لکھنے کا آغاز 3 برس قبل کیا۔ تعلیم ایم اے میڈیا اسٹڈیز میں۔ رائٹرز کلب سے 2016ء سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- تعلیم میں اساتذہ کا کردار

2- رشتے نبھانے کی آخری صدی

3- ریڈرز ہی لیڈر

4- حقیقی رشتوں کی قدر کیجیے

5- فرائیڈے.... بلیک یا وائٹ؟ فیصلہ آپ کا

☆.....☆.....☆

تعلیم میں اساتذہ کا کردار

انسانی جسم میں جیسے ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت ہے، ویسے ہی معاشرے میں استاد کی اہمیت ہے۔ استاد کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تو ہر کوئی جانتا ہوگا مگر اس مرتبے کے ساتھ انصاف کوئی کوئی کرتا ہوگا۔ استاد روحانی باپ کا درجہ رکھتا ہے۔ بغیر استاد کے کوئی بھی شاگرد کوئی کام، کوئی علم نہیں سیکھ سکتا۔ حضرت محمد صل اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''دنیا میں تمہارے تین باپ ہیں۔ ایک وہ، جو تمہیں عدم سے وجود میں لے کر آیا، دوسرا وہ جس نے تمہیں اپنی بیٹی دی اور تیسرا وہ، جس نے تمہیں علم سکھایا''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''جس شخص نے تمہیں اک لفظ بھی سکھا دیا، وہ تمہارا استاد ہے''۔

والدین اپنی اولاد کو عدم سے وجود میں لے کر آتے ہیں مگر جب بچے کو درس گاہ میں بھیجتے ہیں تو استاد ہی ہوتا ہے، جو سب سے پہلے اسے قلم پکڑنا سکھاتا ہے۔

امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اتنی بڑی مملکت کے خلیفہ ہونے کے باوجود ان کے دل میں کوئی حسرت ہے؟ تو آپ نے فرمایا، ''کاش! میں ایک معلم ہوتا''۔ استاد، معاشرے کا وہ ستون ہے جس کے بل پر معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر یہ ستون کم زور ہونے لگے تو معاشرے کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ معلم ایک ایسی شخصیت ہے، جو بچے کو بتاتا ہے کہ وہ کون ہے، کیا ہے، کہاں سے آیا ہے، اسے کہاں جانا ہے، اس کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے، اس کا اصلی مالک کون ہے، وہ کس کی غلامی کا پابند ہے اور اس کا سر کس کے سامنے جھکنا ہے؟

شاعرِ مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں، ''استاد دراصل قوم کے محافظ ہیں کیوں کہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا، انہیں کے سپرد ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور کارگزاریوں میں سب سے

زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے معلموں کی کارگزاری ہے۔ معلم کا فرض تمام فرائض سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیوں کہ تمام اقسام کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اس کے ہاتھ میں ہے اور ہمہ قسم کی ترقی کا سرچشمہ اس کی محنت ہے''۔

اہل مغرب کا کہنا ہے کہ زندگی کے پہلے تیس سال پڑھو، پھر اگلے تیس سال اُسے پڑھاؤ اور سکھاؤ۔ یہ ''رِیڈ اینڈ لیڈ'' کا فارمولا کہلاتا ہے۔ استاد طلبا کے لیے ایک مثال کی مانند ہوتا ہے۔ اسکول میں آنے والا ہر بچہ ایک اَن لکھی سلیٹ کی مانند ہوتا ہے اور استاد جو کچھ اسے سکھاتا اور پڑھاتا ہے، وہ اسے عمر بھر نہیں بھول پاتا۔ اگر ان کو صحیح نہج اور طرز پر تعلیم دی گئی ہو تو یہی اس کی ترقی کا بہترین زینہ بن جاتی ہے۔

یہ مثالیں استاد کے مقام اور درجوں کو بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مگر معاشرہ استاد سے کیا چاہتا ہے؟ ایک اچھے استاد کی خوبیوں کے بارے میں ابراہم لنکن کا کہنا ہے، ''استاد وہ ہوتا ہے جو طالب علم کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرے''۔ مگر افسوس.... آج تعلیم ایک کامیاب کاروبار بن چکی ہے اور استاد کامیاب بزنس مین۔ آج کل استاد ایک سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ معاشرے کے لیے استاد کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ پھر مخلوط تعلیمی نظام میں مرد و خاتون اساتذہ کی وجہ سے بچوں اور بچیوں کی تعلیم پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مگر آج کل یونیورسٹیوں کی تعلیم اور اساتذہ کا کردار قابل رحم ہو چکا ہے۔ پڑھنے والے اور پڑھانے والے، سب اپنے اپنے فرائض بھول بیٹھے ہیں۔ تعلیم ایک فیشن بن چکی ہے جسے استاد سجا کے پیش کرتا ہے۔ مجھے جو ذاتی کم زوری یونیورسٹی میں نظر آتی وہ ہے کہ اساتذہ کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ کہاں کہاں اور کیسے اپنے شاگردوں کے ساتھ ناانصافی کر جاتے ہیں اور کیسے ان کی تربیت میں کمی چھوڑ جاتے ہیں۔ روزانہ کلاس میں آنا ایک عادت بن گئی ہے۔ اساتذہ کی باقی کوئی دلچسپی نہیں کہ کلاس میں بیٹھا شاگرد ہیرا ہے یا ایک روشن ستارا۔ فیورٹ ازم حد سے زیادہ، جو سچ بولے گا وہ زیادہ نقصان اٹھائے گا۔ حتیٰ کہ شاگردوں کی قابلیت کا معیار اُن کی شکلوں سے بنایا جائے گا۔ شکل اچھی، نمبر اچھے.... یا جو تعریفیں زیادہ کرے گا، خود سے بنا بنا کے باتیں کان بھرے گا، فوٹو بنا کے اپ لوڈ کرے گا، وہ کامیاب ہوگا۔

میری نظر میں آج کل کے استاد، قوم کے معمار کی، اس سے بھی زیادہ 'خوبیاں' ہیں کہ ظاہر کو دیکھ کر ایک استاد، شاگرد کا کردار تک جان لیتا اور ایسی غلط رائے قائم کر دیتا ہے کہ کچھ شاگردوں کے لیے تو یہ رائے بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اساتذہ کے آپس میں ذاتی اختلافات سے بھی شاگرد ہی پستے ہیں۔ ایک نے نمبر زیادہ دیے تو دوسرا چڑ کے کم دے گا۔ سچ اور محنت کا رواج ختم ہو گیا۔ مجھے اک مرتبہ ایک دوست سے بات کے دوران پتا چلا کہ اسے استاد کے پیشے

ہی سے نفرت ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کے لیے کئی مثالیں دیں مگر اس کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اس مقدس پیشے سے بدگمان ہے۔ تو سمجھ میں آیا، جہاں اساتذہ ظاہری حُسن کو پسند کریں اور حُسن والیوں کو نمبر دیں تو ایسی تعلیم پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لینا چاہیے۔

اساتذہ سے گزارش ہے کہ آپ اپنے سے نہ سہی، کم از کم اپنے پیشے سے خیانت نہ کریں۔ تعلیم ایسا شعبہ ہے جس پر کسی قسم کی غیر ذمے داری ہرگز برداشت نہیں ہونی چاہیے۔ تعلیمی اداروں میں غیر مہذب الفاظ اور غیر مہذب انداز سے بھی پرہیز کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں اور بچیوں کو حصول تعلیم میں کامیاب کرے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

رشتے نبھانے کی آخری صدی

انسانی زندگی میں رشتوں کی اہمیت سے انکار نہیں بلکہ انہیں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ان رشتوں پر غور کریں تو پتا چلے گا کہ یہ فولاد سے زیادہ مضبوط اور شیشے سے زیادہ نازک ہیں۔یہی زندگی کی فطرت اور کائنات کا راز ہے کہ ہر شے اس دارالفنا میں فنا ہوتی ہے۔اسی لیے انسانی تعلقات اور رشتوں سے زیادہ کوئی شے ناپائیدار، کم زور اور نازک نہیں، البتہ جو رشتے احساس اور ایثار کے خمیر سے گوندھے جاتے ہیں وہ کے۔ٹو سے بلند ظرف اور فولاد سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

رشتے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔رب کی طرف سے عطا کردہ فطری، روحانی، قانونی، انسانیت کے اور وہ، جو ہم خود بناتے ہیں، دوستی کی صورت میں۔ یہ تمام وہ رشتے ہیں جن کے باعث ایک انسان دوسرے انسان میں کشش محسوس کرتا ہے۔مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا ہم ہر رشتے کو بہتر طریقے سے نباہ رہے ہیں؟ کہیں آج ہم دُہرے معیار پہ تو عمل نہیں کر رہے کہ اپنے باپ کے ساتھ اور رویہ اور دوست کے ساتھ اور رویہ۔ارے دوست بھی تحفۂ خدا ہوتے ہیں۔تاہم، یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں ماں باپ کی عزت واہمیت پر ان کو بھی فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر رشتے کی اہمیت کو سمجھا جائے اور خوب صورتی سے نبھایا جائے، کیوں کہ کوئی بھی رشتہ بغیر عزت، احترام اور یقین کے کامیاب نہیں ہوسکتا۔

رشتوں کو کامیابی سے نبھانے کا راز ان تین (عزت، احترام، یقین) عناصر میں ہے اور یہ جُز ہر رشتے کے لیے برابری کی سطح پر لاگو کر کے ہم نئے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ یاد رکھیے! دولت، شہرت اور دنیاوی مال سب معمولی ہیں۔اہم ہیں تو رشتے، ان کی عزت، ان سے جڑے رہنا۔یہ دنیاوی مال واسباب ہمیں زندگی بھر کے لیے خوشیاں نہیں دے

سکتے کیوں کہ ہماری خوشیاں تو اپنے رشتوں کے ساتھ جڑی ہیں اور ان ہی سے ہماری زندگی آسان ہوتی ہے۔ اپنوں سے دُور ہو کر اغیار کو اہمیت دینا اور انہیں کے ساتھ خوشیاں تلاش کرنا بے وقوفی کی انتہا ہے۔

محترم قارئین! میں اعتراف کرتی ہوں کہ رشتے نبھانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اُن سے جڑے رہنے کے لیے اپنا بنا کر رکھنے کے لیے بعض اوقات دل دکھانے والے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے ظرف کا پیمانہ بلند کرنا پڑتا ہے، اپنی انا اور غصے کا گلا گھونٹ کر دل صاف کرنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر رشتوں کی ڈور مضبوط ہوتی ہے اور وہ مضبوطی ہم اپنے اعتماد، خلوص اور پیار سے دیتے ہیں، پھر وہ رشتہ محض رشتہ نہیں بلکہ ایک گھنا سایہ دار درخت بن جاتا ہے جس کی چھاؤں میں سبھی مل کر رہتے ہیں چاہے وہ رشتہ خون کا ہو یا ہمارا خود کا بنایا ہوا۔

مگر افسوس صد افسوس! آج رشتہ نبھانا سب سے مشکل کام بن گیا ہے۔ ہم اپنے رشتوں میں ناکام ہو گئے۔ ایک چھت تلے رہتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھتے۔ ہائے.... یہ رشتے نبھانے کی آخری صدی ہے۔ یہ بڑا المیہ ہے کہ ہم برداشت، احساس اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ معمولی بات پر قطع تعلق کی قسمیں کھا کر خوشی غمی میں شریک نہ ہونا معمول بن چکا ہے۔ بعض تو راستہ چلتے ہوئے سلام دعا بھی ترک کر دیتے ہیں۔ معذرت کے ساتھ.... اگر یہ رشتے ہمیں خرید کر بنانے پڑتے تو یقیناً ہم ان کی بھی قدر کرتے، یہ تو رب کی مفت نعمت ہے، جس کی ہم بالکل قدر نہیں کرتے۔

خدارا! اپنے رشتوں کو وقت دیں، انہیں سمجھیں کیوں کہ انسان وہ تناور درخت ہے، جس کی ٹہنیاں اس کے رشتے ہیں۔ اگر ٹہنیاں سوکھ جائیں تو درخت بھی ہرا نہیں رہتا اور بغیر ٹہنیوں کے کوئی درخت خوب صورت نہیں لگتا۔ لہٰذا، اپنے رشتوں کو محبت، اپنائیت اور احترام کا پانی پلاتے رہیے تاکہ درخت (آپ خود) بھی ہرے بھرے رہیں اور ٹہنیاں (رشتے) بھی۔

آپ سے التجا ہے کہ اپنے رشتوں کو لفظوں اور فقروں کی چٹانوں کے نیچے ریزہ ریزہ مت کریں۔ کوشش کیجئے کہ لفظوں کی تلوار سے رشتوں کو لہولہان ہونے سے بچائیں۔ یہ نہ ہو کہ جو آج آنکھوں میں بسے ہیں، کل ان سے نظریں چرانی پڑ جائیں۔ محترم قارئین! اگر ہم شکر کے راستے پر چلیں اور جتنا ہو سکے، معاف کرنا سیکھ لیں تو نہ صرف ہمارے لیے بہترین ہوگا بلکہ پورے معاشرے میں مثبت تبدیلیاں آئیں گی۔ اس سے پہلے کہ وقت ریت کی طرح ہتھیلی سے پھسل جائے۔ اس سے پہلے کہ یہ بات زبان زدِ عام ہو جائے۔ اٹھیں، سمجھیں اور دھیان کریں.... کہیں یہ صدی رشتے نبھانے کی آخری صدی نہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رشتوں کو نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

ریڈرز ہی لیڈر

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا پر انسانوں سے زیادہ کتابوں نے حکومت کی ہے۔مشہور مقولہ ہے،''ریڈرز ہی لیڈر ہوتے ہیں''۔اس جملے سے کتابوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔کتابیں ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جس طرح اچھے بیج کی کاشت سے فصل بہترین ہوتی ہے،اسی طرح کتاب ہمیں مکمل اور بہترین بناتی ہے۔انسانی شعور کے ارتقا میں کتابوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔کتاب سے محبت اور مطالعے کا شوق نہ صرف آپ کے علم میں اضافے کا سبب بنتا ہے بلکہ آپ کی گفتار اور شخصیت بھی دلچسپ بن جاتی ہے۔

بے شک جو قومیں مطالعے کی عادت اپناتی ہیں، وہ باعزت اور کامیاب ہوتی ہیں کیوں کہ کتابوں میں جوہرِ انسانی اُجاگر کرنے کا راز مضمر ہے۔کسی چیز کو غور سے دیکھنا،اس کا مطالعہ کہلاتا ہے لیکن عرفِ عام میں مطالعے کا اطلاق کتاب بینی پر ہوتا ہے۔انسان کو ہوش سنبھالتے ہی کتابوں سے واسطہ پڑتا ہے۔یہی کتابیں ہمیں زندگی کے نشیب وفراز،طرز، بودوباش، رہن سہن کے آداب سکھاتی ہیں۔بلند پایہ مصنّفین کے خیالات اور حکیمانہ باتیں ہم تک پہنچاتی ہیں۔بے شک کتابیں تادمِ حیات زندگی کی راہوں میں ہماری بہترین رفیق،معلم اور رہ نما ثابت ہوتی ہیں کیوں کہ بعض اوقات ہم کتب بینی سے اتنا کچھ سیکھ جاتے ہیں کہ وہ سنی ہوئی باتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

قارئین! جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کتابیں ہماری بہترین دوست ہوتی ہیں تو ہماری مراد اُن کتابوں سے ہے،جس سے ہمارے کردار کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔مطالعے کے لیے بھی آدابِ مطالعہ ضروری ہے۔یعنی کتاب کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے،مصنّف اور کتاب کا مضمون دیکھ کر مطالعہ کریں۔میرا تو یہ ماننا ہے کہ کتاب کے ساتھ ساتھ میز،قلم اور لیمپ وغیرہ،سب کا ادب کرنا چاہیے۔(باادب بانصیب، بےادب بےنصیب)

کتابیں اور ان کا مطالعہ:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ''ایک باب علم کا سیکھنا، چاہے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو، ہزار رکعت نفل پڑھنے سے ارفع ہے''۔ (ابن ماجہ) مطالعہ انسان کے لیے اخلاق کا معیار ہے۔ (علامہ اقبال) تیل کے لیے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے میں رات کو چوکیداروں کی قندیلوں کے پاس کھڑے ہو کر کتاب کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ (حکیم ابونصر فارابی) مطالعے سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے۔ (بیکن) تین دن بغیر مطالعہ گزار لینے کے بعد چوتھے روز گفتگو میں پھیکا پن آجاتا ہے۔ (چینی ضرب المثل) عربی کا مشہور مقولہ ہے، زمانے میں بہترین دوست کتاب ہے۔ کتابیں انسان کو حیاتِ فانی میں عزت اور حیاتِ دوامی میں ابدی سکون بخشتی ہیں۔ (امام رازی)

محترم قارئین! ذرا سوچیں، یہ کتابیں ہمارے لیے کیا ہیں؟ کتابیں مشکلات میں فروزاں چراغ، زمانے کے دکھوں سے دل برداشتہ ہونے والوں کے لیے مطمحِ نظر۔ یہ سفر و حضر میں ہماری رفیق ہوتی ہیں۔ یہ چھپی ہوتی ہیں، انہیں سمجھنے اور غور و فکر کرنے سے عظمت، اہمیت اور افادیت کے گوہر آب دار ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں۔ افسوس کہ آج ہمارے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے مگر کتاب بینی کے لیے نہیں ہے۔

کچھ روز پہلے ایک دوست سے بات کرتے ہوئے یہ معلوم ہوا کہ کتاب پڑھنا اس کے لیے بوریت کا کام ہے۔ جناب والا! یہ کام آج ہر کسی لیے بوریت والا ہے۔ اس نے سوال کیا کہ لوگ کتاب پر فلم، ٹی وی، فیس بک کو ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ گھر کا ماحول اور آپ کی صحبت، آپ کو جو دیتی ہے، آپ وہی چیزیں سیکھتے ہیں اور وہی آپ کی عادات بن جاتی ہیں۔

محترم قارئین! ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ کتابیں پڑھیں اور خرید کر پڑھیں تاکہ مصنّفین کی حوصلہ افزائی ہو۔ عوام الناس میں کتب بینی کی عادت پیدا کی جائے اور صحت مند کتابوں کی طرف راغب کیا جائے۔ حکومتی سطح پر بھی کاغذ سستا کرنا چاہیے تاکہ چھپائی کے اخراجات کم ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ٹی وی، انٹرنیٹ، موبائل اور سوشل میڈیا نے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کر لیا ہے مگر کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ یقین کیجیے، اگر ہم آج سے بھی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں تو ہمارے نفسیاتی مسائل خاصی حد تک کم ہو جائیں گے۔

☆.....☆.....☆

حقیقی رشتوں کی قدر کیجیے

آنکھوں دیکھی حقیقت کہوں! آج کی ناقابلِ برداشت تلخ سچائی، جو تعلیمی اداروں یا دفاتر میں کسی ایسے رشتے کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں، جو ہم کسی انجان شخص کو اپنے بھائی یا بہن تک کا درجہ دے دیتے ہیں۔ جی ہاں! بھائی یا بہن۔ جنابِ عالی! یہ رشتہ لڑکیوں کو بعض اوقات بہت مہنگا پڑتا ہے، اس کی دُگنی قیمت چکانی پڑتی ہے اور پڑنی بھی چاہیے کیوں کہ جن رشتوں کی ہمیں اسلام اجازت نہیں دیتا، ان میں ہمیں برکت اور خیر نہیں ملتی۔ ماں جائے پہ مان ہوتا ہے اور یہ منہ بولے رشتے تو وہ ہیں، جن کی بنیاد ہی کھوکھلی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے، جب رب نے آپ کو اپنے رشتوں سے نوازا ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، سب ہیں تو باہر رشتے بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ ہم کچھ نہ جانتے ہوئے ایک انجان شخص کو بھائی کا درجہ دیتے ہیں اور اس پہ اتنا یقین کر لیتے ہیں کہ شاید وہ اس قابل نہیں ہوتا۔ افسوس.... ہمارے اردگرد ہر روز اس طرح کے کئی رشتے جنم لیتے اور مر جاتے ہیں مگر ہم سمجھنے سے قاصر ہیں اور دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یہ وقتی سہارے، وقتی رشتے، دھوکا ہی تو ہیں۔ یہ کیسا رشتہ ہے کہ 'بھائی' ہونے کے باوجود ہم اپنی ماں اور اپنے سگے بھائی سے چھپاتے ہیں کہ بھائی! ہمارا ایک اور بھی بھائی ہے، ماں! آپ کا ایک بیٹا اور بھی ہے۔ جناب عالی! جب آپ کے اپنے رشتے ہیں تو اضافی رشتوں سے پرہیز کرنا چاہیے، کیوں کہ وہ ہمارے بھائی نہ کبھی تھے نہ ہوں گے۔ یہ بات خود سے سمجھیں گے تو شاید سمجھ نہ آئے مگر جب وقت سمجھائے گا تو یہ سبق کبھی نہیں بھولے گا۔

بحیثیت مسلمان ہماری کچھ حدود، کچھ اصول ہیں۔ بہت کمال لوگ ہیں ہم، بوقتِ ضرورت رشتہ بنا لیتے ہیں وہ بھی ایک نامحرم انسان سے۔ جب کہ قرآن یہ اعلان کر رہا ہے کہ ''اگر مجبوری میں بھی کسی نامحرم سے بات کرنی پڑ جائے تو نرم انداز اختیار نہ کرو۔ کیا پتا دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے''۔ (سورۃ الاحزاب: 23) مگر افسوس!

ہم ان الفاظ پر پورا اترتے ہیں۔ہم خود ہی اپنے لیے غلط رشتوں کا انتخاب کر کے اذیت کا شکار ہوئے۔سوال پوچھیے ناں خود سے، جب نامحرم سے ہاتھ ملانا دُور کی بات....اسے دیکھنے کی اجازت اسلام میں نہیں،تو ہم کب سے اتنے بااختیار ہو گئے کہ نامحرم کو بھائی بنالیا؟

جناب والا! یہ بھی پوچھیے، کیا کوئی بھائی چار لڑکوں میں بیٹھ کر اپنی بہن کی تصویریں دکھا کر ہنستا ہے؟ مجھے آج بھی یاد ہے، رات کی تاریکی اور اس کی چیخیں گرلز ہاسٹل ونگ سے گزرتے جب میرے کانوں میں پڑیں تو میرے قدم رک گئے اور میں جلدی سے اس کے کمرے کی طرف بھاگی۔دروازہ کھولا....قصہ مختصر، وہ رات ہی کالی نہیں تھی بلکہ اس لڑکی کی زندگی کو بھی سیاہی نے آن گھیرا تھا کیوں کہ اس کا منہ بولا بھائی اسے اکیلے میں ملنے پر مجبور کرتا تھا۔اس کے راز اور تصویریں، گھر بھیجنے کی دھمکی دیتا تھا۔ارے....حیرت کیوں؟ بھائی تھا ناں، اسے حق تھا۔جب کہ میرے لیے وہ لمحۂ شکر تھا کیوں کہ مجھے بھی 'بہن' بننے کی پیش کش ہوئی تھی۔

معزز قارئین! ضروری نہیں کہ آپ میری بات سے اتفاق کریں مگر خدارا! اپنے حقیقی رشتوں کو اہمیت دیں، اُن کے ساتھ جُڑیں، اپنی عزت کی حفاظت کریں۔میرے نزدیک جتنی عزت عورت کی ہے، اتنی ہی مرد کی بھی ہے اگر وہ سمجھے، معذرت کے ساتھ، کیوں کہ آج کل اکثر مردوں کا مشہور کھیل، عزت سے کھیلنا ہے، جسے کھیلنے کے بعد وہ اور معاشرہ ایک ہی بات کہتے ہیں، لڑکوں کا کچھ نہیں جاتا، عزت لڑکی ہی کی خراب ہوتی ہے۔گویا اس سے یہ ثابت ہوا کہ عزت کا تعلق صرف لڑکی سے ہے، آپ جناب سے نہیں۔چلیں....آپ اپنی بہن کا سوچ لیا کریں، شاید ایک دن آپ کو اپنی عزت کا بھی پتا چل جائے۔یاد رکھیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ''دوسروں کی عورتوں سے دُور رہو، تمہاری عورتیں بھی پاک دامن رہیں گی''۔

یہ سچ ہے کہ انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ اسے مکمل اور آسانی سے میسّر آجانے والی ہر چیز سے اکتاہٹ ہو جاتی ہے، دل بھر جاتا ہے۔خدارا! خود کو کبھی کسی انجان یا نامحرم کے لیے آسان مت بنایئے گا کیوں کہ جو آسانی سے میسّر ہو جائے، وہ اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔اپنے آپ کو کبھی نہ پتا چلنے والا راز بنا لیجیے، خود کو مشکل بنالیں جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے تا کہ آپ بچ سکیں۔مختصر یہ کہ اپنے آپ کو رد ہونے سے بچایئے کیوں کہ درد تب ہوتا ہے، جب آپ کو رد کیا جاتا ہے۔

بقول علی عباس جلال پوری، ''یہ بات مرد کی سرشت میں ہے کہ وہ ایک عورت سے فیض یاب ہونے کے بعد بھنورے کی طرح دوسری کلی کا طواف کرنا شروع کر دیتا ہے۔اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے، پچھتاوے ہمارے ذہنوں پر سوار ہو جائیں، اپنی اصلاح کر لیں۔

☆.....☆.....☆

فرائیڈے.... بلیک یا وائٹ؟ فیصلہ آپ کا

''بلیک فرائیڈے'' کی ابتدا 1961 میں امریکا میں ہوئی۔ ہر سال نومبر کے آخری جمعے کو شاپنگ سینٹرز میں سیلز آفرز لگائی جاتی ہیں اور مغربی ممالک میں لوگ اسی دن سے اپنے مذہبی تہوار ''کرسمس'' کی خریداری شروع کر دیتے ہیں۔

2005 سے آج تک، یہ دن خریداری کے اعتبار سے سال کا سب سے زیادہ مصروف اور منافع بخش دن بنتا جا رہا ہے۔ منافعے کے اعتبار سے تو اس دن کا نام بلیک فرائیڈے نہیں بلکہ وائٹ فرائیڈے ہونا چاہیے تھا۔ اہلِ اسلام کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ان کو تو اربوں، کھربوں کا منافع ملتا ہے، آپ کو کس مجبوری سے اس دن کو بلیک یعنی سیاہ اور اردو میں سیاہ دن یعنی برا دن کہنا پڑتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مغرب کی اندھی تقلید نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ ہم مغرب کی پیرویِ میں اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ بابرکت دن کو بلیک فرائیڈے منانے پر مجبور ہیں۔ جناب عالی! مجبوری کس چیز کی ہے؟ ہم کس کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جوتیاں، کپڑے کیا اس قدر اہم ہیں؟ اگر یہی وجہ ہے تو ہمیں واقعی صرف 'جوتیوں' ہی کی ضرورت ہے۔

اب تو پاکستان میں بھی اسے آن لائن شاپنگ اور مختلف برانڈز نے رائج کر دیا ہے، جس میں ڈسکاؤنٹ کا لالچ ہوتا ہے۔ یاد رکھیے کہ دوسروں کی پیروی کرنے والے کبھی اپنی پہچان نہیں کروا سکتے۔ جمعے کو سیاہ دن کہنا، چاہے کسی بھی معنی میں ہو، غلط ہے۔ کیوں کہ شریعت اسلامیہ کے مطابق، جمعے کے دن کو تمام دنوں کا سردار قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے مغربی ممالک جمعے کو بھلے بلیک فرائیڈے سے منسوب کریں مگر اسلام میں جمعے کے مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ رب تعالیٰ نے جمعے کو تمام دنوں پر فوقیت دی ہے۔ یہ رحمتوں، فضیلتوں والا دن ہے۔ ارے جناب! آپ کن کو متاثر کرنے میں لگ گئے۔

جمعے کی فضیلت بیان کرنے کے لیے تو رب تعالیٰ کا قرآن پاک میں 'سورۃ جمعہ' کا تحفہ موجود ہے، جس کی تلاوت رہتی دنیا تک ہوتی رہے گی۔ جمعے کو ہفتے کی عید قرار دیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ''سورج کے طلوع وغروب والے دنوں میں کوئی بھی دن، جمعے کے دن سے افضل نہیں۔ یعنی جمعے کا دن تمام دنوں سے افضل ہے۔ (صحیح ابن حبان)

ذرا سوچیے! جب آسمان، زمین، ہوائیں، پہاڑ، سمندر، سب جمعے کے دن سے گھبراتے ہیں کہ کہیں قیامت قائم نہ ہو جائے، اس لیے کہ قیامت جمعے کے دن ہی آئے گی، تو ہمیں رب کے کہے اور رسول کے بتائے بابرکت دن کو بلیک فرائیڈے کہتے یا مناتے ڈر یا حیا کیوں نہیں آتی؟ محترم قارئین! جہنم کی آگ روز دہکائی جاتی ہے مگر جمعے کے دن کی فضیلت واہمیت کی وجہ سے آگ نہیں دہکائی جاتی۔ غور فرمائیں اور سوچیے کہ اتنی فضیلتوں، برکتوں والا دن بلیک ڈے کیسے ہوسکتا ہے؟ سوچیے، مغرب کی اندھی تقلید اہم ہے یا ایمان؟ میرا ماننا ہے کہ یہ تو دوسری قوم سے شباہت والا معاملہ ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمیں اس بابرکت دن کو بلیک ڈے کہنے پر بائیکاٹ کرنا چاہیے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

سعدیہ انعم

سعدیہ انعم کا تعلق شہر قائد کراچی سے ہے۔ گریجویشن تک تعلیم حاصل کی ہے۔ قلم کی نوک سے حیاتِ مقصد کی تکمیل کا آغاز کیے 2 سال بیت چکے ہیں۔ رائٹرز کلب سے ایک سال سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- ذہنی بوجھ

2- بہت ساری جنتیں

3- غیرت

4- نظم

☆.....☆.....☆

ذہنی بوجھ

مجھے وہاں پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ افطار کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں کچن میں چلی گئی۔ ''کوئی کام ہے تو بتائیں، میں کر دیتی ہوں۔''

''نہیں، میں کر لوں گی۔'' انہوں نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر جواب دیا اور پھر سے ٹرے میں رکھے پھل کاٹنے لگیں۔

''آپ رو رہی ہیں؟'' میں نے ان کے کچھ قریب جا کر انہیں کاندھے سے پکڑ کر اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ اب ان کا رخ میری طرف تھا اور آنسو ٹپ ٹپ اُن کی آنکھوں سے بہ کر رخسار پر اداسی کی لکیریں کھینچ رہے تھے۔

''مجھے بتائیں کیا ہوا ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟'' میرے پوچھتے ہی انہوں نے اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے لگا جیسے ان کے سارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہوں۔ کتنی اداسی تھی ان آنکھوں میں، کتنا کرب تھا، کتنی بے بسی تھی۔

''ہم بیٹیوں کا کوئی گھر بھی ہوتا ہے کیا؟ جب تک ابا زندہ تھے، میری سسرال میں کسی کی مجال نہ تھی کہ مجھے ایک بات بھی کہے۔ جانتی ہو کیوں؟'' میں نے ناسمجھی سے نفی میں بمشکل سر ہلایا۔

''کیوں کہ وہ یہاں آتے رہتے تھے اور میرا پوچھتے تھے۔ جب بھی آتے تھے کچھ نہ کچھ ساتھ ضرور لاتے تھے۔ کبھی خالی ہاتھ نہیں آتے تھے۔ میری سسرال والوں کے ذہن میں بھی یہ بات ہوتی تھی کہ اس کے والی وارث ہیں، اگر اسے کچھ کہا تو وہ ہم سے ضرور پوچھیں گے۔ ابا کے جانے کی دیر تھی، سب بدل گیا۔ سب کچھ بدل گیا۔ انعم! سب بدل گیا۔'' ان کا ضبط جواب دے گیا اور وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ مجھے اس وقت تسلی کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ مجھ سے گلے لگ کر رو رہی تھیں اور میں جیسے بت بنی ہوئی تھی۔

باہر سے اپنا نام پکارے جانے پر وہ فوراً میرے گلے سے ہٹیں اور منہ دھو کر کچن سے نکل گئیں۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلی۔ کمرے سے ذرا دُور کھڑی، میں اندر سے آتی آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''تم رو کر آئی ہو؟''

''نہیں امی! وہ میں.... پیاز کاٹ رہی تھی۔''

کیا پتا روئی ہو۔ ویسے بھی جب سے تمہارے ابا گئے ہیں، تمہارا رونا ختم نہیں ہو رہا۔ اسلام میں بھی تین دن سے زیادہ سوگ منانے کی اجازت نہیں۔ خیر.... میں کہہ رہی تھی کہ بلال (داماد) کو تراویح پڑھنے جانا ہے۔ وہ جلدی گھر جائے گا۔ افطار کے فوراً بعد اسے کھانا دینا ہے، اس لیے کھانا بھی تیار رکھنا۔'' جواب میں کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے نکلتی دکھائی دیں۔

میں ان کے آنے سے قبل کچن میں آ گئی تا کہ انہیں شرمندگی نہ ہو کہ میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔

''سنو! تم کبھی شادی مت کرنا۔ اپنے گھر کی زندگی بہت اچھی ہوتی ہے۔ ماں باپ کا پیار پھر نصیب نہیں ہوتا، سب بدل جاتے ہیں۔ احمد بھی اب وہ نہیں رہے۔ شادی سے پہلے اور تھے اب اور ہیں۔ تم کہتی ہو ناں! اسلام نے عورت کو بہت مقام دیا ہے۔ کہاں ہے میرا مقام؟ کہاں ہیں میرے حقوق؟ تم مَردوں کی حمایت میں بہت لکھتی ہو، اب لکھو میری بھی داستان، اور ہر اس لڑکی کی داستان، جو کبھی کچن میں تو کبھی واش روم میں چھپ کر روتی ہے۔'' پھُرتی سے کام کرتے کرتے وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں نہ سسکیوں کی نمی تھی نہ ہچکیوں کی رکاوٹ۔ اگر کچھ تھا تو غصہ.... شدید غصہ، بے بسی.... بے پناہ بے بسی۔

میں نے بھی درمیان میں بول کر انہیں نہیں روکا کیوں کہ میں چاہتی تھی، وہ اپنا سارا غبار نکال لیں اور کہہ دیں جو کہنا چاہتی تھیں، جو شاید کسی اور سے نہیں کہہ پا رہی تھیں۔

''وہ کون سی نظم لکھی تھی تم نے مرد پر؟'' ذرا رک کر انہوں نے سوال کیا تو میں بھی اچانک سوال پر سوچ میں پڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتی، وہ خود بول پڑیں۔ ''مرد سب ایک سے ہوتے ہیں، اسی بات کے خلاف لکھی ہے ناں؟ غلط لکھی ہے، بالکل ایک سے ہوتے ہیں۔ کوئی کہے گا کہ میرے تین بھائی ہیں؟ کسی سے اتنا نہیں ہو سکا کہ ایک مرتبہ افطار پر بلا لیں، بلائیں گے بھی نہیں۔ عید آ رہی ہے اور دیکھنا عیدی بھی نہیں آنی میری۔ پچھلے سال بھی نہیں آئی تھی۔ ہاں، حارث بھائی نے ایک سوٹ بھیجا تھا، دیکھنے کا نہیں تھا، پوری سسرال میں کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی، کس کس نے مذاق نہیں اُڑایا۔'' پھلوں کی ٹرے ایک طرف رکھتے ہوئے اب وہ فریج سے ملک شیک بنانے کے لیے دودھ نکال رہی تھیں۔ ایک بار پھر ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''لائیں.... جوس میں بنا دیتی ہوں۔'' میرے کہنے پر مجھے دودھ کا جگ پکڑا کر وہ پکوڑوں کے لیے تیل گرم

کرنے لگیں۔

''زندگی میں سکون ہی نہیں رہا۔بس میں ہی میاں کے، ان کے گھر والوں کے کام کروں، باتیں سنوں۔ان کا کوئی فرض نہیں؟ کیا اسلام نے سارے فرائض بیوی کے لیے رکھے ہیں، شوہر کے لیے کچھ فرض نہیں؟'' کام کرتے کرتے وہ مسلسل بول رہی تھیں اور ایک ہاتھ سے آنسو پوچھ رہی تھیں، مبادا کوئی انہیں ایسے روتا ہوا نہ دیکھ لے۔

ان کے سوالوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔وہ ایسی تو نہ تھیں، کس طرح کے سوالات ان کے ذہن میں دیمک کی طرح آ چکے تھے۔''اگر کوئی اپنی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے نہیں نبھاتا تو اس میں اسلام کا کیا قصور؟ اس میں اس شخص کی اپنی کوتاہی ہے، جو اپنے فرائض نہیں نبھا رہا۔آپ اسلام کو بیچ میں مت لائیں۔'' میں نے دوٹوک جواب میں کہا تو وہ میرے عین سامنے آ گئیں۔

''اچھا! تو کیا کروں میں؟ کس کے سامنے رونا روؤں۔ مجھے تو ناکردہ گناہوں کی بھی سزا مل جاتی ہے اور ان کا کیا.... جو کسی کی بیٹی کو ایک نوکرانی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے؟ تمہارے سامنے اسلام کی بات نہ کروں تو کس کی کروں؟ تم ہی اس دن کہہ رہی تھیں ناں کہ اسلام نے عورت کو بہت مقام دیا ہے۔کہاں ہے میرا مقام؟'' انہوں نے اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔

''آپ کا بھی مقام ہے مگر آپ کو دکھائی نہیں دے رہا کیوں کہ اس وقت آپ جس اذیت سے دوچار ہیں، اس نے آپ کی سمجھنے کی حس مفلوج سی کر دی ہے۔اسی لیے آپ بہت سی باتوں کا ذمے دار اسے ٹھہرا رہی ہیں جو قصوروار نہیں ہے۔میں مانتی ہوں کہ آپ کے ساتھ جو ہو رہا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے مگر آپ جو کر رہی ہیں، وہ بھی درست نہیں۔''

''میں کیا کر رہی ہوں؟'' کڑاہی میں تیل اُنڈیلتے وہ فوراً بولیں۔

''اللہ کو ناشکری پسند نہیں اور ناامیدی کفر ہے۔شاید ابھی میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے مگر اکیلے میں سوچیے گا کہ بھلا ایسا بھی کوئی کام ہے، جو اللہ کے اختیار میں نہیں؟ اور اگر حالات پھر بھی نہ بدلیں تو ضرور کہیں نہ کہیں ہماری کوتاہی یا آزمائش ہے۔رہی بات یہ کہ اسلام نے آپ کو کیا دیا؟ تو آپ کے تین بیٹے ہیں ناں؟ اللہ نے اگر ایک مرد کی خدمت میں آپ کو جنت کی بشارت دی ہے تو تین بیٹوں کی جنت آپ کے قدموں میں بھی تو رکھی ہے۔کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ آپ کو اس نے اعلیٰ مقام والوں میں چنا؟ وہ آپ کو اولاد نہ دیتا تو آپ کیا کر لیتیں؟ جانتی ہیں، اولاد کے بغیر کیا کیا ہو جاتا ہے عورت کے ساتھ؟ جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔آپ شکر کریں، اللہ نے آپ کو اس نعمت سے نوازا۔اللہ دکھ دے تو کبھی شکوہ نہ کریں، نہ اللہ کے بندے سے اللہ کا گلہ کریں۔کیوں کہ وہ بھی انہی کو آزماتا ہے، جن سے محبت کرتا ہے۔''

میرے خاموش ہونے پر وہ کچھ دیر سوچ میں گم مجھے دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں، ''میں جانتی ہوں، میں ٹھیک نہیں

کرتی مگر جب بہت تکلیف پہنچتی ہے تو کچھ بھی کہہ دیتی ہوں۔'' نظریں جھکائے، دھیمی آواز میں وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھیں۔

ضرور بولیں، کچھ بھی بولیں مگر ایسا کچھ نہ بولیں کہ جس سے اللہ سے ناامیدی اور اللہ کی ناشکری جھلکے۔ میں جانتی ہوں، کبھی کبھی آپ سے زیادتی ہو جاتی ہے، مگر ذرا اپنے شوہر کی ان باتوں کے بارے میں بھی سوچیں جو بہت سے شوہروں میں نہیں ہوتیں۔ انہوں نے کبھی آپ پر ہاتھ نہیں اٹھایا، آپ کو گالی نہیں دی۔ بقول آپ کے، جب آپ سارے گھر کے کاموں کا غصہ ان پر نکالتی ہیں تو وہ تحمل سے سنتے ہیں اور آپ کو سمجھاتے ہیں۔ یہی بتایا تھا ناں آپ نے مجھے؟'' میں نے تصدیق چاہی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''آپ کو کیا پتا کہ وہ گھر والوں کو نہیں سمجھاتے؟ ہو سکتا ہے سمجھاتے ہوں، وہ سمجھتے نہ ہوں؟ آپ اچھا گمان بھی تو کر سکتی ہیں؟ آپ دعا کیا کریں، اللہ تقدیر بدلنے پر قادر ہے۔ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ آپ کا وقت بھی بدلے گا۔ آپ کے تین بیٹے ہیں۔ ابھی چھوٹے ہیں، ان کی پرورش یوں کریں کہ آپ کے گھر آنے والی کسی کی تین بیٹیاں آپ کی تربیت پر ناز کریں۔ جب آپ کی تربیت کی وجہ سے آپ کے بیٹے کسی کی بیٹی کو عزت، مان، محبت دیں گے تو آپ کو اللہ وہ اعلیٰ مقام دے گا کہ آپ خود پر رشک کریں گی۔ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں آپ؟'' جوس کا جگ ان کے سامنے رکھ کر میں نے اپنائیت سے ان کا ہاتھ تھاما تو وہ مسکرا دیں۔ باتوں میں واقعی تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ انہوں نے اپنا پرانا جملہ کسا اور کڑاہی میں کچھ دیر پہلے ڈالے پکوڑے پلٹنے لگیں۔

''ہو سکتا ہے کبھی زندگی میں کوئی ہرانے والا آ جائے۔ میں بھی جیت جیت کر اکتا گئی ہوں۔ اب چاہتی ہوں، کوئی ہرانے والا آئے اور ہرانے والا ہو کر بھی ہار جائے۔ کیوں کہ جسے جیتا ہو یا جیتنا ہو، اس سے جیتا نہیں کرتے۔'' کھلی کھڑکی کے درمیان جگہ بناتے ہوئے بیٹھ کر میں نے ماحول بدلنے کو شرارتی لہجے میں کہا تو وہ بھی ہنس پڑیں۔

''فکر نہیں کرو، ایسا ہی ہوگا۔ تمہارے لیے خاص دعا نکلتی ہے دل سے، مجھے بہت حوصلہ ملتا ہے تم سے بات کر کے۔'' ان کی بات سنتے ہی میرے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ دعا ہی تو چاہیے ہوتی ہے مجھے۔

آخر میں اتنا کہوں گی کہ بہنوں کو شادی کے بعد ضرور یاد رکھیں کیوں کہ باپ کے بعد بہنوں کی ساری امیدیں ان کے بھائیوں سے جڑی ہوتی ہیں اور اچھے بھائی ہی اپنی بہنوں کا سہارا بنتے ہیں۔ یاد رکھیں! بعض اوقات انسان اپنے مسئلے کسی کے سامنے اس لیے نہیں رکھتا کہ وہ ان کا حل بتائے بلکہ اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ ہم انہیں تسلی دیں، حوصلہ دیں۔ ان کی ہمت بندھائیں، ان کو اس آزمائش میں کامیاب ہونے کے لیے امید کی ایسی دیوار کا سہارا دیں جس سے ٹیک لگا کر وہ ان خاص رشتوں کے مثبت رویوں کو سوچ سکیں، جن کے کسی خاص منفی رویے کے وہ ستائے ہوتے

ہیں۔

ہمارا ذہن بن چکا ہے کہ ہم تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے ہیں اور فوراً کسی کے بھی ظالم اور مظلوم ہونے کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اگر ایک عورت کسی دوسری عورت سے اپنے شوہر کی کوئی شکایت کرتی ہے تو وہ فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملا کر نہ صرف اس سے ہمدردی کرتی ہے بلکہ اس کا دل اس کے شوہر سے مزید بے زار کر دیتی ہے۔ یوں معاملات مزید بگڑ جاتے ہیں۔ زندگی نشیب و فراز کا نام ہے۔ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ کچھ خامیاں شوہر میں ہوتی ہیں تو بیوی بھی ان سے پاک نہیں۔ کس کی زندگی کی حقیقت کیا ہے ہم سو فی صد نہیں جانتے۔ ہمارے سامنے بات کرنے والا شخص تصویر کا ایک رخ ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا، اگر وہ واقعی سچا ہو تب بھی کوشش کریں، اسے اُن رشتوں سے مزید بے زار نہ کریں، جن کے ساتھ اس کا خاص تعلق ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی پر سب سے زیادہ خوش شیطان ہوتا ہے، اگر کہوں بھنگڑے ڈالتا ہے تو غلط نہ ہوگا، اور ان کی لڑائی بڑھانے والا شیطان کا رفیق ہو جاتا ہے۔

اس سارے واقعے کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر مسئلہ سنگین ہے، آپ فیصلہ کرنے کے اہل نہیں، بس ایک سماعتی ہیں تو امید بندھائیں۔ بہترین راستے بتائیں، حوصلہ بڑھائیں پھر اس کا حل اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ اللہ نیتیں دیکھ کر بہت زیادہ سے نواز بھی دیتا ہے اور بہت زیادہ سے محروم بھی کر دیتا ہے۔ جہاں آپ کچھ نہیں کر پاتے وہاں آپ کی نیت دیکھی جاتی ہے۔ لوگوں کے ذہنی بوجھ کو کم کریں، ان کا دل بھی ہلکا ہوگا اور آپ کا بایاں بازو بھی، جس پر برے اعمال کی رجسٹری ہو رہی ہے۔

☆.....☆.....☆

بہت ساری جنتیں

احتشام کلاس دوم کا طالبِ علم تھا۔ سوچنا اور سوال کرنا اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ نہ صرف مضمون سے متعلق بلکہ اس کے علاوہ بھی سوالات کیا کرتا تھا، جس سے اس کی ذہانت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مس زوینہ انہیں ڈرائنگ سکھایا کرتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ احتشام کی ڈرائنگ بھی بہت اچھی تھی۔ آج سب بچے اپنا اپنا پسندیدہ کارٹون بنا کر ٹیچر سے چیک کروا رہے تھے۔ احتشام کی باری آئی تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے اچھے ریمارکس ملے۔ اس نے مسکراتے ہوئے مِس زوینہ کو تھینکس کہا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔

احتشام کو کھڑا دیکھ کر مس نے پوچھا، ''آپ کو کچھ پوچھنا ہے احتشام بیٹا؟ احتشام، جو اس کشمکش میں تھا کہ وہ بولے یا نہ بولے، اچانک مِس زومی کے سوال پر چونکا۔ جی مِس! وہ مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ سے۔ جی بیٹا! پوچھو۔ مِس زومی نے ہمیشہ کی طرح بہت پیار سے اُس سے کہا تو اُس کی ہمت بندھی۔ ''مس! یہ اولڈ ہاؤس کیا ہوتا ہے؟ وہاں کون رہتا ہے؟'' مس زومی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ وہ باقی بچوں سے ہٹ کر ہی سوال کرتا تھا مگر آج کا سوال انہیں بھی عجیب لگا مگر جواب تو دینا تھا۔ لہٰذا، انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، ''بیٹا! اولڈ ہاؤس ایک بہت بڑا ہاؤس ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہاں بہت ساری جنّتیں رہتی ہیں۔ او کے میرا بیٹا! اب آپ اپنی جگہ پر جاؤ شاباش۔''

مس زوینہ احتشام کے سوال پر کچھ الجھ سی گئی تھیں کہ آخر یہ سوال کرنے کا خیال اسے کیوں آیا؟ وہ جاننا چاہتی تھیں مگر ابھی احتشام سے کچھ بھی پوچھنا انہیں مناسب نہ لگا۔ مس زومی نے ہوم ورک میں سب کو ایک ایک گھر بنانے کو دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ کل ان کے بنائے ہوئے گھر ہی کے حوالے سے ان سے کچھ سوالات بھی کریں گی۔ بچوں نے خوشی خوشی ہامی بھر لی۔ وہ جانتی تھیں کہ احتشام کے دماغ میں جو بھی چل رہا ہے، اس کی ڈرائنگ اس کے خیالات کی کچھ نہ کچھ عکاسی ضرور کرے گی۔

وہ ایک بہترین اور تجربے کار ٹیچر تھیں۔ اپنے شاگردوں کی نفسیات سمجھتی تھیں۔ انہیں پوری امید تھی کہ وہ احتشام کی مخفی سوچ تک رسائی حاصل کر لیں گی اور یوں ہی ہوا۔ اگلے دن جب احتشام کے ڈیسک پر گئیں تو احتشام نے چارٹ پر ایک بہت بڑ، شان دار سا گھر بنایا ہوا تھا۔ جس میں بہت سی بوڑھی عورتیں بنی ہوئی تھیں کوئی کھا رہی تھی، کوئی قرآن پڑھ رہی تھی، کوئی تسبیح پڑھ رہی تھی، کوئی سو رہی تھی مگر سب سے حیران کن وہ دو بوڑھی خواتین تھیں، جو رو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک پر لکھا تھا، ''پاپا کی جنّت'' اور دوسری پر لکھا تھا، ''میری جنت'' اور سب سے اوپر رنگ برنگے مارکرز سے موٹے موٹے الفاظ میں لکھا ہوا تھا.... ''اولڈ ہاؤس''

مس زمینہ نے چارٹ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا، جو اداس، کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ مس زومی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں، بیٹا! یہ گھر آپ نے بنایا ہے؟ احتشام نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو مس زومی نے چارٹ پر روتی بوڑھی عورت، جس پر 'پاپا کی جنت' لکھا تھا، انگلی رکھ کر پوچھا، ''احتشام بیٹا! یہ کون ہے؟'' تو احتشام نے فوراً کہا، ''دادی جان'' مس زومی نے دوسری روتی عورت پر، جس پر لکھا تھا، ''میری جنت'' انگلی رکھ کر احتشام کو دیکھا تو اس نے کہا، ''میری مما'' اور یہ کہہ کر اس نے معصومیت سے سر جھکا لیا۔ اس کی اداسی اور اس کا بنایا اولڈ ہاؤس، اس کے جذبات کی عکاسی کر رہے تھے۔ مس زومی نے کہا، ''آپ نے بہت پیارا گھر بنایا ہے پھر بھی آپ اداس ہیں؟ کیوں بیٹا! کیا بات ہے، اپنی مس کو بھی نہیں بتائیں گے؟ ہمم۔'' مس زومینہ نے اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے بہت اپنائیت سے پوچھا۔ تو احتشام نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور ایک دم رو دیا۔ مس زومینہ پریشان سی اسے چپ کرانے لگیں۔ ساری کلاس کے بچے بھی حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ مس زومینہ نے سب سے کہا کہ وہ اپنا کام کریں تو سب پھر سے اپنی ڈرائینگ میں مصروف ہو گئے۔

احتشام پانی پلانے اور مسلسل چپ کرانے کے بعد اب کچھ خاموش ہوا مگر اب بھی اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مس زومی مزید کچھ پوچھ کر اسے اور رلانا نہیں چاہتی تھیں۔ لہٰذا، اس سے دوبارہ نہ رونے کا وعدہ لے کر جانے کے لیے اٹھی ہی تھیں کہ احتشام کا سوال ان کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ ''مس! کیا پاپا کی جنت کی طرح میری جنت بھی اولڈ ہاؤس چلی جائیں گی؟'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، احتشام نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنا سوال دُہرایا۔ مس بتائیں ناں، پلیز.... کیا ماما بھی چلی جائیں گی کیا مجھے چھوڑ کر؟ مس زومینہ حیران سی دوبارہ وہیں بیٹھ گئیں اور اس کے رخسار سے آنسو صاف کرتے ہوئے سمجھانے لگیں، ''ارے کیا ہو گیا آپ کو احتشام؟ آپ کی ماما بھلا کیوں جائیں گی آپ کو چھوڑ کر؟ وہ کہیں نہیں جائیں گی، کبھی نہیں۔'' لیکن دادی کو تو ماما بابا نے اولڈ ہاؤس بھیج دیا اور آپ نے بھی تو کہا تھا کہ وہاں جنّتیں ہوتی ہیں۔ بابا کی جنت تو گئی تو کیا میری جنت بھی۔۔۔ وہ ایک بار پھر سے رو دیا۔ مس زومی کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ انہوں نے اسے کافی دلاسا دیا اور سمجھایا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ دادی کچھ عرصے کے لیے گئی ہوں گی، آ جائیں گی

۔وہ جانتی تھی کہ وہ حقیقت کے برعکس بول رہی ہیں مگر اس قت وہ بس کسی بھی طرح احتشام کو بہلانا چاہتی تھیں۔وہ دل میں سوچ چکی تھیں کہ وہ ضرور اس سلسلے میں احتشام کے والدین سے بات کریں گی کہ ان کا بچہ کس قدر ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا ہے اور یہ اُس کے لیے سخت مضر ہے۔ہم نہ جانے کب تک اپنے رویوں سے، اپنے والدین اور اپنے بچوں کے احساسات کو روندتے رہیں گے۔نہ جانے کب ہم رشتوں کی قدر و اہمیت سمجھیں گے، نہ جانے کب....؟

☆.....☆.....☆

غیرت

آج پھر پارٹی سے واپسی پر وہ خاموش رہی۔ بلیک ساری میں اس کی برہنہ گوری بانہوں پر سیاہ ریشمی بال لہرا رہے تھے، گلے میں ڈائمنڈ کا قیمتی ہار اس کے حُسن کو چار چاند لگا رہا تھا مگر چاندنی ماند سی تھی۔ اداسی کسی گرہن کی طرح اس کے چہرے سے لگی ہوئی تھی۔ عباد نے بھی سارے راستے اس سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ عباد کے گاڑی کو بریک لگانے کو دیر تھی، ماہ ضیاء نے بجلی کی سی رفتار سے کار کا دروازہ کھولا اور بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی۔ عباد نے غصے سے اسے جاتے دیکھا اور خود بھی سیڑھیاں چڑھتا ہوا سیدھا بیڈروم تک آ گیا۔ اسے ماہ ضیاء کو ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی بلک بلک کے رو رہی تھی۔ عباد نے آگے بڑھ کر زور سے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے غصے سے پوچھنے لگا۔

''تم سمجھتی کیا ہو خود کو ہاں.... آخر کس بات پر تیور دِکھاتی ہو؟ بولو! کیا چیز کیا ہو تم؟'' ماہ ضیاء نے پھیلے ہوئے کاجل میں ڈوبی سرخ آنکھوں سے اسے بے بسی سے دیکھا پھر اس کے پاؤں میں پہنے جوتوں کو سکتے کی سی کیفیت سے دیکھنے لگی۔ عباد نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہیں جھکائیں اور اپنے ہی جوتے دیکھنے لگا۔ ناسمجھ میں آنے والی کیفیت میں اس نے ماہ ضیاء کو دیکھا اور کہنے لگا، ''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے، جواب دو کیا سمجھتی ہو خود کو؟''

ماہ ضیاء ایک قدم آگے بڑھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''جانتے ہیں آپ؟ میں.... یعنی مسز عباد، شہر کے مشہور و معروف بزنس مین کی بیوی، خود کو آپ کے پیروں میں پہنے اِن قیمتی جوتوں سے بھی زیادہ حقیر سمجھتی ہوں، پتا ہے کیوں؟ کیوں کہ ان جوتوں کو دیکھنے کے لیے پارٹی میں موجود بڑے سے بڑے آدمی کو نظریں جھکانی پڑ رہی تھیں اور بڑے لوگ نظریں جھکانا کہاں پسند کرتے ہیں؟ لہٰذا، اگر کسی کی نظر پڑ جاتی تو وہ فوراً ہٹا لیتا مگر آپ کی

بیوی....'' ماہ ضیاء نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اس کے سینے کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کے وجود کو جھنجھوڑتے ہوئے پُر زور انداز میں دوبارہ دُہرایا، ''جی آپ کی بیوی کا معیار ان جوتوں سے بھی گیا گزرا ہے، مسٹر عباد صاحب! تب ہی تو ہر ایرا غیرا نظریں اٹھا اٹھا کر اسے دیکھ رہا تھا۔''

''آپ بہت غریب ہیں عباد! بہت غریب۔ کیوں کہ آپ کے پاس بہت پیسہ ہے مگر کچھ چیزیں پیسوں سے کبھی نہیں ملتیں۔ جی ہاں، غیرت کسی دُکان سے نہیں خرید سکتے اور کیوں لے آئے آپ مجھے یہاں؟ چھوڑ آتے اپنے ان نام نہاد دوستوں کے پاس تا کہ وہ ٹھیک سے۔۔۔'' اس سے پہلے کہ ماہ ضیاء اپنی بات پوری کرتی، عباد نے ایک زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر رسید کیا اور وہ توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے بیڈ پر جا گری۔

''شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ.... پورا کمرہ اس کی آواز کی دہشت سے گونج رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ بہت ہو گیا، اب ایک لفظ اور نہیں۔''

ماہ ضیاء نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور چہرے سے کسی معصوم بچے کی طرح آنسو صاف کرتے ہوئے بولی، ''تھینکس عباد! تھپڑ کے لیے کیوں کہ یہ تھپڑ ثبوت تھا آپ کے اعلیٰ اسٹیٹس کے نیچے دبی، اس کی ڈری سہمی غیرت کے ہونے کا۔'' عباد، جو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کی سلوٹوں کو مسلتے ہوئے مضطرب سا ادھر ادھر ٹہل رہا تھا، تھپڑ کے اس ردِّعمل پر رک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر جانے کا فیصلہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ماہ ضیاء نے اسے پھر مخاطب کیا، ''سنیے!'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم روکنے پر مجبور ہو گیا۔ ''مجھے تحفظ چاہیے عباد! آپ دیں گے ناں؟'' عباد نے مڑ کے اسے دیکھا۔ وہ تھکی ہاری کسی بے جان خوب صورت مورتی کی مانند بیڈ سے ٹیک لگائے نم آنکھوں میں امید لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ آنسو، مسکان کی موجودگی میں بھی جاری تھے۔ دھوپ میں بارش کا سا سماں تھا۔ ''عباد! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' کہتے کہتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ عباد کو بے ساختہ اس پر ترس آ گیا۔ وہ اس کے قریب گیا، اس کے آنسو صاف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس کے ضمیر کی آواز نے یہ کہہ کر اس کا ہاتھ روک لیا کہ ''تم اس قابل نہیں کہ اتنے قیمتی آنسوؤں کو چھو بھی سکو۔'' اس نے پاس رکھا کمبل کھول کر اس پر بہت احتیاط سے ڈالا اور کمرے سے نکل گیا۔ آج اس کا ضمیر جاگا تھا، وہ بھلا کیسے سوتا؟

☆.....☆.....☆

نظم

ایک شام جو آئے گھر بابا
پسینے میں تھے تر بابا
پر بابا! بابا! کہتی میں
سینے سے جا کر لپٹ گئی
وہ درد سے جب کراہے تو
میں سہمی، ذرا سا ٹھٹک گئی
مجھے دیکھ کر سہما سہما، وہ
پھر ہلکا سا مسکرائے تھے
اور کھول کر دونوں ہاتھ اپنے
مجھے جب انہوں نے دکھائے تھے
میری آنکھ ہوئی تھی نم وہاں
نکلا تھا تھوڑا دم وہاں
دیکھ کر ہاتھ کے چھالوں کو
میں نے چھوا تھا اُن کے گالوں کو
اور پوچھا تھا، بابا! درد ہے کیا؟
موسم بھی کتنا سرد ہے ناں؟
آپ بیٹھیں، چائے میں لاتی ہوں
اور سر بھی آ کر دباتی ہوں
ماں سے لے کر آئی مرہم
پھر ہاتھ پر آ کر لگاتی ہوں
بابا نے بیٹا! کہہ کر پھر
ایک بوسہ لیا تھا پیشانی پر

بے ساختہ آیا تھا پیار اُنہیں
دیکھ کر میری پریشانی پر
وہ بوسہ اب تک ماتھے پر
مہر ہے بابا جان کی
قیمت نا چکا پاؤں گی
میں ان کے کسی احسان کی

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

ام محمد عبداللہ

ام محمد عبداللہ کا تعلق

خیبر پختونخوا کے علاقے جہانگیرہ سے ہے۔ کمپوٹر سائنس میں ایم سی کیا ہے۔ بچپن سے مختلف اخبارات و رسائل میں لکھ رہی ہیں۔ لکھنے لکھانے کے کا آغاز اسکول کے زمانے میں بچوں کے جنگ سے ہوا۔ بعد ازاں مختلف تحریریں قومی اخبارات اور رسائل کی زینت بنیں۔ ایک سال سے رائٹرز کلب سے منسلک ہوئے ہیں۔ رائٹرز کلب کے توسط سے دین اسلام اور پاکستان کی محبت میں رچی بسی تحریریں قومی اخبارات میں اپنی جگہ بنا رہی ہیں۔

فہرست تحریر:

1- سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا
2- جائز کاموں میں سفارش کا اجر وثواب
3- نفع نقصان کا مالک
4- عقیدہ ختم نبوت، ایمان کا لازمی حصہ
5- آم کھاؤ بھئی آم

☆.....☆.....☆

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا

جارج کا دفتر شہر کے مضافات میں واقع ایک خوب صورت عمارت کے دفتر میں تھا۔ چاروں جانب لگے بڑے بڑے شیشوں سے باہر کا خوش نما منظر بہت صاف نظر آتا تھا۔ سال بھر کام کے دوران، کھڑکی سے بدلتے موسم دیکھنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ خاص طور پر جب خزاں کا موسم شروع ہوتا تو تمام درخت بڑی تیزی سے زرد پتوں کی چادر اوڑھ لیتے۔

یہ منظر بہت دل نشیں ہوتا مگر جلد ہی یہ پتے سوکھ کر درختوں سے جھڑ جاتے، بادل گہرے ہو جاتے، روشنی غائب ہو جاتی اور سرد ہوائیں چلنا شروع ہو جاتیں۔ پژمردگی اور افسردگی کا ماحول بن جاتا۔ اس ماحول میں دُہری کمر والی پچھتر سالہ بڑھیا، ایک چھوٹے سے کتے کو ٹہلاتی ہوئی گزرتی تو ماحول سے نظریں ہٹا کر وہ ایک گہری نگاہ اس پر ڈالتا۔ برسوں پہلے کا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا۔

جب یہ بڑھیا ایک جوان اور پُرکشش عورت تھی۔ اسی عمارت کے اسی آفس میں ایک پیسہ بنانے والی مشین کی مانند سارا دن مصروف رہنے والی یہ عورت جب نگاہ اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھتی تو وہاں عین اسی جگہ، جہاں وہ آج خود کھڑی تھی، جارج کھڑا ہوتا۔ چھوٹے سے کتے کی رسی ایک ہاتھ میں پکڑے وہ ماں کی فطری محبت سے تہی دامن تھا اور ماں اپنی فطری ممتا دبائے پیسے کی محبت میں بے کل تھی۔

کچھ روز پہلے کی بات ہوتی تو جارج بڑھیا ماں پر ایک گہری نگاہ ڈال کر ہٹا چکا ہوتا مگر اب نگاہ ہی نہیں زاویۂ نگاہ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے بڑھیا کے ناتواں وجود کو سڑک پر گھسٹتا دیکھ رہا تھا۔ ایک آنسو آنکھ سے بہ نکلا تھا۔ ہاں.... چند روز پہلے جب اسلامک سینٹر جا کر ایک مسلم اسکالر کے سامنے اس نے اسلام قبول کیا تھا تو ان اسکالر نے اسے بتایا تھا۔

''بیٹے! حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ رب العالمین کے بعد ہم پر سب سے بڑھ کر حق ہماری ماں کا ہے۔'' سامنے میز پر حدیث کی کتاب کھلی رکھی تھی، جارج پڑھ رہا تھا۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں، ''جس زمانے میں قریش اور مسلمانوں میں معاہدہ تھا، میری مشرک ماں میرے پاس آئی۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری ماں آئی ہے اور وہ اسلام سے رغبت نہیں رکھتی۔ کیا میں اس سے سلوک کر سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! اس سے سلوک کرو۔'' (متفق علیہ)

اس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی۔ وہ دفتر کی سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اتر آیا تھا۔ ''مام!'' اس کے اپنے ہی کانوں کو یہ آواز بڑی نامانوس لگی تھی، اجنبی آواز پر بڑھیا کیا لبیک کہتی؟ وہ تو حسرت و یاس کی تصویر بنی اولڈ ہاؤس کی جانب گھسٹ رہی تھی۔ جارج کو لمحے بھر کے لیے بڑھیا سے کراہت سی محسوس ہوئی۔ اسی لمحے سرد ہوا کا اک جھونکا اس کے کانوں میں سرگوشی کر گیا۔ 'جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔'، وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ 'مام! آپ اولڈ ہاؤس نہیں، میرے ساتھ میرے گھر چلیں گی۔' بڑھیا پر تو خوشی اور حیرتوں کے پہاڑ گر چکے تھے۔

جارج دن رات اس کی خدمت میں مصروف تھا۔ کبھی پاؤں دباتا تو کبھی سر۔ کبھی دوا دیتا تو کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا، کبھی اپنے ساتھ گھمانے لے جاتا۔ بیٹے کے دین اسلام قبول کرنے کا اعجاز تھا کہ اولڈ ہاؤس میں سسکتی بڑھیا قیمتی اثاثہ بن چکی تھی۔ وہ حیران ہو کر پوچھتی، کس نے تمہارے دل میں میری محبت ڈالی، کس نے تمہیں میری قدر و منزلت سے آگاہ کیا؟ کس نے سمجھایا کہ میرا مقام اولڈ ہاؤس کا نہیں، تمہارے ادب و احترام کا حق دار ہے۔' اس کے سارے سوالوں کے جواب میں وہ مسکرا دیتا۔

''مام! ہے اک کامل رہ نما، جس کی پیروی انسان کو شرفِ انسانیت بخشتی ہے۔ جو حقوق دینے میں، فرائض بجا لانے میں متعصب نہیں۔ جو فرماتا ہے، ماں مشرک ہو تو بھی لائق صد احترام ہے مگر ظلم ہے مام، دنیا کے سب سے بڑے غیر متعصب رہ نما کو ہمارا معاشرہ تعصب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتا اور اس کے پیروکاروں کے دل دکھاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری تہذیب ریت کے ذرّوں کی مانند ہے، یہ جتنی بھی اونچی اُڑ لے، رہے گی بے قیمت۔ جب کہ رسول عربی ﷺ کا وضع کردہ تمدن وہ نایاب ہیرا ہے جو سدا اپنی چمک دمک دکھاتا رہے گا۔ اسی تمدن نے مجھے تمہارا ادب و احترام اور محبت دی مام!

وہ سکتے کے عالم میں سن رہی تھی۔ کیا میرے پاس اس دین کو قبول کر لینے کی کوئی گنجائش باقی ہے؟ آخری لمحوں پر آئے اس کے لرزتے کانپتے وجود نے خوش بخت بیٹے سے سوال کیا۔ ہاں مام! ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک گنجائش باقی ہے۔

وہ کلمہ وحید پڑھ رہی تھی، زندگی میں پہلی اور آخری بار۔ وہ ظلمتوں سے روشنیوں کا سفر طے کر چکی تھی۔

''مام! تمہاری طرح ہماری قوم کا ہر غیر متعصب فرد تاریکیوں سے روشنیوں کی جانب سفر کرے گا۔ اندھیروں سے اجالوں کا سفر، جہالت سے آگہی کا سفر۔

ہماری دلیل اور منطق سے ہار جانے والی قوم اب اُمِ جمیل اور ابوجہل کی سی گھٹیا ذہنیت لے کر میدان میں اتری ہے۔ وہ آوازیں کستے تھے، یہ ناپاک مقابلے کرتے ہیں۔ حاصل ان کو بھی کچھ نہ ہوا، لاحاصل ان کی بھی سب کاوشیں ہوں گی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنی قوم میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے گوہر نایاب دامن مصطفیٰ ﷺ میں ڈال گئے۔

☆.....☆.....☆

جائز کاموں میں سفارش کا اجر وثواب

بیگم صاحبہ! آج کل بارشیں بہت ہو رہی ہیں، کچا مکان ہے۔ چھت ٹپکنے لگتی ہے، بہت مشکل ہو جاتی ہے، اگر آپ مجھے کچھ رقم دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ برکت بی بی امی جان سے کہہ رہی تھیں۔ سلمان نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔ برکت بی بی بے چارگی جب کہ امی بے زاری لیے ہوئے تھیں۔ ''ابھی جاؤ، میں پھر دیکھوں گی۔ وہ اسے اٹھانا چاہتی تھیں۔

بیگم صاحبہ! تو میں کب آؤں؟ اس نے پوچھا۔ میں اگر کوئی بندوبست کر سکی تو خود کوئی بچہ بھیج دوں گی، تم مت آنا۔ امی جان نے ٹکا سا جواب دیا۔ وہ سخت دل نہیں تھیں، اکثر لوگوں کے کام آتیں لیکن اس وقت مہینے کا اختتام تھا، اس لیے وہ برکت بی بی کی مدد سے ہچکچا رہی تھیں۔

سارا دن سلمان کا ذہن برکت بی بی کے بوسیدہ مکان میں اٹکا رہا۔ وہ جانتا تھا، برکت بی بی سچ کہہ رہی تھیں۔ رات ہو چکی تھی۔ اوہو! بجلی پھر چلی گئی۔ امی جان! یہاں بہت گرمی ہے۔ میں اور سائرہ تھوڑی دیر کے لیے چھت پر چلے جائیں؟ سلمان نے امی سے پوچھا۔ چلے جاؤ لیکن ذرا دھیان سے۔ امی نے کہا۔

چھت کی کھلی فضا کمرے کے بند ماحول سے بہتر تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ چودھویں کا چاند اپنی حسین جگمگاہٹ کے ساتھ بادلوں میں نکلتا چھپتا دل کش منظر پیش کر رہا تھا۔ سلمان اور سائرہ چھت کی دیوار کے ساتھ کچھ اس طرح لگ کر کھڑے ہوئے کہ سارے شہر کا منظر ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ دُور جی ٹی روڈ پر گاڑیوں کی قطار، دُور بہت دُور.... اونچے اونچے پہاڑ اور ان پر کھڑے درخت۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ سائرہ نے اشارہ کیا۔ جی ہاں! سلمان نے تائید کی لیکن پھر خود بخود اس کی نظریں کالونی کی اُس طرف، کچی بستی کی جانب مڑ گئیں۔ جہاں انسانوں کی دریافت کردہ سہولیات تو مفقود تھیں لیکن قدرت کی چاندنی اتنی ہی فیاضی سے وہاں بھی بکھری ہوئی تھی جتنی کہ یہاں۔

برکت بی بی کا گھر بھی تو اسی کچی بستی میں ہے۔اس نے سوچا۔

''سائرہ تمہیں پتا ہے، برکت بی بی امی سے کچھ قرض مانگ رہی تھیں۔'' سلمان نے سائرہ کو مخاطب کیا۔

''جی ہاں، دن میں کچھ ایسی بات ہو تو رہی تھی۔'' سائرہ نے جواب دیا۔''امی اس کی مدد کرنے سے ہچکچا رہی تھیں۔'' سلمان نے سائرہ کو بتایا۔''اچھا! میں نے توجہ نہیں دی۔'' سائرہ نے جواب دیا۔''سائرہ! میرا دل چاہ رہا ہے، میں امی سے برکت بی بی کی سفارش کروں۔ وہ ضرورت مند ہیں۔ امی اکثر صدقہ وخیرات کیا کرتی ہیں۔اس مرتبہ برکت بی بی کو دے دیں۔'' سلمان نے سائرہ کی جانب دیکھا۔ جی بھیا! سفارش سے یاد آیا، وہ حدیث بھی ہے ناں۔ ''اشفعوا تو جروا'' جائز سفارش کرو اجر پاؤ گے۔تو تمہارا کیا خیال ہے؟ سلمان نے سائرہ سے پوچھا۔اس سے پہلے کہ سائرہ جواب دیتی، ابا جان! جو ابھی اوپر آئے تھے، پیار سے بچوں سے پوچھنے لگے۔چھت پر کیا کر رہے ہیں؟

بابا جانی! ہم امی جان سے برکت بی بی کی سفارش اور حدیث اشفعوا تو جروا، سفارش کرو اجر پاؤ گے، پر بات کر رہے ہیں۔آپ ہماری رہنمائی کریں۔آؤ بیٹھتے ہیں۔ابا جان نے چھت پر پڑی بینچ پر بیٹھتے ہوئے سائرہ اور سلمان کو اپنے دائیں بائیں بٹھالیا۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم شریف میں ہے۔حضرت ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں۔''اللہ کے رسول ﷺ کے پاس جب کوئی ضرورت مند آتا تو آپ اپنے شرکائے مجلس کی طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے، اس کے لیے سفارش کرو، تمہیں بھی اجر دیا جائے گا اور اللہ اپنے نبی ﷺ کی زبان پر جو پسند فرماتا ہے، فیصلہ فرما دیتا ہے۔'' بابا جانی نے بچوں کو حدیث کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ہر اچھے اور نیک کام کے لیے سفارش نہ صرف پسندیدہ ہے بلکہ اس پر اجر وثواب بھی ہے۔

''ابو! سفارش ہم کن کن کاموں میں کر سکتے ہیں؟'' سائرہ نے پوچھا۔''بیٹے! ہر جائز اور نیکی کے کام میں سفارش کی جاسکتی ہے۔'' ابو نے بتایا۔جیسے کسی غریب، ذہین بچے کی کسی تعلیمی ادارے میں مفت داخلے کی سفارش، کسی غریب کو کھانا کھلانے کی سفارش۔

سلمان سوچتے ہوئے بولا، کسی باصلاحیت نوجوان کی نوکری کے لیے سفارش یا پھر کوئی بھی نیکی کا کام کرنے پر انعام دیے جانے کی سفارش۔ سائرہ نے بھی چند مثالیں دیں۔ بالکل میرے بچو! بابا جان اپنے بچوں کی ذہانت پر بہت خوش ہوئے۔بچو! یاد رکھنا، ناجائز کاموں پر سفارش نہیں ہے۔

ناجائز کام؟ ناجائز کام کون سے ہوتے ہیں بابا جانی؟ سلمان نے پوچھا۔حرام کام مثلاً شراب کی بوتل دینے کی سفارش۔سود لینے کی سفارش یا پھر کسی نکمے اور غیر مستحق شخص کو نوکری دیے جانے کی سفارش وغیرہ؟

ہاں وہ واقعہ تو تم جانتے ہی ہو، جس میں فاطمہ نامی ایک عورت چوری کے جرم میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لائی گئی اور آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔لوگوں نے حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

سے کہا کہ آپ دربار رسالت میں اس عورت کی سفارش کریں کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ جب حضرت اسامہ نے اس عورت کی سفارش کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفارش کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، ''کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو؟ اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کے ہاتھ بھی کاٹ دیے جاتے۔'' اس سے پتا چلتا ہے کہ حرام کاموں اور اللہ کی حدود میں سفارش نہیں ہے۔

جزاک اللہ خیراً کثیراً بابا جانی۔ سلمان اور سائرہ بات سمجھ جانے کی خوشی میں بابا جانی سے لپٹ گئے۔ بجلی آ گئی ہے، ہمیں نیچے جا کر سونا چاہیے۔ بابا جانی بولے اور سب نیچے آ گئے۔ امی جان! برکت بی بی واقعی ضرورت مند ہیں۔ آپ ان کی مدد کر دیں۔ سلمان نے ناشتا کرتے ہوئے امی جان کو مخاطب کیا۔ جی امی جان! میں بھی ان کی سفارش کرتی ہوں۔ سائرہ نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

آپ بچوں کی یہی سفارش ہے تو ٹھیک ہے، لیکن اس نیکی کے کام میں آپ کو بھی حصہ لینا ہوگا۔ امی جان بولیں۔ وہ دل ہی دل میں بچوں کی اچھی سوچ پر بہت خوش ہوئیں پھر سوچا کہ چلو ذرا ان کا امتحان بھی ہو جائے۔ یہ رہا ہمارا حصہ۔ سائرہ اور سلمان نے اپنا کوائن باکس امی جان کی جانب بڑھایا۔ ہم دونوں کیرم بورڈ کے لیے پیسے جمع کر رہے تھے۔ یہ آپ برکت بی بی کے لیے رکھ لیں، ہم پھر جمع کر لیں گے۔ امی اور بابا جانی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔ ان کے دل گواہی دے رہے تھے کہ ہمارے بچے اللہ تعالی کے فرماں بردار اور اسوۂ رسول پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

☆.....☆.....☆

نفع نقصان کا مالک

(بچوں کی کہانی)

''چلو! چور سپاہی کھیلتے ہیں۔ میں سپاہی، میں تم سب کو پکڑوں گا۔'' کاشف نے چہکتے ہوئے کہا۔ عصر کی نماز کے بعد سب بچے چمن میں کھیلنے کے لیے جمع تھے۔ ''جی نہیں، میں سپاہی۔'' دانیال نے اکڑ کر کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے، دانیال سپاہی، ہم سب چھپتے ہیں۔'' سب دانیال کے سپاہی بننے پر راضی ہو گئے۔ کاشف منہ بسور کر رہ گیا۔ ''میں نہیں کھیلتا۔'' اس نے منہ بنایا اور چمن میں پھیلی بوگن ویلیا کی بیل کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ سب بچے ہنس کھیل رہے تھے۔ کاشف غور سے بیل کو دیکھنے لگا۔ کتنی پیاری اور انوکھی بیل ہے۔ بلندیوں کی جانب جاتا ہوا لمبا، مضبوط اور قدرے کم موٹا تنا۔ بابا جانی نے تراش خراش کے نیچے سے ساری شاخیں چھانٹ دی تھیں۔ اوپر سے شاخیں سمیٹ کر گول دائرے کی شکل میں لوہے کے ایک رِنگ میں دے کر چمن کے پول کے ساتھ باندھ دی تھیں۔ کاشف مکمل طور پر بیل کی خوب صورتی میں کھو چکا تھا۔ سبز پتوں اور گلابی پھولوں والی یہ بیل کیسی حَسین تھی۔

کاشف کی نگاہیں رِنگ کی گولائی میں تہ در تہ پھیلی ہوئی بیل کو کھوج رہی تھیں۔ اچانک خوشی اور حیرت سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سب اپنے کھیل میں مگن تھے، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ بیل کے اندرونی حصے میں خاصی اونچائی پر شہد کی مکھیوں نے چھتّا بنا رکھا تھا۔ کتنا مزہ آئے گا جب میں بابا جانی کو شہد کے چھتّے کے متعلق بتاؤں گا۔ خوشی اور جوش میں کھڑے ہوتے ہوئے اس نے بیل کا تنا زور سے ہلا ڈالا۔ بیل کے ہلنے سے مکھیاں بے چین ہو کر اِدھر اُدھر اُڑنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ کاشف بیل سے دُور ہوتا، دو تین مکھیاں اس کے دائیں ہاتھ پر کاٹ چکی تھیں۔

''امی.... امی جی!'' کاشف درد کی شدت سے چیخا۔

''دانیال کی وجہ سے مکھیاں مجھے کاٹ گئیں، یہ میری جگہ سپاہی بن گیا تھا۔ کاش امی جان! آپ چمن میں ہوتیں اور مجھے مکھیوں سے بچا لیتیں۔''

کاشف کو مکھیوں کے کاٹنے سے درد اور جلن محسوس ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بخار نے بھی آن دبوچا تھا۔ اسے اپنی تکلیف کے ذمے دار اپنے ساتھی لگ رہے تھے۔ امی جان اسے وہ ہمدرد اور مسیحا لگ رہی تھیں جو اگر موقع پر موجود ہوتیں تو اسے اس حادثے سے بچا لیتیں۔ وہ بار بار اپنے بے ربط جملوں میں اپنے احساسات کا اظہار کر رہا تھا۔ امی جان، جواب تک اس کی تکلیف پر افسردہ تھیں، اس کے خیالات جان کر بے حد پریشان ہو گئیں۔

آئندہ دو روز میں کاشف کے ہاتھ کی سوجن کافی کم ہو گئی۔ دھیرے دھیرے بخار بھی اتر گیا۔ امی جان، جو بخار میں اس کی دیکھ بھال کے لیے مستعد تھیں، اب اس کی سوچ کی اصلاح بھی چاہتی تھیں۔

''امی جان! یہ دیکھیں میرا ہاتھ، مکھی کے کاٹنے کا نشان اب بھی باقی ہے۔'' کاشف نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ امی جان کے سامنے کیا۔ امی جان نے کاشف کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا، ''کاشف! آپ کو کیا لگتا ہے، شہد کی مکھی نے آپ کو کیوں کاٹا''؟

''دانیال کی وجہ سے۔'' کاشف نے بغیر سوچے جھٹ سے جواب دیا۔ ''سچ.... دانیال ایسا با کمال ہے، جس کی وجہ سے شہد کی مکھی آپ کو کاٹ گئی؟'' امی جان نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ.... جی ہاں، نہیں.... پتا نہیں۔'' کاشف امی کے لہجے کی وجہ سے گڑبڑا سا گیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا، ''آپ نہیں تھیں ناں میرے ساتھ.... اس لیے، ورنہ تو آپ مجھے بچا لیتیں۔'' اب کی بار اس نے محبت سے امی جان کی طرف دیکھا۔ ''پیارے کاشف! کیوں ناں میں آپ کو ایک حدیث سناؤں؟'' امی جان کاشف کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولیں۔ ''جی امی جان!'' کاشف سعادت مندی سے ان کی طرف متوجہ ہوا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ''میں ایک دن نبی ﷺ کے پیچھے تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا، (لڑکے! میں تمہیں کچھ باتیں سکھاتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو وہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کو یاد رکھو تم اسے اپنی سمت میں پاؤ گے، جب بھی مانگو تو اللہ تعالیٰ سے مانگو اور جب بھی مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ سے، یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اگر پوری امت مل کر تمہیں معمولی فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ تمہیں وہی فائدہ دے سکتی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور اگر وہ سب مل کر تمہیں معمولی نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ تمہیں اتنا ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ قلمیں اٹھا لی گئی ہیں اور صحیفے خشک ہو گئے ہیں۔'' (ترمذی)

امی جان حدیث سنا کر لمحے بھر کو خاموش ہو گئیں۔ کاشف سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ''کاشف بیٹے! غور کریں۔ اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے ہیں کہ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اگر پوری امت مل کر تمہیں معمولی فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ تمہیں وہی فائدہ دے سکتی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور اگر وہ سب مل کر تمہیں معمولی نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ تمہیں اتنا ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ یعنی شہد کی مکھی کا

کاٹنا اور آپ کا اس تکلیف میں مبتلا ہو جانا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا ہوا تھا۔ اس میں دانیال یا کسی اور بچے کا دخل نہیں تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو شہد کی مکھی کی مجال نہیں تھی کہ وہ آپ کو کاٹتی اور دانیال، جسے آپ قصوروار سمجھ رہے ہیں، وہ غریب تو اپنا بھی کچھ دفاع نہ کر پاتا اگر اس مکھی کو اسے کاٹنے کا حکم ملتا۔ ایسے ہی اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا اور دانیال تو کیا سب دنیا کے لوگ مل کر شہد کی مکھی سے آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتے تو نہ پہنچا سکتے۔'' کاشف غور سے امی جان کی بات سن رہا تھا۔

''تو امی جان! اگر آپ وہاں موجود ہوتیں تو مجھے بچا نہ لیتیں؟'' کاشف نے سوال کیا۔

''بیٹا! میں اللہ پاک کی رحمت سے کوشش ضرور کرتی مگر آپ کو صرف اسی صورت میں بچا سکتی اگر اللہ پاک آپ کو بچانا چاہتا وگرنہ میری کوشش ناکام ہو جاتی۔ ہمارا ہر طرح کا نفع نقصان اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اس لیے ہمیں دل میں نہ کسی سے متعلق برے خیالات پالنے چاہئیں اور نہ ہی کسی سے لمبی چوڑی توقعات وابستہ کرنی چاہیے۔'' امی جان نے کاشف کو سمجھایا۔

''جی امی جان! میں سمجھ گیا، ہمیں تکلیف بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہنچتی ہے۔ اس لیے ہمیں ہر وقت استغفار اور اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے عافیت کی دعا مانگنی چاہیے۔'' ''شاباش بیٹے! اسی طرح ہمیں کامیابی بھی اللہ کے حکم سے ملتی ہے، اس لیے ہمیں اللہ کا شکر ادا کر کے اپنی نعمتوں کو محفوظ کرنا چاہیے۔'' امی جان نے پیار سے کاشف کو سمجھایا۔ ''اللہ کے جو بندے ہمارے اردگرد ہیں ان کا کیا امی جان؟'' سائرہ نے، جو امی اور کاشف کی گفتگو غور سے سن رہی تھی، پوچھا۔ ''بیٹے! اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنے نفع نقصان سے عاجز سمجھتے ہوئے ہر حال میں اپنے اچھے برتاؤ کا حق دار بنائیے۔'' امی جان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''جزاک اللہ خیرا کثیرا، امی جان! آپ نے ہمیں بہت اچھی بات بتائی۔ ہم ہمیشہ اس کو ذہن میں رکھیں گے۔ ان شاء اللہ۔'' سائرہ اور کاشف نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

☆.....☆.....☆

عقیدہ ختم نبوت، ایمان کا لازمی حصہ

(بچوں کی کہانی)

کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم سی روشنی تھی۔ کاشف امی کی گود میں سر رکھے، آنکھیں موندے آہستہ آواز میں درود شریف پڑھ رہا تھا۔ امی جان نے محبت سے کاشف کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو حدیث یاد ہوئی کاشف؟''

''جی امی! میں آخری پیغمبر ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی ﷺ نہ ہوگا۔ (بخاری و مسلم)'' کاشف نے روانی سے حدیث سنائی۔ ''شاباش! اب سونے کی دعائیں پڑھ کر سو جائیں۔'' ''امی! یہ قادیانی کون ہوتے ہیں؟'' کاشف اسکول کے لیے تیار ہو کر باورچی خانے میں آ گیا تھا جہاں اس کی امی ناشتا بنا رہی تھیں۔ ''کیا....؟ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' سارہ کو اس کے سوال پر حیرت ہوئی۔

''ہماری جماعت کا قاسم ہے ناں، وہ کہتا ہے، میں مسلمان ہوں لیکن کچھ بچے کہتے ہیں، یہ قادیانی ہے۔ قادیانی کیا ہوتا ہے امی؟'' کاشف نے اپنا سوال دہرایا۔

''بیٹا! عقیدۂ ختم نبوت یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے اور آپ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ آپ کے بعد کسی شخص کو اس منصب پر (کسی بھی درجے میں) فائز نہیں کیا جائے گا، اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ قادیانی اس عقیدے سے انحراف کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے۔ قادیانی خود کو مسلمان کہلواتے ہیں مگر یہ مسلمان نہیں ہیں۔'' قادیانیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کیا ہے۔ بیٹا! ایسے لڑکوں سے دوستی نہیں کرنی، جو ہمارے نبی ﷺ، ہمارے دین اور ہمارے وطن کا دشمن ہے، وہ ہمارا دوست نہیں ہوسکتا۔'' کاشف نے 'جی اچھا' کہا اور چلا گیا۔

اگلے روز کاشف اپنے کزن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ شام کو چچا چچی ان سے ملنے آئے تھے۔ وہ بہت خوش تھا۔ کھیلتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھا کر صوفے پر بیٹھی چچی جان کی جانب دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ چچی جان رو رہی تھیں۔ ''بھابھی! جب سے ان کو کاروبار میں نقصان ہوا ہے، تب سے یہ قرض لینا چاہ رہے تھے۔ پہلے خدا خدا کر کے بینک سے قرض لینے سے روکا کہ سود کا معاملہ ہے۔ ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اب اس کے بعد نہ جانے یہ قادیانی ان کو کہاں سے مل گیا۔ کہتے ہیں دو لاکھ روپے کا قرض آرام سے بِنا سود دینے پر راضی ہے اور یہ لینے پر۔ میری تو راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے۔ کیا ہمارا ایمان اتنا ناقص ہو گیا ہے کہ ہم قادیانیوں کے سہارے اپنا کاروبار چلائیں گے؟'' چچی جان بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ ''روئیں نہیں بھابھی! کاشف کے ابو سمجھا رہے ہیں بھائی صاحب کو۔'' سارہ انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ کاشف کا دل یک دم کھیل سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔

''شوقیہ قرض نہیں لے رہا، مجبوری ہے۔'' چچا جان بولے۔ ''ایسی بھی کیا مجبوری کہ ہم قادیانیوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں؟'' کاشف کے بابا نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ خود کو مسلمان کہتے ہیں بھائی جان! ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم انہیں برا بھلا کہیں؟'' ''مسلمان ہونے کے کچھ عقائد ہیں دانیال میاں!'' ''مگر بھائی جان! اللہ، رسول اور قرآن پاک کو تو وہ مانتے ہیں۔''

''اچھا.... تو ذرا یہ بھی بتائیے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی (نعوذ باللہ) اور اس کی کتاب تذکرہ کو وحی مانتے ہیں؟ سمجھنے کی کوشش کرو دانیال! عیسائی، حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور توریت کو مانتے ہیں مگر اس بِنا پر وہ خود کو یہودی نہیں کہلواتے اور نہ ہی کوئی یہودی انہیں یہودی مانتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور انجیل پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ہمیں دیکھو! ہم حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر یقین رکھتے ہیں۔ توریت و انجیل پر ہمارا ایمان ہے لیکن ہم یہود و نصاریٰ! کے گروہ میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی یہود و نصاریٰ ریاستیں ہمیں اپنے برابر کھڑا کرتی ہیں۔ قادیانیوں اور دنیا بھر کی طاغوتی طاقتوں کا ہم پر یہ کیا رعب ہے کہ ہم انہیں مسلمان سمجھیں؟ جب کہ وہ مسلم عقائد کی صریح نفی کرتے ہیں۔''

''اچھا! تم تو خود کاروبار کرتے ہو، یہ بتاؤ تمہاری کمپنی سو سال سے کاروبار کر رہی ہے۔ تمہارا اپنا نام ہے، ٹریڈ مارک ہے، لوگو ہے اور اپنی ساکھ ہے۔ اب چند افراد تم سے الگ ہو کر ایک نئی کمپنی بنا لیتے ہیں لیکن وہ بضد ہیں کہ نام، ٹریڈ مارک اور لوگو تمہارا استعمال کریں گے؟ کیا تم انہیں اس کی اجازت دو گے؟ کیا دنیا کا کوئی قانون اس باغی کمپنی کو یہ اجازت دے گا؟ اگر نہیں، تو قادیانیوں کو کیوں اسلام و مسلمان کا ٹائٹل، حامل قرآن و مسجد کے تمام تر حقوق مل سکتے ہیں؟ میرے بھائی! پاکستان میں عیسائی، سکھ، ہندو، سب ہی رہتے ہیں۔ کبھی کسی عالم دین نے ان پر سوال اٹھایا؟

نہیں ناں۔ کیوں؟ یہ سب اپنے دائروں میں رہتے ہیں، ہمارے حقوق پر دعویٰ نہیں کرتے۔ قادیانی عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، عقیدۂ ختم نبوت، سب پر شب خون مارتے ہیں اور پھر بھی امت مسلمہ کی صفوں میں گھسے رہنا چاہتے ہیں۔

میرے بھائی! ان کی تاریخ نکال کر پڑھو۔ یہ بقول ان کے کاذب لیڈر، انگریز کا کاشت کردہ پودا ہیں۔ جب مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر کمر بستہ ہونے کی ضرورت تھی، یہ نظریۂ جہاد کو کالعدم قرار دینے کے لیے پروان چڑھائے گئے۔ یہ تو دجالی فتنہ ہیں میرے بھائی۔ ایک ایسا فتنہ، جسے جنگ یمامہ میں حفاظ کرام کی شہادتوں کے بدلے نیست و نابود کیا گیا۔ کیا ہماری دینی حمیت ہم سے تقاضا نہیں کرتی کہ ہم اس فتنے کو اپنی پوری قوت سے کچل ڈالیں؟ بابا جانی بولتے بولتے خاموش ہو گئے تھے۔ چچا جان بھی سر جھکائے کسی سوچ میں گم ہو گئے۔

کاشف، جو بغور بابا اور چچا جان کی باتیں سن رہا تھا، دھیرے سے چلتا ہوا چچا جان کے برابر آ کھڑا ہوا۔ ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے بولا، ''چچا جان! ہم اپنے دین اور وطن کے دشمنوں سے مدد کی بھیک نہیں مانگ سکتے۔ امی جان کہتی ہیں، ہمارا بھروسا اللہ پر ہے اور ہم ایک دوسرے کے خود مددگار ہیں۔ میرے کوائن باکس میں بہت سے پیسے ہیں۔ آپ الیاس قادیانی سے قرض نہ لیں، میں آپ کو اپنا کوائن باکس دے دوں گا۔'' بابا اور چچا جان کاشف کا جذبۂ ایمانی دیکھ کر مسکرا دیے۔ ''نہیں بیٹے! میں سمجھ گیا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن بھلا میرا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟'' ''شاباش دانیال! سچ کہا تم نے۔'' کاشف کے بابا جوش سے بولے۔

☆.....☆.....☆

آم کھاؤ بھئی آم

(بچوں کی کہانی)

آہا! بابا آم لائے.... بابا آم لائے۔ چمن میں کھیلتے ہوئے بچے بابا کے ہاتھ میں آموں کا شاپر دیکھ کر خوشی خوشی انہیں سلام کرنے دوڑے۔ السّلام علیکم بابا جان! ننھے منے ہاتھ سلام کے لیے آگے بڑھے، جنہیں بابا جان نے محبت سے تھام لیا۔ وعلیکم السّلام بچو! جیتے رہو۔

امی میں ابھی آم کھاؤں گا۔ یہ سب سے چھوٹا کاشف تھا، جو امی کے دوپٹے کے ساتھ جھولنے لگا تھا۔ نہیں بیٹا! آم ہمیشہ ٹھنڈے کر کے کھانے چاہئیں۔ میں انہیں دھو کر فریج میں رکھتی ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد کھائیں گے، ان شاءاللہ۔ رات کے کھانے کے بعد.... بچے منہ بسورنے لگے۔

سلمان اور سائرہ تو اطمینان سے ہوم ورک کرنے لگے لیکن کرن اور کاشف کا سارا دھیان آموں ہی میں لگا ہوا تھا۔ تمہیں پتا ہے کاشی! آموں میں وٹامن اے، بی اور سی پایا جاتا ہے۔ یہ معدے کے نظام کو درست رکھتا ہے۔ کرن فریج کھول کر آموں کا جائزہ لینے لگی تھی۔ جو بھی پایا جاتا ہے، یہ ہوتے بہت خوش ذائقہ اور لذیذ ہیں۔ کاشف نے للچائی نظروں سے فریج میں جھانکا۔ تم دونوں فریج بند کر کے یہاں آؤ، ہمارے ساتھ ہوم ورک کرو۔ سلمان نے کرن اور کاشف کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ چاروں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ میں پہلے آم کھاؤں گا۔ کاشف نے آنکھیں مٹکائیں۔ اچھا ادھر آؤ، آموں سے متعلق ایک بات بتاتی ہوں۔ سائرہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ کیا؟ تینوں بہن بھائی سائرہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ یہ کہ آم تیزابیت اور بدہضمی دُور کرتے ہیں۔ یہ یادداشت اور نظر بھی تیز کرتے ہیں۔ سائرہ مسکرائی۔

اس رسالے میں بھی آموں سے متعلق لکھا ہے۔ میں پڑھ کر سناتا ہوں۔ اب کے سلمان نے گفتگو میں حصہ

لیا۔آم آنتوں کی سوزش کے لیے مفید ہیں۔ ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ آم کھانے سے آنتوں کی سوزش دور ہوتی ہے اور یہ پورے نظام ہاضمہ کو بہترین بناتا ہے۔آم میں کئی طرح کے وٹامنز، اینٹی آکسیڈنٹس، پولی فینولز اور فائبر (ریشے) پائے جاتے ہیں۔اس کے کئی فائدوں میں آنتوں کی سوزش دور کرنا، نظام ہاضمہ کو بہتر بنانا اور غذا کو فوری طور پر جزو بدن بنانا ہے۔آج کی تیز رفتار زندگی میں ہر دوسرا فرد خراب نظامِ ہاضمہ اور پیٹ کے امراض میں مبتلا ہے اور آم اس کا مؤثر حل ہے۔ٹیکساس اے اینڈ ایم یونیورسٹی کے ماہرین نے اس کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔انہوں نے 36 خواتین وحضرات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ان میں سے ایک گروہ کو روزانہ 300 گرام آم کھلایا گیا اور دوسرے گروہ کو فائبر کا پاؤڈر دیا گیا۔دونوں گروہوں کی غذا میں پروٹین، کیلوریز، کاربوہائیڈریٹس، فائبر اور پروٹین کی مقدار یکساں رکھی گئی تھی۔

تو بھیا، آپی! آپ امی جان کو کہیں ناں.... ہمیں آم دیں۔کاشف نے بے صبری سے اپنے بڑے بہن بھائیوں سے درخواست کی۔ارے بھئی کاشف! کھانے کے بعد آم بھی ملیں گے اور آموں کے بعد جامن بھی۔ بابا جان نے مسکراتے ہوئے بچوں کی گفتگو میں حصہ لیا، کیوں کہ جامن آموں کی گرمی کے اثرات دور کرتے ہیں۔امی جان! یہ میں سب کو دوں گا۔کھانے کے بعد جب امی نے آم دسترخوان پر رکھے تو کاشف ایک نئی فرمائش لیے ہوئے تھا۔اچھا بھئی! آپ تقسیم کریں سب میں۔امی نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے۔کاشف نے جلدی سے ایک آم اٹھایا اور بائیں جانب بیٹھی کرن کو پکڑانے لگا۔

ارے ارے.... یہ کیا؟ امی جان نے اشارے سے کاشف کو روکا۔کیوں کیا ہوا؟ اس نے امی جان کی جانب حیرت سے دیکھا۔بیٹا! ابھی کل ہی تو آپ نے حدیث یاد کر کے سنائی تھی کہ الایمن فالایمن، کھلاتے اور پلاتے وقت دائیں طرف سے شروع کرو۔اوہ امی جان! معاف کیجئے گا، میں بھول گیا۔کاشف نے شرمندگی سے سر جھکایا۔کوئی بات نہیں، اب دائیں طرف سے دینا شروع کرو۔ بابا جان نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔بچو! جو حدیث یاد کرو، اس پر عمل ضرور کرو، کیوں کہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ہمیں کتنی ہی احادیث، قرآنی آیات اور اچھی اچھی باتیں یاد ہوں مگر ہم ان پر عمل نہ کریں تو یہ یاد کرنا بے کار ہے۔بابا جان نے بچوں کو سمجھایا۔

کھلاتے اور پلاتے وقت کے علاوہ بھی ہم جب کوئی چیز کسی کو پکڑائیں تو خیال رہے کہ دائیں ہاتھ سے پکڑائیں۔امی جان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔اسی طرح پاجامہ یا شلوار پہنیں تو پہلے دایاں اور پھر بایاں پاؤں داخل کریں۔کرتا یا قمیص پہنیں تو پہلے دایاں پھر بایاں ہاتھ آستین میں داخل کریں۔ایسے ہی جوتا پہلے دائیں پاؤں میں پھر بائیں پاؤں میں پہنیں اور جب جوتا اتاریں تو پہلے بائیں طرف کا جوتا پھر دائیں طرف کا اتاریں۔سب بچے امی جان کی باتیں غور سے سن رہے تھے کہ ابا جان نے بات آگے بڑھائی۔ پیارے بچو! یہ سب ہمارے پیارے آقا حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّتیں ہیں۔آپ دائیں ہاتھ سے اچھے کام کرنا پسند فرماتے تھے۔اس لیے جب ہم سنّت پر عمل کی نیت سے دائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں تو ہمیں ثواب حاصل ہوتا ہے۔کام کی اصل خوب صورتی نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّتوں پر عمل کرنے میں ہے۔آپ ﷺ کی باتوں کو قرآن پاک میں حکمت کہا گیا ہے۔

جی بابا جان! ہم ان شاءاللہ سنتوں پر عمل کرنے کی مکمل کوشش کریں گے۔بچوں کے لب و لہجے سے ان کا عزم جھلک رہا تھا اور کاشف نے دائیں طرف سے آم دینا شروع کیے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

ڈاکٹر حامد حسن حامی

ڈاکٹر حامد حسن حامی کا تعلق بہاولپور سے ہے۔ شعبہ اینستھیز یا کے ماہرین ہیں۔ لکھنے کا سلسلہ کالج سے ہی شروع کیا اور کالج کے میگزین ''قائد'' سے وابستہ رہے۔ بطور چیف ایڈیٹر ''قائد'' 2009ء کا اجراء□ کیا۔ کسی خاص اخبار سے وابستگی نہیں لیکن اخبارات و رسائل میں اکثر لکھتے رہتے ہیں۔ رائٹرز کلب میں ایک سال سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- خطرناک کون....ایڈز یا معاشرہ؟

2- بڑا آدمی

3- غرض....بے غرض

4- قوانین اصلاح

5- تبدیلی کیسے لائی جائے؟

☆.....☆.....☆

خطرناک کون....ایڈز یا معاشرہ؟

''طاہر کے ابا! سنتے ہیں؟'' خالد صاحب چونک کر مڑے اور بیگم کو دیکھنے لگے۔

''نہ صرف سنتا ہوں بلکہ دیکھتا بھی ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ۔۔۔کیا بات ہے؟''

''نوید بھائی نے جمعے کو ہمیں گھر پر بلایا ہے۔وہ کچھ خیرات کر رہے ہیں، عائشہ کی صحت یابی کے لیے۔''

''ٹھیک ہے چلیں گے، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''وہ....آج طاہر کچھ سن کر آیا ہے۔''

''کیا؟'' ''ڈاکٹروں کے مطابق۔۔۔عائشہ کو ایڈز ہے۔''

''کیا۔۔۔۔؟ ایڈز۔۔۔؟ لاحول ولاقوۃ!'' انہوں نے منہ بنایا۔''اب جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا، لیکن ٹھیک ہے، جانے کی رسم تو نبھائیں گے۔''

صحن میں چارپائیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ایک کونے والی چارپائی پر جاں بہ لب عائشہ نڈھال سی پڑی تھی۔اس کی امی ہاتھ میں پیالہ لیے اسے چمچے سے دلیا کھلا رہی تھیں، ساتھ ہی نوید صاحب کھڑے ہوئے تھے۔''بیٹی اور لونا۔ دیکھو، ابھی تک تم نے کچھ بھی نہیں کھایا، سارا دلیا ویسا ہی پڑا ہے۔''

''نہیں امی! نہیں کھایا جاتا۔ایسا لگتا ہے کہ اور کھایا تو پیٹ پھٹ جائے گا۔''

عائشہ کی بات سن کر نوید صاحب تیزی سے مڑے اور کمرے میں چلے گئے۔امی نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور پیالہ ایک طرف رکھ کر ان کے پیچھے چل پڑیں۔آہٹ پا کر نوید صاحب نے آنکھیں صاف کیں اور بولے۔

''میں کیا کروں؟ کیسے کہوں کہ اس میں عائشہ کا کوئی قصور نہیں۔لوگ کیوں باتیں کر رہے ہیں؟'' نوید صاحب پھر رو پڑے۔

''اگر یہی ایڈز کسی لڑکے کو ہوتا تو لوگ کچھ نہ کہتے۔ میری بیٹی کو ہو گیا ہے تو وہ بدکردار ہو گئی۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ لڑکی ہے؟''

''ابو! میں نے کچھ نہیں کیا۔'' عائشہ کی آواز سن کر دونوں مڑے۔ عائشہ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ نوید صاحب دوڑے اور اسے پکڑ کر چارپائی کی طرف لے جانے لگے۔

''بیٹا! مجھے معلوم ہے مگر یہ دنیا کسی کی نہیں سنتی۔ اس کے لیے تم گناہ گار ہو کیوں کہ تم ایک لڑکی ہو اور میں اسی لڑکی کا باپ ہوں۔''

''تو ابو! لڑکی ہونا گناہ ہے کیا؟'' عائشہ یہ کہتے کہتے چارپائی پر گر پڑی۔ جب کہ نوید صاحب آنسوؤں سے اور عائشہ کی امی سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

صحن میں بہت سے لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ خیرات کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ عائشہ ایک کونے میں الگ تھلگ پڑی تھی۔ اس کا چچازاد بھائی ارسلان، جو ایک میڈیکل اسٹور پر کام کرتا تھا، سارے انتظامات میں مصروف تھا۔ ایک چارپائی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں آواز گونجی۔ ''میں نے خود ٹی وی پر دیکھا ہے، یہ جنسی بیماری ہے۔''

ارسلان مڑا تو دیکھا، انکل خالد دیگر بزرگوں کو بتا رہے تھے۔ ''اور یہ جنسی تعلقات ہی سے پھیلتی ہے۔'' ان کے پیچھے ہی نوید صاحب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''انکل خالد! ذرا مجھے بھی بتائیں، آپ کس بیماری کی بات کر رہے ہیں؟'' ارسلان نے پوچھا تو انکل خالد بولے۔ ''بیٹا آپ کی عمر کی بات نہیں ہے''

''کیوں انکل؟ کیا یہ مجھے نہیں ہو سکتی یا عائشہ میری عمر کی نہیں ہے؟'' خالد صاحب اسے غصے سے دیکھنے لگے۔

''معافی چاہتا ہوں انکل! لیکن آپ غلط بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کی اور سب لوگوں کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ ایڈز ہے کیا؟'' ارسلان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''انکل! انسانی نفسیات ہے کہ ہمیں بہت ساری باتوں میں سے صرف وہی بات یاد رہتی ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے ذہن کو ہلا کر رکھ دے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں آپ سے پوچھوں کہ ایڈز پھیلتا کیسے ہے تو آپ صرف جنسی تعلقات ہی کا بتائیں گے۔ ایسا ہی ہے ناں؟'' خالد صاحب کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

''انکل! آپ ٹی وی کے جس اشتہار کی بات کر رہے ہیں اسی میں جنسی تعلقات کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی بتائی گئی ہیں، جن سے ایڈز پھیلتا ہے۔ مثلاً متاثرہ خون کی منتقلی، متاثرہ شخص کے استعمال شدہ بلیڈ اور متاثرہ سرنج سے، وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ چھوت کی بیماری نہیں ہے کہ عام بول چال یا ساتھ کھانے پینے سے لگ

جائے۔ یہاں، جو اتنا فاصلہ رکھا ہوا ہے، صرف اس وجہ سے ہے کہ لوگ اسے چھوت کی بیماری سمجھتے ہیں، جو بالکل غلط ہے۔'' ارسلان نے ایک نظر سب کو دیکھا پھر بولا۔

''انکل! یہ بیماری واقعی اتنی خطرناک ہے کہ جان تک لے سکتی ہے۔ جہاں تک عائشہ کا تعلق ہے تو آپ سب کو یاد ہوگا کہ کچھ سال پہلے یہاں ایک اتائی ڈاکٹر آیا تھا۔ اس کے ایک غلط انجکشن ہی سے عائشہ کو ایڈز ہوا ہے اور آپ لوگ نہ جانے کیا کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ سب چھوڑیں اور صرف یہ سوچیں کہ ایڈز ہے کیا اور اس کیسے بچاؤ کیا جائے۔''

خالد صاحب سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔ اٹھے، ایک نظر سب پر ڈالی اور ایک کونے میں موجود عائشہ کی طرف بڑھے۔ نوید صاحب کو بلا کر اس کی چارپائی صحن کے کونے سے اٹھوا کر درمیان میں رکھی اور عائشہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''عائشہ بیٹی! مجھے معاف کر دو۔ مجھے واقعی صرف اتنا ہی یاد تھا کہ جس کی بنیاد پر ہمیشہ غلط سوچیں ہی دامن گیر ہوتی ہیں۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔'' عائشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ایک نظر سب کو دیکھا پھر ارسلان کو دیکھنے لگی۔

''ارسلان بھیا!'' عائشہ کی کم زور سی پکار پر وہ اس کے قریب پہنچا۔ عائشہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چوم کر بولی، ''بھیا! اب میں سکون سے جا.... سکوں گی۔ آپ کا.... بہت.... بہت شکریہ!'' اور ہاتھ آنکھوں سے لگا لیا۔ ارسلان نے آرام سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کی بے نور آنکھوں کو بند کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اسی لمحے گھر میں کہرام مچ گیا کیوں کہ عائشہ کے ساتھ ہی عائشہ کا مرض بھی ختم ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بڑا آدمی

بچپن اور پچپن میں کتنا فرق ہے؟ کوئی کچھ بھی کہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ بس ''سوجھ بوجھ'' کا فرق ہے۔ گو میرے ''پچپن'' میں ابھی بہت دیر ہے لیکن ''بچپن'' کو گزرے کافی عرصہ بیت چکا ہے اور میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ ''بڑا آدمی'' کسے کہتے ہیں۔

بچپن میں دادی اماں دعا دیا کرتیں کہ ''اللہ! تمہیں بڑا آدمی بنائے۔'' تو مجھے فی الفور اس وقت کے طویل القامت آدمی کا خیال آتا اور دل سے دعا نکلتی، ''یا اللہ! اتنا بڑا ابھی نہ کرنا کہ میں کار میں بھی نہ بیٹھ سکوں۔'' یعنی ایسے سکڑ کر بیٹھنا کہ گھٹنے سینے سے جڑ جائیں اور سر گھٹنوں کے اندر پھنسا ہوا ہو۔ یہ بھی کوئی بیٹھنا ہوا؟

بہرحال تعلیم نے کچھ شعور دیا تو سمجھ میں آنے لگا کہ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے، جس کے سامنے چھوٹے لوگ ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑے ہوں۔ جیسے داستانوں میں بادشاہ سلامت کے آگے درباری۔ ذرا اور بڑے ہوئے تو اِس بادشاہ کی تعریف پر نہ جانے کون کون پورا اترنے لگا۔ ہم ماسٹر صاحب کے آگے سر جھکائے، ماسٹر صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب کے آگے اور ہیڈ ماسٹر صاحب تقریبات کے مہمانانِ خصوصی کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوتے۔ ایک عجب دستور تھا۔

ڈاکٹر بننے کا شوق تو تھا لیکن اس وقت ہمارے لیے ''ایم بی بی ایس'' کا مطلب ''میاں بیوی بچوں سمیت'' تھا۔ یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس عشق کے لیے آگ کے سات سمندر ڈوب کے پار کرنے ہوں گے۔ یہ سات سمندر پار کرنے والی مشقت نصیب میں لکھی تھی تو عبور کرنی ہی پڑی اور ہم ایم بی بی ایس ہو کر ''بندہ ذات'' سے خارج ہو گئے، جب کہا گیا کہ ''بندے ہو یا ڈاکٹر؟''

ڈاکٹر تو بن گئے لیکن ''بڑا آدمی'' اب بھی سمجھ سے دور تھا۔ بیمار، سسکتے انسان میرے سامنے آتے، ان کی

بیماریوں کا علاج تو ہو جاتا لیکن سسکیوں اور آہوں کا مداوا میرے بس میں کہاں تھا۔ ان سسکیوں اور آہوں کی داستان سنتا تو دل دکھ سے لبریز ہو جاتا کہ ہر سسکنے والے کا تعلق کسی نہ کسی بڑے آدمی سے ضرور ہوتا تھا۔ لیکن کسی بڑے کو کسی چھوٹے کی ایسی خرافات سے دلچسپی کیوں ہونے لگی۔ مرتے انسان کو بچانے کی جدوجہد اور دکھ درد بانٹ لینے کے عوض کبھی کبھی مجھے بھی بڑا آدمی کہا جاتا لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھ سے کئی گنا بڑے لوگ ہر جگہ موجود ہیں، جن تک میری رسائی ہی ممکن نہیں، پھر میں کہاں بڑا ہوا؟

اب اگر میں ایک چھوٹے آدمی کی بات کروں، جو بذاتِ خود چھوٹا آدمی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا ہے۔ نام ہے 'شبّن میاں' لیکن اس کی کہی ہوئی باتیں بسا اوقات مجھے کسی 'بڑے' کی کہی ہوئی باتیں لگتی ہیں۔ وہ میرے پاس آیا تو اپنی بیماری کے علاج کے لیے تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے ساتھ کسی بزرگ جیسی محبت سے پیش آنے لگا ہے۔ عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ شخص، جسے اس کی اولاد نے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا اور وہ مجھے اپنی اولاد جیسا ماننے لگا ہے۔ ایک دن میں اسی سے پوچھ بیٹھا، ''بڑا آدمی کون ہوتا ہے؟'' بولا، ''ایک ہوتا ہے عمر کا بڑا، ایک بات کا بڑا، ایک جسامت کا بڑا، ایک قامت کا بڑا، ایک عہدے کا بڑا، ایک عزت کا بڑا اور.... ایک مقام کا بڑا۔ بولو! کون سا چاہیے؟'' میں نے کہا، ''باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن یہ عزت اور مقام کو الگ کیوں کیا ہے؟'' تو بولا، ''عزت کا بڑا وہ ہے، جس کی دنیا دل سے عزت کرے اور مقام کا بڑا وہ ہے، جس کی بڑائی اور عزت اس کے مقام کی وجہ سے ہو۔'' اس کی بات تو تمام ہوئی لیکن میں سوچ میں پڑ گیا کہ ہمارا مقام کیا ہے؟ عوام کا مقام کیا ہے اور لیڈروں کا مقام کیا....!

☆.....☆.....☆

غرض....بے غرض

وہ نہایت خوف ناک حادثہ تھا۔ موٹر سائیکل ٹرک کے نیچے آ کر 'پلیٹ' سی بن گئی تھی۔ سوار کی خوش نصیبی کہ وہ جھٹکا لگتے ہی اُچھل کر دُور جا گرا تھا۔ بے شک اسے اچھی خاصی چوٹیں لگی تھیں اور وہ بے ہوش بھی ہو گیا تھا لیکن ریسکیو والوں کو بروقت فون کر دیا گیا تھا اور ان کی مہیا کردہ ابتدائی طبی امداد سے فوری خطرہ بھی ٹل گیا تھا۔ فون رمضان نے کیا تھا کہ زخمی کی جان بچ جائے ورنہ کون سا اس سوار نے اسے اجرت دینی تھی۔ اس کی بے غرض امداد نے ایک جان بچا لی۔

وزیر کی آمد پر تمام راستے بلاک تھے، دیر تو ہونی ہی تھی۔ وہ ابتدائی طبی امداد کی بدولت ہی اتنا وقت نکال سکا تھا۔ ڈاکٹرز کہہ رہے تھے۔ والد اور بھائی آپریشن کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ خون کا بندوبست کیا، بازار سے کچھ ضروری اشیاء لائے، نرسوں اور ڈاکٹروں کے اشاروں کی پیروی کی اور پھر آپریشن تھیٹر میں رشید کی منتقلی۔ اب وہ بارگاہِ خداوندی میں رشید کے لیے دعا گو تھے۔ بیوی رضیہ اور ماں نوافل پڑھ پڑھ کے رشید کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ خدا کے نام لیوا عبادت کر رہے تھے۔

حادثہ....ابتدائی طبی امداد اور پھر راستوں کی رکاوٹیں، وہ زندگی کے پندرہ میں سے نو اسکور کے ساتھ آپریشن تھیٹر میں آیا تھا۔ آپریشن ایسے ہوا کہ دل کی دھڑکن مدہم، فشارِ خون بہت کم اور حواس نابود تھے، حالاں کہ اس حالت میں 'بے ہوشی' ممکن نہیں تھی۔ کڑا امتحان تھا، بے ہوشی والے ڈاکٹر اور سرجن کا۔ سر سے خون جاری تھا جسے روکا نہ جاتا تو موت یقینی تھی لیکن آپریشن کام یاب ہوا اور مریض زندگی کے پندرہ میں سے بارہ اسکور کے ساتھ وارڈ میں منتقل ہو گیا۔ سب خوش تھے کہ صرف چار گھنٹوں بعد وہ ہوش میں تھا۔

رشید کی بلائیں لی جا رہی تھیں۔ حادثہ کیا تھا، وہ موت کے منہ سے واپس آیا تھا۔ سر کی اندرونی چوٹ، پھر

آپریشن، لیکن اب سب ٹھیک تھا۔ ماں، باپ، بھائی اور بیوی، سب نے گھیرا ہوا تھا۔ خوب محبت لٹائی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے چھٹی دی اور وہ گھر آ گئے۔ بھائی اپنے گھر چلا گیا، ماں اپنے گھر اور باپ اپنے کام پر۔ بیوی بھی شوہر کی تیمارداری کے لیے آئے ہوئے اپنے والدین کی خدمت میں لگ گئی تھی۔

رمضان نے فون کرنے سے پہلے حادثے کی باتصویر رپورٹ بھیج کر اپنی روزی کھری کر لی۔ رشید کے گھر والے رشید کی زندگی کے لیے اپنے خالق کے قریب کیا ہوئے، پروردگار نے ان کی سن لی۔ بروقت آپریشن کے بعد ڈاکٹر حضرات بھی ٹھیک وقت پر اپنے گھر روانہ ہوئے۔ اللہ نے کرم کیا۔ رشید کی صحت یابی کے بعد زندگی پھر اپنی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی۔ غرض دیوانی ہے لیکن ساتھ ہی کسی کا بھلا ہو جائے تو کیا برا ہے؟

☆.....☆.....☆

قوانینِ اصلاح

آج بچے بہت خوش تھے۔ اسکول کی اکٹھی پانچ کلاسیں ختم ہوگئی تھیں۔ مطلب یہ کہ پہلے گھنٹے کی پڑھائی کے بعد کوئی پڑھائی نہیں ہونی تھی۔ ٹریفک پولیس والے اسکول آئے تھے اور کلاسیں ختم کرا کر بچوں کو ساتھ لے جا رہے تھے۔ کوئی ریلی یا جلوس نکالنا تھا۔ پھر آٹھویں جماعت کے لڑکے آگے آگے کھڑے کر کے ان کے ہاتھوں میں دو بینر دے دیے گئے۔ ایک پر لکھا تھا، 'ہیلمٹ کا استعمال آپ کی زندگی کا ضامن ہے'؛ جب کہ دوسرے کے الفاظ تھے، 'اپنے کم عمر بچوں کو موٹر سائیکل نہ چلانے دیں'۔ اور ان دو بینروں والے گیارہ بچوں کی رہبری میں تمام بچے سڑکیں ناپنے لگے۔ شہر کے مرکزی چوک سے مرکزی بازار اور پھر گاڑیوں کے بے ہنگم ہجوم سے بھری بڑی سڑک تک، ہوتے ہوئے واپس مرکزی چوک کا سفر۔ بچوں کی معیت میں ٹریفک پولیس نے سب کو ٹریفک کے بارے میں 'اقوالِ زرّیں' پڑھائے۔ اس کے بعد مرکزی چوک ہی پر بچوں کو دو گھنٹے بٹھا دیا گیا۔ بڑی بڑی شخصیات نے ٹریفک قوانین کی نہ صرف وضاحت کی بلکہ عمل پر بھاشن بھی دیا۔

اس پورے پروگرام میں صرف ایک بات قابلِ غور تھی۔ کم عمر بچوں کو موٹر سائیکل نہ چلانے کا حکم دینے والا بینر، جن چھے بچوں نے پکڑا ہوا تھا، وہ سارے آٹھویں جماعت کے تھے اور اب پریشان ہو رہے تھے۔ کہاں اسکول میں ڈیڑھ بجے چھٹی ہو جاتی تھی اور کہاں اب تین بجنے والے تھے۔ وہ دو باتوں سے پریشان تھے۔ ایک تو گھر میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ اسکول سے باہر ہیں اور اتنی دیر ہو جانے کا سبب اسکول والوں کے علم میں ہے۔ دوسری بات، پانچ بچوں کی موٹر سائیکلیں اسکول کے پارکنگ اسٹینڈ میں تھیں، جو ڈھائی بجے بند ہو جایا کرتا تھا۔ انہیں واپسی کی فکر ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے 'ٹریفک آگاہی' مہم اختتام پزیر ہوئی اور سب بچے اسکول کو بھاگے۔ پانچوں بچوں نے پارکنگ سے موٹر سائیکلیں نکالیں اور سڑک پر ہوا ہو گئے۔ اگلے تیس منٹ میں ان پانچ میں سے دو بچے ٹریفک حادثے کا شکار

ہو کر ہسپتال کے شعبۂ حادثات میں داخل ہو رہے تھے۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ کم عمر کے بچے بِنا ہیلمٹ موٹر سائیکل چلا رہے ہیں بلکہ سب یہ دیکھ رہے تھے کہ اتنے چھوٹے چھوٹے بچے حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ کہاں گئی آگاہی مہم اور کس نے وہ اقوال زرّیں یاد رکھے؟

ہم اپنے کم عمر بچوں کو یہی سکھا رہے ہیں کہ قانون توڑنا کیسے ہے۔ حالاں کہ یہ وہ عمر ہے، جس میں سیکھے ہوئے طور طریقے انسان کی عادات بنتے ہیں۔ ایک بچہ، جسے بتایا جائے گا کہ غلط سمت میں موٹر سائیکل چلا کر وہ اپنی منزل پر 'جلدی' پہنچ سکتا ہے تو وہی بچہ بڑا ہو کر کیا اپنی گاڑی غلط لین میں چلاتے ہوئے 'جلدی' کی کوشش نہیں کرے گا؟ کسی نے اگر کہہ دیا کہ قانون بنتے ہی اس لیے ہیں کہ انہیں توڑا جائے۔ تو اس مہمل سی بات کو حقیقت سمجھ کر سبھی اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ہر ذی شعور جانتا ہے کہ الٹے قدموں چلنے سے نہ صرف منزل پیچھے چلی جاتی ہے بلکہ راستے کا تعین بھی ممکن نہیں رہتا۔ قوانین، انسان کی سہولت اور آسانی کے لیے بنائے جاتے ہیں نا کہ تکالیف و مشکلات کے لیے۔ لیکن حضرتِ انسان ان سے روگردانی کر کے اپنے لیے مصائب خریدتا ہے اور یہی بات ہم سمجھنا نہیں چاہتے۔

بات ٹریفک قوانین کی ہو رہی ہے تو اس پر ہی توجہ کرانا چاہوں گا۔ ایک چھوٹی سی بات یعنی سگنل کی خلاف ورزی نہ کرنا وہ سبق ہے، جس سے حادثات میں بہت زیادہ کمی واقع ہو جاتی ہے اور صرف ہیلمٹ پہن لینے ہی سے کسی حادثے کی صورت میں جان کا خطرہ اسّی (80) فی صد کم ہو جاتا ہے۔ لیکن کون مانتا ہے؟ ڈرائیونگ لائسنس بننے تو لگے ہیں، ٹیسٹ بھی ہوتے ہیں لیکن ہمارے نوے (90) فی صد لائسنس رکھنے والے حضرات کو لائن اور لین کا فرق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ جیسے ہی سگنل سبز ہوتا ہے، تمام افراد لین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی خطرے سے دوچار کر دیتے ہیں۔ کسی طرف مڑنا ہو تو اشارہ تک نہیں دیتے اور نہ ہی لین و لائن کا حساب رکھتے ہیں۔ سیکھنا، عمر کا محتاج نہیں ہے۔ اگر آج ہی سب لوگ یہ تمام باتیں جان لیں تو سڑکیں محفوظ اور ہسپتال ویران ہو جائیں۔ دیکھتے ہیں کون قانون کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی اور اپنے پیاروں کی زندگیاں محفوظ کرتا ہے اور کب ٹریفک آگاہی مہم کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

تبدیلی کیسے لائی جائے؟

تبدیلی کا مطلب کیا؟ سوال ہوتا ہے کہ ملک میں تبدیلی کیسے لائی جائے؟ اس کا جواب آج کل تو صرف 'ووٹ' ہی بنا ہوا ہے لیکن میرا نہیں خیال کہ ووٹ ملک میں تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔ ووٹ سے حکومت کی تبدیلی ممکن ہے، ملک کی نہیں۔ سیاست پر گفتگو سے مکمل احتراز کرتے ہوئے میں صرف اتنا کہوں گا کہ 1947 کے پاکستان اور آج کے پاکستان میں بہت تبدیلی آ چکی ہے اور اس تبدیلی کا ذمے دار صرف سیاست کو ٹھہرانا کسی طور جائز نہیں۔ بہت سی چیزیں ہیں جو تبدیلی کا باعث بنتی ہیں اور یہ تبدیلی مثبت بھی ہوتی ہے اور منفی بھی۔ پہلے وقت کے لوگ سادہ اور مخلص تھے، ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ ایک احترام تھا، مروت تھی اور محبت تھی جب کہ آج ان چیزوں کا وجود ہی ناپید ہے۔ ہماری تربیت ہی سے ان کا فقدان ہے۔ محبت، خلوص اور احساس، وہ اجناس ہیں کہ سونے کے بھاؤ میں بھی نہیں ملتیں کیوں کہ آج کوئی بھی اپنے بچوں کو محبت، خلوص، احترام یا احساس کی تربیت ہی نہیں دیتا۔ بچے بچپن ہی سے منافقت کا سبق، طاقت کا استعمال اور درد دینا سیکھتے ہیں۔ من حیث القوم ہم منفی رویے کے حامل ہو چکے ہیں۔ نہ صرف ہمارے اعمال بلکہ ہماری سوچ تک منفی ہو چکی ہے۔ ہم کسی بھی تحریک، تحریر، تقریر یا مہم میں پہلے منفی پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ جب تک ہم منفی بحث اور پروپیگنڈے سے سیر نہیں ہوتے، ہمیں کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔

کسی نے اپنا کاروبار شروع کیا، کسی کی شادی ہو گئی، کسی نے کوئی ڈگری لی، حکومت یا حزب اختلاف نے کوئی منصوبہ پیش کیا۔ ہمارا کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود ہم پہلے اس میں کیڑے نکالتے ہیں، اس کے ہر ہر پہلو کے منفی اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ جب خوب تھک جاتے ہیں تب اس موضوع کی جان چھوٹتی ہے۔ میرے ایک بزرگ دوست ہیں شبّن میاں۔ وہ کہا کرتے ہیں، ''یہ جو کہا جاتا ہے ناں کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک طرف تصویر ہوتی ہے اور دوسری طرف سفید کاغذ۔ لیکن جو معاملات ہیں، ان میں ایک طرف معاملات ہوتے

ہیں تو دوسری طرف سیاہ کاغذ۔ ہم لوگوں کو سیاہی پہلے نظر آتی ہے اور سیاہی دیکھنے کے بعد ہم روشن رخ دیکھتے ہی نہیں۔'' اب اگر اس سوال کا جواب میں دینا چاہوں تو مجھے شبّن میاں کی بات کی روشنی میں ایک چیز، جو تبدیلی کی متقاضی نظر آتی ہے، وہ ہے ہمارا نقطۂ نظر یا دوسرے الفاظ میں ہماری سوچ۔ ہم اگر اپنی سوچ کو مثبت رہ گزر کا راہی بنائیں تو اس کے مابعد اثرات بہت دُور تک جاتے ہیں۔ لیکن ایسا ممکن کیسے ہو؟

ایک جاہل انسان کبھی مثبت نہیں سوچ سکتا۔ علم وہ روشنی ہے جو اندھیروں اور تاریکیوں کو تاراج کرتی ہے۔ سوچ کو روشنی کا حامل بنانے کا ایک ذریعہ! لیکن اس سے پہلے بھی کچھ ہے جس کا ہماری زندگی پر اثر ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ.... یہاں عقیدے سے مراد خدا اور رسول والا عقیدہ نہیں بلکہ وہ عقیدہ ہے، جو ہم اپنے لیے بنا لیتے ہیں، جس کی روشنی میں ہمارے روزمرہ کا رویہ نمو پاتا ہے اور شخصیت کا ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ اس میں ہمارا اٹھنا بیٹھنا، بولنا ہنسنا، کھانا پینا، دوسروں کے ساتھ رویہ اور نہ جانے کتنے اجزا ہیں جو ایسے تکمیل پاتے ہیں کہ ہمیں بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس 'بن چکی' شخصیت کو بلاشبہ یک لخت تبدیل نہیں کیا جا سکتا، صرف شخصیت کے چند ہی پہلو ایسے ہیں جنہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ان میں سب سے بڑا، جس سے ہم مکمل طور پر بدل سکتے ہیں، وہ ہے اخلاق کا۔ شبّن میاں کہتے ہیں کہ آدمی جاہل ہو، چل جاتا ہے، گنوار ہو یا کم عقل ہو، چل جاتا ہے لیکن اگر بدتمیز ہو تو دنیا برا کہا کرتی ہے۔ اگر صرف میٹھا بول پیدا کر لیں تو کیا جھگڑا شروع ہو سکتا ہے؟

دوسری چیز، جس کا انفرادی اثر، انفرادی نہیں رہتا، وہ ہے احساس.... ایک دوسرے کا احساس۔ 'تم اُس وقت تک مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔'' اس حدیث کے مطابق جب مزاج بن جائے تو انسان دوسروں کے متعلق برا نہیں سوچ سکتا۔ دوسرے الفاظ میں، جو چیز آپ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اگر وہ اپنے حوالے سے سوچیں تو احساس پیدا ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یعنی کوئی ایک عمل جو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے سامنے یا آپ کے لیے نہ کیا جائے کیوں کہ وہ آپ کو پسند نہیں، تو یہی سوچیں کہ وہ عمل دوسروں کو کیسے پسند آ سکتا ہے؟ ایک چھوٹی سی مثال سے وضاحت کرتا چلوں۔ اگر ہمسائے کی موٹر سائیکل گلی کو بند کرتی ہے تو کیا آپ کی گاڑی گلی کو بند نہیں کرتی ہوگی؟

تیسری چیز، جو تبدیلی لا سکتی ہے، وہ ہے محبت۔ آپ کو اپنے آپ سے اور اپنے گھر والوں سے محبت ہونی چاہیے۔ آپ کی ساری محنت اور کمائی کا محور آپ کی اپنی ذات ہوتی ہے یا آپ کے گھر والے۔ جو مقاصد آپ ان کے لیے سوچتے ہیں، ایڑی چوٹی کا زور بھی لگاتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے سوچ وسعت اختیار کرتی ہے اگر پہلی دو چیزیں بھی شامل حال ہوں تو دو اور چیزیں، جو بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، وہ ہیں برداشت اور درگزر۔ برداشت نہیں تو اخلاق جیسے زیور سے بے بہرہ ہی رہیں گے اور اگر دوسروں کی غلطیاں معاف نہیں کر سکتے تو احساس اور محبت، دونوں

بے فائدہ چیزیں ہیں۔ان چار چیزوں سے ہمارے کردار کے مثبت ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ جاتی اور پھر سوچ کے مثبت ہونے میں دیر ہی نہیں لگے گی۔

اگر ہم اپنے کردار اور اپنی سوچ میں مخلص ہو گئے تو ملک میں مثبت تبدیلی لانا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگا۔ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اپنی نسلوں کو کیا دے کر جائیں گے۔اس ملک کو مخلص لوگوں ہی کی ضرورت ہے نا کہ مفاد پرستوں کی؟ آئیں....اس ملک کو خلوص کے نذرانے دے کر اپنے مثبت کردار سے سیراب کریں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

اسری نوشین ملک

اسریٰ نوشین ملک کا تعلق پنجاب کے شہر خوشاب سے ہے۔ تعلیم ایم اے اردو ہے۔ بچپن سے ہی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ کئی اخبارات میں اور رسائل میں کہانیاں اور آرٹیکلز شائع ہو چکے ہیں۔ رائٹرز کلب سے بطور رکن ایک سال سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- میں پاکستان ہوں

2- ٹیلی وژن کی تباہ کاریاں

3- ایٹمی قوت.... پاکستان کی نئی شناخت

4- پہلا قدم

5- اڑان

☆.....☆.....☆

میں پاکستان ہوں

میں پاکستان ہوں۔ میں زمین کا محض ایک ٹکڑا نہیں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کی دعاؤں اور قربانیوں کا ثمر ہوں۔ میں علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر اور قائداعظم محمد علی جناح کی اَن تھک محنت اور کوششوں کا صلہ ہوں۔ میرا نام چوہدری رحمت علی نے تجویز کیا۔ میں 14 اگست 1947 مطابق 27 رمضان المبارک کو دنیا کے نقشے پر اُبھرا۔ مجھے اسلام کے نام پر قائم کیا گیا۔ جب میں معرضِ وجود میں آیا تو نوزائیدہ بچے کی طرح بہت ناتواں اور کم زور تھا۔ مجھ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی سکت نہیں تھی۔ غربت اور کسمپرسی نے میرے چاروں اطراف ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میرے قائم ہونے پر مسلمانوں نے بہت خوشیاں منائیں لیکن بڑی قربانیاں بھی دیں۔ کئی سہاگ اُجڑے، کئی بچے یتیم اور در بہ در ہوئے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے لٹے پٹے خاندانوں کو دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا رہا۔ میرے قیام کے بعد میرے وجود کو ختم کرنے کی کئی بار کوششیں کی گئیں، مجھے توڑنے کے لیے سازشیں کی گئیں۔

میری شہ رگ، میرے خطۂ کشمیر پر قبضہ کر لیا گیا اور مجھے اس سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن میں آج بھی پُر امید ہوں کہ میرے خطۂ کشمیر سے بھارتی تسلط ختم ہو جائے گا۔ میں پیدائش کے ایک سال بعد ہی یتیم ہو گیا، میرے بانی قائداعظم محمد علی جناح مجھے چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے جانے کے بعد ان جیسا کوئی مخلص نہ ملا۔ مفاد پرستوں نے مجھے جی بھر کے لوٹا اور میرے خلاف سازشیں کیں۔ 1962 اور 1965 میں میرے حریفوں نے مجھ پر حملہ کیا لیکن میری فوج نے انہیں منہ توڑ جواب دے کر مجھے بچا لیا۔ تب مجھے حوصلہ ملا اور کامل یقین ہو گیا کہ میرے چاہنے والے، مجھ پر جان قربان کرنے والے میرے محافظ، مجھے دشمن کی میلی نگاہوں سے بچائے رکھیں گے۔

آہستہ آہستہ میں نے ترقی کی راہ پر قدم رکھ دیے اور مستحکم ہونے لگا، لیکن اندونی اور بیرونی سازشوں کے سبب 1971 میں میرے ایک حصے کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا گیا۔ میں بہت تڑپا، لیکن کسی نے میری نہ سنی۔ اس

جنگ میں مجھے جا بجا زخم آئے، جو آج بھی تازہ ہیں، جن سے آج بھی خون رستا ہے۔ مجھ پر کبھی آمریت کا تسلط رہا تو کبھی جمہوری نظام کے ذریعے حکم رانی کی گئی۔ دونوں صورتوں میں مجھے استحکام نصیب نہ ہوا۔ مفاد پرست حکم ران ذاتی مفاد کے لیے مجھے لوٹ کھسوٹ کر، نوچ کر، لہولہان چھوڑ جاتے۔ پھر اگلا حکم ران مجھے روشنی کے خواب دکھا کر مزید اندھیروں میں چھوڑ جاتا۔ مجھ پر کئی بار اندرونی حملے بھی کیے گئے۔

میرے اپنوں نے میرے چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی اور عالمی دنیا میں میرا تمسخر اُڑایا گیا لیکن میں پھر بھی خاموش رہا۔ خود پر ہوتے وار سہتا رہا۔ ماؤں کو اپنے جگر گوشوں کی لاشوں سے لپٹ کر روتا سسکتا دیکھ کر میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ اسلحے بارود کی بدبو سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ آج میں اکہتر سال کا ہو چکا ہوں لیکن ابھی تک اپنے پاؤں پہ مکمل کھڑا نہیں ہو سکا۔

بے شمار قدرتی وسائل ہونے کے باوجود مجھ پہ قرضوں کا بوجھ لاد دیا گیا جس سے میرے کندھے مزید جھک گئے۔ میں خوب صورت پہاڑوں اور دریاؤں کی سرزمین ہوں۔ میرے پاس بے شمار نعمتیں ہیں۔ بہادر اور جری سپوت ہیں۔ میرے پاس دنیا کی نمبر ایک فوج ہے۔ میں دفاع، تعلیم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ پھر بھی میرے عوام غربت کا شکار ہیں۔

میری اپنے باسیوں سے گزارش ہے کہ میری رگوں سے خون نچوڑنے والوں کا ساتھ نہ دیں۔ ہر فرد پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پوری لگن اور دیانت داری سے کام کرے۔ اور کبھی مجھ پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح نہ دے کیوں کہ میری عزت و وقار اُسی کے دم سے ہے اور اس کی پہچان مجھ سے ہے۔ میرا روشن مستقبل، اس کا روشن مستقبل ہے۔ میری تمام پاکستانیوں سے گزارش ہے کہ خدارا! اپنی شناخت برقرار رکھیں۔ مجھے ایسی ریاست بنائیں جہاں امن کا بول بالا ہو، لڑکیوں اور خواتین کی عزتیں محفوظ ہوں، جہاں خوش حالی کا راج ہو۔ مجھے ویسا پاکستان بنائیں جیسا قائداعظم چاہتے تھے۔

☆.....☆.....☆

ٹیلی وژن کی تباہ کاریاں

موجودہ دور میں شاید ہی کوئی گھر ٹیلی وژن سے خالی ہو۔ ٹی وی (ٹیلی وژن) جیسی سائنسی ایجادات کے فوائد تو کم ہی نظر آتے ہیں مگر ان کے نقصانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ڈش، کیبل اور انٹرنیٹ.... یہ وہ آلات ہیں جن کے ذریعے فحش فلمیں، غیر اخلاقی گانے اور عریاں تصاویر، مسلم معاشرے میں دکھائی جاتی ہیں۔ اس قسم کی تمام ایجادات کو مسلم معاشرے میں جنسی بے راہ روی اور شہوانی خواہشات پھیلانے کا بہترین ذریعہ سمجھ سکتے ہیں۔

ٹی وی کے ذریعے پھیلنے والی تباہ کاریاں اور خرابیاں کسی بھی ذی شعور سے مخفی نہیں۔ تاہم، اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جس گھر میں بھی ٹی وی، کیبل جیسی لعنت داخل ہوئی ہے، اس گھر کے افراد کے اعتقادی، ایمانی اور اخلاقی اقدار ضرور تباہی و بربادی کا شکار ہوئے ہیں۔ بچیوں کے لباس اور لباس پہننے کا ڈھنگ بدل گیا۔ اولاد کا والدین کے سامنے اور بہن کا بھائی کے سامنے حجاب بدل گیا۔

مسلمان تو پہلے ہی اپنی اعتقادی اور ایمانی کم زوری اور قرآن وسنّت کی صحیح تعلیمات کو پس پشت ڈالنے کے سبب دنیا میں اپنی اقدار کھو چکے ہیں۔ رہی سہی جو قدریں ان کے پاس ہیں، وہ ٹی وی، ڈش، کیبل اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال سے ختم ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے الفاظ و اصطلاحات کی تشریحات باطل کی سوچ و فکر کے مطابق ہو رہی ہیں، جو سیدھی ہماری نئی نسل پر حملہ آور ہو رہی ہیں۔ نہ صرف نئی نسل بلکہ ہماری موجودہ نسل کا 90 فی صد طبقہ اس کا شکار ہو چکا ہے۔ ہم نہ تو قرآن وسنّت کے ماحول میں پلے بڑھے، نہ ہی ہماری نئی نسل قرآن وسنّت کی پاکیزہ تعلیمات کے درمیان پنپ رہی ہے۔ غیر مسلموں کے رواج، ان کے رہن سہن، عبادات اور ان کی عادات و اطوار دیکھ کر پل بڑھ رہی ہے جو یقیناً امتِ مسلمہ کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ٹی وی کے ذریعے ہمارے معاشرے میں پھیلنے والے چند نقصانات مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔

عبادات کا زیاں:

ٹی وی پروگرامز کی وجہ سے مسلمان اپنی عبادات ٹھیک طریقے سے، خشوع وخضوع کے ساتھ ادا نہیں کر پاتے ہیں اور بعض اوقات تو پسندیدہ ڈراموں، ٹاک شوز، انٹرٹینمنٹ اور پسندیدہ فلموں کی وجہ سے نمازیں تک قضا ہو جاتی ہیں۔ مساجد میں باجماعت نمازوں کی ادائیگی متاثر ہوتی ہے اور وہ مرد وزن، جو دن رات ٹی وی اسکرین کے سامنے قسط وار ڈرامے، کرکٹ میچ یا دوسرے پروگرام دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، آہستہ آہستہ ان کا دل عبادات سے ہٹ جاتا ہے کیوں کہ ان کا دل ٹی وی کے ساتھ چسپاں ہو جاتا ہے۔

عقائد میں خرابی:

ٹی وی پر غیر مسلموں کی تہذیب، ان کے رسم ورواج اور کفریہ ثقافت پر مبنی فلمیں اور ڈرامے دکھائے جاتے ہیں، جن کے ذریعے مسلمانوں کے اعتقاد میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور انسانی ذہنوں سے ایک واحد اللہ کا تصور ہٹ کر کئی دیوی، دیوتاؤں کا تصور رچ بس جاتا ہے، جس سے موں کی فکر اور سوچ غلبیت سے ہٹ کر مغلوبیت کی طرف آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان قوم ہندوستان سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود ہندو کلچر میں رچی بسی ہوئی ہے۔ آج بچوں کے معصوم ذہنوں میں اسلامی ثقافت اور عبادات اتنی پختہ نہیں ہیں جتنا ہندووانی رسم ورواج اور عیسائی نظریات پختگی اختیار کر چکے ہیں۔ مسلمانوں نے آج خود قرآن وسنّت کی تعلیمات کو پیچھے چھوڑ کر اپنی نسل کو ڈش، ٹی وی اور کیبل جیسی لعنت کی گود میں بٹھا دیا ہے۔

عریانی اور فحاشی:

جب ٹی وی اسکرین پر عریاں عورتوں کو مردوں کے لیے اور خوب صورت نوجوان مردوں کو عورتوں کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو شہوانی خواہشات کا اُبھرنا ایک لازمی امر ہے۔ عورتوں کو مختصر لباس زیب تن کرا کے معاشرے میں جنسی خواہشات کو اُبھارا جاتا ہے جس کی وجہ سے اخلاقیات تباہ وبرباد ہو جاتی ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ نے مرد وزن کے لیے ستر وحجاب کے احکامات مفصل بیان کیے ہیں اور ٹی وی پر ستر وحجاب کی وہ وہ دھجیاں بکھیری جاتی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ ٹی وی، ڈش اور کیبل پر اداکاراؤں کو دیکھ کر ہزاروں گھروں کی پاک دامن عورتیں بھی کئی ایسے امور کا ارتکاب کر بیٹھتی ہیں جو شرعاً حرام ہوتے ہیں۔ مثلاً چہرے کے بال اکھیڑنا، بھنویں باریک کرنا، میک اپ کر کے کھُلے منہ بازاروں میں نکلنا، دوپٹا سر پر اوڑھنے کے بجائے صرف گلے میں ڈالنے کو کافی سمجھنا، باریک لباس پہننا، ناخن بڑھانا، غیر محرم مردوں سے خلوتیں اختیار کرنا، گھروں سے فرار اختیار کرنا اور غیر محرم مردوں کو دیکھ کر ان کی خوب صورتی کا اندازہ لگانا۔

ٹی وی ڈراموں کے ذریعے مرد وزن کو باہمی تعلقات ورابطہ قائم کرنے، ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرنے

اور نامحرم مرد وعورت کے درمیان دوستی کے رشتے قائم کرنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔غرض کہ آج ہمارے معاشرے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان عشق وعاشقی کے جو معاملات ہیں، وہ اسی ٹی وی، ڈش اور کیبل پر دکھائے جانے والے رومانوی ڈراموں، فحش فلموں اور گانوں ہی کی مرہونِ منّت ہیں، جن سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

غیرت کا خاتمہ:

ٹی وی جس قدر فحاشی و بے حیائی پھیلا رہا ہے وہ کسی ذی شعور سے مخفی نہیں۔اس کے فحش پروگرام لوگوں کو بے حیا و بے غیرت بننے کا درس دیتے ہیں۔جب انسان میں سے حیا ختم ہو جاتی ہے تو اس کا ایمان بھی برباد ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مرد، جو بظاہر شریف نظر آتے ہیں، ان کے باطن میں غلاظت اور گندگی بھرتی جاتی ہے۔ ہیجان انگیز مناظر اچھے برے کی تمیز بھلا دیتے ہیں۔

فحاشی سے بھرپور انگریزی اور اردو فلمیں، جن میں کھلم کھلا جنسی معاملات، نوجوانوں کے عشق وعاشقی کے قصّے، پیار ومحبت کے مکالمے، عورتوں کے شرم وزینت کے خدوخال نمایاں کر کے، جو مناظر دکھلائے جاتے ہیں، وہ بیان کرنے کے قابل نہیں۔گندی اور عریاں فلموں اور ڈراموں کے ذریعے زنا اور بے حیائی کو فروغ دیا جاتا ہے جس کی پاداش میں غیرتوں کے جنازے اٹھ جاتے ہیں اور ماں، بیوی، بہن، بھائی اور باپ جیسے مقدس رشتوں میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔

وقت کا زیاں:

دنیا کی چندروزہ زندگی انسان کے لیے امتحان گاہ ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ انسان سے سوال کرے گا کہ میں نے تجھے جو عمر دی تھی، تو نے کہاں گزاری؟ اگر اس دنیا کی زندگی کو اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گزارا ہوگا تو کامیاب ہوگا ورنہ خائب وخاسر ونامراد ہوگا۔

ان تمام وجوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں ٹی وی کا استعمال محدود سے محدود تر کر دینا چاہیے۔گھر میں پاکیزہ ماحول فراہم کرنا ہماری ہی ذمے داری ہے۔ہم گھر کو جس قدر اچھا اور پاکیزہ ماحول مہیا کریں گے، ہمارے بچوں میں اچھائی کی شرح بھی اسی قدر بڑھے گی۔ہمیں نہ صرف ٹی وی بلکہ گندے رسائل، فحش لٹریچر اور جنسی خواہشات پر مبنی کتب ودیگر مواد سے بھی بچنے کی سخت ضرورت ہے۔

☆.....☆.....☆

ایٹمی قوت.... پاکستان کی نئی شناخت

14 اگست 1947 کے یوم آزادی کے بعد 28 مئی اور سہ پہر 3.30 منٹ کا وقت، پاکستان کی تاریخ کا وہ لمحہ ہے، جس کے احساس تفاخر نے پوری قوم اور عالم اسلام کے مسلمانوں کا سر فخر اور خوشی سے بلند کر دیا۔ 28 مئی، یوم تکبیر، پاکستان کی تاریخ کا وہ دن ہے، جس دن پاکستان نے بلوچستان کے مقام چاغی کے پہاڑی سلسلے راس کوہ میں زیر زمین چھے ایٹمی دھماکے کر کے عالم اسلام کی پہلی اور دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور 11 مئی 1998 کو پوکھران میں 3 اور 13 مئی کو ہونے والے دو ایٹمی دھماکوں کے بھارتی ایٹمی ایڈونچر کا دندان شکن جواب دے کر بھارتی جوہری بالادستی کا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اس تاریخ ساز موقعے پر اس وقت کے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے قوم سے اپنے خطاب میں کہا: ''الحمدللہ! ہم نے گزشتہ دنوں کے بھارتی ایٹمی دھماکوں کا حساب چھے کام یاب ایٹمی دھماکوں سے چُکا دیا ہے۔ اب ہم پر کوئی دشمن شب خون مارنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔''

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں بعض لمحات اتنے منفرد، اہم اور تاریخی ہوتے ہیں کہ ان کی اہمیت اور حیثیت کا مقابلہ کئی صدیاں بھی مل کر نہیں کر سکتیں۔ یہ منفرد و قیمتی لمحات دراصل تاریخ کا وہ حساس موڑ ہوتے ہیں، جہاں کوئی قوم اپنے لیے عزت و وقار یا ذلت و رسوائی اور غلامی و محکومی میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرتی ہے۔ بزدل، ڈرپوک، ابن الوقت اور غلام ذہنیت کے لوگ ان تاریخ ساز لمحات کی قدر و قیمت نہیں جانتے اور نہ ہی ان کے دل و دماغ کسی چیلنج کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ایسی اقوام شاہ راہِ حیات پر دوسری اقوام سے پیچھے رہ جاتی ہیں، پھر ان اقوام کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب یہ قومیں ماضی کی گرد میں کھو کر قصۂ پارینہ بن کر تاریخ کی بوسیدہ کتابوں کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جرأت مند اور بہادر لوگ تاریخ کے ان نازک لمحات میں ہوش

مندی اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسے تاریخی فیصلے کرتے ہیں جو قومی تحفظ کے لیے لازم وملزوم ہوتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کا عزم تھا کہ ''ہم گھاس کھالیں گے، لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔'' یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی کا کارنامہ تھا کہ جہاں ایک طرف انہوں نے فرانسیسی حکومت کو جوہری ری پراسیسنگ پلانٹ کی تعمیر کی پرانی پیشکش کی تجدید پر آمادہ کیا، وہیں پاکستان کے جوہری پروگرام کو درست سمت میں گام زن کرنے کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو، جو اس وقت ہالینڈ میں مقیم تھے، پاکستان بلوا کر پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی ذمے داریاں سونپیں۔ ذوالفقار علی بھٹو جس تیزی سے پاکستان کا جوہری پروگرام بڑھا رہے تھے، وہ امریکا اور صہیونی لابی کے نزدیک کسی طور بھی قابل قبول اور قابل معافی جرم نہیں تھا، چناں چہ 1976 میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کیسنجر نے پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو دھمکی دی کہ ایٹمی ری پراسیسنگ اور ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے منصوبے پر کام بند کر دیا جائے، لیکن قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے کیسنجر کی اس دھمکی کے باوجود پاکستان کا ایٹمی پروگرام جاری رکھا کیوں کہ ان کے نزدیک ملک وقوم کی سلامتی اور بقا زیادہ اہمیت کی حامل تھی، جو پہلے ہی بھارتی ایٹمی پروگرام کی وجہ سے شدید خطرے میں تھی۔ دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو کے حکم پر عالمی شہرت یافتہ، مایہ ناز ایٹمی سائنس دان اور پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی کے بانی ومعمار ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انتہائی نامساعد حالات میں پاکستان کے جوہری پروگرام کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی نگرانی میں 1976 میں پاکستان کے سائنس دانوں نے کہوٹہ لیبارٹری میں یورینیم کی افزودگی کا کام شروع کیا اور 1982 تک پاکستانی سائنس دان 90 فی صد افزودگی کی صلاحیت حاصل کرنے میں کام یاب ہو چکے تھے۔ بالآخر وہ دن بھی آیا جب قومی وملّی جذبوں سے سرشار ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کی پوری ٹیم کی اَن تھک محنت نے 28 مئی 1998 کو بھارت کے پانچ ایٹمی دھماکوں کے جواب میں چھے کام یاب ایٹمی دھماکے کر کے نہ صرف وطن عزیز کو ناقابل تسخیر قلعہ بنا دیا بلکہ قوم و مسلح افواج کے مورال کو بھی آسمان کی بلندیوں پر لے گئے اور پوری قوم کے اعصاب سے بھارتی تسلط کا خوف ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کی ٹیم کے اس عظیم کارنامے کی بدولت 28 مئی 1998 کا دن پاکستان کی تاریخ میں یوم تکبیر کے نام سے منایا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایٹم بم پر کام کئی مراحل میں ہوا، اور اس کی تخلیق میں کئی ادوار گزرے اور کئی حکومتیں تبدیل ہوئیں، لیکن جب پاکستان کو اپنی ایٹمی صلاحیت کا اعلان کرنا تھا تو اس وقت نواز شریف برسرِ اقتدار تھے۔ کلنٹن انتظامیہ نے پاکستان کی حکومت پر بے پناہ دباؤ ڈالا کہ وہ ایٹمی تجربے سے باز رہے، لیکن نواز شریف نے پاکستان کی عزت اور وقار کا سودا نہیں کیا اور پاکستان کو بھارت کے دباؤ میں آنے سے بچا لیا۔ یقیناً جب بھی پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کا تذکرہ ہوگا، تب اس مشکل فیصلے کا بھی تذکرہ ہوگا، جس کی بدولت پاکستان کو ایک نئی شناخت ملی۔

☆.....☆.....☆

پہلا قدم

زندگی میں کامیابی کا بڑا فارمولا پہلا قدم ہے۔ ہر انسان زندگی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر کچھ لوگ اپنے فیصلوں، اپنے مقاصد پر قائم نہیں رہتے یا نتائج سے خوف زدہ ہو کر متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

بچہ جب چلنے کے قابل ہوتا ہے تو ننھے ننھے قدم اٹھاتا ہے۔ کئی بار ڈگمگاتا ہے، گرتا، سنبھلتا ہے مگر بالآخر اس کے قدم زمین پر مضبوطی سے جمنے لگتے ہیں۔ پھر وہ بغیر کسی سہارے کے چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسان جب بھی کوئی نیا کام شروع کرتا ہے تو ابتدا میں اسے کافی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ راہ میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں مگر وہ ثابت قدمی سے اپنے مقصد پہ ڈٹا رہے اور پُرعزم رہے تو ایک دن اپنا مقصد ضرور حاصل کر لیتا ہے۔ مگر کامیابی کی پہلی شرط ہے آغاز.... جب ہم مشکلات سے خوف زدہ ہو کر کام کی ابتدا ہی نہیں کریں گے تو اسے پایۂ تکمیل تک کیسے پہنچائیں گے؟ مسافر سفر میں درپیش رکاوٹوں سے گھبرا جائے تو منزل مقصود تک کیسے پہنچے گا؟

بظاہر ہمیں بہت سے کام مشکل یا ناممکن نظر آتے ہیں مگر کچھ بہادر لوگ جب عزم کر لیتے ہیں تو اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ یہاں میں عبدالستار ایدھی اور ڈاکٹر عبدالقدیر کی مثال دینا چاہوں گی۔

جب پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا خواب دیکھا گیا تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے عزم، محنت اور حوصلے نے اسے ایٹمی قوت بنا دیا۔ اسی طرح جب عبدالستار ایدھی نے انسانیت کی بھلائی کے لیے قدم آگے بڑھایا تب وہ تنہا تھے مگر پھر کئی لوگ ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ یوں ایک کارواں بن گیا۔ ذرا سوچیے! اگر عبدالستار ایدھی یا ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنے مقصد پر ڈٹے نہ رہتے یا مشکلات سے گھبرا جاتے تو کیا وہ کامیابی حاصل کر پاتے؟ کامیابی کے لیے ضروری ہے آپ پہلا قدم اٹھائیں اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں۔

انسان کا پہلا قدم یعنی آغاز ہی اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور اپنی زندگی کے مقاصد حاصل کر لے گا۔ مصائب اور مشکلات تو انسان کی زندگی کا حصہ ہیں لیکن انسان جب کسی کام کا آغاز کر لیتا ہے تو پھر اسے مشکلات سے نمٹنا اور مصائب سے نبرد آزما ہونا بھی آسان لگتا ہے، لیکن اگر وہ پہلا قدم ہی نہیں اٹھائے گا تو یہی مشکلات اور مصائب اس کے لیے پہاڑ بن جاتے ہیں جنہیں سر کرنا اسے ناممکن لگتا ہے۔ دُنیا میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ انسان مشکلات اور مصائب کے باوجود کامیابی کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔

☆.....☆.....☆

اُڑان

علینہ نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اسے بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا بہت شوق تھا۔ آج اتوار تھا اور وہ بے صبری سے بچوں کے رسالے کا انتظار کر رہی تھی۔ دادا جان کو اندر آتا دیکھ کر وہ ان کی طرف لپکی، جھٹ سے رسالہ ان کے ہاتھ سے لے کر جلدی جلدی صفحات پلٹنے لگی پھر اپنی کہانی نہ پا کر مایوس سی ہوگئی۔

دادا جان علینہ کی خوشی کو افسردگی میں بدلتا دیکھ کر معاملہ سمجھ گئے۔ علینہ افسردہ سی شکل بنائے چھت پہ چلی گئی۔ وہ آسمان پر اُڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی، جب دادا جان نے اسے پکارا۔ جی دادا جان! علینہ نے جواب دیا۔ دادا جان بھی وہیں اس کے پاس بیٹھ گئے اور اداسی کی وجہ پوچھی۔

دادا جان! اب میں کوئی کہانی نہیں لکھوں گی کیوں کہ میں اچھا نہیں لکھتی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ارے.... یہ کس نے کہا؟ دادا ابو نے حیرت سے پوچھا۔ میں اچھا نہیں لکھتی اسی لیے دوسری بار بھی میری کہانی نہیں چھپی۔ وہ سر جھکائے روئے جا رہی تھی۔ دادا ابو نے مسکراتے ہوئے پیار سے علینہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ دیکھو بیٹا! اِن اُڑتے پرندوں کو دیکھو۔ دادا جان نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، ان میں کچھ چھوٹے پرندے ہیں کچھ بڑے۔ بڑے پرندے بھی پہلے بہت چھوٹے تھے۔ یہ پرندے گھونسلوں میں رہتے ہیں۔ جب ان کے نئے نئے پر نکلتے ہیں تب یہ اپنے گھونسلے ہی میں اپنے پروں کو کھول کر پھڑ پھڑاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ننھی منی اُڑان بھرنا شروع کرتے ہیں۔ کئی بار گرتے سنبھلتے ہیں مگر ہار نہیں مانتے کیوں کہ ان کی نظر آسمان پر ہوتی ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنا چاہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی اُڑان بلند سے بلند تر ہو جاتی ہے، اس طرح ان میں مزید خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور انہیں اپنے پروں پر، اپنی قوت پرواز پر یقین ہونے لگتا ہے۔ آخر کار ان کی پرواز اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے پرندوں کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں لمبی لمبی مسافت طے کرنے لگتے ہیں۔

علینہ بغور دادا جان کی باتیں سن رہی تھی۔ابھی تم بھی ننھا منا پرندہ ہو۔ابھی تم نے نئی نئی اُڑان بھرنی شروع کی ہے۔ابھی سے ہار مان لوگی تو بلندی تک کیسے پہنچو گی؟ لکھنا تمہارا شوق ہے۔تم لکھو، بار بار لکھو، پھر اپنی غلطیوں کی اصلاح کرو۔ان سے سیکھو، اس طرح تم بہتر سے بہترین لکھنے لگو گی اور ایک دن تمہاری کہانی بھی ضرور شائع ہوگی بلکہ لوگ فرمائشیں کر کے لکھوائیں گے۔یاد رکھو! کامیابی محنت، لگن، پختہ عزم اور مسلسل سیکھنے سے ملتی ہے۔

علینہ دادا جان کی باتوں کا مقصد سمجھ کر مسکرانے لگی۔وہ خوش تھی کیونکہ اسے کامیابی کا راز مل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

حوریہ ایمان ملک

حوریہ ایمان ملک کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ گزشتہ ایک سال سے رائٹرز کلب کے ساتھ بطور ممبر منسلک ہیں۔ پاکستان کے صف اول کے اخبارات اور میگزین میں اپنی تحریریں شائع کروا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی سلسلہ بھی ابھی جاری ہے۔ کئی عزائم ہیں جن کے لیے دعا گو بھی ہیں اور تگ و دو بھی جاری ہے۔

فہرست تحریر:

1- آج میرا روزہ ہے
2- عقل مند کی تلاش
3- ہم دیکھیں گے
4- کیا آپ ڈپریشن کا شکار ہیں؟
5- پاکستانی ڈرامے اور اخلاقی شعور

☆.....☆.....☆

آج میرا روزہ ہے

(بچوں کی کہانی)

11 سالہ علی بھی روزہ رکھنے پر بضد تھا۔ دادا جان نے اس کا شوق اور جذبہ دیکھ کر روزہ رکھنے کی اجازت دے دی۔ سحری میں امی نے جگایا تو وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔ سب کے ساتھ سحری کی۔ اذانِ فجر کے بعد ابو اور دادا جان مسجد جانے لگے تو علی بھی ان کے ہمراہ چل دیا۔ نماز باجماعت ادا کی اور قرآن پاک کی تلاوت کی۔ مسجد سے واپس آ کر اسکول کی تیاری کی اور اپنے دوست احمد کے ساتھ اسکول کی راہ لی۔ احمد، اس کا ہم عمر دوست اور کلاس فیلو تھا۔ دونوں ہمسائے بھی تھے اس لیے دونوں کی بہت اچھی دوستی تھی۔ علی نے احمد کو اپنے روزے کے متعلق بتایا تو احمد حیران ہو کر سوچنے لگا، علی سارا دن کیسے بھوکا پیاسا رہے گا؟ جب وہ اسکول پہنچے تو اسمبلی کے بعد پرنسپل نے طلبا کو روزے کے احکام اور رمضان کی فضیلت سے آگاہ کیا۔ کلاس ٹیچر نے کلاس میں روزے دار بچوں کو سراہا اور باقی بچوں کو روزہ رکھنے کی تلقین کی۔

لنچ بریک میں احمد نے بیگ سے اپنا لنچ باکس نکال کر علی کے سامنے رکھا۔ علی نے اسے یاد دلایا، ''آج میرا روزہ ہے۔''

''ابھی تو کوئی بھی تمہیں نہیں دیکھ رہا، تم میرے ساتھ لنچ کر لو۔'' احمد نے اردگرد نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں نہیں کھاؤں گا کیوں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ روزے میں کچھ بھی کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور روزہ توڑنا گناہ ہے۔'' علی نے وضاحت کی تو احمد خاموش ہو گیا لیکن اس کا دماغ الجھنے لگا۔

گھر پہنچ کر علی نے ظہر کی نماز ادا کی اور سو گیا۔ شام کو جب وہ نمازِ عصر ادا کرنے مسجد جا رہا تھا، راستے میں اسے احمد کھیلتا دکھائی دیا۔ احمد نے اسے دیکھتے ہی آواز لگائی لیکن علی نے کھیلنے سے انکار کر دیا اور مسجد کی جانب چل پڑا۔

شام کو علی افطاری دینے احمد کے گھر گیا۔ احمد کی امی نے اسے روزہ رکھنے پر شاباش دی۔ احمد نے علی کے

چہرے پر عجیب سی خوشی دیکھی اور اس کی وجہ دریافت کی۔

''ابھی افطار کا وقت ہونے والا ہے پھر میں روزہ افطار کروں گا۔''علی خوشی سے بولا۔

''تم سب کچھ ویسے بھی تو کھا سکتے تھے پھر اتنا بھوکے پیاسے کیوں رہے؟''احمد اب بھی الجھا ہوا تھا۔

احمد کی امی ان کی باتیں سن رہی تھیں، بولیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ ہے، 'روزے دار کو دو خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔ایک روزہ افطار کے وقت، دوسری اللہ سے ملاقات کے وقت۔' جب کوئی مسلمان روزہ رکھتا ہے تو اسے افطار کے وقت جو خوشی ملتی ہے وہ دن بھر پیٹ بھر کے کھانے سے بھی نہیں ملتی اور دوسری خوشی، جب وہ اللہ کے سامنے جائے گا تو اپنے روزے کے باعث خوش ہوگا۔'انہوں نے مزید وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

''امی! کیا میں روزہ رکھ سکتا ہوں؟''احمد نے امی سے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں، تم بھی روزہ رکھ سکتے ہو لیکن جھوٹ، لڑائی جھگڑے اور ہر برے کام سے خود کو دور رکھو گے۔ نماز باقاعدگی سے ادا کرو گے تبھی روزے کا اصل مقصد پورا ہوگا ورنہ صرف بھوکا پیاسا رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

احمد نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ بھی کل روزہ رکھے گا۔دوسرے روز علی اپنے ابو اور دادا کے ساتھ مسجد گیا تو احمد بھی وہاں موجود تھا۔دونوں نے نماز ادا کی، مسجد سے واپس آ کر دونوں اسکول کی تیاری کرنے لگے۔آج احمد بہت خوش تھا کیوں کہ آج اس کا پہلا روزہ تھا۔

☆.....☆.....☆

عقل مند کی تلاش

(بچوں کی کہانی)

بہت دنوں کی بات ہے، کسی ملک کے ایک انصاف پسند بادشاہ کا وزیر مر گیا۔ وہ وزیر بہت عقل مند اور نیک انسان تھا، جو بادشا کو رعایا کی بھلائی کے لیے اچھے مشورے دیتا تھا۔ بادشاہ اس کو بہت عزیز رکھتا تھا اور اس پر مکمل بھروسا کرتا تھا۔ بادشاہ کو اس کی موت کا بہت افسوس تھا۔ بادشاہ ہی کو نہیں، اس ملک کے عوام کو بھی وزیر کی موت کا بہت غم تھا۔

بادشاہ اپنے درباریوں میں سے کسی کو بھی اپنا وزیر بنا سکتا تھا، لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ملک ہی کے کسی عقل مند آدمی کو وزیر بنائے گا۔ بادشاہ اپنے ایک وفادار ملازم کے ساتھ رات کو بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حالات جاننے کے لیے نکلتا تھا۔ اس طرح وہ ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کرتا تھا۔ ایک بار آدھی رات کے وقت وہ شہر کی ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ اندھیرے کی وجہ سے ایک آدمی سے ٹکرا گیا۔ بادشاہ نے پوچھا، تم کون ہو اور رات کے وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا، میں اس شہر کا ایک شریف انسان ہوں اور بے وقوفوں کو عقل مند بننے کے گُر سکھاتا ہوں۔

بادشاہ گھوم پھر کر اپنے محل واپس پہنچا اور دوسرے دن حکم جاری کیا کہ شہر میں رات کے وقت ہر شخص ہاتھ میں چراغ لے کر نکلا کرے۔ جو شخص ایسا نہیں کرے گا، اسے سخت سزا دی جائے گی۔

کچھ دنوں بعد بادشاہ رات کے وقت شہر کی ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ وہ پھر ایک آدمی سے ٹکرا گیا۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اس نے پوچھا، تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟

جناب! میں اس شہر کا ایک معزز آدمی ہوں اور بے وقوفوں کو عقل سکھلاتا ہوں۔ بادشاہ نے پہچان لیا کہ یہ وہی

شخص ہے، جو چند دن قبل بھی اس سے ٹکرایا تھا۔

کیا تم نے بادشاہ سلامت کا حکم نہیں سنا کہ رات کے وقت ہر آدمی ہاتھ میں چراغ لے کر نکلا کرے۔تم نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی، اس لیے تم کو سخت سزا ملے گی۔ بادشاہ نے غصے میں کہا۔

جناب والا! میرے ہاتھ میں چراغ ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں۔اس آدمی نے جواب دیا۔

مگر یہ روشن کیوں نہیں ہے؟ بادشاہ نے سوال کیا۔

جناب والا! بادشاہ سلامت کا حکم صرف اتنا ہے کہ ہر آدمی ہاتھ میں چراغ لے کر چلے۔ یہ حکم نہیں دیا کہ اس میں تیل بھی ہو اور وہ روشن بھی ہو۔ بادشاہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس آدمی نے پھر کہا، میرا خیال ہے کہ بادشاہ کے دربار میں عقل مند وزیروں کا قحط ہے ورنہ ایسا حکم صادر کرنے سے پہلے وہ بادشاہ سلامت کی توجہ دلاتے۔ میری دعا ہے کہ خدا ہمارے بادشاہ سلامت کو ایک عقل مند وزیر با تدبیر عطا فرمائے۔

بادشاہ یہ جواب سن کر دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ وہ اس آدمی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور باتوں میں اس کے بارے میں ذاتی معلومات حاصل کر لیں۔

بادشاہ نے پوچھا، تمہارا پیشہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا، جناب والا! میں ایک مدرسے میں استاد ہوں اور عقل مند بنانے والی دو عظیم کتابوں کا حافظ ہوں۔اس کے علاوہ بہت ساری ایسی کتابیں پڑھ چکا ہوں جو انسان کو عقل مند بنا کر انہیں کام یاب انسان بنا سکتی ہیں۔ میرے استاد نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کوئی آدمی 'گلستان اور بوستان' کی حکایتوں کو سمجھ کر پڑھے اور ان پر غور کرے تو ایک دن وہ عقل مند ترین انسان بن کر کسی بادشاہ کے دربار میں جگہ پا سکتا ہے۔

باتیں کرتے کرتے اس عقل مند انسان کا گھر آ گیا اور وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کے مکان اور محلے کو ذہن نشین کر لیا اور اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ دوسرے دن بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس عقل مند آدمی کو عزت کے ساتھ ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ بادشاہ اس کی گفتگو اور عالمانہ باتیں سن کر بہت خوش ہوا، اور اسے اپنا وزیر بنا لیا۔اس وزیر نے بادشاہ کو بہت اچھے اور مفید مشورے دیے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ شہر کے سارے باشندوں کو مفت چراغ اور تیل فراہم کیا جائے اور گلی کوچوں میں رات کو روشنی کرنے کے لیے چراغ تھامے نوکر رکھے جائیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ استادوں کے ساتھ شہر کے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ شیخ سعدی کی کتابیں 'گلستان و بوستان' ضرور پڑھے۔

☆.....☆.....☆

ہم دیکھیں گے

پاکستان کی جغرافیائی حدود میں شامل کشمیر کے ساتھ لفظ 'مقبوضہ' لگے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، نہ جانے ابھی اور کتنا عرصہ یہ لفظ یونہی لگا رہے گا۔ کہنے کو تو یہ ایک لفظ ہے مگر اس کے پیچھے ظلم و جبر کی بہت سی داستانیں پوشیدہ ہیں جنہیں بیان کرنے کے لیے حوصلہ اور بہت سا وقت درکار ہے۔ بھارتی مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ کشمیر کا جو حال ہے اگر کسی مغربی ملک کے ساتھ ایسا ہوتا تو ساری دنیا اس کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوتی مگر افسوس.... مغربی ممالک کشمیر کے لیے اندھے، گونگے اور بہرے ہو چکے ہیں۔

بھارت امن اور آزادی کا پرچار تو خوب کرتا ہے لیکن کشمیر کو ابھی تک ان کے حق سے محروم رکھا ہوا ہے۔ بھارت کی سات لاکھ فوج کشمیریوں کے سروں پر سنگینیں تان کر کھڑی ہے پھر بھی کشمیری عوام کا جذبۂ آزادی ختم نہیں کر سکی۔ بھارت کا ہر نیا ظلم، کشمیریوں کے جذبۂ آزادی کو ہوا دیتا ہے۔ بھارت، کشمیریوں کے جذبے سے اس حد تک خوف زدہ ہو چکا ہے کہ کشمیر میں جنم لینے والی آزادی کی ہر تحریک کچلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظلم و ستم کی کئی داستانیں رقم کرتا ہے مگر کشمیریوں کے حوصلے پست نہیں کر سکتا۔

کشمیر میں چلنے والی برہان وانی کی تحریک آزادی نے بھارت کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ برہان وانی کی شہادت کو ایک سال گزر چکا ہے مگر کشمیریوں کے حوصلے آج بھی ہمالیہ کی چوٹیوں سے بلند ہیں۔ بھارتی فوج برہان وانی کو شہید کر کے بھی اس کے پیغام کو نہ روک سکی۔ آج کشمیر کا ہر جوان، بچہ، بڑا، بوڑھا، برہان وانی بن چکا ہے۔ جذبۂ آزادی سے سرشار وہی عزم لیے ہر کشمیری سر پہ کفن باندھے نکلا ہوا ہے۔ آج کشمیر کا بچہ بچہ برہان وانی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ جب کشمیریوں میں جذبۂ آزادی کی کمی نہیں تو بھارت کب تک انہیں آزادی جیسی نعمت سے محروم رکھ سکے گا۔ جس قوم کے بچے مجاہد بن جائیں، اس کے شہیدوں کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ بھارت اس حسین خطے کو پاکستان سے جدا نہیں کر سکتا نہ اسلحے کے زور پہ کشمیریوں کے دل میں بڑھتی ہوئی بھارتی نفرت کو محبت میں بدل سکتا ہے۔ بھارتی ظلم و جبر اور جنگی جنون ایک روز دم توڑ جائے گا۔ میں پُرعزم ہوں کہ کشمیر میں آزادی کا سورج جلد طلوع ہوگا۔ ہم دیکھیں گے، جب کشمیر کی فضائیں نوحہ کناں نہیں ہوں گی بلکہ ان فضاؤں میں خوشی کے گیت گونجیں گے۔ جب کشمیری عوام کی آنکھوں میں آنسو نہیں بلکہ روشن مستقبل کے خواب ہوں گے۔ ہاں....ہم بہت جلد دیکھیں گے۔ (ان شاءاللہ)

☆.....☆.....☆

کیا آپ ڈپریشن کا شکار ہیں؟

ڈپریشن یعنی ذہنی دباؤ ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جس میں انسان اپنے آپ کو دکھی اور اداس محسوس کرنے لگتا ہے۔ ڈپریشن کے ساتھ ظاہر ہونے والی دیگر علامات انسان کی روزمرہ کی سرگرمیوں کو بری طرح متاثر کرتی ہیں جس کے باعث وہ اور اس کے قریبی لوگ سخت تکلیف و پریشانی کا سامنا کرتے ہیں۔

اکثر لوگ وقتی اداسی اور مایوسی کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ڈپریشن کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جو کچھ دیر بعد اکثر اپنے آپ ٹھیک بھی ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں یہ ڈپریشن نہیں۔ طب کی زبان میں ڈپریشن ہے جس سے نمٹنے کے لیے ماہر نفسیات کی مدد درکار ہوتی ہے۔ چوں کہ یہ ایک سنجیدہ نوعیت کا اعصابی دباؤ ہوتا ہے، جو خود بخود ٹھیک نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایک سنگین طبی مرض کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

علامات:

جو شخص ڈپریشن کا شکار ہو، اسے ہر وقت اضطراب و بے چینی کی کیفیت کا سامنا رہتا ہے۔ وہ خود میں اور اپنی زندگی میں ایک خالی پن محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ زندگی جینے اور خوش رہنے کی امید کھو بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کی سوچ منفی ہو جاتی ہے اور اس کے اندر ایک روشن مستقبل کی امید دَم توڑنے لگتی ہے۔ ڈپریشن میں گرفتار شخص کو اپنی زندگی بے معنی لگنے لگتی ہے اور وہ مستقل پشیمانی اور احساسِ جرم میں مبتلا رہتا ہے۔ ایسے لوگ اکثر چڑچڑے اور بے چین رہنے لگتے ہیں، جن سے ان کی ذاتی و پیشہ ورانہ زندگی پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دیگر علامات میں نیند کا نہ آنا یا ضرورت سے زیادہ نیند کا آنا شامل ہے۔ ایسے لوگ روزمرہ کی سرگرمیوں میں اپنی دلچسپی کھو دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کی جنسی زندگی بھی اسی ذہنی دباؤ سے متاثر ہونے لگتی ہے۔

انسان دو صورتوں میں ذہنی و اعصابی دباؤ کا شکار ہوتا ہے۔ ایک تو تب، جب وہ شدید جذباتی کیفیت

(mania) میں ہو اور دوسری، جب وہ احساسِ مایوسی کا شکار اور کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر ہو۔ ذہنی دباؤ (depression) کا شکار انسان غور وفکر اور فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس کی یادداشت بھی کم زور ہو جاتی ہے۔ ڈپریشن کی ایک علامت، بھوک کا کم لگنا یا زیادہ بھوک لگنا بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ سر اور جوڑوں میں درد میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور انہضام کے عمل میں دشواری کا سامنا کرتے ہیں۔ علاج کے باوجود بعض اوقات ان تکالیف پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ تمام تکالیف بعض اوقات اس حد تک بھی بڑھ جاتی ہیں کہ انسان خودکشی کے بارے میں بھی سوچنے لگنے لگتا ہے۔

وجوہ:

ڈپریشن کیوں ہوتا ہے؟ ڈپریشن یا ذہنی دباؤ کی کوئی ایک وجہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے کئی جینیاتی، حیاتیاتی، معاشرتی اور نفسیاتی عناصر شامل ہیں۔ ایم آر آئی (میگنیٹک ریسونینس امیج) سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی دباؤ کے شکار لوگوں کا دماغ عام لوگوں کے دماغ سے مختلف ہوتا ہے۔ ڈپریشن کے شکار شخص کے دماغ کا وہ حصہ، جس سے موڈ، بھوک، نیند اور اس کے رویے کا تعلق ہوتا ہے، دیگر لوگوں سے الگ ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر ذہنی دباؤ کے شکار لوگ عام لوگوں سے مختلف انداز میں برتاؤ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے روزانہ صبح اٹھ کے کپڑے تبدیل کرنا اور تیار ہونا بھی ایک انتہائی مشکل عمل بن جاتا ہے۔

اقسام:

یاد رہے کہ ذہنی دباؤ عموماً آگے چل کر دیگر شدید نوعیت کی اعصابی و ذہنی بیماریوں کا سبب بن سکتا ہے۔ ہمارے اردگرد ہمیں ایسے کئی لوگ ملتے ہیں، جو ذہنی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ بہت حد تک ممکن ہے کہ وہ اس بات سے ناواقف ہوں۔ ڈپریشن کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ ہر شخص میں ذہنی دباؤ کی مختلف علامات نظر آتی ہیں۔ اس کی شدت، نوعیت اور قسم کا تعلق انسان کے ماحول اور اس کی انفرادی خصوصیات سے ہوتا ہے۔

شدید ذہنی دباؤ:

عام طور پر زیادہ تر لوگ اسی قسم کے ڈپریشن سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کی علامات بھی کافی شدید ہوتی ہیں۔ اس قسم کے ذہنی دباؤ سے انسان کی کام کرنے، سونے، پڑھنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ماند پڑنے لگتی ہے۔

مستقل محسوس ہونے والا ذہنی دباؤ:

یہ دیرپا رہنے والا ڈپریشن ہوتا ہے جس کی کم از کم مدت دو سال ہوتی ہے۔ مخصوص صورتِ حال میں محسوس ہونے والا ذہنی دباؤ: اس قسم کا ذہنی دباؤ انسان کو کسی خاص موقعے ہی پر محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پوسٹ پارٹم

(postpartum) ڈپریشن، وہ ڈپریشن ہے جو حاملہ مائیں بچے کی پیدائش سے پہلے محسوس کرتی ہیں۔ بعض لوگ سردیوں کے موسم میں اعصابی دباؤ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ بہار یا گرمیوں کے موسم میں خود کو ہلکا پھلکا اور تروتازہ محسوس کرتے ہیں۔

پاکستان میں اعصابی دباؤ کے اثرات:

پاکستان میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں یا عمر کے کسی نہ کسی حصے میں اعصابی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ مردوں سے زیادہ عورتیں ڈپریشن کا شکار پائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں ڈپریشن سے متاثرہ افراد کی شرح 44.4 فی صد ہے، جن میں 25.5 فی صد مرد اور 57.5 فی صد خواتین شامل ہیں۔ البتہ یہاں اس مرض کے بارے میں بہت ہی کم تحقیق کی گئی ہے، جس کے باعث زیادہ تر لوگ جانتے ہی نہیں کہ وہ ڈپریشن کا شکار ہیں۔

ہمارے ملک میں اچھے اور تجربہ کار ماہرین نفسیات کی شدید ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پاکستان کے ماہرین نفسیات اعلیٰ پائے کے نہیں، لیکن ان کی تعداد ضرورت کے حساب سے بے حد کم ہے۔ ڈپریشن سے متعلق آخری مُردم شماری 1998 میں ہوئی تھی اور ایک اندازے کے مطابق اس شرح میں پچھلے 17 سالوں میں بڑی حد تک اضافہ ہوا ہے۔

ڈپریشن کسی بھی جسمانی بیماری کی طرح ایک قابل فکر لیکن قابل علاج مرض ہے۔ اسی لیے ذہنی دباؤ سے متاثرہ لوگوں کو محض خوش رہنے کی تلقین کرنے کے بجائے ان کے مسائل اور ذہنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆.....☆.....☆

پاکستانی ڈرامے اور اخلاقی شعور

ایک بزرگ ہاتھ میں فائل پکڑے لڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔خوش اخلاق لڑکی نے بزرگ کی بات نہایت دھیان سے سنی اور ان کی مطلوبہ فائل پر کام کرنے لگی۔

''میں تمہارے باپ جیسا ہوں۔'' بزرگ نے باتوں کے دوران اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ یہ سننا تھا کہ اس خوش اخلاق لڑکی نے فائل اٹھا کر بزرگ کے سامنے پھینک دی اور انہیں فوراً دفع ہو جانے کو کہا۔ بے چارے بزرگ فائل پکڑے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں ہکا بکا یہ منظر دیکھ رہی تھی۔اس 'خوش اخلاق' لڑکی کی یہ حرکت اس کی کولیگ بھی دیکھ رہی تھی۔کولیگ نے لڑکی سے اس تلخ رویے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی۔اس آدمی نے کہا، یہ میرے باپ جیسا ہے۔اگر یہ میرے باپ جیسا ہے تو یہ یہی ڈیزرو کرتا ہے۔

میں ابھی تک ششدر تھی کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ اچھی بھلی خوش اخلاق لڑکی اچانک اتنی سی بات پر کیسے آپے سے باہر ہوگئی کہ ایک بزرگ کی اتنی بے عزتی کر دی۔قسط وار ڈراما ''مبارک ہو، بیٹی ہوئی ہے'' ختم ہو چکا تھا مگر میں اسی ایک سین میں الجھ کر رہ گئی۔آخر اس بزرگ کا قصور کیا تھا؟ صرف یہ کہنا کہ میں تمہارے باپ جیسا ہوں۔اس پر لڑکی کا رویہ ایسا کیوں تھا؟ صرف اس لیے کہ وہ اپنے باپ سے نفرت کرتی تھی اور اس کے پاس نفرت کرنے کا جواز بھی تھا۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی اور پہلی بیوی سے بے اعتنائی برتی۔وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بیٹے کی ماں نہ بن سکی بلکہ چار بیٹیوں کو جنم دینے والی ماں تھی۔وہ لڑکی، اسی ماں کی ایک بیٹی تھی، جسے بچپن میں ماں پر کیے جانے والے ظلم اور باپ کی بے اعتنائی نے باپ سے متنفر کر دیا تھا۔

باپ پر غصہ فطری بات ہے۔مانا کہ باپ کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر اس کی ماں نے الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی بیٹیوں کے ساتھ تنہا زندگی گزاری۔ان کی اچھی پرورش کی، اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ بیٹیاں بھی اتنی

قابل نکلیں کہ ماں کو ان پر فخر ہوتا۔ ماں کی اتنی اچھی تربیت اور اتنی قابلیت کے باوجود ایک لڑکی جاہلانہ انداز سے بزرگ سے بات کرتی دکھائی گئی۔ وجہ تھی، اس کا باپ، جس کی نفرت اتنی شدید تھی کہ وہ باپ کی عمر کے ہر بزرگ کو حقارت سے دیکھنے لگی۔

یہ ہے اے آر وائی ڈیجیٹل چینل پر چلنے والا ٹی وی ڈراما۔ مذکورہ لڑکی اور بزرگ، اس ڈرامے کا کردار ہیں۔ مگر بات صرف ڈرامے یا کردار کی نہیں، سوال یہ ہے کہ میڈیا چینلز ہمیں کیا دکھا رہے ہیں۔ ہماری نسل کو کیا ترغیب دے رہے ہیں؟

بزگوں کا ادب و احترام اس سین میں مفقود ہو کر رہ گیا۔ ایک بزرگ، جو لڑکی کو عزت دے رہا ہے، اسے اپنی بیٹی سمجھ رہا ہے، اس کی اتنی توہین کرنا؟ اس سین میں کہاں بھلائی دکھائی گئی، کہاں گئی ماں کی تربیت، کہاں گئی تعلیمی قابلیت، جو اتنا شعور بھی نہ دے سکی کہ بزرگوں کا احترام کرنا چاہیے۔ باپ کے گناہوں کی سزا دوسروں کو دینا، ہر بزرگ کو اپنے باپ جیسا سمجھنا، اپنے آپ کو صرف اس لیے اس قابل بنانا کہ باپ اور اس کے رشتے داروں کو نیچا دکھا سکے۔

ہم نوجوان نسل کو کیا سکھا رہے ہیں کہ باپ برا ہے تو اسے معاف کرنے کے بجائے اس سے اپنی محرومیوں کا بدلہ لیں۔ باپ سے اتنی نفرت کریں کہ کوئی بزرگ آپ کو بیٹی سمجھے تو اس سے حقارت سے پیش آئیں۔ افسوس کے ساتھ.... مگر یہ سچ ہے کہ ہمارے آج کل کے ٹی وی ڈراموں میں بھلائی کا پہلو اتنا نمایاں نہیں رہا جتنا برائی کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے رویوں میں شدت آ چکی ہے۔ ہمارے ذہنوں کی اسکرین پر چلنے والے ایسے سین ہمیں حقیقی زندگی میں تلخ بنا دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرتی رویے صبر و برداشت اور ہر احساس سے عاری ہوتے جا رہے ہیں۔ بچے والدین سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں، نہ چھوٹوں کا لحاظ رہا نہ بڑوں کا ادب۔

اس سلسلے میں میڈیا پر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ایسے ڈرامے دکھائے جائیں جو اچھائی کی ترغیب دیں، جس میں بزرگوں کی عزت و احترام کے پہلو نمایاں ہوں۔ بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینے کی ترغیب دیں۔ اگر میڈیا نے ڈراموں کا معیار بہتر نہ بنایا تو بہت جلد ہماری نوجوان نسل، ان ڈراموں کی دیکھا دیکھی اپنی اخلاقی، مذہبی اور ثقافتی اقدار فراموش کر بیٹھے گی۔ معیاری ڈراموں کے معاشرے پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں جب کہ غیر معیاری ڈرامے اخلاقی پستی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

انیلہ افضال

انیلہ افضال کا تعلق لاہور سے ہے۔ تین مضامین میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی پھر ایل ایل بی کے بعد ہائی کورٹ کی ایڈووکیٹ رہیں۔ باقاعدہ لکھنے کا آغاز گزشتہ برس کیا اور ایک سال سے ہی رائٹرز کلب سے بطور ممبر منسلک ہیں۔

فہرست تحریر:

1- وطن کی خاطر

2- عبادت اور خوفِ الٰہی

3- بطور پاکستانی ہماری ذمے داریاں

4- یہ دو کوڑی کے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں

5- زنانی کی زبان

☆.....☆.....☆

وطن کی خاطر

تیمور نے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی تھی یا یوں کہیے کہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ کئی دیہات پر مشتمل جاگیرداری، کئی سو مربعوں کا اکلوتا وارث تھا۔ جہاں پاؤں رکھتا، کئی ہاتھ وہاں بچھ جاتے تھے۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات آسمانی صحیفے کا درجہ رکھتی تھی۔ پھوپھیاں، خالائیں اور بڑی بہن صدقے واری جاتی تھکتی نہ تھیں۔ انہی نوابی ٹھاٹھوں میں پانچ سال گزر گئے تو تیمور کو اسکول بھیجنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ پھوپھی کا کہنا تھا، کوئی ضرورت نہیں اسکول بھیجنے کی، اسے کون سا کسی کی نوکری کرنی ہے۔ بس مولوی صاحب سے کہہ دو کہ گھر آ کر قرآن شریف کا درس دے دیا کریں اور تھوڑا بہت ماسٹر جی گھر آ کر لکھت پڑھت سکھا دیں بس۔ کل کو زمینوں کے حساب کتاب دیکھنے میں آسانی ہوگی۔

ہاں! اور کیا۔ دادی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر چوہدری مراد کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اوئے نہیں! وہ گرجا۔ میرا پُتر اسکول جائے گا اور اس کے بعد کالج بھی جائے گا۔ تعلیم بہت ضروری ہوگئی ہے آج کل۔ اس نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ اوئے.... کل کلاں کو الیکشن بھی تو اسی نے لڑنا ہے۔ سنا ہے بی۔ اے تک کی تعلیم لازمی کر دی ہے انہوں نے۔ کچھ ہی سالوں کی بات ہے، میں نے وزیر بنا دینا ہے اپنے پتر کو۔

اُدھر تقدیر میں تیمور کے لیے کچھ اور ہی لکھا گیا تھا۔ پانچ جماعتیں گاؤں کے اسکول میں پڑھنے کے بعد اسے شہر کے ''وڈے اسکول'' میں داخل کرا دیا گیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، تیمور پر تقدیر کا رنگ چڑھنے لگا تھا۔ اس کے دل میں فوجی بننے کی خواہش بیدار ہونے لگی تھی۔ اس نے دسویں کا امتحان پاس کر کے جونہی کالج میں قدم رکھا، چوہدری مراد سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

اوئے نہیں، اوئے پتر! ان جاگیروں اور زمینوں کو ہم نے آگ لگانی ہے جو تو فوج میں جانے کی بات کر رہا

ہے؟ مگر ابا جی! میں اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ تو اسی کا بندوبست کر رہا ہوں پتر! یہ کروڑوں روپے پارٹی فنڈ میں کیوں دیتا ہوں؟ اسی لیے ناں کہ کل کو تو وزیر بن کر ملک کی خدمت کر سکے۔ چوہدری مراد نے پتّا پھینکا۔ تیمور خاموش رہا مگر دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ فوج میں ضرور بھرتی ہوگا۔

کالج کے دو سال پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ انہی دنوں فوج کی بھرتیاں جاری تھیں۔ تیمور نے دوستوں کے ساتھ درخواست دے دی۔ چند ہی دنوں میں وہاں سے کال بھی آ گئی۔ فوج کے مشکل ٹیسٹ پاس کرتا ہوا تیمور کمیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ چوہدری مراد نے بڑی چیخ وپکار کی مگر تیمور ٹس سے مس نہ ہوا۔ ٹریننگ کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور مقابلے کا امتحان پاس کر کے آرمی انٹیلی جنس میں شامل ہوگیا۔

چوہدری مراد کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔ تاہم، اس نے ہمت نہ ہاری اور تیمور کی شادی کا ارادہ کیا۔ تیمور نے بہت سمجھایا کہ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا، مجھے شہادت کی آرزو ہے، جوان شاءاللہ آج نہیں تو کل میرا مقدر بنے گی۔ میں کیوں کسی کی زندگی خراب کروں۔ مگر اب تو ماں نے بھی ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ دیکھ پتر! تو نے جو چاہا وہ کیا، میں نے کچھ نہیں کہا۔ پتر! میرے بھی کچھ ارمان ہیں تجھ سے۔ تو حویلی کا آرام چھوڑ کر فوج میں مشقت کی زندگی گزار رہا ہے، ریشمی بستر چھوڑ کر پتھروں پر سوتا ہے۔ میرا دل دکھتا ہے پر چل، تیری خوشی، مگر پتر! تو بھی تو میری خوشی کا سوچ۔ وہ ماں کو انکار نہ کر سکا اور یوں حریم اس کی زندگی میں آ گئی۔ وقت کو بھی جانے کس بات کی جلدی تھی کہ تین سال ہی میں ہی اوپر تلے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نواز دیا۔ اس کے بعد حریم کے نصیب میں نہ تھا کہ اپنے سرتاج کو دیکھ سکتی، اس سے بات کرتی، اس سے اپنی دلی کیفیات بیان کر پاتی۔

تیمور کو ایک خفیہ مشن کے لیے چن لیا گیا۔ اسے غیر علاقے میں جا کر دشمن کے نیٹ ورک کا پتا چلانا تھا۔ یہ آسان کام نہ تھا، کیپٹن تیمور بھیس بدل کر علاقہ غیر جا پہنچا۔ وہ ایک مجذوب کے روپ میں تھا۔ پھٹے پرانے گندے کپڑے، ننگے پیر، جسم پر میل کی پپڑیاں جم گئی تھیں۔ تپتی دوپہریں ہوں یا ٹھٹھرتی راتیں، کالی سڑکیں ہی اس کا ٹھکانا تھیں۔ وہ، جس کی حویلی سے سیاست دان لاکھوں کے فنڈ پاتے تھے، جہاں سے ہر رمضان میں نہ صرف اپنے پنڈ بلکہ اردگرد کے پنڈوں میں بھی راشن تقسیم کیا جاتا تھا۔ جس کے گھر سے ہر سردی میں غریبوں میں لحاف تقسیم ہوتے تھے۔ وہ بھوکا، گندہ، کبھی تپتی، تو کبھی ٹھٹھرتی سڑک پر دن کاٹ رہا تھا۔ کیوں؟ یہ ہی تو اس کا مقصدِ حیات تھا کہ وہ کوئی بڑا کام کر سکے۔

بالآخر دو سال کی محنتِ شاقہ کے بعد وہ دشمن کے نیٹ ورک کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ سارا پلان سامنے تھا، دشمن کے جاسوس گرفتار ہو چکے تھے۔ مگر تیمور کو اب بھی سکون نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ قدرت اس سے اور بھی کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ اور وہی ہوا۔ تیمور کی بہترین کارکردگی کے باعث اسے ایک عظیم مقصد کے لیے منتخب کر لیا گیا

تھا۔ اسے اب دشمن کے ملک میں گھس کر اس کے عزائم کا نہ صرف پردہ فاش کرنا تھا بلکہ اس کے خلاف بھرپور کارروائیاں بھی کرنی تھیں۔ اس کام کے لیے اسے پہلے سے بھی بڑی قربانی دینی تھی۔ اسے ایک دہشت گرد کارروائی میں شہید قرار دے دیا گیا۔ پورے پروٹوکول کے ساتھ اس کی لاش اس کے آبائی گاؤں پہنچائی گئی اور پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ کیپٹن تیمور ''شہید'' ہو چکا تھا۔

حریم محض 29 سال کی عمر میں بیوہ ہو چکی تھی اور اس کے بچے، باپ کے زندہ ہوتے ہوئے یتیم ہو گئے تھے۔ مگر تیمور کا مقصد ان سب چیزوں سے بہت بلند تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے مر چکا تھا مگر ایک نئے نام اور نئی پہچان کے ساتھ نئے مشن پر کام کر رہا تھا۔ جس میں شاید وہ کسی دن کسی گم نام گولی کا شکار ہو جائے یا کہیں دشمن کے قبضے میں تشدد سہتے ہوئے زندگی کی بازی ہی ہار دے۔ نہ جانے اسے کفن نصیب ہو گا یا اس کی لاش کہیں کوڑے پر سڑتی ہوئی ملے گی۔ یہ سب کیوں؟ اس ملک کی بقا کے لیے، اس قوم کی عظمت کے لیے، جہاں کسی کو اس بات کا احساس تک نہ ہو گا کہ کوئی ان کے لیے اپنا سکون، اپنا گھر بار، بیوی بچے تک چھوڑ چکا ہے۔ اپنے خاندان سے منہ موڑ چکا ہے، اپنی پہچان کھو چکا ہے۔

☆.....☆.....☆

عبادت اور خوفِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تا کہ وہ اس کی عبادت کرے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:''میں نے جن وانس کو خلق نہیں کیا سوائے اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' اس بِنا پر قرآن مجید تاکید سے یہ بات بیان کر رہا ہے کہ انبیائے الٰہی ومرسلین کے اہم ترین اہداف میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی دعوت دیں۔رب العالمین فرماتا ہے،''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔'' مزید فرمایا،''اور اللہ میرا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار ہے۔لہٰذا، اس کی عبادت کرو۔یہی صراطِ مستقیم ہے۔''

واضح رہے کہ ایسی عبادت صرف انسان کی اپنی تکمیل کے لیے ہے۔چوں کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں کوئی نقص نہیں اور نہ ہی اسے اس بات کی حاجت ہے کہ وہ کسی کی عبادت کے ذریعے اپنی کم زوری کو دُور کرے۔دوسرے لفظوں میں،عبادت تو اس انسان اپنی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے جو عبادت کو انجام دیتا ہے۔یہ عبادات خدا تعالیٰ کے لیے کمال کے حصول کا ذریعہ نہیں ہیں۔قرآن مجید میں آیا ہے،''اور روئے زمین کے تمام بسنے والے بھی کافر ہو جائیں تو ہمارا اللہ سب سے بے نیاز ہے اور وہ قابلِ حمد وستائش ہے''

اسلام کے تصورِ عبادت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے لفظ عبادت کے معنی ومفہوم، جو عربی زبان ہی کا ایک لفظ ہے، ذہن نشین کر لیں۔عبادت کے لغوی معنی انتہائی عجز وتذلل کے ہیں۔امام راغبؒ لکھتے ہیں، ''عبودیت کے معنی اظہارِ فروتنی کے ہیں اور عبادت کے معنی اس سے بھی ایک درجہ آگے، یعنی غایت درجہ فروتنی کے ہیں۔اس کی مستحق صرف وہ ذات ہے جس کی مہربانیاں بے پایاں ہیں۔اسی لیے ارشاد ہوا ہے: صرف اسی کی عبادت کرو۔''

معروف عربی لغت ''لسان العرب'' میں ہے، ''عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ ''عبدالطاغوت'' یعنی اس نے طاغوت کی اطاعت کی اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''ایاک نعبد'' یعنی ہم تیری ہی عاجزانہ اطاعت کرتے ہیں اور لغت میں عبادت کے معنی اطاعت مع الخضوع ہیں۔ چنانچہ عبادت کے ساتھ عاجزی وانکساری کا ہونا لازمی ہے۔

عبادت کی منزل تقویٰ کا حصول ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی ہیں کہ نفس کو ہر اُس کام سے بچانا، جس کے باعث کوئی شخص عذاب کا مستحق قرار پائے۔ جیسے کفر وشرک، بے حیائی اور حرام چیزوں سے بچنا اور فرائض کی ادائیگی کرنا۔ تقویٰ کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ''تیرا رب تجھے وہاں نہ پائے جہاں اس نے منع کیا ہے۔'' یا یوں کہیے کہ تقویٰ انسانی زندگی کی وہ صفت ہے جو تمام انبیاء کی تعلیم کا نچوڑ ہے۔

فروتنی است دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ خود

یعنی اہل کمال کی نشانی عاجزی اور انکساری ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ سوار جب منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے تو پیادہ ہو جاتا ہے۔ اب جب، منزل کے بارے میں جان گئے ہیں تو اس منزل پر پہنچنے کے لیے ہمیں زادِراہ کی ضرورت تو پڑے گی۔ عبادت کی راہ میں تقویٰ ہماری منزل ہے اور اخلاص وخشیت الٰہی ہمارا زادِراہ ہے۔ ان کی پیدائش کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی ''عبادت'' ہے اور عبادت میں جان ہی ''اخلاص'' سے پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دیجیے کہ بے شک میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا، میرا مرنا (سب) اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

چناں چہ اخلاص تمام اعمال کی روح ہے اور وہ عمل، جس میں اخلاص نہ ہو، اس جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔ گویا اخلاص، عبادات واعمال میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر انسان کا بنیادی مطمحِ نظر یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اس کی رضا حاصل کرے تاکہ اسے جنت نصیب ہو۔ اس مقصد کے لیے اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اعمال کا حُسن معتبر ہے نہ کہ محض کثرت۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وہ تمھیں ضرور آزمائے گا تاکہ وہ جان لے کہ تم میں سے کون ہے، جو بہتر اعمال کرنے والا ہے۔''

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعمال کے حُسن جانچنے کا تذکرہ کیا ہے، کثرت کا نہیں۔ چناں چہ اعمال کی قبولیت اور اس پر اجر وثواب کے حصول کے لیے اس میں روحانیت واخلاص اور کیفیت کا اعتبار ہے نہ کہ محض تعداد یا

قلت و کثرت کا۔ مفسرین کے مطابق، ''احسن عمل'' سے مراد وہ نیکی ہے، جو اخلاص پر مبنی ہو اور شریعت کے مطابق ہو۔'' اس آیت کے پیش نظر علما و محققین نے اعمالِ صالحہ کی قبولیت کے لیے دو شرطیں بیان کی ہیں: ایک، اخلاص یعنی وہ عمل، جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کیا جائے اور دوسری، اتباعِ سنّت یعنی وہ عمل، جو قرآن و سنّت کی تعلیمات کے موافق ہو۔ بدعت یا کسی اور طرح سے خلافِ شرع نہ ہو۔

ایک حدیث میں خاتم النّبیین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ متقی، مخلوق سے مستغنی اور اخفا پسند بندے کو پسند فرماتا ہے۔'' اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے تین صفات والے بندے کو اپنا محبوب قرار دیا ہے۔ ایک متقی: وہ بندہ، جو ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہو اور اس کی معصیت سے بچتا ہو۔ دوسرا غنی: وہ بندہ، جو لوگوں کے مال و جاہ سے کوئی غرض اور کوئی حرص و مفاد وابستہ نہ رکھتا ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے فقر و حاجت کا اظہار کرتا ہو۔ مخلوق سے استغناء برتتا ہو اور اللہ کے سامنے خود کو محتاج بنا کر رکھتا ہو۔ تیسرا خفی: وہ بندہ، جو اپنے نیک اعمال بھی مخلوق کے دکھاوے سے بچنے کے لیے چھپ کر کرتا ہو اور اگر کوئی گناہ صادر ہو جاتا ہو تو اس کو بھی چھپاتا ہو اور اس پر خوب توبہ و استغفار کرتا ہو، کیوں کہ اپنے گناہوں کا بندوں کے سامنے اظہار بھی شریعت میں پسندیدہ نہیں۔

اب خشیت الٰہی کا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ خشیت یعنی خوف۔ خوف دل کی بے چینی کا نام ہے۔ جب انسان حرام کام اور معاصیات کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا دل اللہ کے خوف سے لرز جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا، اسے چھوڑنے سے بھی دل بے چین ہو جاتا ہے یا ان پر عمل کر کے عدم قبولیت کا خدشہ محسوس کرتا رہتا ہے۔ اسی کا نام خوفِ الٰہی ہے۔ ایک مومن سے یہ خوف مطلوب ہے۔ کیوں کہ اللہ کا خوف عبادت اور توحید میں شامل ہے۔ قرآن میں خوف سے متعلق متعدد قسم کے الفاظ و کلمے آئے ہیں، جن میں اللہ سے ڈرنے کا حکم اور تلقین کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرما دیا کہ ''اللہ سے ڈرنے والے علم والے لوگ ہیں۔'' مگر افسوس بھی اسی بات کا ہے کہ آج علم والوں کی کمی نہیں، کمی ہے تو صرف اللہ سے ڈرنے والوں کی۔ انسان کو خوفِ خدا ہو تو شاید وہ کبھی گناہ کے قریب بھی نہ پھٹکے۔ اس لیے مذکورہ بالا تمام امور انسانی زندگی اور نیکی کی قبولیت کے اہم ترین جز ہیں۔ اللہ ہمیں متقی اور پرہیزگار بنائے، آمین۔

☆.....☆.....☆

بطور پاکستانی ہماری ذمے داریاں

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل ڈالے۔'' صاف ظاہر ہے کہ کسی بھی معاشرے یا قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی ذمے داریوں اور فرائض کا نہ صرف احساس ہو بلکہ وہ ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کی حتیٰ الوسع کوشش بھی کریں۔ یہاں کوشش کا لفظ استعمال کرنے کی بیّن وجہ یہ ہے کہ من حیث القوم ہمیں ہمارے حقوق کا تو پورا پورا ادراک ہے مگر فرائض کی بات آتے ہی ہم ''چوچے'' بن جاتے ہیں۔

بچپن سے پچپن تک، ہمیں صرف حقوق کے بارے میں بتایا جاتا ہے اور یہ بات ہمیں اچھی بھی لگتی ہے۔ مثلاً، ماں کے دودھ پر بچے کا حق، باپ کی دولت پر اولاد کا حق۔ تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے اور جب بچہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکول میں داخل ہوتا ہے تو وہاں بھی (انتہائی معذرت کے ساتھ) اسلامیات اور معاشرتی علوم کی کتابوں میں صرف حقوق ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، اساتذہ کے حقوق، غریبوں کے حقوق، ہمسائیوں کے حقوق، قیدیوں کے حقوق، مسافروں کے حقوق وغیرہ وغیرہ۔ فرائض کا یہاں بھی کوئی تذکرہ نہیں اور کسی نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری تو آخر میں لکھ دیا: ''ایک کے حقوق، دوسرے کے فرائض ہیں۔'' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسکول میں داخل ہونے والا تین چار سال کا بچہ جب 23 برس کا ہو جاتا ہے اور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ڈگری اور زبان پر ''ساڈا حق.... ایتھے رکھ'' کا نعرہ ہوتا ہے۔

ہمارا پیارا وطن پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ یہاں کے عوام ہمہ وقت مساجد میں ہوں گے اور انہیں صوم وصلوٰۃ اور حج وعمرہ کے سوا کوئی دوسرا کام نہ ہوگا اور اتنے نیک لوگوں کے لیے

دودھ کی نہریں جاری ہوں گی اور من وسلویٰ کا اہتمام ہوگا۔ قیام پاکستان کا اصل مقصد اسلامی اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنا اور اسلامی تشخص برقرار رکھنا تھا۔

کسی بھی قوم کی ترقی اور اس کی بقا کا دارومدار اسی بات پر ہوتا ہے کہ اس کے افراد اپنے معاشرتی فرائض کی ادائیگی کس حد تک کرتے ہیں، کیوں کہ وہ اعمال اور ذمے داریاں صرف انہی کی ذات تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ ایک وسیع دائرہ ہوتا ہے جس پر ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگلے کچھ ہی دنوں میں ملک میں انتخابات کی گہما گہمی شروع ہو جائے گی۔ آپ سے التماس ہے کہ سب کے نہیں تو کم سے کم ملک کی چار بڑی سیاسی جماعتوں کے منشور کا مطالعہ کیجیے گا۔ آپ کو یقین کی حدوں سے پرے، دعوؤں اور خوب صورت وعدوں کے سوا کوئی تیسری چیز نظر نہیں آئے گی۔ پکی گلیاں، کشادہ سڑکیں، لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ، اسکول، طبی مراکز اور روزگار کے مواقع۔ مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ آپ کسی حق کے حق دار تب ہی ہیں جب آپ اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ آپ ٹیکس ادا نہیں کرتے مگر حکومت کی نااہلی کا رونا خوب روتے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک با آوازِ بلند ملک، قوم اور معاشرے کی درستی کی بات کرتا ہے مگر صاحبو! ذرا غور کرو تو یہ ملک، یہ قوم، یہ معاشرہ اور کوئی نہیں بلکہ میں اور آپ ہیں۔ ہمیں قطعاً ملک وقوم کے غم میں کڑھتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں معاشرے کا ٹھیکے دار بننے کی بھی کوئی ضرورت نہیں اور ہر بات پر من حیث القوم کا جام پی کر کسی نالی میں لڑھکنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف میں اور صرف آپ.... بطور ایک فرد، خود کو ٹھیک کر لیں تو یہ ملک، یہ قوم اور یہ معاشرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

نہیں نہیں، ایسا ہرگز نہیں۔ ہم بطورِ فرد یا شہری اپنی کوئی ذمے داری پوری نہیں کر رہے۔ ہم میں سے اکثر اپنی ''اختیاری'' ذمے داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہے ہیں۔ یہ وہ ذمے داریاں ہیں جو ہمارے بس میں، ہمارے اختیار میں ہوتی ہیں اور جن کی ہم سے جواب طلبی ہوتی ہے۔ جیسے ایک استاد کی ذمے داریاں، ایک باپ کی ذمے داریاں، ایک بینکر کی ذمے داریاں، ایک صنعت کار کی ذمے داریاں وغیرہ۔ یا یوں کہہ لیں کہ وہ ذمے داریاں، جو پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے طور پر لاگو ہوتی ہیں، اس کے بعد آتی ہیں۔ وہ ذمے داریاں، جو کسی پر بحیثیت فرد، اخلاقی طور پر فرض ہیں۔ جیسے ٹریفک قوانین کی پابندی، وقت کی پابندی، قطار کی پابندی، خواتین کا احترام وغیرہ۔ یہ وہ ذمے داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کی کوشش کرنے والے قریباً کامیاب رہتے ہیں۔

ایک تیسری قسم کی ذمے داری بھی ہے، جو مندرجہ بالا دونوں ذمے داریوں کا مجموعہ ہے، جس میں پیشہ ورانہ اور اخلاقی، دونوں اقسام کی ذمے داری فردِ واحد پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً سفارش، رشوت، نظر اندازی، اقربا پروری وغیرہ۔ یعنی اس ملت اسلامیہ کے افراد اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں پوری تو کرتے ہیں مگر اخلاقیات کی ڈنڈی مارنا نہیں

بھولتے۔

اب ایک نظر ان اصولوں پر، جو بطور پاکستانی شہری ہم پر فرض ہیں اور جن کا تقاضا یہ مملکت خداداد اپنے شہریوں سے کرتی ہے۔

1:۔اسلامی قوانین کو ملک کی بنیادی اساس مانتے ہوئے اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق بسر کریں۔

2:۔ پاکستان کے شہری ایسے جمہوری نظام کی حمایت کریں جس میں سب کے لیے آزادی، احترام، عزت، تکریم اور مساوات کا نفاذ ہو۔

3:۔ پاکستان کے شہریوں کو محبِّ وطن ہونا پڑے گا اور آزمائش کی گھڑی میں ملک وقوم کی خاطر قربانی دینے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔

4:۔ ہر پاکستانی کو رزقِ حلال کی طلب کرنی ہوگی۔ یہ ہمارا دینی تقاضا بھی ہے اور اس سے رشوت، سفارش اور اقربا پروری کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی۔

5:۔تعلیم یافتہ اور مہذب شہری ہی قوموں میں نئی روح پھونک سکتے ہیں۔لہٰذا، تعلیم پر خصوصی توجہ دینی ہوگی اور یہ کام انفرادی سطح پر بھی کرنا ہوگا۔

6:۔شہریوں کو چاہیے کہ وہ ملک کے قوانین کی پابندی کریں اور اداروں کے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہوئے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے سے گریز کریں۔

7:۔سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں کھلونا بننے کی بجائے قومی وقار، ترقی اور یک جہتی کے کاموں میں حصہ لینا چاہیے۔

8:۔نکمے، ناکارہ اور سست شہری، ریاست کا بوجھ ہوتے ہیں۔لہٰذا، محنت کیجیے اور محنت کش بنیے۔

9:۔اپنے تمام ٹیکس مکمل اور بروقت ادا کیجیے۔

10:۔فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لیں۔

11:۔دوسروں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔

12:۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔لہٰذا، اسلامی اخوت اور عظمت کے لیے کام کیجیے۔

13:۔اپنے تمام فرائض پوری ذمے داری اور توجہ سے ادا کریں۔

☆.....☆.....☆

دو کوڑی کے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں

اللہ دتا کالے، گندے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مَلک حشمت نے مڑتے ہی ایک لات دتّے کے پہلو میں رسید کی، دتّا بلبلاتا ہوا فرش پر جا گرا۔ اس کی بیوی، جو پاس ہی گھٹنوں کے بل، ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی، تڑپ کر دتّے کی طرف لپکی اور اسے سیدھا کر کے پھر سے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔ سرکار! مہربانی کر دو۔ وہ منمنائی۔ دوبارہ ایسی خطا نہ ہوگی پھر کریں تو جو کالے چور کی سزا، وہ ہماری سزا۔ سرکار! اب کی بار معافی دے دو۔

تو چپ کر! سارا کیا دھرا تیرا ہی ہے۔ ملک حشمت دھاڑا۔ تو نے ہی اسے پٹی پڑھائی ہوگی کہ دوسرے ڈیرے پر چلے چلتے ہیں، وہاں بہشت کے جھولے ملیں گے۔ ملک حشمت تو خون پیتا ہے ناں تم لوگوں کا۔ لے....اب پتا چل گیا اپنی اوقات کا۔ اوئے....! کس میں اتنی ہمت ہے کہ مَلِکوں کے کمیوں کو پناہ دے۔ اوئے، میں نسل مکا دوں گا تمہاری، اگر آئندہ بھاگنے کی جرأت کی تو۔

جی سرکار! جی سرکار! ہماری کھال کی جوتیاں سلوالینا سرکار۔

ہونہہ! مَلِک پھنکارا! اوئے چل اٹھ....اب جا کر اپنے اڈے پر لگ جا۔

دتّا اور جیراں اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے جا کر مَلِک کے بھٹے پر اپنے اپنے کام میں جُت گئے۔ دوا دارو تو دُور کی بات، کسی نے دو گھڑی آرام کا بھی نہ سوچا۔ اور سوچتے بھی کیسے؟ پیٹ میں بھوک نے آگ بھڑکا رکھی تھی اور باہر مَلک حشمت کے غصے کی آگ برس رہی تھی۔ ہاں.... پر جاتے جاتے ایک جملہ ان کے کانوں سے ٹکرایا تھا، ''یہ دو کوڑی کے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں۔''

او سرکار! آپ کی خفگی بجا ہے۔ میرے کارندوں نے مجھے آپ کے سامنے شرمندہ کروا دیا۔ جناب! بس دو دن کا وقت اور دے دیں۔ آپ کا آرڈر آپ کے فارم ہاؤس پر پہنچ جائے گا۔ مَلک حشمت کے منہ سے شہد ٹپک رہا تھا۔

اوسرکار! ہم نے بھلا اس ملک میں نہیں رہنا جو آپ سے بگاڑ ڈالیں گے۔ ملک حشمت نے آنکھ دبائی۔ اب یہ کیا کم ہے کہ آپ نے اپنے نئے ٹھیکے کے لیے اینٹیں ہمارے بھٹے کی منظور کروادی ہیں، باقی وادے گھاٹے تو ہم آپس میں دیکھ لیں گے۔

بس بس مَلک حشمت! زیادہ چاپلوسی نہ کرو۔ تمہارے پاس آرڈر پورا کرنے کے لیے صرف چوبیس گھنٹے کا وقت ہے ورنہ.... ٹھیکے دار کریم بخش نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

جی.....جی سرکار! بالکل، آئندہ جو کوتاہی کروں تو میری کھال کی جوتیاں سلوا لیجیے گا۔

ہمم.....کریم بخش نے ہنکارا بھرا۔ ملک حشمت جلدی سے کمرے سے نکل گیا مگر ایک جملہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ ''یہ دو کوڑی کے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں۔'' ٹھیکے دار کریم بخش سیکرٹری داخلہ کے دفتر میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ کیوں مسٹر کریم! تم تو ہمیں بھول ہی گئے۔ اگلا ٹھیکا پاس کروانا ہے یا کام چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے؟ نہیں نہیں سرکار! کام چھوڑ کر بھوکوں مرنا ہے؟ بھوکے تو تم ویسے بھی مر جاؤ گے مسٹر کریم! ہم سے چالاکیاں مہنگی پڑ جائیں گی۔ ارے جناب! میرے تو باپ کی بھی توبہ جو آپ سے چالاکی کرنے کا سوچوں بھی، میری کھال کی جوتیاں سلوا لیجیے گا۔ ارے نہیں نہیں، مسٹر کریم! میں سستے چمڑے کا جوتا نہیں پہنتا۔ سیکرٹری داخلہ نے رعونت سے کہا۔ ہی ہی ہی! کریم بخش کھسیانی ہنسی ہنسا۔ سرکار! آپ خفا نہ ہوں۔ میں آج شام ہی بنگلے پر حاضری دیتا ہوں۔ ہمم.....! سرکاری افسر نے نخوت سے کہا اور کریم بخش سلام کرتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔ تاہم، نکلتے نکلتے ایک جملہ اس کی سماعت کو چیر گیا۔ ''یہ دو کوڑی کے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں۔'' کیوں سیکرٹری صاحب! لگتا ہے کام سے دل بھر گیا آپ کا۔ وزیر داخلہ نے استہزائیہ انداز میں سرکاری افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نہیں سر! ایسا تو کچھ نہیں۔ سیکرٹری صاحب مؤدبانہ انداز میں گویا ہوئے۔ یہ آپ لوگ چار جماعتیں پڑھ کر اور مقابلے کے امتحان پاس کر کے خود کو کوئی توپ چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ مت بھولیں کہ یہ ہم سیاسی لوگ ہی ہیں جو آپ کو آگے لاتے ہیں اور آپ لوگ ان شاہی عہدوں پر فائز ہوتے ہیں ورنہ سرکاری دفتروں میں جوتیاں گھسیٹتے عمر کٹ جاتی ہے آپ جیسوں کی۔ جی سر! بجا فرمایا آپ نے۔ ہاہاہاہاہاہا! اور آپ ہمیں کو آنکھیں دکھانے لگے ہیں؟ نہیں سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہماری تو کھال کی جوتیاں سلوا لیجیے جناب۔ ارے نہیں، نہیں سیکرٹری صاحب! ایسا نہ کہیں، جوتے تو میں برانڈڈ ہی پہنتا ہوں۔ وزیر داخلہ نے رعونت سے کہا۔ ہاہاہاہاہا۔ سیکرٹری صاحب کا چہرہ لال ہو گیا اور وہ اجازت لے کر دفتر سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے ایک جملے نے ان کی سماعت میں گویا تیزاب انڈیل دیا۔ ''یہ دو کوڑی کے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں۔''

☆.....☆.....☆

زنانی کی زبان

آج کل سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو وائرل ہے اور قریباً ہر شوہر اپنی بیگم کو ''ثواب'' کی نیت سے بھیج رہا ہے۔ ویڈیو کچھ یوں ہے کہ ایک خاتون گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے شوہرِ نام دار سے کہتی ہیں: آپ ہی بتائیں، زنانی (عورت) آپ کا گھر سنبھالے، آپ کے والدین کو سنبھالے، آپ کے بچے سنبھالے، آپ کو سنبھالے، آخر ایک زنانی کیا کیا سنبھالے؟ اور شوہر نام دار فرماتے ہیں، ''زنانی صرف اپنی زبان سنبھالے۔'' (ویڈیو ختم) یعنی زنانی اپنی زبان نہیں سنبھالتی۔

بچپن سے بڑھاپے تک، اور پھر اپنی موت تک، زنانی اپنی زبان بہت اچھی طرح سنبھالتی ہے۔ چھوٹی بچی کو کوئی اگر کچھ کہہ دے، کچھ غلط سلط یا کچھ نازیبا، تو نہ صرف اس بچی کی ماں خود اپنی زبان سنبھالتی ہے بلکہ بچی کو بھی یہی درس دیا جاتا ہے کہ ''گھر میں کسی سے کچھ مت کہنا۔'' یعنی اسے زبان سنبھالنا سکھا دیا جاتا ہے۔ اسکول یا کالج جاتے ہوئے کسی اوباش، چھچھورے نے کوئی آوازہ کسا تو زنانی نہ صرف وہاں، اس جگہ اپنی زبان سنبھالتی ہے بلکہ گھر میں بھی باپ یا بھائی سے تذکرہ کرنے سے گریز کرتی ہے۔ دفتر ہو یا بازار، سڑک ہو یا بس، ہر جگہ زنانی زبان سنبھال کر رکھتی ہے۔ شادی ہو جائے تو ساس کے طعنے سننے کو ملیں یا شوہر صاحب کے نخرے اٹھانے ہوں، ہر جگہ زنانی زبان سنبھالتی ہے۔

اگر مشترکہ خاندانی نظام ہو تو وہ قائم ہی اسی صورت میں رہ سکتا ہے جب زنانی زبان سنبھال کر رکھتی ہے۔ یہ جو کچھ شوہر حضرات کہتے پھرتے ہیں ناں کہ میں نے تو بیوی کو دبا کر رکھا ہے۔ مجال ہے کہ اسے اتنی جرأت ہو جائے کہ میرے گھر والوں کے خلاف کچھ بول جائے۔ تو ان کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ آپ نے بیوی کو دبا کر نہیں رکھا، اس کرموں والی نے اپنی زبان دانتوں تلے دبا کر رکھی ہے ورنہ اگر وہ آپ کے پیارے گھر والوں کے بارے میں کچھ

بولے گی تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ پہلے آپ اسے ڈانٹ دیں گے پھر دو تھپڑ جڑ دیں گے مگر اس بیچ وہ اپنی بات کہہ چکی ہوگی۔ دو، چار، دس بار ایسا ہوگا پھر آہستہ آہستہ وہ باتیں آپ کے دل میں جگہ بنانے لگیں گی کیوں کہ اگر پانی کا قطرہ مسلسل گرتا رہے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے، یہ تو پھر آپ کا دل ہے۔

شکریہ ادا کیجیے اپنی زنانی کا کہ اس نے زبان سنبھالی ہوئی ہے ورنہ آپ کے گھر والوں کا شمار ملائکہ میں نہیں ہوتا۔ آپ کی بیوی کو بھی ان سے کچھ شکایات ہو سکتی ہیں۔ اسے بھی کسی کی بات بری لگ سکتی ہے اور وہ جو ایک عام مقولہ ہے، ''اگر عورتیں اپنی زبان بند نہ رکھیں (راز نہ رکھیں) تو مرد معاشرے میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتے۔'' بہرحال.... آج بھی بہت سے گھر اس لیے آباد ہیں کہ زنانی نے اپنی زبان سنبھالی ہوئی ہے۔ بہت سے خاندان جڑے ہوئے ہیں کیوں کہ زنانی اپنی زبان سنبھالتی ہے۔ بہت سے رشتے اس لیے قائم ہیں کہ ایک عورت اپنی زبان سنبھالے ہوئے ہے۔ اچھائیاں، برائیاں سب میں ہوتی ہیں، نہ تو مرد صرف خوبیوں کا مرقع ہے اور نہ ہی عورت صرف برائیوں کی پوٹلی ہے۔ خدارا! ہر وقت مذاق اُڑانے اور عورت کو کم تر ثابت کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کرنے کی بجائے اسے اس کا جائز مقام دیجیے۔ یاد ہے ناں.... اماں حوا کے بغیر بابا آدم جنت میں بھی بے چین تھے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

عاجزہ بنت عارف

عاجزہ بنت عارف کا تعلق پنجاب کے شہر ٹیکسلا سے ہے۔ عالمہ کا کورس اور حفظ جاری ہے جبکہ عصری تعلیم بھی شروع ہے۔ لکھنے کا آغاز گزشتہ برس سے کیا۔ رائٹرز کلب کی ایک برس سے رکن ہیں اور کئی تحریریں پاکستان کے قومی اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

فہرست تحریر

1- عظیم شہید بیٹا

2- فکر دنیا نے کیا ہمیں برباد

3- پھولوں جیسے نازک جذبات

4- رشتوں کی مٹھاس

5- مقصد زندگی

☆.....☆.....☆

عظیم شہید بیٹا

آج اسے الوداع کرتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کی ماں آنکھیں پُرنم ہوگئی تھیں جنہیں وہ چاہ کر بھی نہ چھپا سکی۔ امی! میں تو اللہ کی راہ میں، وطن کی حفاظت کی خاطر، دشمنوں سے مقابلے کے لیے جا رہا ہوں۔ مجھے آپ کی دعا چاہیے کہ اللہ مجھے اپنی رضا دے۔ یہ معاذ تھا، جو اپنی ماں کو تسلی کے کلمات کہتا ہوا روانہ ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آج اس کا یہ سفر مبارک ہوگا۔ یہ کلمات آخری ہوں گے اور یہی وہ لمحات تھے، جو ماں کے دل کو خوشی سے لبریز ہونے کے ساتھ آنکھوں کو نم کیے جا رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں کی عرصے سے خواہش تھی کہ اللہ مجھے ایسی اولاد دے جو تیرے دین کی داعی اور اس وطن، پاکستان کی حفاظت کرنے والی ہو۔

کافی عرصے بعد ان کے گھر میں تین بہنوں کے بعد یہ شہزادہ آیا، جسے سبھی کا پیار ملا اور وہ اسی سوچ میں پروان چڑھا، جو ماں کی خواہش تھی۔ اس سے پہلے کہ ماں اس سے اپنی خواہش کا اظہار کرتی، وہ اسی سوچ میں دن رات گزار رہا تھا کہ کب وہ دن آئے اور کب میں اس سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت پانے نکلوں۔ آخر اس نے ہمت کی اور ماں کے پاس اپنا مدعا لیے چلا آیا۔ اس کی پرورش تو اسی سوچ میں ہوئی تھی مگر اسے ڈر تھا کہ میں ایک بیٹا ہی ہوں جسے اللہ سے بہت منّتوں مُرادوں سے مانگا گیا۔ ماں باپ کا پیار، بہنوں کا پیار.... کہیں مجھے روک نہ دیا جائے۔

یہاں اسے روکے جانے کا ڈر تھا اور وہاں والدین اور بہنیں یہ چاہتے تھے کہ بیٹا خود ان سے اس خواہش کا اظہار کرے تاکہ وہ بھی دیکھیں کہ آخر ان کی پرورش کیا رنگ لائی ہے؟

وقت کیسے گزرا، کسی کو پتا ہی نہ چلا۔ اس ننھے مجاہد نے جب عمر کے پندرہویں حصے میں قدم رکھا تو جوش ٹھاٹھیں مارنے لگا اور وہ ماں کے پاس گیا۔

جس رستے پر قدم رکھے ہیں اسی پہ چلتے جانا ہے
چودہ صدیاں پیچھے ہٹ کے سب سے آگے جانا ہے

اجازت لینے کے لیے لب گویا ہوئے۔''امی! میں جانتا ہوں، آپ نے مجھے اللہ سے رو رو کر مانگا۔ میں آپ کی آنکھوں کا تارا ہوں، بہنوں کا لاڈلا ہوں لیکن امی! آج مجھے آپ سے انکار نہیں سننا، آپ کو آج ماننا ہوگا۔ ماں کے دل میں خوشی کا چراغ روشن ہوا مگر ان جان بنتے ہوئے پوچھا، بیٹا! کیا بات ہے، کیا مانگتے ہیں، کیا آپ کی کبھی کوئی بات رد کی ہے؟ تو آج آپ کو کس چیز کا خوف ہونے لگا؟ آپ کہیں، جو کہنا ہے۔

یہ حقیقت تھی کہ معاذ کی بات کبھی رد نہ کی جاتی تھی لیکن وہ باقی بچوں جیسا بھی نہ تھا۔ اس کی فرمائشیں بھی نرالی ہوتیں کہ خود پوری کرنے کا جی چاہتا۔ کبھی تبلیغ میں جانے کی خواہش میں رونے لگتا تو کبھی حفظ کے شوق کے بعد مچلتے لبوں سے قاری بننے کی خواہش، تو کبھی کسی غریب کی مدد کی خواہش، عجیب بات تھی، اس چھوٹی عمر میں اس کی سوچ، اور خواہشات پر سب حیران ہوتے کہ ہم نے اسے اتنا نہیں سکھایا جتنا یہ ہمیں سکھاتا ہے۔ واقعی یہ حقیقت ہے کہ انسان کو جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اسے محبوب کی جو ادا پسند آ جائے، اس کی نقل میں لگ جاتا ہے۔ یہی بات تھی کہ اسے اپنے نبی صل اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت تھی کہ کبھی گھر کے کاموں میں والدہ اور بہنوں کا ہاتھ بٹاتا تو کبھی اپنے آنے والے داڑھی کے ہلکے ہلکے گھنے چھنے بالوں پہ محبت سے ہاتھ پھیرتا، تو کبھی جوشِ محبت میں یہ شعر پڑھتا۔

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضٰی، سوزِ صدیق دے

اس کا ہر انداز نرالا تھا۔ بہت کم گو، نرم مزاج، بہادر اور ہمدرد تھا۔ یوں وہ سب کا دل جیت چکا تھا مگر یہ لمحات جانے والے تھے۔ آج جب ماں سے اجازت کے لیے گویا ہوا تو کیا جذبات تھے کہ ماں بھی خوشی سے رونے لگی۔ اللہ نے میرے بیٹے کے دل میں ایمان کی محبت کو پیوست کر رکھا ہے۔ جوں ہی ماں سے اجازت ملی، وہ خوشی سے ماں کی گود میں سر رکھ کے بچوں کی طرح رونے لگا۔ بہنوں پر یہ منظر عیاں ہوا تو وہ فوراً سجدۂ شکر بجا لائیں اور استقامت کی دعا مانگنے لگیں۔ اور پھر وہ دن آیا جب یہ ننھا مجاہد اپنے سفر پہ روانہ ہو گیا۔

ہمیشہ ماں اسے الوداع کہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں آج اسے معاذ کی ہر ہر بات یاد آ کر رنجیدہ کر رہی تھی۔ دل چاہتا، معاذ کو سینے میں چھپا لے، آج نہ جانے دے۔ اس نے سوچا۔ آخر ماں تھی۔ لیکن صبر کرتے ہوئے اللہ سے اجر کی

امید لگائے معاذ کو وداع کر رہی ہے۔ اسے عمامہ پہنایا، بالوں میں کنگھی کی، جوتے پہنائے۔ معاذ ہمیشہ امی کو جوتے پہنانے سے روکتا تھا۔ اسے یہ ہاتھ پاؤں میں اچھے نہیں لگتے تھے مگر آج وہ بھی چاہتا تھا، اسے اتنا پیار ملے کہ جہاں نظر جائے ماں کا پیار ہی نظر آئے۔

جب وہ جانے لگا تو سب سے چھوٹی بہن ماریہ نیند کی آغوش میں سوئی ہوئی تھی۔ اسے پیار کیا اور سب کی دعائیں لیتے ہوئے نکل گیا۔

وہ سب کی یادیں دل میں لیے اپنے وطن عزیز کی حفاظت میں مگن تھا۔ آخر وہ اپنے مقام پہ پہنچ گیا۔ جونہی اتر کر چند قدم آگے بڑھا، دشمنانِ اسلام کی جانب سے زوردار بم باری ہوئی اور وہ وہیں جام شہادت نوش کر گیا۔ وہ معاذ سے ''شہید معاذ'' کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس کی ماں تک اس خبر کے ساتھ معاذ کا کچھ سامان اور اس کے جوتے بھی پہنچائے گئے، جنہیں وہ ہمیشہ ہاتھ لگانے سے روکتا تھا۔ آج وہ جوتے تو تھے مگر پہننے والا نہ تھا۔ ماں محبت سے ان جوتوں کو سینے سے لگاتی کہ وہ مقام، جس کے لیے بیٹا مانگا تھا، آج اسے مل گیا۔

ماں اپنے معاذ کو یاد کر کے خوشی سے ہچکیوں سے رونے لگی۔ میرا معاذ تو واقعی عظیم تھا۔ آج اس کی ہر ہر ادا یاد آتی ہے۔ کبھی اس کا نغمے سنانا تو کبھی بہنوں کے ساتھ ہاتھ بٹانا، کبھی چھوٹی بہن کو کھلانا، کبھی اسے سبق پڑھانا۔ ماریہ کی باتیں اکثر سب کو رلا دیتیں۔ ''امی! میں یہاں بیٹھتی تھی اور بھائی مجھے آ کر سبق پڑھاتے۔ آج شام ہوگئی، بھائی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟ امی! بھائی کب آئیں گے؟ امی! مجھے بھائی یاد آ رہے ہیں۔ مجھے بھائی کے پاس جانا ہے۔'' اس کی باتیں سب کو تڑپا دیتیں۔

☆.....☆.....☆

فکرِ دنیا نے کیا ہمیں برباد

آج اپنے گھر کے آس پاس بڑی بڑی عمارتیں دیکھ کر نجانے کیوں دل میں اک خوف سا پیدا ہونے لگتا ہے کہ اتنے بڑے مکان، اتنی زیادہ سجاوٹ، دنیا سے اتنی محبت، آخرت سے اتنی دُوری، اتنی پختہ عمارتیں.... آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ احساس دل کو چھوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا وہ دَور نہ تھا کہ جب ایک شخص کے پختہ عمارت بنانے پہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے اپنا چہرۂ انور پھیر لیا تھا؟ پھر آج ایسا کیوں ہے؟

یہ بدلاؤ اتنے جلد نہیں آیا۔ اس میں بہت وقت لگا ہے۔ آخر کہیں تو، کوئی تو کوتاہی ہوئی ہے۔ سامنے بنی عمارتیں دیکھتے ہوئے عائشہ آج پھر ہمیشہ کی طرح بہت گہری سوچ میں محو تھی کہ اذان کی آواز سے ہوش آیا۔ اس نے نماز پڑھی اور پھر اسی سوچ میں کھو گئی کہ جب اس شہر میں نئی نئی آئی تھی تو اس وقت کیا سماں تھا؟ اُف.... یہ سوچ کر تو عجیب ہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو نا قابلِ بیان ہے۔ بس کچھ جھلکیوں پہ اکتفا کروں گی۔ دراصل جو پہلے والا مسافر خانہ تھا، اس میں کہیں دُور ایک مسجد تھی جس میں خاموشی میں بھی بمشکل اذان سنائی دیتی اور وہ بھی شاذ و نادر، لیکن جب نئے مسافر خانے میں منتقل ہوئے تو اس میں بے انتہا آسانیوں کے ساتھ ساتھ جو اس احساس نے قلب کو چھوا تو گویا جان ہی آنی جانی ہو گئی، والی کیفیت طاری رہنے لگی۔

اب بھی یہ سوچ کر وہی حال ہونے لگتا ہے۔ اللہ اللہ! بیان سے باہر ہے۔ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں، جو اس کیفیت کی ترجمانی کر سکیں جب رمضان سے ایک روز قبل ہم لوگ یہاں منتقل ہوئے اور زیادہ مساجد، مدارس کا قیام۔ ایک وقت میں کئی کئی مساجد سے آذانوں کی آوازیں پھر ساتھ ہی جب کسی کے مرنے کا اعلان ہوتا تو اپنی موت یاد آجاتی کہ کہیں اگلا نمبر ہمارا ہی نہ ہو۔ وہ اعلان بھی ہر مسجد میں ہوتا۔ چوں کہ دین کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی تو ایک اعلان کئی کئی مرتبہ سن کر دل شدید اداس رہنے لگا۔ شب و روز کے اعلانات نے اس کے قلب کی حالت یکسر بدل دی تھی

اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے لگی کہ، ''نصیحت کے لیے موت کا دھیان ہی کافی ہے۔''

حالِ دل عجیب سے عجیب تر ہوتا جا رہا تھا۔لیکن الحمدللہ! آج جب یہ عمارتیں دیکھتی ہوں تو دل اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ یہاں منتقل ہونا باعثِ رحمت بنا۔تاہم، ساتھ ہی یہ غم نڈھال کرنے لگتا ہے کہ آج اس امت کو کیا ہو گیا ہے؟ کس کام کے لیے آئی تھی اور کیا کما کر جا رہی ہے؟

عائشہ اسی غم، اسی خیال میں ڈوبی حقیقت کی دنیا کو نہ چاہ کر بھی مانتے ہوئے سکوت اختیار کیے دل میں آنسوؤں سے رو رہی تھی۔اندر ہی اندر اک درد اسے ستانے لگا تھا کہ یا اللہ! ہمیں کیا پانا تھا اور کیا پا رہے ہیں؟ کیا گنوانا تھا اور کیا گنوا رہے ہیں؟؟ انہیں خیالوں میں کھوئی عائشہ کو ہمیشہ کی طرح اس کورس نے دوبارہ وہ جذبات لوٹا دیے تھے، جنہیں کھو دینے پہ وہ اکثر غمگین رہا کرتی، لیکن آج اسے اس احساس نے جھنجھوڑ دیا تھا کہ مشاہدہ کرنے اور حال دل بیان کرنے سے بھی جذبات دوبالا و پُر جوش ہوا کرتے ہیں۔یہ تھا اپنا کچھ درد، کوئی سوچ.... جسے نجانے کبھی عملی روپ میں دوبارہ دیکھا بھی جائے گا یا یہ ارمان، حسرت ہی بنے رہ جائیں گے۔

☆.....☆.....☆

پھولوں جیسے نازک جذبات

آج ایک تحریر پڑھ کر دل موم ہو گیا۔ شاید نہیں بلکہ یہی حقیقت ہے کہ آج والدین کو صرف بچوں کا مستقبل اچھا بنانے کی فکر ہے۔ حالاں کہ ان کو کھلانے والا بھی اللہ ہی ہے، اگر اللہ نے انہیں کھلانے کے لیے ذرائع پیدا کیے تو کیا ان کی اولاد کو بھوکا مارے گا؟ اس نے تو خود فرما دیا کہ ''اور جو اس کے لیے تقویٰ اختیار کرتا ہے (گناہوں سے بچتا ہے) تو وہ اس کے لیے وہاں سے رزق کا انتظام فرماتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہو سکتا۔'' وہ تو خود فرما رہا ہے، صرف مجھ سے ڈر کر، گناہوں سے بچ کر زندگی گزارو۔ میں لمبی لمبی عبادتوں کا نہیں کہتا، بس صرف میری حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اگر تم حلال و حرام، جائز ناجائز کا خیال رکھ کر زندگی گزارو تو میں تمہارے لیے وہاں سے رزق کا انتظام کروں گا، جہاں سے تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ لیکن ہمیں اپنی تو کیا، اپنی اولاد بلکہ اولاد کی اولاد کی بھی فکر لگی رہتی ہے۔ اور جو فکر ہونی چاہیے تھی، جو جذبہ ابھرنا چاہیے تھا، وہ تو ختم ہونے کے قریب ہو چکا۔ ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اچھے گھر میں رہیں، اچھا لباس پہنیں، اچھا پڑھ لکھ جائیں۔ مگر کبھی کسی نے یہ بھی سوچا کہ ان کے بچے کیا چاہتے ہیں؟ ایسا نہیں کہ ان کا الگ ذہن ہوتا ہے۔ بچے بھی چاہتے ہیں کہ وہ اچھا کھائیں، اچھا پہنیں، اچھی زندگی گزاریں لیکن.... یہ جو لیکن کا لفظ ہے ناں، کس کو دل چیر کر دکھایا جائے کہ اس لیکن کے آگے جو الفاظ ہیں، وہ الفاظ نہیں خونِ جگر ہے۔ بہت نازک سا جذبہ ہے۔ یہ فقط الفاظ نہیں کہ بس پڑھ کر خوش ہوا جائے یا لطف اندوز ہوا جائے یا دکھی ہوا جائے اور بس۔

نہیں نہیں.... یہ وہ جذبہ ہے جسے اپنانے کے لیے آج اکثریت تڑپتی ہے۔ یہ وہ محبت ہے جسے پانے کے لیے آج کی اکثر اولاد شب میں رو کر سوتی ہے۔ یہ وہ محبت ہے جسے بچے اکثر تڑپ تڑپ کر اللہ سے مانگتے ہیں۔ جس محبت، جس جذبے، جس احساس کو اولاد شب میں پانا چاہتی تھی، دن میں اس نازک سے دل میں سمانا چاہتی تھی مگر.... مگر وہ جذبہ، وہ محبت تو کہیں دُور سوئی پڑی ہے۔ وہ جذبہ تو کہیں کوئی اور رخ اختیار کر چکا ہے۔ اس جذبے کو تو بچوں کے

جذبات سمجھنے تھے۔اس محبت کو تو بچوں کو وہ پیار دینا تھا جسے آج بچے نہ پا کر شب میں اکثر روتے روتے سو جاتے ہیں۔ یہ دل، یہ درد، یہ احساس آخر کس طرح دل سے نکال کر سامنے رکھوں۔آخر کس طرح سمجھاؤں کہ آج کے والدین نے بچوں کو وہ سب کچھ تو دے دیا جس کے بغیر وہ جی سکتے تھے مگر وہ چیز، وہ محبت، وہ جذبہ، وہ احساسات نہیں دیے جن کے بغیر بچوں کا جینا محال ہے۔والدین زندہ نہ رہیں تو غم ہوتا ہے لیکن اگر زندہ ہو کر بھی وہ محبت نہ ملے تو دل میں درد کی جو لہر اٹھتی ہے وہ دکھائی نہیں جا سکتی۔

آج والدین نے بچوں کو ٹی وی دیا، موبائل دیا، ٹیبلٹ دیا، آئی پیڈ دیا، کمپیوٹر دیا، لیپ ٹاپ دیا، عالی شان گھر دیا، بنگلہ دیا، ائیر کنڈیشنڈ کمرے دیے۔اچھا لباس، اچھا کھانا پینا، اچھا رہن سہن حتیٰ کہ اچھی تعلیم دی لیکن، جو بچوں نے کبھی سرد راتوں میں بستر میں منہ دے کر تو کبھی گرمی میں نہانے کے بہانے رو کر، کبھی شب میں اللہ سے آہ وزاری کر کے تو کبھی آنکھ میں کچھ چلے جانے کے بہانے رو کر والدین کے جس جذبے، محبت اور توجہ کی کمی کو دل میں سہا۔والدین انہیں وہ جذبہ اور وہ احساس نہ دے سکے۔جس محبت کو بچے ترسے، جس محبت کے نہ ملنے پر غلط دوستیاں کر کے اپنے احساسات کو تباہ کیا، وہ محبت والدین نہ دے سکے۔

اولاد کی تربیت کے پیچھے والدین کی لاپروائی کا ہاتھ ہے۔مجھے تو آج کی اولاد دیکھ کر وہ زمانہ بھی یاد آتا ہے کہ جب بچے بختیار کاکی رحمہ اللہ علیہ بنا کرتے تھے، عطا اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ علیہ بنا کرتے تھے، صلاح الدین ایوبی بنا کرتے تھے۔آخر اس کی کیا وجہ تھی، کبھی کسی نے سوچا؟ ان کے والدین نے تو انہیں کوئی عالی شان بنگلے نہ دیے تھے۔ کوئی شاہی کھانے، ٹی وی، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ نہیں دیے تھے، پھر وہ بچے ایسے کیوں تھے جنہیں آج بھی زمانہ یاد کرتا ہے؟ آخر کیا تھا، جو ان بچوں کو ملا تھا؟ کبھی خیال آیا آپ کو؟ نہیں ناں....تو چلیں کوئی بات نہیں، آج میرے ساتھ آپ بھی سوچ لیں کہ آخر وہ کیا تھا جو ان بچوں کو ان کے والدین نے دیا تھا؟ چلیں....میں بتاتی ہوں کہ کیا دیا؟

جس کو فطرت نے قبول کیا، وہ دیا انہوں نے۔جس دین کو اللہ نے محبوب کیا، وہ دیا انہوں نے۔جس محبت کے لیے تڑپے بچے کا دل، یقین مانو وہی تو احساس دیا انہوں نے۔بس اک یہی فرق رہ گیا ہم میں اور ان میں۔انہوں نے اپنی اولاد کی فکر کی، اپنی آخرت کی فکر کی۔وہ دیا جو فطرت چاہتی تھی۔وہ دیا جس کے لیے بچے کا دل تڑپتا تھا۔تب جا کر وہ بچے، وہ بنے جنہیں آج کے نوجوان شاید ایک خواب سمجھتے ہیں۔جب انہوں نے اولاد کے جذبات کا خیال رکھا تو وہی بچے بڑے ہو کر فرماں بردار بنے۔خالق ومخلوق، دونوں میں محبوب بنے۔

آج کے بچوں کو کارٹون تو مل گئے لیکن ماں کی توجہ نہ ملی۔رنگ برنگے کھانے تو مل گئے لیکن ماں کی محبت نہ ملی۔ سیر سپاٹے کرنا تو مل گیا مگر والد سے دوستی والا انداز نہ ملا۔والدین کا وہ احساس، وہ پیار اور وہ توجہ نہ ملی، جس محبت، احساس اور توجہ کے بعد یہ عالی شان بنگلے، قسم قسم کے لذیذ کھانے اور مہنگے ملبوسات کوئی قیمت نہیں رکھتے۔کبھی دیکھا ان

غریبوں کو.... کتنے سکون سے جیتے ہیں۔ نہ مال کی فکر، نہ زیادہ ٹھاٹھ سے رہنے کی نہ شاہی کھانے پینے کی۔ بس ضروریاتِ زندگی اور مقصدِ زندگی کو یاد رکھا۔ اپنے بچوں کو وہ پیار، توجہ اور احساس دیا جسے پا کر وہ ہر اُس چیز کی خواہش اور تمنا بھول بیٹھے، جسے آج کے والدین نے بچوں کی ضرورت سمجھ کر پورا تو کر دیا مگر دراصل وہ ان کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کے بغیر بھی جی لیتے۔ اف.... سچ کہوں تو کیا تم سنو گے؟ یقین مانو، والدین کی چاہت کے بغیر زندگی بہت تلخ ہے۔

آپ بھی کسی کے والدین ہیں، خود کو جھنجھوڑیے، ہوش میں آیئے۔ ایک دفعہ کبھی تنہائی کے لمحات میں سوچیے کہ کیا آپ بچوں وہ دے رہے ہیں جسے پانے کے لیے ان کی فطرت تڑپتی ہے؟ کیا وہ محبت، وہ احساس، وہ توجہ آپ دے رہے ہیں؟ یقین مانیں، بچوں کی خواہش ضرور ہوتی ہے کہ وہ بھی اچھا کھائیں، اچھا پہنیں لیکن جب والدین کی بات آتی ہے تو مت پوچھیں، آنسو گلے ہی میں رہ جاتے ہیں۔

وہ جذبات، وہ درد قابلِ بیان نہیں۔ بس سنبھل جائیں۔ سنبھل جائیں، خدارا ابھی وقت ہے، سنبھل جائیں۔ انہیں آپ کی محبت، توجہ، پیار اور آپ کے ہونے کا احساس چاہیے۔ آپ اپنے فرائض پہ غور کیجیے۔ وہ معمولی خوراک کھا کر زندہ رہ جائیں گے۔ بہت زیادہ اچھا نہ پہن کر جی لیں گے لیکن آپ کی توجہ اور محبت کے بغیر وہ اندر ہی اندر گھٹ کے مر جائیں گے۔ خدارا.... کچھ سوچیں۔

☆.....☆.....☆

رشتوں کی مٹھاس

کوئی مانے نہ مانے، میرا دل یہ بات نہیں مانتا کہ کوئی اس طرح خاندان سے کٹ کر، اکیلے زندگی گزارے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، تنہا کھاؤ پیو اور بس۔ آج تینوں دوستوں نے ایک دعوت میں یہ تذکرہ شروع کر دیا۔ لائبہ کم گو لیکن اس کے جذبات سے کبھی سب متفق ہوتے تو کبھی نہ بھی ہوتے۔ اور آج بھی یوں ہی ہوا۔ دونوں دوستیں اس کی باتوں سے اتفاق نہیں کر رہی تھیں۔ نور کہتی، یار! چھوڑو، یہ کیا رشتے داروں کی باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہو۔ لائف انجوائے کرو۔ حنا کا ذہن ایسی باتوں سے منتشر ہو جاتا۔

تذکرہ شروع ایک چھوٹی سی بات سے ہوا، اور یہ خاندانی رشتوں کو لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ مجھے تو وہ وقت دل کو بہت بھاتا ہے جب میں، امی ابو، بہن بھائی، سب کو اکٹھے بیٹھے دیکھتی ہوں۔ لائبہ اپنی سوچ کا اظہار کر رہی تھی لیکن نور اس کی باتوں سے جیسے چڑ رہی ہو۔ لائبہ! جانے بھی دو، کیا باتیں کرنی کسی سے۔ بس سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوتے ہیں۔ کسی کے پاس کہاں اتنا وقت ہے کہ مل کے بیٹھے۔ نور اپنی سوچ بتا رہی تھی۔

لیکن نور! مجھے تمہاری یہ بات سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ جو تم رات، دیر تک موبائل پہ لگی رہتی ہو، لیپ ٹاپ پہ بیٹھی رہتی ہو، اس کے لیے وقت کیسے نکل آتا ہے؟ اب تو حنا کو بھی لائبہ کی باتوں میں کچھ دلچسپی محسوس ہوئی اور وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کیوں حنا! ایسی بات ہے کہ نہیں، ہم نے آج اپنوں کی محبت کو کھو دیا ہے۔ اسی لیے تو ہمیں جینے کا مزہ نہیں آتا۔ وہ بھی کتنا پیارا دَور تھا جب بڑے، چھوٹوں کو نصیحت کیا کرتے تھے اور کسی ایک کو کوئی تکلیف ہو تو سب فکرمند ہو جایا کرتے تھے۔ سب کی بے چینی قابلِ رشک ہوتی تھی۔ دیکھو ناں! آج ہم نے بڑوں کی صحبت میں، بزرگوں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے میں دلچسپی چھوڑ دی ہے۔ ہر کوئی اپنی ہی دُھن میں لگا ہے۔ بزرگوں کی دعائیں لینی، ان کی نایاب باتیں سننی چھوڑ دی ہیں۔ تو دیکھو! ہم قدم بہ قدم نقصان اٹھاتے ہیں۔ لائبہ کی بات آخر درست ہی تو

تھی۔

ہاں لائبہ! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔حنا نے لائبہ کی بات کی تصدیق کی اور اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔لائبہ! آپ کی باتوں سے مجھے وہ زمانہ یاد آنے لگا جب ایک دفعہ میری امی جان کو اچانک بخار ہو گیا اور ابو اتنے پریشان ہوئے کہ ہم سب بھی فکر مند ہو گئے کہ اب نجانے کیا ہو جائے۔حالاں کہ پھر اللہ کا کرم ہوا اور امی جان بالکل ٹھیک ہو گئیں لیکن اس بیماری کے آنے سے میرے دل نے گواہی دی، واقعی یہ رشتے بہت اچھے ہیں۔کوئی دکھ سکھ میں ساتھ دینے والا، درد کو سمجھنے والا بھی ہے۔

لائبہ! آپ کو معلوم ہے، میرے بڑے بھائی بیرون ملک ہوتے ہیں۔وہ اکثر باتیں کرتے ہیں ناں....تو یقین مانو مجھے کبھی کبھی تو شدید حیرت کے ساتھ یہ سوچتے ہوئے کئی دن لگ جاتے ہیں کہ وہاں کے لوگ انسان ہیں بھی یا نہیں؟

کیوں حنا! ایسے کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟ لائبہ! اگر آپ سننا ہی چاہتی ہیں تو پھر سنیں۔ایک دفعہ میری فون پر بھیا سے بات ہو رہی تھی، وہ بتانے لگے کہ آج میرا گزر ''اولڈ ہاؤس'' میں ہوا۔میں سمجھی، شاید کوئی پرانا گھر ہو گا جسے بھیا نے دیکھ لیا ہو گا کیوں کہ وہاں تو بڑی بڑی عمارتیں اور عالی شان مکانات ہیں۔تو میں نے پوچھا کہ بھیا کیا کیا تھا اس پرانے گھر میں؟ تو بھیا ہنسنے لگے اور مجھ سے کہا، میری پیاری بہنا! آپ کو ابھی تک اس کا علم نہیں؟ چلیں....میں آپ کو بتاتا ہوں۔اصل میں یہاں جن لوگوں کے والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں اس گھر میں چھوڑ جاتے ہیں۔

اچھا! سچی بھیا؟ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔یہ کیسے ہو سکتا ہے، اتنے پیارے امی ابو، جنہوں نے اتنے پیار سے پال پوس کر بڑا کیا، اچھا انسان بنایا، تعلیم دلوائی۔وہ کیسے ان کی سب قربانیوں اور محبتوں کو بھول کر انہیں اس گھر میں چھوڑ آتے ہیں۔بس حنا! آپ نہیں جانتیں، یہاں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔آج جب میں کام سے واپس گھر کی طرف جا رہا تھا۔جلدی میں تھا کہ گھر جا کر کھانا بھی بنانا ہے۔میں نے راستے سے کھانے کا سامان لیا تو ایک بہت ضعیف اماں کو دیکھ کر اپنی امی جان کی یاد آ گئی۔ان کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آ گیا اور میں ان کے پاس چلا گیا۔جب قریب گیا تو وہ بھی جیسے میرے انتظار میں تھیں۔میرے قریب ہوتے ہی وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنے اور رونے لگیں۔میں انہیں تسلی دینے لگا کہ نجانے کیا حادثہ ہو گیا ان کے ساتھ۔تو کہنے لگیں، بیٹا! میں آج موت مانگ رہی ہوں لیکن پتا نہیں کب آئے گی۔

میں نے پوچھا، کیوں اماں! کیا ہوا؟ تو کہنے لگیں، ''وہ والا سامنے گھر دیکھ رہے ہو؟'' میں نے کہا، جی اماں! تو کہنے لگیں کہ میرا بیٹا! مجھے وہاں چھوڑ آ۔اتنا کہہ کر وہ پھر سے رونے لگیں اور میں عمارت کا نام پڑھ کر سمجھ گیا۔میں نے انہیں تسلی دی تو وہ کچھ سنبھل کر بولیں، میں کئی دنوں سے بیمار ہوں۔آج بیٹے سے علاج کے لیے کچھ پیسے مانگے تو اس

نے پہلے مجھے مارا پھر وہاں چھوڑ گیا کہ میں تیری کھانسی اور خرچوں سے تنگ آ گیا ہوں۔

وہ ابھی اور کچھ کہتی لیکن گارڈ آ کر انہیں اُس گھر میں لے گئے۔اس واقعہ نے مجھے بے چین کیے رکھا کہ آج زمانے کو کیا ہو گیا ہے؟ بس لائبہ! اس دن سے میرے دل میں اپنوں کا پیار و محبت رچ بس گیا اور دل میں یہ بات بار بار آتی ہے کہ کیا وہ انسان نہیں کہ کسی کے درد، کسی کے احساس کو محسوس کریں۔آخر وہ کیسے لوگ ہیں جنہیں والدین کی فکر ہی نہیں۔حنا بات کرتے ہوئے گلوگیر ہو گئی۔ہاں حنا! یہی بات تو میں سوچتی ہوں۔آج احساس، دکھ درد کا جذبہ ختم کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ یہ دکھ درد تو انسان کو ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں۔ان دکھوں میں سکھ دینے ہی سے تو رشتوں میں پیار و محبت بڑھا کرتا تھا۔ مجھے اکثر حضرت اویس قرنیؓ کا واقعہ یاد آتا ہے۔حضرت اویس قرنیؓ نے والدین کی کیسی خدمت کی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ اویسؓ سے اپنے لیے دعا کروائیے گا۔اتنا بڑا مقام انہیں والدین کی خدمت سے ملا تھا اور آج ہم کس رخ پہ جا رہے ہیں؟ والدین بھوکے ہوں اور ہمیں اپنی ہی خوشیوں کی فکر رہتی ہے۔

ہاں حنا! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔لائبہ نے کہا۔ان دونوں نے نور کو دیکھا، جو سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔وہ بولی، آج مجھے احساس ہوا کہ اصل محبت، اصل پیار یہی ہے۔اگر اپنوں میں محبت نہ ہو تو زندگی کا مزہ نہیں۔یہ محبت، یہ احساس ہی رشتوں کو جوڑے رکھتا ہے۔میں نے آپ دونوں کی باتوں میں بہت سکون پایا۔آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں۔مجھے اپنوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔میں اپنی والدہ سے اکثر بدتمیزی سے پیش آتی ہوں لیکن آج کے بعد میں کبھی ان کا دل نہیں دکھاؤں گی۔نور کی بات پر وہ دونوں مسکرا دیں۔

☆.....☆.....☆

مقصد زندگی

آج جویریہ اور عائشہ کافی دنوں بعد کلاس میں اکٹھی بیٹھی تھیں۔ ''میں نے اس راستے کو چھوڑ کر دین کا راستہ چن لیا ہے۔'' عائشہ نے جویریہ سے کہا۔ عائشہ! ایسے کیوں ہوتا ہے کہ جس کام کی نیت میں کروں پہل آپ کرتی ہیں؟ جویریہ نے پوچھا۔ ''نہیں، جویریہ! بات یہ نہیں، صرف اللہ کے ہاں قبولیت کی ہوتی ہے کہ وہ جب، جس کو چاہے قبول کر لے۔'' عائشہ نے مدھم لہجے میں کہا۔

اب جویریہ سوچنے لگی کہ جن راہوں پہ میں نے چلنے کا سوچا تھا، اس پہ پہلے عائشہ کے قدم کس طرح آئے۔ آخر کس بات نے عائشہ کی زندگی بدل دی؟ جب کہ عائشہ دین سے دُور اک الگ ذہن کی مالک تھی۔ جسے دین کی سمجھ نہیں تھی، دین کی خبر نہیں تھی۔ آج اسے کیسے دین کا یہ درد مل گیا؟ عائشہ! آخر کس بات نے آپ کا ذہن بدل دیا؟ جویریہ اب عائشہ کی طرف یوں متوجہ تھی گویا کلاس میں عائشہ کے سوا کوئی بھی نہ ہو۔ جویریہ! آپ کو یاد ہے، میں نے اور آپ نے ساتویں جماعت میں قرآن مع ترجمہ پڑھنے کا فیصلہ کیا تھا؟ جی جی! مجھے یاد ہے۔ جویریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب جویریہ اگلی بات جاننے کی منتظر تھی۔

بس جویریہ! وہیں سے میری زندگی کا رخ مڑنے لگا تھا۔ جب ترجمہ قرآن شروع کیا تو انہیں دنوں میرا ناظرہ قرآن مکمل ہوا جس پہ استانی صاحبہ نے مجھے کچھ کتابیں ہدیہ میں دیں۔ میں نے انہیں سنبھال رکھا تھا اور اب، جب ہم کچھ ماہ پہلے اپنے اس نئے مسافر خانے میں آئے تو ایک دن اچانک ان کتابوں کا خیال ایسا غالب ہوا کہ میں انہیں پڑھنے پر مجبور ہوگئی۔ بس وہ پڑھنا تھا کہ میری زندگی ہی بدل گئی۔ ہر بات دل میں اترتی چلی گئی۔ مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں نے جان لیا کہ زندگی کا مقصد یہ نہیں ہے، جو ہم گزار رہے ہیں۔

عائشہ! آپ نے کیا پڑھا تھا؟ مجھے بھی بتائیں، میں بھی آپ کی طرح بننا چاہتی ہوں۔ عائشہ بولی۔ میں نے

کتاب سرورق دیکھا، نام پڑھ کر سمجھ نہ پائی۔ ''شرعی پردہ'' اس کا کیا مطلب؟ پھر سرسری نظروں سے جونہی صفحات کو آگے پیچھے پلٹا تو ایک جگہ نظر جا کر رک گئی۔ بس شاید وہی لمحہ اللہ نے میرے حق میں قبولیت کا لکھا تھا۔ بات ایسی کہ میری روح تک میں اتر گئی۔ میری نظریں پڑھ رہی تھیں اور دل رو رو کر اللہ سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

اچھا!؟ جویریہ بھی گویا عائشہ کے احساسات کا اثر لینے لگی تھی۔ عائشہ نے کہا، 'بوڑھوں سے پردے کی زیادہ ضرورت ہے۔' یہ سرخی تھی۔ میں پوری تحریر پڑھتی گئی اور سوچ رہی تھی کہ یہاں بوڑھوں کا ذکر ہے اور میرا تو جوانوں سے بھی پردہ نہیں۔ کیا معاملہ ہوگا میرا؟ پھر کتاب بند کر کے سوچنے لگی کہ ہم اگر کوئی چیز بنائیں تو اس کے بنانے کا کچھ مقصد ہوتا ہے اور جب وہ چیز اس مقصد میں کام یاب نہ ہو تو ہم اسے توڑ دیتے ہیں، کچرے میں پھینک دیتے ہیں۔ تو جس انسان کے لیے اللہ نے فرمایا، ''بے شک انسان کو بہترین ساخت دے کر پیدا کیا گیا۔'' کیا انسان، جسے اللہ نے اتنا بلند مقام دیا، تمام مخلوق سے اشرف و افضل بنایا، تو کیا اللہ نے اسے بغیر کسی مقصد کے پیدا کر دیا؟ جویریہ! اس بات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا پھر اللہ نے مزید آسانی فرمائی اور میری قریبی سہیلی سلمٰی نے ''فضائلِ اعمال'' ہدیہ کی، جسے پڑھنا میرا مشغلۂ حیات ہو گیا۔ میں نے تو اللہ کو بھلا دیا تھا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں تھا کہ میں کس مقصد کے لیے اس جہاں میں آئی ہوں۔ کل اللہ نے پوچھ لیا کہ جب انسان کوئی چیز بغیر مقصد کے نہیں بناتا تو کیا میں نے انسان کو یونہی بنا دیا تھا؟ کیوں غور نہیں کیا میری تخلیق پر؟

میں کیسے کہوں جو میں نے گزاری، وہ زندگی تھی
دل چاہتا ہے یہ صدا لگاؤں وہ زندگی نہیں گندگی تھی

اللہ نے اس دنیا میں اپنے قانون، اپنے احکام، اپنی کتاب دے کر بھیجا مگر ہم نے اسے توتے کی طرح پڑھنا تو سیکھ لیا لیکن اس کے احکام جاننے کی فکر نہیں کی۔ جویریہ! تم ہی بتاؤ کہ ہمارا کوئی چاہنے والا، ماں باپ، بہن بھائی، ہمیں کوئی میسج لکھتا ہے تو ہم اسے کتنے دھیان سے پڑھتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک بات کو کئی کئی بار سوچ سوچ کر پڑھتے ہیں۔ یہ بھی تو اللہ کا ایک میسج ہے، ایک پیغام ہے، تو ہم اسے کیوں نہیں سمجھ کر پڑھتے؟؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک ایک حرف پڑھنے کے بدلے میں دس دس نیکیوں کا اجر بتایا ہے۔ ہم وہ اجر تو پا لیتے ہیں مگر جو ایک ایک بات پر غور و فکر کے بدلے میں کئی کئی ہزار سال کی عبادت کا ثواب ملتا ہے، وہ فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ جویریہ! اس سوچ کے بعد اب میں قرآن مجید کو اسی نیت سے اٹھاتی ہوں کہ میرے پیارے اللہ نے، میرے پیارے خالق نے مجھے اس دنیا میں مختصر سی زندگی گزارنے کے لیے کیا قانون دیے، کیا اصول دیے، کیا طریقے سکھائے۔ اب

تو معارف القرآن پڑھنے سے سمجھ میں آنے لگا ہے کہ یہ دنیا کی چند روزہ زندگی کچھ بھی نہیں، ہمیں اللہ نے اس دنیا میں آخرت بنانے کے لیے بھیجا ہے۔ جب ہماری آنکھیں بند ہوں گی، ان سانسوں کا رشتہ ٹوٹے گا تو معلوم ہوگا کہ کیا گنوایا ہے اور کیا پایا ہے؟ معلوم نہیں جویریہ کب موت آجائے اور میں نے کچھ تیاری نہیں کی۔ تم ہمیشہ کہتی ہوناں.... کہ میں ہر کام میں تم سے پہل کر جاتی ہوں؟ تو آؤ، آج ہم دونوں مل کر اللہ کو راضی کرتے ہیں۔ زندگی کا اصل مقصد سامنے رکھ کر اس تھوڑی سی زندگی کو گزارتے ہیں۔ آج یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ دن، جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اس کی فکر میں زندگی گزاریں گے۔

ہاں عائشہ! میں تیار ہوں۔ ہم ساتھ مل کر اللہ کو راضی کرتے ہیں۔ مجھے بھی یہ خیال رات کو سونے نہیں دیتا کہ جب موت کا فرشتہ آئے گا تو نا معلوم وہ منظر کیسا ہوگا؟ کس طرح جاں کنی ہوگی؟ کس طرح قبر میں اکیلا سونا پڑے گا؟ کس طرح اس ذات کے دربار میں ان گناہوں کے انبار کے ساتھ حاضری ہوگی؟

اف.... جویریہ! میرا دل خون کے آنسو روتا رہتا ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ جہاں ہم ہر سال اتنی کتابیں پڑھتے ہیں، وہاں اللہ کی کتاب کو بھی پڑھوں گی، سمجھوں گی، ان شاء اللہ۔ پھر دونوں نے عہد کیا کہ اب مقصد زندگی کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیتے ہوئے زندگی گزاریں گی۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

آسیہ پری وش

آسیہ پری وش کا تعلق حیدرآباد سے ہے اور بچوں کے ادب کے لیے بہت لکھ چکی ہیں۔ رائٹرز کلب سے ایک سال سے وابستہ ہیں اور اسی پلیٹ فورم سے پاکستان کے صف اول کے اخبارات اور میگزین میں بچوں کی کہانیاں شائع کروا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ کالم اور مضامین بھی لکھ چکی ہیں۔ ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔

فہرست تحریر:

1- اپنی دنیا آپ پیدا کر

2- معاشرے کی اصلاح کیسے ممکن

3- اصل محتاجی معذوری نہیں ذہنی ہے

4- ٹیوشن سینٹر

5- توجہ کے طالب، اپنے آنگن کے پھول

☆.....☆.....☆

اپنی دنیا آپ پیدا کر

ہمارا پیارا وطن پاکستان جس کے وجود کو زمین کے خطے پر منوانے کے لیے اس کے بانی قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی بیماری اور اس سے ہونے والی بے تحاشا تکلیف سے لڑتے اور بیماری کو چھپاتے اپنی تمام تر توانائیاں اس پہ صرف کر دیں۔ پاکستان کے قیام کے سال بعد ہی جن کے اس بیماری کے باعث انتقال پہ انگریز حکمرانوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کچھ یوں کہا تھا کہ اگر ہمیں قائداعظم کی اس بیماری کا پتا ہوتا تو ہم قیام پاکستان کو ابھی ٹالتے رہتے۔ ہمارے قائد نے اپنی بیماری کی راز داری صرف اس لیے رکھی کہ ہمیں اپنی پہچان مل سکے۔ ہمیں اپنے آزادانہ حقوق مل سکیں۔

ایک الگ آزاد ملک کا مفہوم صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کسی قوم کی غلامی کی صعوبتیں سہی ہوں۔ جنہیں صرف اپنی ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی بھی جانی، مالی اور دوسری قربانیوں کا بھی شدت سے احساس ہو۔ جنہوں نے صرف آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے ایک بڑی اور پُر خطر ہجرت کی۔ دراصل انہیں ہی آزادی کی قدر و منزلت کا پتا ہوگا۔

بیشمار تکلیفوں اور قربانیوں سے وجود میں آنے والی اس پاک سرزمین کو ہم پاکستانیوں نے اس دوراہے پہ لا کھڑا کر دیا ہے کہ اپنے قائد کے اپنی ہی زندگی پہ لاگو کیے اصولوں کو بھلائے خود کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر یا اپنے مفاد کی خاطر اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے اور پھیلائے پاکستان کے نظام کی بُرائیاں کھول کھول کے بیان کرنے لگتے ہیں، کبھی دوسروں پہ الزام لگاتے، کبھی انہیں برائیوں کو برا کہتے ہوئے بطور پاکستانی ان برائیوں میں ہاتھ ڈالنے پہ خود کو مجبور سمجھ کر تو کبھی کسی اور طریقے سے۔

پاکستان کی برائیاں کرتے ہم دشمن ممالک کو یہ باور کرا رہے ہوتے ہیں کہ ہم ایک کمزور قوم ہیں۔ آؤ ہم پہ مسلط ہو جاؤ۔ وہ غیر ممالک جن کی نظر میں ہماری پاک سرزمین کی مضبوطی بے مثال تھی۔ 1965 کی جنگ میں ہماری قوم کی

اسی مضبوطی کی وجہ سے ہمیں ملی غیبی امداد کی کئی مثالیں ہمارے اردگرد بکھری پڑی ہیں اور وہی ہمارا مضبوط ملک اب ان غیر ممالک کی نظر میں کیا اور کیوں ہے۔ ذرا سوچیے۔

درحقیقت پاکستان کو عیاں کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کوئی جیتا جاگتا سانس لیتا وجود نہیں ہے بلکہ یہ ہماری پہچان، ہماری ذات، ہمارا کردار ہے۔ جسے سب لوگوں سے منوانے کے لیے ہم ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں لیکن پاکستان کے نظام کو برا بھلا کہتے دراصل ہم اپنے اصل کو بھلائے اپنی پہچان، ذات اور کردار کی نفی کرتے ہیں۔

پیدائشی آزاد فضاؤں میں سانس لینے والے غیر ممالک کی غلامی کو ترجیح دیتے پھر سے آزادی سے غلامی میں جانے پہ خود کو خود ساختہ مجبور پاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اگر ہمارے ملک کے ٹھیکیدار اس کی تعمیر و ترقی میں صحیح کارکردگی نہیں دکھا رہے تو کیا اس میں رہتے ہم پہ یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ جس سرزمین نے ہمیں رہنے کے لیے اپنا سائبان دیا ہوا ہے اس کی ناقص تعمیر پہ بجائے حکمرانوں پہ واویلا کرنے کے، اس کی مضبوط تعمیر و ترقی کے لیے اپنے طور پہ اپنے کردار کو فعال بنائیں؟ یا یہ بہتر ہوگا کہ اس کی صرف فکر میں مبتلا جلتے کڑھتے اور دوسروں پہ الزام دھرتے خود ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے ایک طرف بیٹھ جائیں یا پھر اپنے سائبان کو کمزور جان کر اسے چھوڑ کے غیروں کے در پہ بھٹکا جائے؟

اگر ہم چاہیں تو پورے پاکستان کی فکر میں غلطاں رہنے اور دوسروں کو دیکھنے کے بجائے خود آگے بڑھ کر اپنے گھر اور آس پاس کے علاقے کے ہی مسائل کو حل کر کے انہیں صاف ستھرا، اخلاقی لحاظ سے ترقی پذیر اور امن کا گہوارہ بنا کر اپنے پاکستان کے ایک چپے کی خوشحالی کی داستان بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم پورے پاکستان کو سنوار نہیں سکتے تو اپنے حصے میں ملے پاکستان کو ہی خوشحال بنا کر اور اس کی حفاظت کر کے اپنی پاک سرزمین سے صرف زبانی سچائی اور ایمانداری دکھانے کے بجائے اپنی عملی سچائی اور ایمانداری کا ثبوت دے کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ وطن ہمارا ہے ہم ہیں پاسبان اس کے۔

☆.....☆.....☆

معاشرے کی اصلاح کیسے ممکن

مایوسی کفر ہے۔سو یہ سوچنا کہ آج کے معاشرے کی اصلاح ناممکن ہے تو یہ غلط ہوگا کیونکہ معاشرے میں اچھائی اور برائی لیے دونوں طرح کے لوگ موجود ہیں لیکن معاشرے کی اصلاح کیسے ممکن ہو؟ معاشرے کی اصلاح سے پہلے ہمیں خود اپنی اصلاح کرنی ہوگی کیونکہ اس معاشرے کا ہم خود بنیادی حصہ ہیں۔ پہلے ہمیں خود کا جائزہ لے کر اپنی خامیاں سدھارنا ہوں گی۔اپنے اندر مثبت سوچ لانی ہوگی۔ایسی مثبت سوچ جس کے ذریعے ہم اپنے اندر کی منفی اور تخریب کارانہ سوچوں کو شکست دے کر اپنی سوچوں اور ارادوں کو یکجا کر کے دوسروں کے لیے خود کو مددگار ثابت کر سکیں اور خود کو قرآن کے پلیٹ فارم پہ لا سکیں۔خود میں بدلاؤ لا کر ہی ہم دوسروں میں بدلاؤ لانے کے قابل بن سکتے ہیں۔

آج کل جگہ جگہ پہ اسکولز اور کالجز کھل رہے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے ایک طرح سے بزنس بنتا جا رہا ہے۔اپنے مقصد سے ناواقف ان اسکولز اور کالجز میں روز بروز طالب علموں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ وہیں پہ غریب کے بچے یہ سوچ کے اسکول اور کالجز سے قدم پیچھے ہٹا رہے ہیں کہ تعلیم حاصل کر کے کون سا نوکری مل جانی ہے۔ہم معاشرہ یہ کیوں سمجھتا ہے کہ تعلیم صرف ڈگری لینے کا نام ہے یا تعلیم نوکری کے لیے حاصل کی جاتی ہے؟تعلیم کا اصل مقصد اچھے برے کی پہچان کے ساتھ ساتھ خود اپنی پہچان کرنا ہے اور اپنے لیے سیدھی راہ کا تعین کرنا ہے لیکن آجکل جتنی زیادہ تعلیم' اتنا ہی زیادہ غرور ہو گیا ہے۔ یہاں پہ ہمیں اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔تعلیم ہمیں خود کی پہچان کرنے کے لیے حاصل کرنی ہوگی نہ کہ ڈگری یا نوکری کے لیے۔تعلیم کے اصل مقصد کو پہچان کر یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ تعلیم اپنی درسی کتابوں کے ذریعے اپنے مدارج طے کراتے ہوئے ہمارے لیے کیا کیا سیکھنے، سمجھنے اور پہچاننے کے در وا کرتی ہے۔ہمیں کون سے اخلاقی سبق سمجھانے کی کوشش کرتی ہے ورنہ تو اپنے ملک کیا باہر کے ملکوں سے بھی بڑی بڑی ڈگریاں لائے لوگوں کے ساتھ ساتھ کچھ علماء کو بھی تعلیم کے مفہوم سے نا آشنا دیکھا گیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں بیروزگاری بہت بڑھ گئی ہے۔لوگ بڑی بڑی ڈگریاں سنبھالے ادھر ادھر نوکری کے

لیے بھٹک رہے ہوتے ہیں۔جن میں سے اکثر لوگ مایوس ہوکر کچھ ایسا کر بیٹھتے ہیں جن پہ بعد میں انہیں اوران کے گھر کے افراد کو رونا اور پچھتانا پڑتا ہے۔اگر ادھر ادھر ان پتھر کے دیوتا بنے لوگوں کا منہ دیکھنے کے بجائے ہم اپنی مدد آپ کے تحت خود ہی ایک چھوٹے سے کام کی بنیاد رکھ کر خود کو بیروزگاری سے بچا کر اپنے جیسے ہی دوسروں کے لیے بھی روزگار کے مواقع پیدا کر سکتے ہیں۔صرف نیک نیتی کے ساتھ تھوڑی سی ہمت، پختہ ارادے اور مسلسل کوشش سے ہم بھی عبدالستار ایدھی کی مثال بن سکتے ہیں جو کہ معاشی مشکلوں کے باوجود اپنی نیک نیتی اور پختہ ارادے کے بل بوتے پر خود اکیلے ہی چھوٹے سے کام کی شروعات کر کے انسانی خدمت اور مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور آج ان کی مسلسل جدوجہد کے سبب ان کا وہ چھوٹا سا کام بڑھ کر پاکستان کی سب سے بڑی تنظیم بن گیا ہے۔جس کے ذریعے بہت سے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگوں کو روزگار بھی مل گیا ہے۔ہم چاہیں تو عبدالستار ایدھی جیسا کردار ہم بھی ادا کر سکتے ہیں بس شرط اللہ پہ بھروسے، نیک نیتی اور پختہ ارادے کے ساتھ مسلسل جدوجہد کی ہے۔

کچھ حدود اسلام نے ہمارے لیے مقرر کر رکھی ہیں جن کو توڑنا معاشرے کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔ان میں سے ایک 'اسلام میں عورت کو پردے کی تلقین کی گئی ہے۔آجکل کی عورت پردے کو بطور فیشن، بغیر پردے اور فیشن ایبل بن کے عام گھومتی نظر آتی ہے۔پھر کہا جاتا ہے عورت کی عزت محفوظ نہیں۔ان عورتوں کی وجہ سے پردے کی پاسداری کرنے والی عورتوں کی عزت کو بھی خطرہ رہتا ہے۔ہمارے سچے دین اسلام کی مقرر کردہ حدود کو پار کرنے والی عورتوں کو اپنی حیا اور پردے کی حفاظت کرنی ہوگی۔

ہمارے معاشرے کے بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے اللہ سے دوری ہے۔دنیا کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکلنے کی لگن اور اس دوڑ میں شامل لوگوں کو کچل کر آگے بڑھتے جانے کی کوشش میں ہم اللہ کو بھولتے جا رہے ہیں۔اللہ اور دعا پہ یقین رکھ کے صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرنا ہمارے اندر سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔جس کی وجہ سے بے سکونی اور ہیجان آمیز کیفیت ہمارے معاشرے کا حصہ بنتی جا رہی ہے جن کا نتیجہ اکثر خودکشی بھی نکلتا ہے۔خودکشی کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ پہلے ہی ہم دنیا میں کم دُکھی ہیں جو مرنے کے بعد بھی اپنے لیے مستقل دکھ اور تکلیف خرید رہے ہیں۔دنیا میں پھر بھی کہیں نہ کہیں خوشی ملنے کی امید تو ساتھ رہ سکتی ہے۔ہم معاشرے کے سدھار کی سب سے بڑی ضرورت اللہ پہ مکمل یقین، مثبت سوچ اور پختہ ارادے کے ساتھ ہم سب کا متحد ہوکر اسلام قرآن کے پلیٹ فارم پہ مضبوطی سے قدم جمانا ہے۔جس سے ہم معاشرے کی اندرونی اور بیرونی برائیوں اور سازشوں پہ قابض ہو سکتے ہیں۔

آخر میں یہ بات ہمیں اپنی یہ سوچ بھی بدلنی ہوگی کہ ہمیں اچھائی کا درس دینے والے دراصل خود کیا ہیں۔کیا کیا کرتے پھرتے ہیں سو ان پہ طنزیہ سوچ لاگو کرتے ہوئے ان کی نصیحت ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے کے بجائے ہمیں ان کی نصیحت دھیان سے سن کر اس پہ عمل کرنا چاہیے کیونکہ اس پہ عمل کرنا ہمارے لیے ہی بھلائی ثابت

ہوسکتی ہے۔ باقی ہر ایک کا عمل ان کے اپنے ساتھ ہی رہنا ہوتا ہے۔ سو اچھائی کا درس دینے والے کا کردار جانچنے کے بجائے ہم اس اخلاقی درس یا نصیحت سے پہلے خود کی اور پھر اپنے عمل سے دوسروں کی اصلاح کر کے خود سے ہی منسلک معاشرے کی اصلاح میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ اپنے عمل سے معاشرے کی اس سوچ کو بھی بدل سکتے ہیں کہ ہمیں اچھائی کا درس دینے والے خود کیا ہیں۔ کیا کیا کرتے پھرتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اصل محتاجی معذوری نہیں ذہنی ہے

میں مانتی ہوں کہ میرے گھر والے میرا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ میں جو یہ صاف ستھری زندگی گزار رہی ہوں یہ ان سب کی ہی مرہون منت ہے۔ مجھے گھر کے اندر ہی بن کہے ہی ہر نعمت مہیا کر دیتے ہیں لیکن ان سب آسائشوں کے باوجود میں گھر میں فارغ بیٹھے بیٹھے اپنی اس فارغ اور یکسانیت بھری زندگی سے اُکتا گئی ہوں۔ میں ان معذور لوگوں کی طرح جو دنیا میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں ان کی طرح خود کو کارآمد بنانا چاہتی ہوں۔ خود کو ضایع ہونے سے بچا کے کچھ کرنا چاہتی ہوں اور خود کو کچھ ثابت کروانے کے لیے مجھے گھر سے باہر نکلنا ہوگا۔ کورسز کرنا ہوں گے اور اس کے لیے مجھے بھائیوں کی مدد اور ساتھ کی ضرورت ہے کہ وہ مجھے لے کر جائیں اور لے کر آئیں لیکن میری اس خواہش کے سامنے ان کی اپنی مصروفیات ہیں جن کے سامنے انہیں میری بیزار کن فراغت نظر ہی نہیں آتی۔ میرا ضایع ہونا دکھائی ہی نہیں دیتا۔ یہ نعمتوں بھرا گھر میرے لیے سونے کا پنجرہ ثابت ہو رہا ہے۔

واقعی معذوری بہت بڑی محتاجی ہے۔ وہیل چیئر پر بیٹھی اپنی اس حساس دوست کے اس مایوسی بھرے شکوے اور اپنی اس سوچ نے مجھے ان سوچوں میں غرق کر دیا جن کی بنا پر میرے اندر میں کچھ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

ہوا کچھ یوں کہ اپنی اس سوچ کے ساتھ بیاختیار میرے ذہن میں بچپن میں بہت شوق سے دیکھی گئی ایک کارٹون سیریز گھوم گئی۔ جس میں ایک حادثے میں معذور ہوا ایک نیگیٹو کردار تھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھا وہ مشین میں جکڑا کردار جس کے جسم کا کوئی عضو کام نہیں کرتا تھا سوائے اس کے دماغ کے اور اس کے دماغ سے نکلے منصوبے ایسے ہوتے تھے کہ عام انسان کی عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ بھلے منفی ہی سہی پر اس نے ثابت کر دکھایا تھا کہ ایک معذور انسان بھی پوری دنیا کو ہلا سکتا ہے اگر اُس کی سوچ، اُس کا ذہن معذور نہ ہو تو۔

واہ کیا باہمت کردار تھا وہ۔ ویسے اس باہمت کردار سے مجھے ایک باہمت واقعہ یاد آ رہا ہے جس کی ہمت نے

میری عقل کو بھی گھما ڈالا تھا۔لیکن اس وقت اس واقعے نے یاد آ کر میری سوچ کی پرواز کو مزید اونچائی پر ڈال دیا ہے۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ پچھلے دنوں مجھے کراچی جانے کا موقعہ ملا۔ جہاں ایک سڑک پر میں نے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس دو لوگوں کو دیکھا۔جس میں سے ایک تو ٹانگوں سے معذور تھا اور گجرے اور دوسری چیزیں ہاتھ میں لے کر فٹ پاتھ تو ایک طرف سڑک سے گزرتی گاڑیوں کے بیچ میں سے بھی خود کو تیزی سے گھسیڑتے ہوئے لیکن دراصل خود کو دوسروں کا محتاج نہ ثابت کرتے ہوئے وہ چیزیں بیچ کر کچھ کمانے کی تگ و دو میں تھا جبکہ دوسرا شخص ہٹا کٹا ہو کر بھی بھیک مانگ رہا تھا۔ جب وہ بھکاری ہمارے قریب آ کر ہم سے بھیک مانگنے لگا تو ہمارے کراچی کے میزبان نے اس ہٹے کٹے بھکاری سے کہا ''ادھر اس شخص کو دیکھو جو اپنی معذوری کی باوجود اتنی قابل رحم حالت میں بھی محنت مزدوری کر رہا ہے اور ایک تم ہو جو اپنے مکمل اعضاء کے باوجود بھی بھیک مانگ رہے ہو''۔

بھائی جی! میں ذرا آئیڈیلزم بندہ ہوں اور اپنے آئیڈیل کی کاپی کرنا اپنا فخر محسوس کرتا ہوں اور میرا آئیڈیل آج کا حکمران ہے تو جب وہ سب کچھ اپنے پاس ہونے کے باوجود اپنی خود ساختہ مجبوریاں بتا کر دوسروں ملکوں سے بھیک او سوری قرض مانگتا پھرتا ہے تو مجھے اپنے آئیڈیل کی پیروی کرنے میں کون سی عار ہے۔ وہ بھکاری بنا کسی شرمندگی کے ہنستے ہوئے اپنا موقف ہمارے سامنے رکھ کر ایک بار پھر ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور ہم اس آج کل کے آئیڈیلزم بھکاری کو حق دق سے دیکھتے رہ گئے۔

بات تو اس نے سچ ہی کہی تھی۔اقتدار پاکستان جیسی دولت ہونے کے باوجود دوسرے ملکوں سے قرض لینا مجھ کو آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارے پیارے پاکستان کی اتنی زرخیز اور سونا اُگلتی زمین کے باوجود ہم دوسروں کے محتاج کیوں بن گئے ہیں؟ یہ محتاجی آخر ہے کس چیز کی؟ جبکہ ہمارے پاکستان کے لوگ ہیں بھی بہت محنتی۔تو کیا اللہ کی طرف سے ملی اتنی سرسبز، زرخیز اور سونے جیسی نعمت کا صحیح استعمال کرنے کی بجائے ہمارے حکمران ذہنی طور پر محتاج ہیں؟ حالانکہ اگر ہمارے حکمران نیک نیتی اور ایمانداری سے کام کریں اور لیں تو ہمارے پاکستان کا ہر فرد خوشحال اور مطمئن زندگی گزار سکتا ہے۔ہمیں دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

ویسے یہ ہمارے محنتی لوگوں کی بات بھی خوب ہے جو کہ میڈیا کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ساری دنیا کو دیکھتے ہی میڈیا کی نظر سے ہیں۔کون کیا کر رہا ہے؟ کہاں پہ کیا ہو رہا ہے؟ کسی کی خفیہ سرگرمیاں کیا ہیں؟ کون کیا کیا سازش کر رہا ہے؟ کون کون اور کس کس بات پر جھگڑ رہا ہے؟ سب کچھ وہ میڈیا پہ بلکہ میڈیا کی نظر سے دیکھنے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ انہیں اپنی عقل کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ عقل جو ہمیں اشرف المخلوقات جیسے رتبے پر فائز کرنے کا سبب بنی ہے۔اس عظیم نعمت کا استعمال شاذ و نادر ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم خود بھی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا صحیح اور کون غلط ہے۔لو جی یہاں پر بھی میڈیا کی محتاجی۔

میڈیا کی بات سے مجھے امی کی ڈانٹ یاد آرہی ہے جو کہ اکثر مجھے اس بات پہ پڑتی رہتی ہے کہ اتنی اچھی سلائی کڑھائی آنے کے باوجود ٹی وی ڈراموں، نیٹ اور موبائل کے پیچھے پڑ کر میں اپنے اس سونے جیسے ہنر کو ضایع کر رہی ہوں۔ اپنی اس غفلت اور سستی کی وجہ سے اپنا یہ کام دوسروں سے کروانے کی محتاج بنتی جارہی ہوں اور امی کی اس حقیقت پر میں موبائل گیم میں الجھے اور گیم سے ہی ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ اُنہیں دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ ملٹی میڈیا اور جدید ٹیکنالوجی نے جہاں ہم لوگوں کے لیے بہت ساری تفریحات اور آسانیاں پیدا کردی ہیں وہیں پہ ہمیں اپنا عادی بنا کر ہمارے ''ایمان'' وقت اور ذہنی کسوٹیوں کو مفلوج بھی کرتی جارہی ہیں۔ ہمارے ایمان کو کمزور کر کے ہمیں صرف نام کا اللہ پر بھروسہ کرنے والا بناتے جارہے ہیں۔

دیکھا جائے تو ہم سب کہیں نہ کہیں ذہنی طور پر محتاج ضرور ہیں لیکن محسوس کرنے کے باوجود ہمیں اپنی وہ محتاجی نظر نہیں آتی۔ جبکہ معذوروں کی محتاجی نظر آنے والی چیز ہے۔ حالانکہ اصل محتاجی معذوری نہیں ہوتی بلکہ وہ سوچ ہوتی ہے جو ہمیں دوسروں کا محتاج بنا دیتی ہے۔ جسم کے کسی عضوے کی معذوری تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ سو اس معذوری کے لیے ہم اپنے پیارے اللہ سے لڑ تو نہیں سکتے لیکن اللہ کی طرف سے ملی نعمت عقل اور صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے خود کو ذہنی محتاجی سے بچا ضرور سکتے ہیں۔ اب ہماری اس مایوس دوست کو ہی لیجیے۔ اللہ نے اس کو لفظ بننے اور کہانیاں لکھنے کی صلاحیت دی ہے۔ اپنی جگہ پہ مجبور اپنے مخلص گھر والوں کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے یہ دوست اللہ اور اپنی صلاحیت پہ بھروسہ کر کے اپنی اس صلاحیت کو استعمال کر کے گھر بیٹھے بھی خود کو کچھ ثابت کرواسکتی ہے۔ اپنا نام بنا سکتی ہے لیکن وہی دوسروں کے سہارے آگے بڑھنے کی محتاج ذہنی سوچ اس کے آڑے آرہی ہے۔ نصیحت کرنا آسان خود عمل کرنا مشکل کی بنیاد پہ اس مایوس دوست کے نام ایک پیغام'' اے پیاری دوست! خود کو خود اس محتاجی سے نکالو۔

☆.....☆.....☆

ٹیوشن سینٹر

(بچوں کی کہانی)

علی ہاتھ میں پکڑی فائل کو چارپائی پہ پٹختے ہوئے خود بھی تھکا تھکا سا چارپائی پہ گر گیا۔ کیا ہوا علی؟ آج بھی نوکری کا کہیں سے آسرا نہیں ملا؟ علی کو پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے اس کی ماں نے اس کے مایوس چہرے سے روز کا اندازہ لگایا۔ نہیں امی۔ مجھے لگتا ہے کہ نوکری میری قسمت میں ہی نہیں ہے۔ مجھے تو اپنی ساری پڑھائی ضایع ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ نہیں بیٹا۔ ایسے نہیں کہتے۔ اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔ امی کے ٹوکنے پہ وہ خاموش ہو گیا۔ علی آج پڑوس سے صابرہ اور جمیلہ آئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تم ان کے بچوں کو تھوڑا سا ٹائم پڑھا دیا کرو۔ پڑوس کے بچے؟ یہ مجھے کیا ٹیوشن فیس دیں گے۔ پہلے سے شکستہ دل علی کا ماں کی بات پہ منہ بن گیا۔

علی! یہ آج کل تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ مت بھولو کہ تم بھی کبھی انہیں بچوں کی طرح پڑھائی میں مدد کے لیے ادھر ادھر پھرتے تھے۔ ماں کے سچائی بیان کرنے پر علی کو بے اختیار بچپن کے وہ دن یاد آ گئے جب پڑھائی میں مشکل پیش آنے کی وجہ سے غربت کے باعث اس کو کم فیس پر کوئی ٹیوشن پڑھانے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے اللہ کی مدد کے بعد ماں باپ کی دعاؤں اور اپنی انتھک محنت کے بل بوتے پہ ایم فل کیا تھا۔ وہ اپنی سوچ پہ شرمندہ ہو گیا۔

دیکھو بیٹا تم آج کل ویسے بھی فارغ ہو اس لیے اگر تم اپنی تعلیم کا یہاں پہ فائدہ دیتے ہوئے بنا کسی لالچ اور غرض کے ان غریب بچوں کی پڑھنے میں مدد کر دو تو کیا پتا اللہ تمہارے اس عمل سے خوش ہو کر تمہارے روزگار کے لیے کوئی در وا کر دے۔ ماں کی بات پہ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اس نے دل کی رضامندی سے رات کا ڈیڑھ گھنٹہ محلے کے بچوں کو پڑھانے کی حامی بھر لی۔

بچوں کو پڑھانے میں علی کو بہت مزہ آنے لگا۔ ان بچوں کو پڑھاتے اسے ان باتوں کو بھی سیکھنے، سمجھنے اور ذہن

نشین کرنے کا موقع مل رہا تھا جنہیں وہ زمانہ طالبعلمی میں صرف پڑھتا تھا۔ وہ تا حال دن کو نوکری کے لیے بھٹک رہا تھا لیکن رات کو اس سے مفت میں ٹیوشن پڑھنے والے بچوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دن کو ہونے والی خواری اور تھکن کے بعد رات کے ان ڈیڑھ گھنٹوں کے پر لطف لمحات نے اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ڈالا۔

کچھ دنوں سے علی بہت پریشان اور الجھا الجھا سا پھر رہا تھا۔ بچوں کو پڑھانے میں بھی اس کی عدم دلچسپی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ آج تو اس نے گھر آئے بچوں کو بھی چھٹی دے دی۔ بچوں کے جانے کے بعد وہ سر تھامے بیٹھا تھا کہ ٹیوشن پڑھنے آنے والے بچوں تنویر اور توقیر کے والد شبیر کے سلام کرنے پہ سر اٹھایا۔ وعلیکم السلام۔ شبیر چاچا آپ؟ بیٹھیے۔ علی نے چارپائی پہ ان کے لیے جگہ بنائی۔ کیا بات ہے بیٹا؟ آج کل کوئی پریشانی ہے؟ ارے نہیں چاچا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ علی نے پھیکی ہنسی سے انہیں ٹالنا چاہا۔

پریشانی بتانے سے اگر ختم نہیں ہوتی تو دل کا بوجھ ضرور کم ہو جاتا ہے سو اگر اعتماد کرو تو مجھے بتا دو۔ شبیر چاچا کی بات پہ اس کے دل کو حوصلہ ملا۔ دراصل چاچا آپ کو تو پتا ہے کہ اتنے وقت سے ادھر ادھر بھٹکنے کے باوجود مجھے کہیں نوکری نہیں مل رہی تو میں نے سوچا کہ کیوں نا کوئی کوچنگ سینٹر کھول لوں۔ سو ادھر ادھر معلومات کرائی۔ اب کوچنگ سینٹر کے لیے ایک جگہ پسند تو آئی ہے۔ وہاں پہ اس کے کامیابی کے چانس بھی زیادہ ہیں لیکن ایڈوانس، کرائے اور اوپر کے کچھ سامان کے لیے تقریبا ایک لاکھ چاہئیں۔ گھر کے حالات تو آپ کے سامنے ہیں۔ دوست احباب ایک لاکھ کا قرضہ دینے کا رسک لینے کو تیار نہیں۔ سود پہ قرضہ تو قرضے سے آدھا تو سود ہے۔ اب سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟

علی کی پریشانی سننے کے بعد شبیر تھوڑی دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد ابھی آیا کہہ کر چلے گئے جبکہ علی چارپائی پہ لیٹ کر آسمان کے تاروں میں اپنے نصیب کا تارہ ڈھونڈنے لگا۔ یہ لو بیٹا 5 منٹ کے بعد وہ دوبارہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔ پورا ایک لاکھ ہے۔ بیٹی کی شادی کے زیور بنوانے کے لیے کمیٹی ڈالی تھی اس کے کل پیسے ملے تھے۔ اب بیٹی کی شادی میں تو ایک سال پڑا ہے اس لیے ان پیسوں سے پہلے تم اپنی ضرورت پوری کر لو۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ لیکن چاچا۔۔۔۔ علی شبیر چاچا سے پیسے لینے میں کچھ ہچکچایا۔

کیوں بیٹا جب تم بنا کسی لالچ اور غرض کے ہمارے بچوں کی پڑھنے میں اتنی مدد کر رہے ہو تو کیا ہم تم کو اس مشکل میں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں؟ چاچا میں یہ قرض آپ کو جلد سود سمیت واپس کر دوں گا۔ شبیر چاچا کے بیغرض خلوص پر علی کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ نہ بابا۔ سود جیسی حرام چیز کو میں نہیں ہاتھ لگاؤں گا۔

پھر اللہ کا نام لے کر علی نے اپنے جیسے ہی چند دوستوں کو ساتھ ملا کر کوچنگ سینٹر کھولا جس کی روز بروز ترقی میں اللہ کی مدد کے بعد ماں باپ اور پرخلوص اپنوں کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ ان سب دوستوں کی انتھک محنت اور علی کو ٹیوشن سے حاصل ہونے والی معلومات کا بھی بڑا حصہ تھا۔ سینٹر سے ہونے والی آمدنی کی بدولت علی نے ڈیڑھ سال میں ہی نہ

صرف اپنے محسن شبیر چاچا سے لیا ایک لاکھ نہایت احسان مندی سے انہیں واپس کر دیا بلکہ اپنے علاقے کے سامنے کسی خدا ترس انسان کے زمین خرید کے دینے پر وہاں پر چھوٹا سا ٹیوشن سینٹر بھی بنالیا جہاں پہ وہ کم وسائل کی وجہ سے تعلیم اور ٹیوشن سے محروم اپنے محلے کے بچوں کے ساتھ ساتھ دوسرے غریب بچوں کو بھی پوری دلجمعی کے ساتھ مفت میں ٹیوشن پڑھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

آمنہ وزیر امن

قلمی و اصلی نام آمنہ وزیر اور تخلص امن ہے۔ ادب سے لگاؤ کم عمری میں والدین سے ملا۔ شاعری کا بیشتر حصہ ماحول، احساسات اور معاشرے میں ہونے والے واقعات پر مبنی ہے۔ لکھائی کا آغاز چھٹی جماعت سے کیا لیکن ایک سال سے قبل رائٹرز کلب کے پلیٹ فورم سے ہی باقاعدہ قلم کے سفر کا آغاز کیا جو کہ جاری ہے۔

فہرست تحریر:

1- دستک

2- حاصل سفر

3- (نظمیں)

☆.....☆.....☆

دستک

علیم، ماہی کے ساتھ اپنی زندگی میں مطمئن تھا۔ دونوں کو رفیقِ سفر ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ علیم عام لوگوں جیسا نہیں تھا، وہ سادہ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ بے شک زمانہ شناسی کے ہنر سے بھی واقف نہیں تھا لیکن خلوص کی دولت سے مالا مال تھا۔ اسی لیے جب ماہی کا باپ دنیائے فانی سے کوچ کر گیا تو علیم نے ماہی کے چھوٹے بہن بھائیوں کو زمانے کی ستم ظریفی سے بچانے کی خاطر نہ صرف انہیں اپنے گھر میں پناہ دی بلکہ ماہی کی بہنوں کے ہاتھ بھی اپنی سرپرستی مہندی سے رنگ دیے۔

شادی کے بعد سحر جب بھی اپنی بہن ماہی کے گھر آتی تو اپنے شریکِ حیات کے اعلیٰ اوصاف بیان کرتی، جس کا اثر یہ ہوا کہ ماہی کو علیم میں وہ تمام خامیاں نظر آنے لگیں، جن سے وہ اب تک ناواقف تھی۔

ماہی امورِ خانہ داری میں مصروف تھی، جب دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ ماہی! ماہی! کہاں ہو؟ دیکھو! دروازے پر کون ہے۔ اماں کی مسلسل آواز سے ماہی دروازے کی طرف بڑھی، جونہی اس نے دروازہ کھولا، سامنے سیلز مین ''سرف'' کے نمونے لیے کھڑا تھا۔ ماہی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے اپنا اور اپنی پروڈکٹ کا مختصر تعارف کرانا شروع کر دیا۔

میرا نام رجب ہے اور یہ ہماری کمپنی کا سرف ہے۔ اس کے ایک دفعہ کے استعمال کے بعد آپ بھی اس کی کارکردگی کی قائل ہو جائیں گی۔ ہماری کمپنی کی طرف سے ہر سال قرعہ اندازی میں انعامات کا اعلان بھی کیا جاتا ہے، جو جیتنے والے کے کوائف کے مطابق اس کے گھر پہنچا دیے جاتے ہیں۔ اگر آپ اس قرعہ اندازی میں شامل ہونا چاہتی ہیں تو آپ کو یہ پروڈکٹ رعایتی دام میں مل جائے گی۔ قرعہ اندازی کے فارم میں مکمل تفصیلات درج کروانے کے بعد ماہی نے سیلز مین کے ہاتھ سے نمونے کا پیکٹ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

وقت تین سال مزید آگے بڑھ گیا۔ علیم کا آنگن 'تانی' اور 'عبدل' کے وجود سے بھر چکا تھا۔ لیکن قدرت کو شاید

کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ برس پہلے دروازے پر دی گئی 'دستک' دراصل ماہی کے دل پر دستک ثابت ہوئی تھی۔ فون کال پر رجب کے ساتھ رابطہ، ان کی دوستی کو کافی گہرا کر چکا تھا۔

ماہی کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی، جب دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی۔ چولہے کی آنچ ہلکی کرنے کے بعد ماہی نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کا بھائی ارشاد اپنی بیوی کے بہکاوے کی وجہ سے کھڑا غصے میں دہک رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہوا اور ماہی کی کوئی بات سنے بغیر اسے زدوکوب کرنے لگا۔ ماہی نے امید بھری نگاہوں سے علیم کی جانب دیکھا، جو سامنے بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن اپنی کم ہمتی کی وجہ سے اپنی شریک حیات کو اس کے بھائی کے تشدد سے بچا نہیں پایا۔

ماہی انتہائی دل برداشتگی کے عالم میں گھٹنوں پر دونوں بازو کے حصار میں سر رکھے رو رہی تھی کہ اسی وقت موبائل فون وائبریٹ کرنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا اور اسکرین پر رجب کا نام دیکھتے ہی فون کال آن کی اور دن بھر کی تمام آپ بیتی رجب کو ہچکیوں کے ساتھ سنا دی۔ رجب کافی دیر تک اسے تسلی دیتا رہا پھر دونوں نے ایک بڑا فیصلہ کر لیا۔ ایک ایسا فیصلہ، جو آج تک ماہی اپنے شوہر علیم کی سادہ مزاج طبیعت اور اچھائی کی وجہ سے نہیں کر پائی تھی۔

آج ماہی، علیم کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ رات کے قریباً دس بجے جب علیم کمرے میں داخل ہوا تو کچھ دیر انتظار کے بعد وہ علیم سے مخاطب ہوئی۔ علیم! آج مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ ماہی کی آواز علیم کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اسے بہت حیرت ہوئی کیوں کہ پچھلے ایک ماہ سے ماہی اس سے بات کرنے سے گریزاں رہتی تھی۔ ہاں! میں سن رہا ہوں، کہو۔ علیم کو اپنی طرف متوجہ پا کر ماہی نے کہا، علیم! میں اس بندھن سے آزاد ہونا چاہتی ہوں، ماہی کی بات سن کر علیم کو اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ وہ بہ مشکل بولا لیکن کیوں....؟

میرے والد صاحب نے مجھے جس تحفظ کی نیت، یقین اور بھروسے پر آپ کے ساتھ اس بندھن میں باندھا تھا، مجھے نہیں لگتا کہ ویسا کچھ بھی ہوا۔ بے شک آپ ایک اچھے انسان ہیں لیکن ایسی اچھائی کا کیا فائدہ جب سربراہ اور محافظ ہونے کے ناتے ایک مرد اپنی شریک حیات کو تحفظ ہی نہ فراہم کر سکے۔ ماہی نے اپنی بات مختصراً مکمل کی اور علیم کو کرب کی کیفیت میں اکیلا چھوڑ دیا۔

علیم، ماہی کو بہر صورت قطع تعلقی سے روکنا چاہتا تھا لیکن ماہی کے شدید تقاضے پر علیم نے خوش اسلوبی سے اسے آزاد کر دیا۔

علیم سے علیحدگی کے بعد ماہی، رجب کی رفیقۂ حیات تو بن گئی لیکن اب اس کے لیے تانی اور عبدل کے بغیر رہنا انتہائی مشکل مرحلہ ثابت ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے علیم پر دباؤ ڈلوا کے دونوں بچوں کو حاصل کر لیا۔ لیکن رجب کو ماہی کا تانی اور عبدل کے لیے لگاؤ پسند نہیں آیا۔ وہ ماہی سے مطالبہ کرنے لگا کہ اپنے دونوں بچوں کے اخراجات علیم سے لے

کیوں کہ وہ انہیں نہیں پال سکتا۔ آخر ماہی نے بچوں کو واپس باپ کے حوالے کر دیا کیوں کہ رجب سے سمجھوتا کرنا اب اس کی مجبوری تھی۔

وقت ایک مرہم ہے، جو کسی بھی طرح کی چوٹ لگنے کی صورت میں درد کی شدت میں کمی کرتا ہے۔ علیم کا درد بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے لگا لیکن ماہی کی خودغرضی نے بچوں کو ماں کے ہوتے ہوئے بھی ممتا کے سائے سے محروم کر دیا۔ حصولِ رزق کی وجہ سے علیم کے لیے دونوں کی تربیت کے ساتھ ماہی کی بے حسی اور خودغرضی کی کمی دور کرنا آسان نہیں تھا۔ علیم کی حالت دیکھتے ہوئے اس کی بڑی بہن نے عبدل کی تربیت کی ذمے داری لے لی اور ممکن حد تک تانی کی رہنمائی بھی کرتی رہی۔

الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے علیم کی نظر پرانی تصویروں پر پڑی تو اس کے ذہن میں کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ علیم! ناشتہ تیار ہے۔ آجاؤ۔ اماں کی آواز نے علیم کی یادوں کا سلسلہ توڑتے ہوئے ماضی کا دریچہ بند کر دیا۔

سادہ مزاج ہوا راہ میں حائل
اور اک دستک نے زندگی بدل دی
جن سے روح کا رشتہ تھا
وہ رخ بدل کر چل دیے
کچھ حالات کی سازش تھی
جو چھوڑ کر ساتھ چل دیے
کچھ قدرت کو نامنظور تھا
جو لوگ سب بدل دیے
جو پہنچ چکے تھے انتہا پر
ماہ و سال نے ان کے رستے بدل دیے

☆.....☆.....☆

حاصل سفر

رستے دشوار گزار اور منزل دور، ہاتھ خالی اور سفر طویل، گھنا جنگل اور خوف ناک جنگلی حیات۔ قدم بڑھاؤ جہاں، وہیں احتیاط لازم۔ ہمت اور حوصلے نے بڑھائے آگے قدم۔ یقیں محکم، عزم مستقل ساتھ لیے، کچھ دُور دو رستے جو دکھائی دیے، یہاں تعین اب درست راہ کا تھا لازم۔

جنگل کا یہ سفر انتہائی کٹھن اور مشکل تھا۔ جہاں راہ میں خوف ناک اور خوں خوار جانور جگہ جگہ مکین تھے۔ اپنے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس لیے وہ ہمت اور حوصلے سے انتہائی احتیاط کے ساتھ قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ کئی میل دُور تک سفر کرنے کے بعد اب اس کے سامنے دو راستے تھے لیکن وہ اپنی منزل کے راستے کا تعین کر چکا تھا۔ تمام خوب صورتی کو چھوڑ کر اس نے مشکل راہ کا انتخاب کرنا مناسب سمجھا۔

وہ تازہ دم دستے کے سپہ سالار کی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ پانی کا کنواں دیکھ کر رک گیا۔ اپنا گھوڑا ایک طرف کھڑا کیا اور کنوئیں سے خوب سیراب ہو کے پانی پیا۔ اچانک اس کی نظر کنوئیں کے قریب رکھے سفید اور کالے موتی پر پڑی۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد سفید موتی اٹھایا اور دوبارہ اپنی راہ پر چل پڑا۔ کہیں دُور سے اسے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اسے تعجب ہوا کہ اس ویران اور کٹھن راہ پر کون چلا آ رہا ہے؟ لیکن جب اسے اپنے سفر کا خیال آیا تو تمام خیالات کو جھٹک کر دوبارہ سفر شروع کر دیا کیوں کہ اس کے پاس وقت کم اور سفر طویل تھا۔

شب و روز قدرت کے نظام کے مطابق تیزی سے گزرنے لگے۔ ایک جانب روشنی اور لوگوں کا ہجوم اور.... دوسرا راستہ خالی اور خاردار۔ پھر جو محتاط روی نے آگے بڑھایا، روشن راہ یا خالی راہ کا انتخاب۔ جہاں خاردار جھاڑیاں صاف دکھائی دیں۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا، مشکل راہ کو چن لیا۔ بے شک راستہ طویل تھا لیکن.... مزید جو قدم آگے بڑھے، راہ میں اک صحرا حائل تھا۔ دشت میں پھر جو قدم رکھ دیا، دُور دُور تک کوئی دکھائی دیتا نہیں تھا اور واپس جانا بھی اب ممکن نہیں تھا۔

اس سفر میں اسے کئی برس بیت چکے تھے اور اب اس کا گزر ایک صحرا سے تھا۔ صحرا میں داخل ہوتے ہی جب اس نے نظر گھمائی تو حدِ نگاہ تک ریت ہی ریت دکھائی دی۔ سورج اپنے جوبن پر تھا اور جھلسا دینے والی دھوپ اس کے بدن میں سرایت کر رہی تھی۔ لیکن وہ ہمت ہارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا حلق پیاس سے خشک ہونے لگا۔ اسی اثناء میں کہیں دُور ایک جھونپڑا نظر آیا اور اس نے اپنا گھوڑا اس جانب بڑھا دیا۔ جھونپڑے کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام کو پیڑ سے باندھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے پر کافی دیر تک دستک دینے کے بعد جب اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ اندر داخل ہو گیا۔ جھونپڑا عمدہ اور عالی شان تھا۔ ایک طرف پانی کا مشکیزہ نظر آیا، اس نے پانی پیا اور مشکیزہ واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اچانک اس کی نظر سفید اور کالے موتی پر پڑی۔ اس نے کالا موتی اٹھا لیا۔ اپنے سفر کے دوران وہ کئی سفید اور کالے موتی جمع کر چکا تھا۔ وہ آرام کے لیے لیٹ گیا۔ سفر کی تھکن سے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے بے خبر سوتے کافی وقت بیت چکا تھا۔ ''اٹھو! ابھی تمہیں لمبا سفر کرنا ہے۔ اٹھو! اٹھ بھی جاؤ''۔ کافی دیر تک مسلسل آوازوں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ جب اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس نے دوبارہ تیزی سے سفر شروع کر دیا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ اس کا پل پل لکھا جا رہا ہے کیوں کہ وہ ہمشہ اپنے دائیں بائیں کسی کو محسوس کرتا تھا۔

اس نے یونہی چلتے چلتے کئی موتی سمیٹے اور کئی سال گزر گئے۔ شب و روز کی انتہائی تلاش سے روحانی سکون بھی مل گیا۔

شام کی سرخی آسمان پر پھیل چکی تھی۔ اتنی مسافت طے کرنے کے بعد وہ کم زور ہو چکا تھا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا اور اپنی گٹھری کھول کر دیکھنے لگا جس میں اس کے جمع کیے ہوئے سفید اور کالے موتی تھے، جن میں سفید موتیوں کی تعداد کالے موتیوں کی نسبت زیادہ تھی لیکن نظر کی کم زوری کے باعث ان موتیوں کی گنتی ممکن نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ گٹھری بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

اب رستہ آگے کا مشکل نہیں تھا۔ ایک اندھیرے غار سے گزر تھا۔ جس گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز وہ وقتاً فوقتاً سفر کے آغاز سے سنتا آ رہا تھا، آج وہ آواز اسے انتہائی قریب سے آتی محسوس ہو رہی تھی اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔

بادل مکمل طور سے آسمان پر پھیل چکے تھے۔ بجلی کی کڑک سے اس کا جسم ہلکا ہلکا لرز رہا تھا۔ اس نے ہلنا چاہا لیکن جونہی خود کو حرکت دینے کی کوشش کی، اس کے پاؤں ساکت ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کا درد بڑھنے لگا، اب اس کی مکمل ٹانگیں سن ہو چکی تھیں۔ درد اس کی تڑپ میں اضافہ کر رہا تھا اور وہ مکمل طور پر بے بس ہو چکا تھا۔ اس نے انتہائی

کرب کی کیفیت میں جونہی نظر گھمائی، اپنے تعاقب میں ایک سایہ نظر آیا اور وہ کچھ ڈر سا گیا لیکن پھر تمام ہمت اور حوصلہ اکٹھا کر کے مکمل جائزہ لیا تو سایہ گھوم کر سامنے آ گیا۔

''تم کون ہو اور میرا تعاقب کیوں کر رہے ہو؟'' اس کے سوال نے سامنے والے کے چہرے پر مسکان بکھیر دی۔ پہلا سوال ''میں کون ہوں؟ کا جواب یہ ہے کہ ''میں فرشتۂ اجل ہوں اور دوسرا سوال، میں تمہارا تعاقب کیوں کر رہا ہوں؟ تو تعاقب کی وجہ حکم الٰہی سے سفر کے لیے تمہیں دی گئی مقررہ مدت کا خاتمہ ہے''۔ اس مختصر وضاحت سے وہ سمجھ چکا تھا کہ کچھ وقت پہلے کی اس کی کیفیت نزع کی تھی۔ اس کا اس جہان فانی کا سفر تمام ہو چکا ہے اور اب اس کے اگلے سفر کی روانگی کا وقت آ گیا ہے۔ اس کا جسم مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ ''لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ'' کلمہ پڑھتے ہی اس نے خاموشی سے فرشتۂ اجل کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے نئے سفر پر جہانِ فانی کے سفر کا حاصل، سفید اور کالے موتیوں کی گٹھری، لیے روانہ ہو گیا۔

اب جو آنکھ کھلی، جہاں ہی بدل گیا
جہان فانی کا راستہ، اس کی منزل پہ ہوا تمام

☆.....☆.....☆

چاند

اب چاند نکل چکا ہے
ستاروں کے جھرمٹ میں
ہزاروں کے جھرمٹ میں
اب چاند نکل چکا ہے
اداسیوں اور سناٹے کو ختم کرتا ہوا
اور اندھیرے کو دُور کرتا ہوا
پانی پہ اپنی روشنی کے عکس بناتا ہوا
خوب صورتی کے جلوے دکھاتا ہوا
اب چاند نکل چکا ہے
ویرانیوں اور پریشانیوں میں الجھے ہوئے
مسافروں کی راہ روشن کرتا ہوا
ہر بھٹکے ہوئے کو رستہ دکھاتا ہوا
اب چاند نکل چکا ہے
اب چاند نکل چکا ہے

☆.....☆.....☆

احساس

پرندوں کا پرواز کرنا اور
درختوں کا جھوم اٹھنا
ہلکے سے ہوا کا چلنا اور
پتوں کا ٹوٹ کر گرنا
اک نئے موسم کے آنے کا احساس ہے
اک انداز کے بدلنے کا احساس ہے
راہوں میں مٹی کا اُڑنا اور ہوا کا
راہ گیروں کو زور سے تھپکنا
ہر کسی کی گفتگو کا مرکز ہے
ہر کسی کے سکوں کا راز ہے
اب جو بادل چھائے گا اور
بارش بھی زور سے برسے گی
سب دکھوں کو بہالے جائے گا اور
خوشیاں ہی خوشیاں دے جائے گا
اب جو قوس قزح بنے گی
پیغام یہی چھوڑ جائے گی
امن جو گزر گیا وہ دَور پرانا ہے
آنے والے وقت کو سبھی نے اپنانا ہے

☆.....☆.....☆

ربِ جلیل

اتنے سناٹے میں شور کیسا ہے
چلتے چلتے اِدھر بھی دیکھا
اُدھر بھی دیکھا، تو ملا کچھ نہیں
اور یہاں! یہاں تو کچھ نہیں
پھر یہ آوازیں کیسی ہیں
ہاں! یہ آوازیں کیسی ہیں
اتنے سناٹے میں شور کیسا ہے
یہ رستے کیوں انجان ہیں
یہ کون سمجھا رہا ہے
یہ کون بتا رہا ہے
میں کس منزل کی طرف ہوں رواں
یہ گرتے گرتے کس نے سنبھال لیا
میرا رہبر کہاں ہے
میری نگاہ کو جو دکھائی نہیں دیتا
لیکن میرے ساتھ بھی ہے
یہ کس کا ساتھ ہے
جو ہر جگہ میرے ساتھ ہے
تنہائی میں رہنما ہے

گھبرا جاؤں تو ہے سہارا بھی
جہاں کہیں میں ڈگمگا گیا
میرا ہاتھ تھام لیا
اور مجھے صراطِ مستقیم کی طرف بڑھا دیا
ہر لمحہ، جو میرے قریب ہے
امّن! وہ تیرا خدا ربِ جلیل ہے

☆.....☆.....☆

دستورِ دنیا

جھکا رہا میں سایہ دینے کے لیے
اور جلتا دھوپ میں رہا
مدد لینے مجھ سے کئی مسافر آئے
اور میں ان کو پناہ دیتا رہا
فکر اک لمبے عرصے تک سبھی کی کرتا رہا
حوصلہ سب کو میں یونہی دیتا رہا
آج خزاں کے موسم میں
جب میری شاخوں سے پتے سوکھ کر گرنے لگے
اور پھول بھی نہ مجھ پہ کھلنے لگے
سبھی پرندوں اور انسانوں نے ساتھ میرا چھوڑا
اور میری لکڑی کو کاٹ کر سب نے توڑا
مثال میں تو ہمدردی و عنایت کی تھا
لیکن کسی کو میری سادگی پسند نہ آئی
گزرتے وقت کے ساتھ سب چاہنے والے ہوئے ہرجائی
امنؔ اب کوئی کسی پہ یقیں نہ کرے گا
کیوں کہ دستورِ دنیا ہی ہے، بے وفائی

☆.....☆.....☆

شیشے کا سائباں

شیشے کا سائباں ٹوٹا تو سب کو زخمی کر گیا
تھی جس سے توقعات سب کو ہزار ہا
ٹوٹا تو سب کو زخمی کر گیا
سبھی کو لامکاں کر گیا
چھت وہی سیکڑوں ٹکڑوں میں بٹی
پناہ گزیں تھے جس کے زیر سایہ کئی مکیں
سبھی کو غمگیں کر گیا
سبھی کو لامکاں کر گیا
جوڑنے کی کوشش میں کانچ کے ٹکڑوں کو
بڑھا جو اک شخص تو خود کو لہولہان کر گیا
سب کی امیدوں کو توڑ گیا
سبھی کو لامکاں کر گیا
امن حالات کے قاتل کہتے ہیں اب ہر جگہ
شیشے کا سائباں ٹوٹا تو سب کو زخمی کر گیا

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

انصر محمود بابر

انصر محمود بابر کا تعلق کدھر شریف، تحصیل وضلع منڈی بہاؤالدین سے ہے۔تعلیم بی اے ہے جبکہ انصر مارشل آرٹس بلیک بیلٹ ہیں اور آس ویلفیئر سوسائٹی کدھر شریف کے صدر بھی ہیں۔رائٹرز کلب ایک سال سے منسلک ہیں۔

فہرست تحریر:

1- عبادات ومعاملات

2- کتاب یا ہتھیار.....ثقافت یا فحاشی؟

3- تغیر وثبات

4- انسان اور مشین

5- فکر

☆.....☆.....☆

عبادات و معاملات

عبد کو اپنے معبود کی عبادت کرنی ہی ہوتی ہے، برضا و رغبت یا بادلِ ناخواستہ، کیوں کہ یہی اس کی زندگی کا مقصد اور یہی اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔ انسانی فریضوں میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ ان کی جزا، اُجرت، معاوضہ یا محنتانہ یہیں، اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ جلد یا بدیر۔ کچھ فرائض ایسے ہیں، جن کا بدلہ اس زندگی میں نہیں بلکہ آنے والی زندگی میں دیا جائے گا۔ کچھ فریضے ایسے ہیں، جن کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ ان فرائض میں سے اگر خدانخواستہ کوئی فرض چھوٹ بھی جائے گا تو مجھے اللہ رب العالمین کی رحمت سے پوری امید ہے کہ وہ معاف کر دے گا۔

کچھ فریضے ایسے بھی ہیں، جن کا تعلق اللہ کے کنبے، اس کی مخلوق سے ہے۔ اس میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ دیگر تمام مخلوقات بھی شامل ہیں۔ وہ جانور ہوں، حشرات الارض ہوں، پرندے ہوں یا جمادات و نباتات۔ سب اسی کی مخلوق ہیں، اسی کی پیداوار ہیں اور یہ سب مخلوقات اسے بہت عزیز ہیں۔ ان سب کا اسے بہت زیادہ احساس اور دھیان ہے۔ تمام کائناتیں اس کی توجہ اور تصرف میں ہیں۔ سب چیزیں اس کے احاطۂ رحمت میں ہیں، اس کے فضل کے حصار میں ہیں۔ ہر مخلوق اس کے کرم کی مرہونِ منّت ہے۔ عبادت کا مقصد یہ ہے کہ حقِ بندگی ادا ہو، مالک راضی ہو جائے، زندگی گزارنے کا طریقہ، سلیقہ اور ڈھنگ آ جائے۔

عبادت کا ثواب یہ ہے کہ دنیا میں اطمینانِ قلب نصیب ہو اور آخرت میں انعام کے طور پر جنت میں ساقیٔ کوثرؐ کی قربت نصیب ہو جائے۔ عبادت کا سواد یہ ہے کہ جس طرح نماز میں صفیں برابر اور سیدھی ہوتی ہیں اسی طرح عام زندگی میں بھی وہی اتفاق و اتحاد، اخوت و محبت، خلوص و یگانگی، مساوات و بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے۔

احساسِ تعلق پیدا ہو، خلوصِ نیت، عاجزی و وقار نصیب ہو۔ سپاہیانہ جلال اور خاکسارانہ تمکنت حاصل ہو۔ ہمہ وقت خود کو حالتِ نماز میں محسوس کرے۔ ایک نماز سے دوسری نماز تک کا سارا وقفہ نماز کو قائم کرنے میں کوشاں

ومصروف ہو۔عبادت کا مقصد کہاں تک پورا ہوتا ہے اور اس کا ثواب کتنا ملے گا؟ یہ کوئی کیسے جان سکتا ہے؟ البتہ تیسری بات، جو نماز کے سوا دکی ہے، یہ مقصد کہاں تک پورا ہوتا ہے، اس کا اندازہ ہم اپنی روزمرہ زندگی سے لگا سکتے ہیں۔اگر ہمارے دل میں دوسروں کے کام آنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا، اگر کسی کے دکھ درد میں شریک ہونے کا احساس نہیں جاگتا، اگر کسی کی خاطر کچھ کر گزرنے کی تڑپ نہیں اٹھتی، اگر کچھ اچھا کر دکھانے کی امنگ انگڑائیاں نہیں لیتی اور اگر زندگی کو جینے کا ڈھنگ نہیں آتا تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہماری نمازوں میں کوئی خشوع اور خضوع نہیں ہے۔

ہماری عبادت میں کہیں کوئی کجی ہے۔ جب ہم خدا کے ہاں ہوتے ہیں تو پھر بھی وہاں نہیں ہوتے۔ہم بظاہر اپنے خدا کے سامنے ہوتے ہیں مگر اپنے قلب وذہن میں ہزاروں بت لیے ہوتے ہیں۔کہیں خواہشات کا بت تو کہیں نیک نامی کا بت، کبھی لذت وراحت کا بت تو کہیں عزت ومرتبت کا بت۔کیا یہ شرک نہیں ہے؟ کیا یہ بت پرستی نہیں ہے؟

آیئے! یہ بت پرستی چھوڑنے کا عہد کرلیں اور آج سے خدائے وحدہٗ لاشریک، بے مثل ولاثانی اور حقیقی پروردگار کی عبادت کریں، صرف اسی کی پوجا کریں۔خالصتاً خلوص نیت سے اس کی بندگی کریں تاکہ بندہ ہونے اور بندہ کہلانے کا حق ادا ہو۔ساتھ ہی ان فرائض کی ادائیگی کا بھی عزم صمیم کریں جو اس کی مخلوق ہونے کے حوالے سے ہم پر عائد ہوتے ہیں۔نیز یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہمیں اپنے حقوق اُس وقت تک نہیں مل سکتے جب تک ہم اپنے فرائض ادا نہیں کر لیتے۔اپنے حقوق چھین کر حاصل کرنے کی بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا ہم نے اپنے فرائض ادا کر لیے ہیں؟ کہیں ہم خدا اور اس کی مخلوق کے مجرم تو نہیں؟؟

☆.....☆.....☆

کتاب یا ہتھیار.....ثقافت یا فحاشی؟

ایک وقت تھا کہ جب بچوں کے نام اسلاف کے ناموں پہ رکھے جاتے تھے۔انہیں لوری میں اپنے فاتحین اور مجاہدین کے کارنامے سنائے جاتے تھے۔اسلامی روایات اور بیش قیمت اقدار ان کی گھُٹّی میں شامل ہوا کرتی تھیں۔ ادب وسپاہ گری کے مقابلے منعقد ہوا کرتے تھے۔بزرگوں کا ادب اور تعظیم وتوقیر ان کے اسباق کا حصہ ہوا کرتی تھی۔ اور یہ بچے جب جوان ہوتے تو ان کی جوانیوں سے اسلامی وقار اور تمکنت جھلکتی تھی۔ان کی جوانیاں پسندیدہ شعائر کی آئینہ دار ہوا کرتی تھیں۔ان کی آنکھیں حیا کا پیکر ہوا کرتی تھیں۔ان کے ماتھے کی سلوٹیں کسی نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی تھیں۔سلام ہے ان ماؤں پر کہ جنہوں نے کبھی بِنا وضو انہیں دودھ نہیں پلایا تھا۔سلام ہے ان اساتذہ پر، جن کی کبھی تہجد قضا نہیں ہوتی تھی۔

سلام ہے ان جوانوں پر، جو اخلاق واخلاص کے امین ہوا کرتے تھے۔جن کی صبح کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا کرتا تھا۔جن کی نمازیں ہمیشہ قائم ہوا کرتی تھیں۔جن کی جوانیاں قابلِ رشک اور کردار قابلِ تقلید ہوا کرتے تھے، جو اپنے اسلاف کی چلتی پھرتی تصویر ہوا کرتے تھے اور....ایک یہ وقت ہے کہ نومولودوں کے کانوں میں پڑنے والی پہلی آواز موسیقی کی ہوتی ہے۔قرآن صرف طاقچوں میں سجانے کے لیے رہ گیا ہے۔ویسے بھی ہم، آج کے مسلمان، قرآن کو محض ثواب سمجھ کر پڑھتے ہیں۔مانا کہ ثواب بھی ایک نہایت اچھی چیز ہے مگر قرآن پاک کا مقصدِ نزول محض ثواب نہیں بلکہ رہنمائی، تعلیم وتعلم اور طریق ہائے عالم گیری اور ضابطۂ اخلاق وحیات بھی ہے۔مگر آج ہم ان باتوں سے گریزاں ہیں۔آج ہم اپنی اولادوں کی تربیت سے غفلت برتنے کے عظیم جرم کے مرتکب ہیں۔آج ہمارے بچوں کے کھلونوں میں آلاتِ موسیقی ہیں یا بارودی ہتھیار۔

ذرا سوچیے....! جن کی پرورش ہی موسیقی اور آلاتِ موسیقی کے ساتھ ہوگی۔جن کے ہاتھوں میں نادانستگی میں

ہم خود جان لیوا ہتھیار تھما دیتے ہیں، کل کلاں ان کی آنکھیں حیا کی آئینہ دار ہوں گی یا ہوس کی ماری؟ ان کی جوانیاں قابلِ رشک ہوں گی یا قابلِ رحم؟ وہ قابلِ بھروسا ہوں گے یا قابلِ تعزیر؟ خدارا سوچیے! وہ ہاتھ اس قوم کی معماری کریں گے یا اسے سپردِ طوفان کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ہی شیر خوار میڈیا پر ہمیں گانے اور موسیقی سننے کی ترغیب دے رہے ہوتے ہیں۔

ذرا سوچیے! آج ہم پر وہ کون سی نحوست طاری ہے کہ ہماری اولادیں بدتمیزی کا شکار ہیں؟ وہ کون سا خفیہ ہاتھ ہے، جو نصابِ تعلیم تک میں سے اسلامی تعلیمات ختم کرنے کے کاری وار میں کامیاب ہے؟ وہ کون سی پوشیدہ طاقت ہے جو ہمیں ایک بار پھر جہالت اور پس ماندگی کے عمیق کنوئیں میں گرانے کے درپے ہے؟ ہائے افسوس! اس کے باوجود ہم عقل کے ناخن لینے کو تیار نہیں۔

ذی شعور قارئین! ذرا سوچیے کہ آج ہم کیا کھاتے ہیں کہ ہمارے قلوب واذہان مفلوج ہوئے جا رہے ہیں؟ ہم کرتے کیا ہیں کہ آج ہمارے آئیڈیل صلاح الدین ایوبی اور محمد بن قاسم کی بجائے فلمی ہیرو بن گئے ہیں؟ ہم کس شیطانی طاقت کے پیروکار بننے کو ہیں؟ ہم اور ہماری نسلیں کون سی طاغوتی قوتوں کے حصار میں ہیں؟ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ ہمارے بچے اسکول میں کیا پڑھتے اور سیکھتے ہیں؟ انتہائی افسوس اور معذرت کے ساتھ مجھے کہنے دیجیے کہ ان معدودے چند تعلیمی اداروں کے سوا، جن پر اللہ کا خصوصی کرم ہے، تمام کے تمام اداروں میں تقلیدِ مغرب کی روش اختیار کی جا رہی ہے۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، سونے جاگنے، غرض آج ہم اپنا ضابطۂ حیات اسلام کو نہیں معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اغیار کے ناپسندیدہ ترین، گھٹیا ترین اور ذلیل ترین افکار کو بنانا چاہتے ہیں۔

خدارا! وقت کی اس اہم ترین پکار پر کان دھریں کہ ''جو قومیں وقت کی قدر نہیں کرتیں، تباہ ہو جاتی ہیں''۔ آج روشن خیالی کا جو طوفانِ بدتمیزی ہم پہ مسلط کر دیا گیا ہے، اسی کی خباثت ونحوست ہے کہ آئے دن نوجوان لڑکیاں گھروں سے بھاگ رہی ہیں۔ خودکُشیاں رواج پا رہی ہیں۔ آج ہم کون سی طاغوتی طاقت کی گندی ذہنیت کا شکار ہیں کہ مساجد میں بھی محفوظ نہیں۔

ہم کس گھٹیا تربیت کے حصار میں ہیں کہ کل جن نوجوانوں کو اس ملک وقوم کی باگ ڈور سنبھالنی تھی، آج وہی خودکُش دھماکے کر رہے ہیں۔ اسی خودساختہ روشن خیالی کی آڑ میں تہذیبِ مغرب کا جو گھٹیا زہر ہماری نسلوں کی رگوں میں انڈیلا جا رہا ہے اگر بروقت اس کا سدِّ باب نہ کیا گیا تو آنے والی نسلیں اور مستقبل کے مورّخ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ویسے بھی میرا نہیں خیال کہ اس نام نہاد کلچر اور تقلیدِ مغرب کا اندھا پن ہمیں کسی مادّی ترقی کی راہ پہ گامزن کر سکے اور اس ساری صورتِ حال کے ذمے دار ہم سب خود ہیں۔ اگر ہم استاد ہیں تو ہمیں اپنا احتساب خود کرنا ہوگا کہ کہیں ہمارے اپنے ہی قول وفعل میں تضاد تو نہیں؟ نیز یہ کہ ہم اس منصبِ پیغمبری کا کتنا حق ادا کر رہے ہیں؟ اور اگر

ہم طلبا یا نوجوان ہیں تو صرف اتنا یاد رکھیں کہ طلبا ملت کا مستقبل اور مسلم نوجوان دینِ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا فخر اور سرمایہ ہیں۔ اگر ہم والدین ہیں تو صرف یہ سوچ لیں کہ اولاد کی تربیت کے حوالے سے کل قیامت کے دن ہم اپنے آقا ومولاؐ کو کیا جواب دیں گے۔ اگر ہم بزنس مین اور تاجر ہیں تو یہی ذہن نشین کر لیں کہ ہمیں اس ماہر معاشیاتِ عالمؐ کی پیروی کرنی ہے جو غیروں میں بھی صادق اور امین جانے جاتے ہیں۔

خدارا....! اب بھی وقت ہے۔ ابھی پانی سروں سے نہیں گزرا۔ اگر ہمیں اپنی نسلیں عزیز ہیں، اگر ہمیں اپنے مستقبل کی فکر ہے، اگر ہمیں مملکتِ پاکستان کی بقا سے ذرا بھی دلچسپی ہے، اگر ہم اپنی دنیا و عاقبت کے حوالے سے ذرا بھی فکرانديش ہیں تو اپنے بچوں کے لیے وقت نکالیں۔ ان کی تربیت پر دھیان دیں۔ اپنے معاملات میں وہ رویہ اپنائیں جو آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ کے لیے روا رکھیں اور پھر سوچیے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو کیا ورثہ دے رہے ہیں۔ کتاب یا ہتھیار....ثقافت یا فحاشی؟

☆.....☆.....☆

تغیر و ثبات

حیاتِ انسانی میں ہر ساعت، ہر لمحے کوئی نہ کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہوتی ہے۔ کہیں پھول کِھلے ہوتے ہیں اور خوشبوئیں لٹا رہے ہوتے ہیں تو کہیں معصوم کلیاں بِن کھلے ہی کمہلا جاتی ہیں۔ ایک منٹ میں انسان کی دھڑکنوں کی تعداد 80 ہے تو دوسرے ہی لمحے یہ کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ انسان کبھی کسی کو دیکھتا ہے تو آنکھیں جھپکنا بھول جاتا ہے اور کبھی کسی چیز کی چکا چوند اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ آنکھیں خیرہ کر دیتی ہیں اور پھر جب وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ وہی سورج ہوتا ہے جس کی تمازت سے بچنے کے لیے ہم سائے تلاش کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی دھوپ سینکنے کی خواہش میں اس کی بادلوں سے آنکھ مچولی بھی اچھی نہیں لگتی۔ چاند ایک ہی وقت میں فطرت پسندوں کے جذباتِ شوق کو مہمیز کر رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف ''لُوٹنے والے'' اور ''لَوٹنے والے'' اسی چاند کے چھُپ جانے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں کچھ لوگ ستاروں کی روشنی میں اپنی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور کچھ اپنی چھتوں پہ لیٹے انہی ستاروں کو گننے کی ناکام کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔

جس جس کو جو جو کرنا ہوتا ہے، وہ کر کے ہی رہتا ہے۔ اگر پھولوں کو کھل کر مرجھانا ہی ہوتا ہے تو وہ کھِلتے ہی کیوں ہیں؟ اگر پھول کھلے ہی رہیں تو کلیاں کبھی پھول نہ بن پائیں۔ سورج ہمارے لیے اگر رات کو بھی اتنا ہی ضروری ہوتا جتنا کہ دن میں، تو اسے رات میں بھی نکلنا ہی پڑتا۔ اگر رات اندھیری نہ ہو تو چاند کی چاندنی اور تاروں کی ضیا پاشیاں کس کام کی؟ سانس کا پھولنا شدتِ محبت کا بھی اظہار ہو سکتا ہے اور شدتِ غضب کا بھی۔ ہر سو پھیلی خوشبو پھولوں کے جوبن کا اعلان کر رہی ہوتی ہے تو کلیاں اپنی حیا کی ردا میں لپٹی اپنے بچپنے سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی ہیں۔ درختوں سے گرتے پتّے جہاں خزاں کی علامت ہوتے ہیں، وہیں اس بات کا مژدہ بھی سنا رہے ہوتے ہیں کہ ہمارے تعاقب میں بہاروں کا ایک سلسلہ بھی ہے، جو دبے پاؤں چلا آ رہا ہے۔ درختوں کے جو پتّے خزاں تک بچ جاتے ہیں وہ خوش نصیب ہوتے ہیں کیوں کہ آنے والی بہار کا استقبال انہی کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔ بہار کے شگوفوں میں بھرا رنگ خشک پتّوں ہی کا جوہر بھی تو ہو سکتا ہے۔ ان خشک پتّوں پہ میں کیا لکھوں کہ جو آنے والی بہار کے قدموں میں قربان ہو کر

امر ہو جاتے ہیں۔ میں ایک دن درختوں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ پاؤں خشک پتّوں پہ پڑ رہے تھے، جو چُرمراتے ہوئے عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔

غور کیا تو محسوس ہوا جیسے یہ پتّے مجھ ہی سے مخاطب تھے۔ میرے ہی بارے میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ دیکھو! زمین پر کیسے اکڑ کر چل رہا ہے۔ کتنا غافل انسان ہے، جو اس بات سے بے خبر ہے کہ کبھی اس پر بھی خزاں آئے گی۔ یہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ سدا جوان ہی رہے گا اور میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ یہ انسانی مزاج ہے کہ پل پل رنگ بدلتا ہے۔ کبھی سائے کی طلب میں سرگرداں، کبھی سرما کی دھوپ کا تمنائی۔ کبھی نئے نئے رشتوں کی تلاش میں کوشاں تو کبھی بالکل ہی تنہائی کا خواہاں۔

کبھی بے حد محبتوں کا سرچشمہ، کبھی بے پایاں نفرتوں کا مظہر۔ کبھی عقیدت و احترام کا پیکر تو کبھی بے نیازِ پیمانِ وفا۔ کبھی خدائے لم یزل کا طاقت ور دست و بازو تو کبھی شیطانی قوتوں کے تابع مجسمۂ شیطان۔ کبھی مسجودِ ملائک تو کبھی ساجدِ نیاز مند۔ کبھی تمام تر انسانی عظمتوں کی انتہائی بلندیوں پر فائز تو کبھی ذلّت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا۔ یہی نیرنگیٔ فطرت ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہماری دعا یہ ہونی چاہیے کہ یا اللہ! تو ہمیں نافع الخلائق بنا دے۔ تیری مخلوق کو ہم سے فائدہ ہو اور ہمیں تمام شرور سے اپنی امان میں رکھ۔ آمین۔

☆.....☆.....☆

انسان اور مشین

ایک سادہ سے پیچ کس سے جدید ترین کمپیوٹرز تک، آج تک جتنی بھی مشینیں ایجاد ہوئی ہیں، سب کی سب انسان کی سہولت اور فائدے کے لیے ہوئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر سہولت کوئی نہ کوئی صلاحیت ضرور چھین لیتی ہے۔ مثال کے طور پر کیلکولیٹر دَورِ جدید کی ایک بہترین سہولت ہے، جس سے اعداد و شمار میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے مگر جب سے کیلکولیٹر آیا ہے، لوگوں خصوصاً طلبا نے پہاڑے یاد کرنے چھوڑ دیے ہیں۔ اسی طرح کمپیوٹرز کی کمپوزنگ کی وجہ سے خطاطی کا فن ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔ انٹرنیٹ کی سہولت آ جانے سے لوگ مطالعے سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح کی دیگر بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

بات یہ نہیں کہ انسانی سہولت کے لیے ایجادات نہیں ہونی چاہئیں، بات صرف اتنی سی ہے کہ ہر چیز کو اعتدال میں رہ کر استعمال کیا جائے تو خرابی کا اندیشہ جاتا رہتا ہے۔ ضرورت اور عادت میں یہی تو بنیادی فرق ہے کہ کام کے وقت ان مشینوں سے فائدہ ضرور اٹھائیں لیکن انہیں عادت نہ بنالیں۔ انہی عادات کی بدولت آج کا انسان مشینوں کے اس دَور میں خود بھی مشین بن کر رہ گیا ہے۔ مادّیت پسندی، سہل پسندی اور ایک مخصوص طرزِ عمل کی بِنا پر ہم آج مختلف جسمانی، اخلاقی، روحانی اور دُنیوی مسائل کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہر کوئی وقت کی کمی، اخراجات کی زیادتی اور کچھ نہ کر پانے کی شکایت کرتا نظر آتا ہے۔

روزمرہ کی گہما گہمی میں ہم اتنے مصروف ہیں کہ پیسہ کمانے کی خاطر اپنی صحت اور دیگر معاملات تباہ کر بیٹھتے ہیں۔ پھر دوبارہ اسی صحت کے حصول کے لیے یہی پیسہ پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل کوئی اتنا معقول اور پسندیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ مشینیں انسان کی سہولت کے لیے ہیں نا کہ سر پر سوار کر لینے کے لیے۔ اس تمام تر خستہ حالی کا علاج صرف اتنا ہے کہ آپ تھوڑا سا وقت اپنی ذات کے لیے ضرور نکالیں۔ اپنے دوستوں سے گپ شپ لگائیں۔

اپنے بچوں کو وقت دیں۔ دیگر افرادِ خانہ سے میل جول رکھیں۔ معاشرتی سرگرمیوں میں بھی تھوڑا بہت حصہ لیں۔ اپنے تعلق داروں کے دکھ سکھ میں شریک ہوں۔ مزید یہ کہ کسی ضرورت مند کی چھوٹی سی ضرورت پوری کر کے دیکھیں، سکون کی دولت سے آپ کا اندر بھر جائے گا۔

اپنے اردگرد دیکھیں، کتنے لوگ آپ کی توجہ کے منتظر رہتے ہیں اور آپ کے پاس ان کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ کسی پُرسکون جگہ اکیلے بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور تمام معاملات کو ذہن سے نکال دیں کیوں کہ ہمارے ذہن الّم غلّم سوچوں، تفکرات، پراگندگی اور الجھنوں سے اس قدر بھر چکے ہیں کہ ہم مزید کچھ سیکھنے، سمجھنے، سوچنے یا برداشت کرنے کی ہمت اور شعور تک کھو چکے ہیں۔ بہرحال.... جب آپ کچھ دیر اسی خالی الذہنی کی کیفیت میں رہیں گے تو آپ پر انکشاف ہوگا کہ سکون آپ سے محض اتنا ہی دُور ہے جتنا آپ اس مشق سے۔ جوں جوں مادّہ پرستی اور ہوس پرستی بڑھتی جارہی ہے اور جیسے جیسے شیطانی علوم اور مکروفریب کا دَور دَورا ہوتا جارہا ہے۔ بالکل اسی طرح کچھ مثبت طاقتیں بھی ہیں جو کائنات کا توازن برقرار رکھنے کی ذمے دارانہ کوششیں کر رہی ہیں۔

تھوڑا سا وقت نکال کر اچھے لوگوں کی صحبت میں گزاریں، جو کمیاں اور خامیاں آپ دوسروں میں دیکھتے ہیں، انہیں اپنے اندر تلاش کریں اور دوسروں کی جو خوبیاں آپ کو متاثر کرتی ہیں، انہیں اپنی ذات میں پیدا کر لیں، چند ہی دنوں میں آپ خود کو پُرسکون، پسندیدہ اور متوازن شخصیت کا مالک پائیں گے۔ اخلاقیات اور روحانیت، آج کے اس پُرفتن دَور میں بھی وہم، بے خوابی، اعصابی بیماریوں اور دیگر الجھنوں کا شافی علاج ہے۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ تھوڑا سا وقت ضرور نکالیں۔ کائنات کی رنگینیوں اور فطرت کی حنابندیوں سے اپنا قلبی اور روحانی تعلق پیدا کریں۔ یقین مانیے، خوشی اور سکون آپ سے دُور نہیں۔

☆.....☆.....☆

فکر

سرما کی ایک حسین صبح تھی۔ گاؤں کے بوائز ہائی اسکول کے ایک خوب صورت پلاٹ میں سورج کی توانائی بانٹتی ہوئی کرنوں میں اسکول اسٹاف کے لیے ہال سجا تھا۔ خوب صورت میزوں کے اطراف کرسیاں بچھی تھیں۔ اس سارے سیٹ اپ کے ساتھ ایک طرف قدرے بڑی اور اونچی میز کے پیچھے فوم کے گدے والی اونچی پشت کی کرسی رکھی تھی۔ اتنے میں اساتذہ کرام میں سے ایک محترم استاد، کئی نسلیں جن سے فیض یاب ہوئی ہیں، تشریف لائے۔ دُور ہی سے اس ساری ترتیب کا جائزہ لیا اور کیا خوب فقرہ کہا: دیکھو! یہ اونچی پشت اور گدے والی کرسی اور بڑی سی میز، جو دوسری میزوں اور کرسیوں سے الگ تھلگ رکھی ہیں، اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ اس میز کرسی پر بیٹھنے والا باقی اساتذہ سے برتر شخصیت کا مالک ہے۔ حالاں کہ اسلام میں اس طرح وی آئی پی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

ایک مقامی اسکول کے مڈل کلاس کو پڑھانے والے محترم استاد کا یہ کتنا اچھا خیال اور سوچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ کسی مشہور انگلش میڈیم کالج یا یونیوسٹی میں پڑھا رہے ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ ان کا خیال مختلف ہوتا۔ بہر حال.... اس دن سے آج تک، میرے اندر سے وہ بات، وہ فقرہ نہ نکل سکا۔ لیکن جب اپر لیول پہ نظر ڈالیں تو سب کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ غریب بچوں کے لیے سرکاری اسکول ہیں۔ وہ سرکاری اسکول کہ چار دیواری ہے تو چھت نہیں، اگر چار دیواری کے ساتھ چھت بھی ہے تو پانی کا کوئی بندوبست اور ''ٹاٹ'' نہیں اور اگر خوش قسمتی سے یہ سارے لوازمات پورے ہیں تو بد قسمتی سے پڑھانے والا کوئی نہیں۔ جب کہ امراء اور وزراء کے بچوں بلکہ ''صاحب زادگان'' کے لیے انگلش میڈیم، ائیر کنڈیشنڈ اسکول ہیں، غریبوں کے لیے وہی سرکاری ہسپتال ہیں جو انگریز دَور کی یادگار ہیں جب کہ اگر کوئی وی آئی پی، جس کا اسلام میں کوئی تصور نہیں، اگر خدانا خواستہ بیمار پڑ جائے تو یورپ، لندن و امریکا کے وی آئی پی ہسپتال سرکاری خرچ پر موجود ہیں۔

عجب نظام ہے کہ امراء اور وزراء، جو اس ملک میں سب کچھ افورڈ کر سکتے ہیں، ان کے لیے بجلی، ٹیلی فون، پانی

اور گیس وغیرہ کے بل تک معاف ہیں اور 80 فی صد طبقہ، جو محض اپنی سانسوں کی مقررہ گنتی گن رہا ہے، جو سر ڈھانپتا ہے تو پاؤں پہ مچھر کاٹنے لگتے ہیں اور پاؤں ڈھانپتے ہیں تو سردی سے سر ٹھٹھر جاتا ہے۔ ایسے نادار اور مستحق لوگوں کے لیے بلوں کی بھرمار ہے۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ کہ کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ، جو مالک و مختارِ کائنات ہیں، ان کا یہ عالم ہے کہ جسم مبارک پر کھردری چارپائی کے نشان پڑ جاتے ہیں لیکن عام مسلمانوں کے لیے تمام دست یاب سہولتیں وقف ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرما دیا تھا کہ میرے دورِ خلافت میں اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاسا مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ جواب دہ ہوگا۔ خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلافت سے پہلے اتنے امیر تھے کہ آپ کے خزانوں کی چابیاں کئی کئی اونٹ اٹھایا کرتے تھے مگر جب خلیفہ بنے تو یہ حال تھا کہ وہی ایک لباس آپ کی کل جاگیر تھی جو آپ کے جسم پہ ہوتا تھا۔ جب کہ آج صورتِ حال یکسر مختلف بلکہ متضاد ہے کہ یہاں جب کوئی وزیر، مشیر یا کسی بھی اعلیٰ عہدے پر تعینات ہوتا ہے تو ملکی اور غیر ملکی بینکوں میں موجود اس کے اکاؤنٹس ڈالروں سے بھر جاتے ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ کوئی ان سے پوچھنے اور احتساب کرنے والا نہیں۔ خود انہیں اپنے آپ تو شرم آنے، کسی مسکین اور یتیم کا احساس کرنے بلکہ خوفِ خدا پیدا ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا یہاں.... اس ملک میں، کسی کا قابل اور باصلاحیت ہونا جرم ہے؟ کیا یہاں غریب ہونا جرم ہے؟

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

اسامہ فاروق

اسامہ فاروق کا تعلق خانیوال کے ایک گاؤں سے ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم ہیں، 2018ء میں لکھنے کا آغاز کیا۔ مستقبل میں میڈیا سے وابستہ ہونے کا ارادہ ہے۔ رائٹرز کلب سے اک سال سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- خدمت کو ووٹ دیں

2- ہمیں بھی پروٹوکول چاہیے، تنقید کیوں؟

3- بے حسی یا بے بسی

4- بچوں کی تربیت کا فقدان

5- تعلیم، ہر بچے کا حق ہے

☆.....☆.....☆

خدمت کو ووٹ دیں

بہت کم لوگ ہوتے ہیں، جنہیں اللہ نے بیک وقت بہت سی خصوصیات اور صلاحیتوں سے نوازا ہوتا ہے اور وہ اپنی ان خداداد صلاحیتوں کا بروقت اور موقعے کے مطابق استعمال کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ساری دنیا ان کی صلاحیتوں اور حکمت عملی کو داد دینے پہ مجبور ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ جماعۃ الدعوۃ کے سربراہ حافظ محمد سعید کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ پہلے ایک استاد، پھر عالم دین پھر مجاہد اور اب ایک سیاست دان ہیں۔ وہ تمام خوبیاں، جو ایک لیڈر میں ہونی چاہئیں وہ ان میں موجود ہیں اور یہ خوبیاں ان میں باہر سے نہیں آئیں، نہ ہی وہ کسی بیکن ہاؤس یا بلوم فیلڈ سے پڑھ کر نکلے تھے اور نہ ہی کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں کہ انہیں کسی شہزادے کی طرح پالا گیا ہو اور ان کے لیے کوئی استاد یا مربّی تعلیم دینے پہ مامور کیا گیا ہو۔ وہ بھی ہماری طرح عام سے اسکول سے پڑھے تھے۔ عام بچوں کی طرح تھے۔

بھارت سے ان کو نفرت کیوں ہے؟ وہ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایک تو وہ لوگ مہاجر ہیں، دوسرے جب وہ غالباً آٹھویں یا نویں کلاس میں تھے، تب پاک بھارت 1965 کی جنگ چھڑی تھی اور وہ اپنے امتحانات دے کر اسکول سے فارغ تھے، سو انہوں نے اپنے گاؤں کے لڑکوں اور دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ڈنڈا بردار فورس بنائی تھی اور پورے علاقے کی خبر رکھتے تھے کہ اگر کہیں بھی ہماری پاک فضائیہ کے شاہین، انڈین ائیر فورس کے جنگی طیارے گرائے تو ہم وہاں پہنچ کر اس تباہ شدہ جہاز پہ ڈنڈے برسا کے اپنا غصہ ٹھنڈا کر سکیں۔ اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہ سعودی عرب چلے گئے جہاں ان کی ملاقات شیخ ابن باز رحمتہ اللہ سے ہوئی۔ وہ ان کے کام سے بہت متاثر ہوئے اور واپس آ کر مرکز الدعوہ والارشاد کے نام سے ایک تنظیم بنائی جو خالص دین اسلام کی دعوت کا کام کرتی تھی۔

اس طرح یہ قافلہ چلتا رہا۔اس دوران ان پر بہت سے مشکل مراحل بھی آئے۔ان کی جماعت کو پابندیوں کے دَور سے بھی گزرنا پڑا، یہ خود بہت مرتبہ نظر بند رہے مگر نہ کبھی حکومت کے خلاف کوئی بیان دیا نہ ہی اداروں کے خلاف کبھی اک لفظ زبان سے نکالا بلکہ اپنے کارکنان کو ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے رہے اور یہ بات میں بغیر کسی لالچ کے بالکل غیر جانب دار ہو کر کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں گزشتہ پچاس دہائیوں سے ایسا کوئی لیڈر نہیں گزرا ہوگا جس کی جماعت اور وہ خود، نظر بندیوں اور پابندیوں کے دَور سے گزرا ہو اور اپنے کارکنان کو مکمل پُر امن رہنے کی تاکید کی ہو بلکہ جس بھی سیاسی رہ نما پر مشکل وقت آیا، اس کے کارکنان نے ہمیشہ باہر نکل کر ملکی امن کو خراب کیا ہے، اپنے ہی ہم وطنوں کا جلاؤ گھیراؤ کیا ہے۔مگر سلام ہے ایسے رہ نما پر، جس نے اگر بیرونی جگا گیری اور دباؤ کے خلاف لانگ مارچ بھی کیا ہے تو ہمیشہ اپنے کارکنان سے کہا کہ دیکھنا! ہمارے مارچ کے دوران اس ملک کے کسی بھی درخت سے ایک پتّا بھی نہ ٹوٹے۔ہے کوئی ایسا حکم ران؟ ہے کوئی ایسا سیاست دان، جو ایسی حُب الوطنی کی مثال پیش کر سکے۔

آگے آیئے.... جب یہ خود گھر پر نظر بند تھے اور ان کے اداروں پر حکومتِ وقت قبضے کر رہی تھی، اس وقت بھی انہوں نے اپنے کارکنان کو پُر امن رہنے کی تلقین کی اور یہ عظیم الفاظ کہے کہ 'ہمارے لیے ہماری جماعت اہم نہیں بلکہ ہمارا پاکستان اہم ہے۔ہمیں پُر امن رہنا ہے اور صرف اپنے وطن کے لیے کام کرنا ہے۔اپنی نظر بندیوں کے خاتمے کے لیے بھی انہوں نے لاکھوں لوگوں کا جلوس نکالنے کی بجائے قانونی جنگ لڑنے کو ترجیح دی اور ملکی عدالتوں نے ان کو ہر قسم کی دہشت گردی اور انتہا پسندی سے بری الذّمہ قرار دیا۔ یہ ہے حافظ محمد سعید کا تیس سالہ سفر، جس کے میں نے بہت ہی مختصر واقعات بتائے ہیں۔

اب انہوں نے سیاست میں قدم رکھا ہے تو بہت ہی سوچ سمجھ کے ساتھ اور ان کا منشور کیا ہے؟ ''ہماری سیاست، خدمتِ انسانیت'' اور عالمی میڈیا اس بات کا گواہ ہے کہ باقی جماعتیں سیاست میں آنے کے بعد خدمت کا دعویٰ کرتی ہیں جب کہ حافظ محمد سعید اور ان کی جماعت نے سیاست میں آنے سے قبل ہی لوگوں کی بہت خدمت کی ہے۔کوئی قدرتی آفت ہو، کہیں کوئی آگ لگ جائے، سیلاب ہو، زلزلہ ہو، کوئی بھی مسئلہ ہو، ان کے رضا کار وہاں پہنچے ہوتے ہیں اور بلا امتیاز لوگوں کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں۔

سیاست میں آ کر بھی انہوں نے اپنے کارکنان کو یہی سمجھایا کہ ہمارے لیے ہماری سیاست یا اقتدار اہم نہیں ہے بلکہ ہم سیاست میں آئے ہی اسی لیے ہیں کہ ہر انسان تک اسلام کی تبلیغ اور نظریۂ پاکستان کی دعوت پہنچ سکے۔اب جس لیڈر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہو کہ پاکستان، نظریۂ پاکستان اور دعوتِ اسلام جس کے نزدیک سب سے اہم ہو، میں اس کو ووٹ کیوں نہ دوں؟؟

☆.....☆.....☆

ہمیں بھی پروٹوکول چاہیے، تنقید کیوں؟

ہم وہ قوم ہیں جو اگر حکم رانوں پہ تنقید کرنے لگ جائیں تو ان پر الزامات اور جرائم کے انبار لگا دیں۔ ہم ان کے پروٹوکول کے خلاف ہیں، ہم ان کی وڈیرہ شاہی کے خلاف ہیں، ہم ان کی نوکر شاہی کے خلاف ہیں۔ ہونا بھی چاہیے، جو غلط کام کر رہا ہے اس کے خلاف آپ جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں۔ آپ غلط کام کے خلاف آواز اٹھا سکتے ہیں تو لازمی اٹھائیں۔ مگر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم خود کیا وہ سب نہیں کرتے، جس سے دوسروں کو منع کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ اس سے بھی کہیں زیادہ غلط ہے۔ جب ہم غیر قانونی قدم اٹھاتے ہیں، تب کیا ہم نیک اور پارسا ہوتے ہیں؟

آیئے! اپنا محاسبہ کریں۔ ہم پولیس تھانے میں جاتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ پولیس اہل کار ہمیں اپنے دفتر میں بٹھا کر چائے پیش کریں۔ ہمیں مکمل پروٹوکول ملے۔ ہم سے پہلے جو سائل وہاں موجود ہوتے ہیں، کیا ہم ان کی پروا کرتے ہیں؟ ہم ہسپتال میں جاتے ہیں، وہاں کسی جاننے والے کو ڈھونڈتے ہیں تاکہ ہمارا کام جلد ہو جائے۔ ہمیں وہاں بھی کسی پروا نہیں ہوتی۔ کون پہلے آیا ہے، کون کب سے انتظار کر رہا ہے۔ ہمیں اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جن بے چاروں کا کوئی جاننے والا نہیں ہوتا اور ہمارا کام آسانی سے ہو جاتا ہے تو ہم بڑی شانِ بے نیازی سے واپس پلٹتے ہیں اور اگر کام نہ ہو تو شور مچاتے ہیں۔ ہنگامہ کرتے ہیں، ڈاکٹروں کو ظالم، درندہ اور وحشی کہتے ہیں۔

ہم ڈسپنسری کا دروازہ کھول کے اندر گھسنے کی کوشش کریں گے اور اگر ڈسپنسر کہہ دے کہ بھائی! آپ کو دوا ونڈو سے ملے گی تو ہم بڑے نخرے سے بتائیں گے کہ میں چیئرمین کا بھائی ہوں، میرے ماموں انسپکٹر ہیں۔ میں یہ کام کرتا ہوں، میں وہ کام کرتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم شاید اس اصول سے ناواقف ہیں کہ قانون سب کے لیے ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہم غیر قانونی نمبر پلیٹ اپنی گاڑیوں پہ چپکائے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی پکڑ لے تو سفارشیں لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گلی کے خاکروب سے لے کر ڈی ایس پی تک سے فون کرواتے ہیں، بس چلے تو وزیراعظم یا کسی اور بڑی ہستی کی

مدد بھی لے لیں۔ہم صحافت کے نام پر ایک دھبا ہیں۔جعلی نمبر پلیٹ،جعلی پریس،جعلی صحافی....مگر ہم ہر ایک کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ہم صحافی تلاشی دیتے وقت سیکیورٹی اہل کار کو بڑی شان سے بتاتے ہیں کہ میں صحافی ہوں تا کہ ہم سیکیورٹی والے پر رعب ڈال سکیں اور تلاشی کے عمل سے بھی بچ سکیں۔

یہ سب ہم ہیں یا نہیں؟ یہ سوال میں آپ پر چھوڑے جا رہا ہوں۔اگر ایسا ہے تو پھر بتائیں کہ کیا ہم کسی کے پروٹوکول پر تنقید کرنے کے اہل ہیں؟ ہرگز نہیں، کیوں کہ ہم خود ہی عیب دار ہیں۔اس لیے لازمی ہے کہ ابھی سے خود کی اصلاح کریں۔اپنے آپ سے شروع کریں اور اپنا پروٹوکول ختم کریں۔ پہلے خود کو آسمان سے نیچے لا کر زمین پر رکھیں اور پھر دوسروں کی تنقید برائے اصلاح کریں۔اسی میں پاکستان کی بھلائی ہے اور یہی حقیقت میں ترقی کا راز ہے۔

☆.....☆.....☆

بے حسی یا بے بسی

یہ جنوری کے شروع کی بات ہے۔ میں ایک شام کلینکل اسسٹنٹ کی کلاس سے فارغ ہونے کے بعد موٹر سائیکل پہ گھر جا رہا تھا۔ ویسے میں عموماً مغرب کی نماز تک گھر پہنچ جاتا تھا مگر اس دن راستے میں ایک دو کام کی وجہ سے رکنا پڑا، اس لیے کچھ تاخیر سے گھر جا رہا تھا۔ ابھی میں اپنے گاؤں سے دو کلومیٹر تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، شدید دھند تھی، روڈ پر دُور دُور تک کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں شدید دھند اور اندھیرے کی وجہ سے موٹر سائیکل آہستہ چلا رہا تھا۔ اچانک مجھے روڈ پہ شیشہ بکھرا ہوا نظر آیا تو فوراً ذہن میں یہی خیال آیا کہ ضرور کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور جب سامنے دیکھا تو ایک کار اینٹوں کی بھری ہوئی ٹرالی کے نیچے گھسی ہوئی تھی۔ کار مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ اس کے اندر دو آدمی موجود تھے، جو کسی حد تک ہوش میں تھے۔ ایک آدمی سڑک پہ گرا ہوا تھا، اس کے جسم سے خون نکل کر سڑک پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح زخمی تھا اور بے ہوش تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات گزار رہا تھا۔

بہر کیف.... میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور جا کر اس بے ہوش آدمی کو چیک کرنے لگا۔ مجھے شروع ہی سے لوگوں کو ریسکیو کرنے کا شوق تھا اور پھر ریسکیو 1122 کے ایک پروگرام کے تحت تین روزہ ریسکیو ٹریننگ بھی کر چکا تھا۔ اس سے بھی پہلے فلاح انسانیت فاونڈیشن سے دو روزہ ریسکیو ورکشاپ کی تھی۔ اس لیے میرا یہ فرض بنتا تھا کہ میں رک کر ان کے لیے کچھ نہ کچھ کروں۔ وہاں مجھ سے بھی پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے، جو کھڑے بے حسی سے صرف تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک آدمی اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اور لوگ شاید ڈر رہے تھے کہ کہیں اس کی موت ہمارے گلے نہ پڑ جائے۔

میں نے کسی بھی انجام کی پرواہ کیے بغیر اس آدمی کا معائنہ کیا اور اسے بچانے کا آخری حربہ آزمانے سے پہلے

ریسکیو 1122 پہ کال کی۔ میرا فون ان کے دوسرے سینٹر پہ جا ملا، جو ہمارے علاقے سے غیر متعلق تھا، انہوں نے مجھے ملتان سینٹر کا نمبر لکھوایا۔ میں نے وہاں کے ریسکیو سینٹر کو اطلاع کرنے کے بعد اپنا کام شروع کر دیا۔ اس آدمی کا وجود خاصا بھاری بھرکم تھا، جسے میں اکیلا نہیں سنبھال سکتا تھا۔ ویسے بھی روڈ ایکسیڈنٹ کے مریض کو، اگر اسٹریچر نہ ہو تو، کم از کم چھے بندے اٹھاتے ہیں۔ میں نے اسے 'سی پی آر' کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر یہ کام کرتا رہا۔ میں اس وقت اکیلا ہی ان زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ باقی جتنے بھی پانچ سات لوگ کھڑے تھے، سب کے سب تماشائی تھے۔ کسی کو پٹی تک کرنی نہیں آتی تھی کہ کسی زخمی کا بہتا ہوا خون ہی روک سکیں۔ لوگ آتے گئے، رش لگتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جم غفیر لگ چکا تھا۔ دو چار لوگ میرے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اب تک سڑک مکمل طور پر بند ہو چکی تھی۔ وہ زخمی میرے سی پی آر کرنے کے دوران ہی فوت ہو چکا تھا کیوں کہ اس کا خون بہت زیادہ مقدار میں ضائع ہو چکا تھا۔ اگر اس کو ابتدائی طور پر ہی پٹی باندھ دی جاتی تو شاید وہ بچ جاتا۔ اب میں دوسرے متاثرین کی طرف گیا، تب تک ان کے اہلِ خانہ بھی پہنچ چکے تھے۔ میرے کالج بیگ میں ہمیشہ فرسٹ ایڈ کا تھوڑا بہت سامان موجود ہوتا ہے تاکہ کسی بھی حادثے کی صورت میں فرسٹ ایڈ دی جا سکے۔ میں نے دوسرے زخمیوں کی مرہم پٹی کر دی، تب تک ریسکیو کی وین بھی پہنچ چکی تھی۔ ریسکیو رز نے پوچھا کہ یہ مرہم پٹی کس نے کی ہے؟ میں نے بتایا کہ میں نے کی ہے، اس پر انہوں نے مجھے شاباشی دی۔ ہم نے زخمیوں کو گاڑی میں منتقل کیا اور سب لوگ اپنے اپنے راستے پہ چل دیے۔

اب یہاں ہمارے معاشرے کے کئی منفی پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم لوگ کسی حادثے کی صورت میں صرف تماشا دیکھتے ہیں، دوسرا یہ کہ ہم بے حس ہیں اور کسی مرتے ہوئے انسان کے لیے کوئی احساس بھی نہیں رکھتے۔

☆.....☆.....☆

بچوں کی تربیت کا فقدان

اگر بچے سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس سلسلے میں اسلام نے بچے کی اصلاح نہایت ہی مشفقانہ انداز میں کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔علاج کا درست طریقہ یہ ہے کہ ہم اسے نرمی اور پیار سے سمجھائیں اور اس کی غلطی پر تنبیہ کریں۔ مضبوط دلائل سے اسے سمجھائیں کہ اس سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، اسے کوئی بھی اچھا انسان پسند نہیں کرے گا۔اس طرح بچہ سمجھ جائے تو ٹھیک....ورنہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے نرم انداز میں سزا دی جائے۔

نرمی سے سمجھانے کی ایک زبردست مثال حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ ''سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں، ایک بدو نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو لوگ اسے مارنے کے لیے دوڑے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہا دو، اس لیے کہ تمہیں آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے نہ کہ مشکلات پیدا کرنے کے لیے''۔

مگر ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے کہ اگر بچے سے کوئی غلطی ہو جائے تو بجائے اسے اچھے انداز میں سمجھانے کے، اس پر تھپڑوں اور لعنتوں کی بارش کر دی جاتی ہے اور اگر یہی سلسلہ تھوڑے لمبے عرصے تک چلتا رہے تو اس سے بھی بچہ ضدی ہو جاتا ہے اور بڑوں کا کہنا نہیں مانتا۔اگر ان کا کہا ہوا کام کر بھی لے تو دلی طور پر نہیں کرتا اور آہستہ آہستہ بغاوت پر اترتا چلا جاتا ہے۔

عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ بچے سے ایک بار غلطی ہو جائے تو اسے ہمیشہ ہی اس کا طعنہ دیا جاتا ہے اور اسے بار بار اس کی ناکامیوں کا احساس دلایا جاتا ہے جس کی وجہ سے بچہ بزدل اور ضدی ہو جاتا ہے۔اس میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے جو نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔اگر بچے کو طعنے دینے اور اس کا مذاق اُڑانے کے بجائے موجودہ حالات کے مطابق مشہور اور کامیاب شخصیات کی محنت، ان کی کامیابی کے لیے کی گئی کوششیں اور ناکام لوگوں کی مثالیں دیں تو وہ بڑی آسانی سے بات سمجھ جائے گا۔آپ کو اپنا دوست مانے گا اور اپنی غلطیوں کو سدھارنے کی کوشش کرے گا۔

ہمارے معاشرے میں بچوں کی نفسیاتی تربیت کا بھی فقدان ہے۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر بھی خاص توجہ دیں۔ مثال کے طور پہ بچہ جب عقل مند اور ہوشیار ہو جائے تو اسی وقت سے اسے جرأت، بے باکی، صداقت وشجاعت اور بہادری کی تربیت دی جائے، اسے کامل اور مکمل ہونے کے لیے شعور دیا جائے۔ وہ دوسروں کے لیے بھلائی اور خیر کے جذبات رکھے۔ اپنے غصے پر قابو رکھے۔ مطلب یہ کہ اسے نفسیاتی اور اخلاقی فضائل اور کمالات سے آراستہ ہونے کی تربیت دی جائے مگر ہمارے ہاں بچے کو، کسی بھی مسئلے کے مثبت پہلو اور اس کا حل بتانے کے بجائے اسے ڈرایا جاتا ہے۔ مثلاً بچہ جب پہلی مرتبہ سانپ دیکھے گا تو یقیناً ڈر جائے گا کیوں کہ ڈرنا تو انسان کی فطرت ہے۔

تاہم، اس کے ذہن میں یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ یہ کیا چیز ہے؟ پھر وہ اپنے بڑوں یا والدین سے پوچھے گا کہ یہ کیا چیز ہے؟ تو والدین اسے بتاتے ہیں کہ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ یہ انسان کو کاٹ لے تو انسان اس سے مر بھی جاتا ہے۔ ایسی باتیں بتانے سے بچہ خوف زدہ ہو جاتا ہے اور مستقبل میں خطروں سے ڈرنے لگتا ہے۔

☆.....☆.....☆

تعلیم، ہر بچے کا حق ہے

ایک سروے کے مطابق پاکستان میں قریباً 19 ملین بچے مزدور کے طور پہ کام کر رہے ہیں اور تعلیم سے محروم ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ نا قابل قبول ہے کیوں کہ پاکستان کی پالیسی کا اصول آزاد تعلیم فراہم کرنا اور بے روزگاری سے نجات دینا ہے۔ بہت سے معاملات میں مزدور بچوں کے والدین تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے یا ان کے نزدیک تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ دیہی علاقے، جہاں غربت زیادہ ہوتی ہے، وہاں تعلیم کی اہمیت کم ہوتی ہے اور والدین بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے انہیں کسی ورکشاپ، بھٹے یا کسی موٹر مکینک کے پاس کام کرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ جس کا فائدہ ان کو یہ ہوتا ہے کہ بچہ کام سیکھنے کے ساتھ ساتھ چند پیسے بھی کماتا رہتا ہے، یوں والدین پر سے اخراجات کا بوجھ کم ہو جاتا ہے اور انہیں وقتی طور پہ آسانی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غربت روز بروز بڑھ رہی ہے کیوں کہ جو بچہ آج خود کام سیکھتا ہے اور مزدور کے طور پہ کام کر رہا ہے اس کے نزدیک بھی تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ چناں چہ وہ بھی اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلواتا۔

وہ بچے جن کے ہاتھ میں قلم اور کتاب ہونی چاہیے تھی، وہ آٹو مکینک کی دکانوں، فیکٹریوں اور بھٹیوں پر جا رہے ہوتے ہیں۔ پاکستان کا ہر بچہ تعلیم کا حق رکھتا ہے۔ اس کے پاس اپنے بچپن سے لطف اندوز ہونے اور آزادانہ طور پہ کھیلنے کا اور علم حاصل کرنے کا مکمل حق ہے مگر یہ حق پاکستان کے 25 فی صد سے زائد بچوں کو نہیں ملتا۔ بچوں کو یہ حق دلانے کے لیے حکومت کے ساتھ مقامی شہریوں کو بھی کردار ادا کرنا چاہیے تا کہ بچوں کو ورکشاپوں اور بھٹیوں پہ بھیجنے کے بجائے اسکول بھیجا جائے۔

آبادی میں موجود تعلیم یافتہ افراد کو ایسے لوگوں پہ نظر رکھنی چاہیے جو اپنے بچوں کو پڑھانے کی بجائے کام پر لگا دیتے ہیں۔ انہیں تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کریں اور لوگوں کو اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے پر آمادہ کریں۔ اس کے بعد

حکومت کی ذمے داری بنتی ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف، جنہوں نے بچے اپنے پاس مزدور رکھے ہوئے ہیں، سخت سے سخت سزائیں نافذ کی جائیں اور پھر متعلقہ اداروں سے ان کالی بھیڑوں کو بھی نکالا جائے جو ائیر کنڈیشنڈ دفتروں سے باہر نکلے بغیر 'سب اچھا ہے' کی رپورٹ دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا بھی اس میں کردار ہونا چاہیے جو صاحب علم ہیں اور صاحبِ استطاعت بھی۔ وہ غریب بچے جو تعلیمی وسائل کی عدم موجودگی کی وجہ سے اسکول نہیں جا سکتے، ان کی مالی معاونت کریں اور بچوں کو پڑھانے کی ذمے داری لیں تو یقیناً مزدور بچوں میں سے استاد، ڈاکٹر، انجینئر، افسران، سیاست دان اور صحافی نکلیں گے، کیونکہ بقول اقبال

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

انعم ثناء

انعم ثناء کا تعلق پنجاب کے شہر ہارون آباد سے ہے۔ بی ایس سی کی طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ اخبارات کے لیے کالم لکھتی ہیں۔ رائٹرز کلب سے ایک سال سے وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- کشمیر جنت نظیر

2- بچوں میں موازنہ

3- سادگی ہی حسن ہے

4- تعلیم یا تربیت؟

☆.....☆.....☆

کشمیر جنت نظیر

اگر آپ کو تلاطم خیز دنیا سے دُور، پُرسکون گوشے کی تلاش ہے تو کشمیر کا انتخاب بہترین ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر۔ پہلا پاکستان میں اور دوسرا بھارت کی حدود میں واقع ہے جسے وادیٔ جموں و کشمیر کہا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر پاکستان کا ایک خوب صورت حصہ ہے جسے وادیٔ جنت نظیر بھی کہا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر کا موسم سارا سال قریباً سرد رہتا ہے اس لیے یہاں سارا سال سیّاح نظر آتے ہیں۔ یہاں بہت سے قدیم قلعے بھی موجود ہیں۔ یہ اپنی خوب صورتی کے باعث پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ ایک صحت افزا جگہ ہے۔ یوں تو یہ پاکستان کا حصہ ہے مگر اس کی اپنی الگ حکومت اور قانون ہے۔ اس کا دارالحکومت مظفر آباد ہے۔

وادیٔ نیلم، آزاد کشمیر کی خوب صورت ترین وادی ہے، جس کے متوازی وادیٔ کاغان ہے اور ان کے درمیان برف پوش چوٹیاں ہیں، جو انہیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔ وادیٔ نیلم کے بالکل درمیان میں دریائے نیلم بہتا ہے۔ وادیٔ نیلم میں گھنے جنگلات ہیں۔ وادی نیلم بھی آزاد کشمیر کی ایک خوب صورت وادی ہے۔ یہاں ایک مشہور سیاحتی مقام ''پلندری'' ہے۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں ''بیرل'' ہے۔ یہاں سِکھ دَور کا مشہور قلعہ ''ڈوگرا'' بھی موجود ہے۔ بیرل سے تھوڑے فاصلے پر ''بلن نر'' نام کی ایک خوب صورت جگہ ہے۔ آزاد کشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے مگر یہاں پہاڑی، گوجری، پشتو اور ہری پوری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ مقامی زبان ''کوشر'' ہے۔ آزاد کشمیر میں پہاڑی سلسلوں کی بلندی دو ہزار سے چھے ہزار میٹر ہے۔ ایڈونچر پسند لوگوں کے یہ پسندیدہ مقامات ہیں۔ آزاد کشمیر جنگلی حیات کا مسکن بھی ہے۔ یہاں چیتے، کالا ہرن، چکور، ہمالیہ کے ریچھوں کے علاوہ اور بھی جانور پائے جاتے ہیں۔

آزاد کشمیر میں موسم سرما کی پہلی برف باری پر ''بکرے کا گوشت بھوننے'' کا تہوار منایا جاتا ہے۔ شام کے وقت یہاں کے لوگ مزے دار کشمیری پکوان پکاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''گلابی چائے'' بھی تیار کی جاتی ہے جسے ''کشمیری چائے'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک خاص نمک کے علاوہ زعفران، دارچینی اور لونگ بھی ڈالی جاتی ہیں۔

کشمیری کھانے بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں قیام بہت ہی محفوظ ہے۔ پاکستانی سیّاحوں پر تو کوئی پابندی نہیں ہے، وہ جہاں چاہیں، جا سکتے ہیں مگر غیر ملکی سیّاحوں کو ہوم ڈیپارٹمنٹ سے اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ ان جگہوں میں دھیر کوٹ، راؤلا کوٹ، چھوٹا گالا، چھکر، دوآخان، مظفر آباد اور منگیا شامل ہیں۔ تاہم، آزاد کشمیر کے کچھ حصے ایسے بھی ہیں جہاں کوئی نہیں جا سکتا اور وہ ہے پندرہ کلومیٹر چوڑا ''بغفر ان''۔ (کنٹرول لائن پر واقع یہ وہی علاقہ ہے جو جموں کشمیر اور آزاد کشمیر کو الگ کرتا ہے،) مظفر آباد، دریائے جہلم اور دریائے نیلم کے کنارے واقع ہے۔ مظفر آباد میں دریائے نیلم کے پاس دو قلعے، ''لال قلعہ'' اور ''کالا قلعہ'' ہیں۔ پیر چناسی کا علاقہ مظفر آباد کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ قدرتی مناظر کے اعتبار سے بہت ہی خوب صورت مقام ہے۔ یہاں شاہ حسین بخاریؒ کا مزار بھی ہے، جو مظفر آباد سے 19 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ شہدگلی بھی مظفر آباد کا ایک خوب صورت سیّاحتی مقام ہے، جو سطحِ سمندر سے 1640 کلومیٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے جو خصوصی طور پر سیّاحوں کے قیام کے لیے بنایا گیا ہے۔

پاتیکا، وادیٔ نیلم کی طرف جانے والا مرکزی راستہ ہے۔ یہاں ایک چڑیا گھر اور مچھلی کے فارم بھی ہیں۔ یہاں بھی محکمۂ سیّاحت نے سیّاحوں کے لیے ایک ریسٹ ہاؤس بنایا ہے، جو سیّاحوں میں بہت مقبول ہے۔ یہاں ایک اور مشہور جگہ ''کنڈل شاہی'' ہے۔ یہاں ایک سلور رنگ کی جھیل ہے، جو دریائے نیلم میں گرتی ہے۔ اس مقام پر ٹراؤٹ مچھلی بہت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک اور مشہور جھیل ''بَن جوسہ'' ہے جو راؤلا کوٹ میں واقع ہے۔ کوہ نوردی کے بے پناہ مواقع کے ساتھ بلندی سے جھیل کو دیکھنا حَسین ترین، پُر کیف منظر ہے۔ یہاں کی روح پرور آب وہوا، طلسماتی جھیل کے سبز اور مہندی رنگ پانی صنّاعی کے ایسے نمونے ہیں جنہیں دیکھ کر کائنات کے تمام رنگ بے معنی لگتے ہیں۔ جھیل کے پانی میں مشرقی سمت میں موجود PWD کے سرخ چھت والے ریسٹ ہاؤسز کا عکس واضح نظر آتا ہے۔ یہ جھیل اگرچہ چھوٹی ہے مگر یہاں صفائی ستھرائی کا اعلیٰ نظام ہے۔ جھیل کے کناروں اور درمیان میں چند لمبے درخت جھیل کا حُسن بڑھاتے ہیں۔ یہ جھیل چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے، جو طلوعِ آفتاب کے وقت ایک الگ ہی نظارہ پیش کرتی ہے۔ بارش کے بعد اس کا پانی چمکیلا ہو کر طلسماتی دنیا کا ایک نیا روپ دکھاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

بچوں میں موازنہ

اولاد، والدین کے لیے خدا کی طرف سے خاص تحفہ ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اس خاص تحفے کا خیال بھی رکھیں۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ضرور ہوتی ہے، جو اسے کسی دوسرے انسان سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے۔ کوئی بھی دو انسان ایک جیسی خوبی کے حامل نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر ایک انسان پڑھائی میں ہمیشہ اوّل آتا ہے مگر وہی اسپورٹس میں ہار جاتا ہے، اس کے برعکس دوسرا انسان، جو پڑھائی میں فیل ہو جاتا ہے، اسپورٹس میں جیت جاتا ہے۔ اس لیے کبھی ایک انسان کا موازنہ کسی دوسرے انسان سے نہیں کرنا چاہیے، جیسے کبھی کبھی والدین کر جاتے ہیں۔ وہ اپنے بچے کا موازنہ کسی دوسرے بچے سے کر کے اپنے ہی بچے کو احساس کم تری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچے کا موازنہ کسی بھی دوسرے بچے سے نہ کریں کیوں کہ ہو سکتا ہے جن چیزوں میں آپ کا بچہ بہتر ہو، اس میں دوسرا بچہ بہتر نہ ہو۔ کبھی کبھی والدین بچوں کو اپنی خواہشات پوری کرنے والا آلہ سمجھ لیتے ہیں اور انہیں اسی طریقے سے استعمال بھی کرتے ہیں۔

بہت سے والدین اپنے کسی ایک بچے کا موازنہ اپنے ہی دوسرے بچوں سے کرتے ہیں۔ پہلے تو والدین کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی بھی بہن بھائی ایک جیسی صلاحیت کے حامل نہیں ہو سکتے۔ ان کی اپنی الگ الگ خوبیاں ہیں، جو انہیں ایک دوسرے سے مختلف بناتی ہیں۔ بہن، بھائی میں موازنہ سب سے زیادہ نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ موازنہ کرنے سے ان کے درمیان حسد پیدا ہوتا ہے اور جب بہن بھائی ایک دوسرے سے حسد کرنے لگیں تو ان کے درمیان پائی جانے والی محبت آہستہ آہستہ نفرت میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ زندگی میں کہیں نہ کہیں، کسی جگہ پر بہن بھائی کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ ان کے درمیان محبت کا جذبہ ابھاریں نہ کہ نفرت کا۔

بچے کو کبھی ''پاگل، ناسمجھ یا بے وقوف'' کہہ کر نہ پکاریں۔ اس سے ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ بہت

سے والدین اپنے بچوں کا موازنہ اُن کے کسی کزن یا دوست سے کر دیتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ تمہارا فلاں کزن کلاس میں ٹاپ کرتا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ تمہارا فلاں دوست تم سے زیادہ ذہین ہے۔ ایسی باتیں ان کے کچے ذہن کو اور کچا کر دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے، جو نہ صرف اس کے ذہنی بلکہ جسمانی نقصان کا باعث بھی بنتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ بچے کی بدلتی روٹین پر نظر رکھیں۔

ڈپریشن کے شکار بچے کی چند نشانیاں یہ ہیں۔ پڑھائی میں دل نہیں لگنا، دوستوں اور خاندان سے میل جول بند کر دینا، خوراک میں کمی اور گھر سے بھاگ جانے کا خیال۔

والدین چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر بنے لیکن کیا پتا وہ ڈاکٹر، انجینئر سے بہتر کوئی کرکٹر بن جائے۔ اس لیے بچے پر کبھی اپنی مرضی نہیں تھوپنی چاہیے۔ اس کی مرضی کا احترام کرنا چاہیے۔ تاہم، صرف جائز باتوں میں۔ ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ والدین یہ بھی نہیں دیکھتے ہیں کہ وہاں کون موجود ہے، بس بچے کو بے عزت کر دیتے ہیں جس سے اُن کی خود اعتمادی میں کمی آتی ہے اور وہ دوبارہ ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے سے گھبراتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو خاندان کے کسی فرد یا اُن کے دوست کے سامنے بے عزت کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اگر وہ اچھے نمبر نہیں لا پاتا تو لعن طعن کے بجائے انہیں حوصلہ دیں کہ کوئی بات نہیں، اگلی بار زیادہ محنت کرنا۔ اس طرح ان کی خود اعتمادی بحال ہوگی اور اس کے نتائج بھی مثبت ہوں گے۔

☆.....☆.....☆

سادگی ہی حسن ہے

فیشن....آج کے انسان کے لیے لازمی جز بن گیا ہے۔گھر ہو یا کالج ،آفس ہو یا یونیورسٹی، شادی ہو یا غمی، پارٹی ہو یا میلاد، ہر جگہ فیشن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔نوجوان نسل میں سجنے سنورنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔آج ہم نے اپنی اصل پہچان کھودی ہے اور اپنے اوپر فیشن کا خول چڑھالیا ہے۔نت نئے اور مہنگے لباس زیب تن کرنا امیری کی نشانی بن چکی ہے۔فیشن ایبل نظر آنے میں لڑکے بھی لڑکیوں سے پیچھے نہیں ہیں۔جن کے گھروں کے مالی حالت ٹھیک نہیں ہیں وہ بھی فیشن کی تکمیل کے لیے اپنی جائز ضروریات کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن فیشن ترک نہیں کرتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ضروریاتِ زندگی بھی بڑھتی جارہی ہیں، جہاں دو وقت کی روٹی پوری کرنی مشکل ہے، وہاں بھی فیشن پورا کرنے کے لیے گنجائش نکال ہی لی جاتی ہے۔بہت سی لڑکیاں صرف اپنے فیشن کی تکمیل کے لیے نوکری کی زحمت جھیل رہی ہوتی ہیں۔

آج کے دَور میں کسی تقریب میں جانا ہو تو مہینوں پہلے ہی اس کی تیاری ذہن میں گھومنے لگتی ہے۔پوری کوشش ہوتی ہے کہ ایسا لباس زیب تن کیا جائے جو پہلے کسی نے نہ دیکھا ہو، اس کے ساتھ میچنگ جیولری بھی ہونی چاہیے۔جوتے وغیرہ، سب کچھ پہلے ہی تیار کر لیے جاتے ہیں۔آج کل تو مہمان کی خاطر تواضع بھی اس کی حیثیت دیکھ کر کی جاتی ہے۔برانڈڈ کپڑے اور جوتے پہننا تو اعزاز سمجھا جاتا ہے۔کپڑے، جوتے یا دوسری چیزیں مشتہر کرنے کے لیے بڑے بڑے اداکاروں کو استعمال کیا جاتا ہے، جس سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

نوجوان نسل ٹی وی پر نظر آنے والے اداکاروں کو دیکھ کر ان کی طرح بننے کی کوشش کرتی ہے جب کہ یہ سراسر غلط ہے۔کوئی بھی شخص کسی دوسرے شخص کی طرح نہیں بن سکتا، ہر کسی کی اپنی الگ پہچان ہوتی ہے، جس سے وہ باقی لوگوں سے الگ لگتا ہے لیکن آج کل لوگوں نے نقالی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایسے کپڑے کیوں پہنتے

ہیں، ایسے گھر کیوں دِکھاتے ہیں؟ تو اس کا جواب بس اتنا ہے کہ اگر یہ لوگ اچھے کپڑے نہیں پہنیں گے تو دوسرے ان کی طرف متوجہ کیسے ہوں گے؟ اگر یہ خوب صورت جگہ اور گھر نہیں دکھائیں گے تو لوگ انہیں کیوں دیکھیں گے۔ یہ تو ان کے کام کا حصہ ہے اور انہیں پیسے ہی اس چیز کے ملتے ہیں۔

غریب گھرانوں کی لڑکیاں جب اپنی ساتھی لڑکیوں کو روزانہ یوں نت نئے لباس زیب تن کیے دیکھتی ہیں تو وہ بھی ان جیسی بننے کی خواہش کرتی ہیں اور کچھ لڑکیاں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے غلط راہ پر بھی چل پڑتی ہیں اور اپنا نقصان کروا بیٹھتی ہیں۔

خود کو سنوارنے کے علاوہ گھروں کو بھی نت نئے انداز سے سنوارنے کا ٹرینڈ بنتا جا رہا ہے۔ گھروں کی آرائش کے لیے قیمتی فرنیچر اور پردے وغیرہ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اپنی چیزوں کی نمائش کرنا بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ دولت کی ہوس اور دوسروں کی نقالی بھی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے چہروں پر نور نہیں ہے۔ تو نور کیسے ہوگا، جب ہم نے اپنے اوپر فیشن کا خول چڑھا رکھا ہو۔ جب مہمان زحمت بننے لگ جائے تو گھروں میں رحمت کیسے آئے گی؟ ہم کیسے مسلمان ہیں جو دوسروں کی نقالی کر کے خوش ہو رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے تو ہمیشہ سادگی اپنائی اور اپنی زندگی بھی سادگی سے گزاری۔ سادگی کا تعلق تو ایمان سے ہے۔ سادگی بذاتِ خود حُسن ہے۔ سادگی سے رہنے والا شخص، اپنے اوپر فیشن کا خول چڑھانے والے شخص سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

تو کیا فائدہ اس عارضی، وقتی اور یک لخت ٹوٹ جانے والی چیز پر اپنا وقت، پیسہ اور قوت صرف کرنے کا؟ ہاں...! جو پائیدار اور ہمیشہ رہنے والی ہے، اس کے لیے پیسہ، وقت اور توانائی خرچ کرنا عقل مندی ہے۔ بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ کنول کا پھول جتنا کیچڑ میں اچھا لگتا ہے اتنا کسی گل دان میں نہیں۔

☆.....☆.....☆

تعلیم یا تربیت؟

آج کے جدید دور میں جہاں تعلیم ضروری ہے وہیں تربیت بھی ضروری ہے۔ تعلیم وہ ہے، جو کتاب میں لکھی ہے۔ استاد نے پڑھایا، بچے نے یاد کیا، امتحانی پرچے میں لکھا، پاس یا فیل ٹھہرا۔ ڈگری ہاتھ میں آئی، جس کی بنیاد پر روزی کمانی ہے۔ جب کہ تربیت لکھی، پڑھی، پڑھائی یا بتائی نہیں جاتی بلکہ یہ ایک عملی رویہ ہے۔ بچوں کی زندگیاں والدین کے گرد گھومتی ہیں۔ بچہ ہر معاملے میں ان کا محتاج نظر آتا ہے۔ اپنی زندگی کا ہر مشورہ اور فیصلہ اپنے ماں باپ کی مرضی سے کرتا ہے۔ اس بات کوئی شک نہیں کہ تعلیم کے بغیر دنیا میں رہنا بہت مشکل ہے۔

بچہ جونہی تین سال کا ہوتا ہے، والدین کو اس کی تعلیم کی فکر ہو جاتی ہے۔ اسے بہترین تعلیم دینے کے لیے اچھے سے اچھے اسکول کا انتخاب کرتے ہیں۔ بہترین کتابیں خرید کر دی جاتی ہیں۔ سالانہ امتحانات کی رپورٹ گھور گھور کر دیکھی جاتی ہے۔ ایک نمبر بھی کم ہوا تو پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ لیکن کیا اس کے ساتھ ہم بچوں کی تربیت میں بھی اتنا ہی تردّد کرتے ہیں۔

یہ ایک اہم سوال ہے، جس کا جواب یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کی تربیت نہیں کر رہے بلکہ صرف تعلیم دینے پر زور دے رہے ہیں کہ ان کا بچہ کسی اچھی فیلڈ میں جا کر ان کا نام روشن کرے۔ ہم جسے تعلیم کہتے ہیں وہ صرف اور صرف روزگار کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہے جب کہ تربیت وہ شے ہے، جو صرف روزگار حاصل کرنے ہی میں نہیں، معاشرے میں، گھر میں، سڑک پر، اپنوں اور بے گانوں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں کام آتی ہے۔

تعلیم تو اتنی ادھوری شے ہے کہ وہ آپ کو مکمل طور پر روزگار کے قابل بھی نہیں بنا سکتی۔ فرض کیا، آپ کو نوکری مل گئی مگر جب آپ ایمان داری سے کام نہیں کریں گے تو آپ کی نوکری بھی برقرار نہیں رہے گی۔ اولاد کی صحیح تربیت والدین کا فرض ہے۔ بچے وہی سیکھتے ہیں جو اس کے آس پاس ہوتا ہے، اگر والدین خود نیک ہو گے تو بچوں کی تربیت

بھی اچھی طرح کر سکیں گے۔ نیک اولاد نہ صرف دنیا میں فائدہ دیتی ہے بلکہ والدین کے دنیا سے جانے کے بعد بھی صدقۂ جاریہ بنتی ہے۔

مشہور قول ہے: ''جو باپ اپنے بچوں کو ادب سکھاتا ہے وہ اپنے دشمن کو نیست و نابود کرتا ہے''۔ کیوں کہ بچہ جب ادب سیکھ جاتا ہے تو دولت، شہرت اور عزت، سب کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ بچے کی اچھی تربیت کرنے کے لیے آپ کا خود اچھا ہونا ضروری ہے۔ انسانوں سے محبت کرنا، ان کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھنا، ان کی خوشی میں خوش ہونا آنا چاہیے۔ بچہ حقوق العباد صرف اس وقت سیکھ سکے گا جب والدین خود سیکھے ہوئے ہوں گے۔

کسی دانش ور نے کہا ہے، ''یتیم وہ بچے نہیں، جن کے والدین دنیا سے چلے گئے بلکہ اصل یتیم تو وہ ہیں جن کی ماؤں کو اولاد کی تربیت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور باپ کے پاس انہیں دینے کے لیے وقت نہیں ہے''۔ والدین بچوں کی تربیت، محض اسکول و کالج کی ذمے داری نہ سمجھیں بلکہ اپنی نگرانی میں اولاد کی شخصیت سازی کریں۔ بچے کی تعلیم کی ذمے داری تو کسی پر بھی چھوڑی جا سکتی ہے مگر تربیت آپ کی اپنی ذمے داری ہے۔ آج کے دَور میں تعلیم اور تربیت دونوں ہی ضروری ہیں کیوں کہ اچھی تعلیم و تربیت ہی بچے میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے، جو اسے زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

حمیدہ کیلانی

حمیدہ کیلانی کا تعلق لاہور سے ہے۔ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی سے ایم ایس کر رہی ہیں۔ 3 سال قبل لکھنے کا آغاز کیا اور تا حال سفر جاری ہے۔ ایک سال سے رائٹرز کلب سے بطور ممبر وابستہ ہوئیں اور اخبارات میں شائع بھی کروا چکی ہیں جن کو خاصی پذیرائی بھی ملی ہے۔

فہرست تحریر

1- میرا رب ہی تمام خزانوں کا مالک ہے

2- تقویٰ، توکل اور دعا

☆.....☆.....☆

میرا رب ہی تمام خزانوں کا مالک ہے

''پھر خدا نے میرے دل میں اس کی محبت ڈالی ہی کیوں؟'' وہ تڑپ کے یوں بولی کہ میرے قدم بے اختیار رک گئے۔ حنا کو بلال دے دیں، آقا ﷺ پلیز بلا لیں۔ آقا ﷺ میرا نام آ جائے۔ آقا ﷺ میں آپ کے روضے پر، آپ کے آگے گڑگڑا کر آپ سے بلال کو مانگنا چاہتی ہوں۔ پلیز آقا ﷺ! آپ تو خدا کے محبوب ہیں، آپ سب منوا لیتے ہیں، مجھے بلال دے دیں۔

وہ لائبریری کے چھوٹے سے پریئر روم میں تنہا بیٹھی زور زور سے ہل ہل کر دعا مانگ رہی تھی، جب میں آہستہ سے اندر داخل ہوئی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے اور میں سراپا سماعت بن گئی۔ وہ میری آمد سے قطعی لاعلم ہلتی اور دعا مانگتی رہی۔ جب چند لڑکیاں شور مچاتی اندر آئیں اور انہوں نے اسے اپنی آواز مدہم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنسوؤں سے تر چہرے پر ہاتھ پھیرا، ٹشو سے ہاتھ اور چہرہ صاف کیا، کاجل درست کیا۔ وہ اٹھ کر شیشے میں اپنا معائنہ کر رہی تھی جب میں نے اسے جا لیا۔

السّلام علیکم! میری آواز ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ ایکسکیوزمی! میں پھر بولی تو اب کی بار وہ متوجہ ہوئی، جی!؟

''السّلام علیکم!'' میں نے خوش دلی سے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ جواباً وہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگی اور اپنا آدھا ہاتھ تھمانے پر اکتفا کیا۔

''آپ کا نام! کس ڈیپارٹمنٹ سے ہیں آپ؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''آئی ایم حنا، فرام آئی بی آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ''۔ وہ اپنے بالوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے بولی۔ ظاہر ہے، میں سراپا حجاب تھی اور وہ سراپا ماڈرنزم کا شاہکار۔ تو بالخصوص جتلانا اس کا بنتا تھا۔

''حنا! میں آپ کی دعا سن رہی تھی ابھی، دل دہل گیا''۔ میری بات پر اس نے ابرو سکیڑے، تعجب کا اظہار کیا،

پھر آہ بھر کر بولی، ''میری کہانی ایسی ہی ہے یار! سب کے دل یوں ہی کانپتے ہیں''۔

اچھا! میں نے بھی جی بھر کر اظہار تعجب کیا۔ ''بس یار! آپ خدا سے میرے لیے دعا مانگنا، خدا مجھے بلال دے دے۔ وہ اب نماز کے لیے لیا جانے والا دوپٹہ گلے میں لپیٹے، بلند و بالا جوڑا بنانے میں مصروف تھی۔

''حنا! میں ان شاء اللہ آپ کے لیے ضرور دعا کروں گی لیکن کیا آپ تھوڑی دیر میرے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں؟ صرف تھوڑی سی دیر کے لیے؟؟''

''ضرور!'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہامی بھر لی اور وہیں بیٹھ گئی پھر کچھ توقف کے بعد ہولے سے مسکرا کر بولی، ''آپ کو یہی کہنا ہوگا کہ مجھے بلال سے دوستی نہیں کرنی چاہیے؟''

''نہیں تو! یہ تو نہیں کہنا''۔ میں بھی جواباً مسکرائی ''بلکہ اگر وہ تمہارے حق میں بہتر ہے تو اللہ تمہیں حلال صورت میں ضرور دے''۔

''آمین!'' اس کے دل سے آواز آئی۔ ''حنا! آپ کا حج یا عمرے کا پلان ہے؟''

''نہیں ایسا کوئی پلان تو نہیں ہے، میری فرینڈ جا رہی ہے، بس میرا بھی دل کیا کہ آقا ﷺ مجھے بھی بلا لیں۔ سنا ہے وہاں جا کر آقا ﷺ سے کچھ بھی مانگو، وہ دعا رد نہیں کرتے''۔

ایک دفعہ پھر میرا دل زور سے کانپا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کہاں سے شروع کروں؟ پھر مجھے یاد آیا، بلاشبہ میری بات سے زیادہ پُر اثر اللہ اور رسول ﷺ کی بات ہے، وہیں سے آغاز کرتی ہوں۔ ''حنا! نبی اکرم ﷺ نے بتایا تھا کہ دعا ہی عبادت ہوتی ہے۔ (ترمذی، صحیح) اور اللہ نے قرآن میں واضح طور پر کہا ہے، تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ (بنی اسرائیل) حنا! اگر اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی جائے تو پتا ہے وہ کیا ہوتا ہے؟ وہ شرک ہے شرک۔ تو حنا! ہم کیوں یہ شرک کرتے ہیں؟ جو سمجھانے آئے تھے کہ شرک نہ کرنا، انہیں کی ذات کی آڑ لے کر ہم عظیم رب کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں''۔ وہ خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔ ''اللہ نے پہلے ہی دن ہمیں یہ کہنا سکھایا تھا حنا! 'ہم صرف اور صرف آپ ہی سے مانگتے ہیں اور صرف آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں''۔ تو پھر ہم کسی اور سے مدد کیوں چاہتے ہیں، ہم کسی اور سے کیوں مانگتے ہیں؟ 'آقا ﷺ مجھے یہ دیں'، کی صدائیں کیوں لگاتے ہیں؟ آقا ﷺ مجھے مدینے بلا لیں۔ یہ آقا ﷺ سے کیوں، اللہ سے کیوں نہیں مانگتے؟'' میں بول رہی تھی کہ وہ شور مچاتی لڑکیاں ایک بار پھر اندر آ گئیں۔ میری بات پر ان میں سے ایک نے پیچھے دیکھا، چونکی اور بولی، ''آقا ﷺ تو وہ ہیں جن سے کسی نے بھی مانگا تو انہوں نے اسے 'لا' (نہیں) نہیں کہا۔ آقا ﷺ سے جس نے بھی مانگا آقا ﷺ نے اسے دیا''۔ وہ سفید لباس میں ملبوس تھی۔

''آپ کا نام؟''

''سنبل''۔

''ٹھیک ہے سنبل! تو گویا ہمیں آقا ﷺ سے مانگنا چاہیے؟ آقا ﷺ کے مالک سے نہیں؟''

''ایک ہی بات ہے، جس سے بھی مانگو''۔

''گویا تمہارا مطلب ہے کہ خدا اور مصطفیٰ ﷺ ایک ہی ہیں۔ ان سے مانگنا بھی ایک ہی بات ہے؟'' میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہی تھی۔

''او مائی گاڈ! بلاشبہ دونوں ایک نہیں ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ آقا ﷺ رب کے محبوب ہیں۔ آقا ﷺ سے کچھ بھی مانگو، آقا ﷺ کسی کو 'نہ' نہیں کہتے''۔ اس نے کہا۔

''تو کیا آقا ﷺ کا رب 'نہ' کہہ دیتا ہے؟'' میں لرز کر بولی تھی۔ وہ یک دم خاموش ہوگئی۔

''اگر وہ 'نہ' نہیں کہتا تو پھر اسی سے مانگنا چاہیے کیوں کہ وہ آقا ﷺ کا بھی مالک ہے۔ سب سے بڑا ہے اور اگر وہ 'نہ' کہہ دیتا ہے مگر ان کا محبوب نہیں کہتا تو پھر۔۔''۔ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ پھر بولی، ''کیا مطلب ہے کہ وہ 'لا' نہیں کہتے تھے؟ یہی ناں کہ ان ﷺ سے بھی مانگو اور خدا سے بھی مانگو۔ کوئی بھی 'لا' نہیں کہتا۔ ہم گناہ گار ہیں، خدا سے پہلے اس کے محبوب ﷺ کے در پر جاتے ہیں''۔

''نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے 'لا' نہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر نبی ﷺ کے پاس کوئی بھی اپنی ضرورت لے کر آتا تھا کہ مجھے فلاں چیز دے دیں۔ کھانا، مال وغیرہ، تو آپ ﷺ نے اسے 'لا' نہیں کہا۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ دوسروں کی بات سنی۔ کسی نے بھوک کی شکایت کی، آپ ﷺ کے پاس کھانا نہ تھا، آپ ﷺ نے منادی کروائی، کون ہے جو اسے کھانا کھلائے۔ پھر ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے مہمان نوازی کی۔ یاد ہے ناں! یہ سب کیا ہے؟ یہی کہ اللہ کے رسول ﷺ انسانی بساط کے مطابق جتنا کر سکتے تھے، کیا کرتے تھے۔ یہ مطلب ہے اس بات کا کہ وہ 'لا' نہیں کہتے تھے اور وہ واقعہ بھی تم دونوں کو یاد ہوگا، جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے لیے نکل رہے تھے، کچھ صحابہ رونے لگے۔ ان کے پاس سواریاں نہ تھیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ کے لیے نکل سکتے، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سواریاں لینے آئے۔ آپ ﷺ نے کیا فرمایا تھا؟ ''میں اپنے پاس کوئی سواری نہیں پاتا جس پہ تمہیں سوار کر سکوں''۔ (سورۃ التوبہ ۲۹) نبی ﷺ کہہ رہے تھے، میرے پاس سواری نہیں ہے، تمہیں نہیں دے سکتا۔ کیوں....؟ کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ مخلوق تھے، اللہ خالق ہے۔ ''اللہ ہی آسمان و زمین کے خزانوں کا مالک ہے''۔ (سورۃ المنافقون) کیا اللہ نے کبھی کسی کو کہا کہ میرے پاس خزانے کم ہوگئے ہیں، تمہیں دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں اب تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ سنبل، حنا! رسول ﷺ اس لیے نہیں آئے کہ انہیں نعوذ باللہ خدا بنا کر ان سے مانگا جائے، وہ اس لیے آئے کہ ان کی اطاعت و فرماں برداری کر کے رب کو راضی کیا جائے''۔ میں سانس لینے کو رکی۔

''مجھے کچھ نہیں پتا یار! بس یہ معلوم ہے کہ آقا ﷺ سب کچھ دے سکتے ہیں''۔ سنبل ٹیک چھوڑ کر بیٹھ گئی تھی۔
''آپ کھانے کی بات کرتی ہیں، وہ کھانا ہی نہیں حافظہ بھی دیتے ہیں، جو بھی مانگو وہ دیتے ہیں۔ یاد ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حافظہ مانگا، کیا آپ ﷺ نے انہیں حافظہ نہیں عطا کیا؟ ایسا عطا کیا کہ پھر وہ کبھی کچھ بھولے ہی نہیں''۔
گروپ کی لڑکیوں کی آنکھوں میں پہلی بار چمک ابھری تھی۔

''سنبل! ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حافظہ مانگا نہیں تھا بلکہ انہوں نے شکایت کی تھی کہ میرا حافظہ اچھا نہیں، میں کیا کروں؟ اور اللہ کے رسول ﷺ کا معجزہ تھا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ سے مانگنا جائز ہے اور وہ سب کچھ دے سکتے ہیں بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام سے معجزے صادر ہوتے ہیں۔ کیا عیسیٰ علیہ السّلام کے معجزات نہیں تھے؟ وہ تو اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کرتے تھے، بیماروں کو شفایاب کرتے تھے۔ یہ ان کے معجزات تھے اور اس لیے تھے کہ لوگ یقین کر لیں کہ پیغمبر برحق ہیں اور ان کی اطاعت فرض ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آج اگر ہم گناہ گار ہیں تو بیمار ہونے پر اللہ کو چھوڑ کر، عیسیٰ علیہ السّلام سے شفاء مانگنا شروع کر دیں''۔
میری توقع کے برعکس سنبل خاموش ہو چکی تھی۔ ''کوئی ایسا نکتہ ہوتا ہے، جو انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ویسے سنبل! سوچنے کی بات ہے ناں، کیا اللہ کو نہیں معلوم کہ اس کے بندے گناہ گار ہیں؟ وہ کہہ دیتا، اے گناہ گار بندو! مجھ سے نہیں، میرے محبوب سے مانگنا، تب میں تمہاری مراد پوری کروں گا۔ مگر سنبل پیاری! حنا عزیزی!'' میں نے حنا کی جانب دیکھا، اس کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ ''اللہ نے ہم سے کہیں بھی ایسا نہیں کہا۔ اس نے ہمیں ان باتوں سے دُور رکھا۔ یہ کہا، مانگو مجھ سے، میں دوں گا۔ صرف، صرف اور صرف اللہ سے مانگنا سکھلایا۔ صرف اپنے در پہ جھکنا سکھایا۔ سنبل! حنا! میں سوچتی ہوں کہ اگر رب فقط نیکوکاروں کا ہے تو گناہ گاروں کا رب کون ہوگا؟ وہ تو کہتا ہے، ''اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا، اللہ سب کے گناہ معاف کر دے گا''۔ (الزمر)

پرئیر روم میں مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کانوں میں بجنے لگی تھی۔ سنبل چھت کو گھور رہی تھی۔ حنا سر جھکائے بیٹھی تھی اور میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی، اللہ! مجھے اور میرے ذریعے لوگوں کو ہدایت دے۔

''لیکن وسیلہ تو بنا سکتے ہیں ناں اور ہم وسیلہ ہی بناتے ہیں۔ ہم اصل میں ان سے نہیں مانگتے۔ ایک ایس ایچ او کے پاس پہنچے کے لیے بھی ہمیں وسیلوں کی ضرورت ہوتی ہے نا یار!'' ساتھ بیٹھی ایک لڑکی نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ ایک باریک سی آواز والی پتلی سی لڑکی تھی۔ دیگر لڑکیاں بھی اس کی تائید کرنے لگیں۔

''ایس ایچ او ہم سے دور ہوتا ہے، اس لیے اس تک پہنچنے کے لیے اس کے کسی پیارے، قریبی عزیز یا دوست کا سہارا لیتے ہیں لیکن جو خود کہتا ہو، بڑے پیار سے، بڑی اپنائیت سے کہ 'میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں'، اس

کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ دور ہے ہی نہیں۔ وہ قریب ہے، رگِ جان سے زیادہ قریب ہے اور قریب تک پہنچنے کے لیے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ قریب، دُور نہیں ہوتا۔ قریب ہمیں خود بڑے پیار سے سن رہا ہوتا ہے، ہماری لاج رکھتا ہے، مان رکھتا ہے''۔

پتلی سی لڑکی نے میری بات پر اثباتاً سر ہلایا۔ چند ثانیوں کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔

''بس یار! یہ آخری سوال ہے''۔ سنبل اپنے ناخنوں سے نیل پالش کھرچ رہی تھی۔ ''اگر سہاروں کی ضرورت نہیں تو روزِ قیامت لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس کیوں جائیں گے؟ وہ قریب رب سے خود کیوں نہیں مانگ لیں گے؟''

''سنبل! دنیا اور آخرت کے اصول مختلف ہیں۔ دنیا میں رب کے بندوں کے لیے یہ قانون ہے کہ وہ قریب ہے، سنے گا، دعائیں قبول کرے گا۔ توبہ بھی قبول کرے گا۔ آخرت میں جہنمی، جتنا مرضی دعا مانگیں، قبول نہ ہوں گی۔ توبہ کرلیں، رائیگاں جائے گی۔ ہے ناں ایسا؟'' وہ سر ہلانے لگی۔ ''اور آخرت میں لوگ، اللہ کے پیارے پیغمبر ﷺ سے دعا کا مطالبہ کریں گے اور وہ دعا کریں گے۔ دعا کی یہ سفارش، آج بھی جائز ہے۔ کسی بھی زندہ (دنیا میں موجود) بزرگ سے دعا کروالیں، بالکل جائز ہے۔ دنیا والے کائنات کے عظیم ترین انسان سے یہ کہیں گے کہ اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ آج ایسے غضب میں ہے جتنا وہ پہلے کبھی ہوا تھا نہ کبھی ہوگا۔ پس ہمارے دلوں کی ٹھنڈک، روحوں کا قرار سیّد المرسلین ﷺ سفارش کریں گے''۔

حنا خلاؤں میں گھورتے ہوئے قریباً سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ''اب میں بھی بس اللہ ہی سے مانگوں گی۔ اپنے بلال کا سوال بھی اللہ ہی سے کروں گی۔

حنا کی بات پر مجھے سنجیدہ ماحول میں بھی بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اسے اپنا بلال نہیں بھولا تھا۔

''اللہ سے دعا اور رسول ﷺ کی اطاعت۔ اس اصول کو یاد رکھو۔ اللہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔

اب وہ شور مچاتی لڑکیاں آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے ٹائم دیکھا۔ سنبل سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا، حنا سے نمبر کا تبادلہ کر کے نکل آئی۔ میری بس کا پوائنٹ آنے والا تھا۔ میں لائبریری کا وسیع و عریض ہال عبور کرتی تیزی سے نیچے جا رہی تھی اور زبان پر کلمۂ شُکر جاری تھا۔

☆.....☆.....☆

تقویٰ، توکل اور دعا

بھلا لوگ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں جب اللہ میرا رب ہے۔ کیا لوگ مجھے تکلیف دیں گے جب میرا رب مجھے کافی ہو چکا؟ ہما! میرے انتظار میں وہ یوں ہی سو گئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بولی، ''کیا ہوا؟''

اس رات میرا وجود گویا سولی پہ لٹکا ہوا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ باس نے مجھے کمپنی سے نکال دیا تھا۔ وہ باس.... جس کی خاطر میں نے کتنے ہی لوگوں کی مخالفت مول لی تھی۔ آج اس نے مجھے ایک معمولی سی غلط فہمی پر چلتا کیا تھا۔ آہ! چار بچوں کا باپ ہوں میں، مجھے دن میں تارے دکھائی دینے لگے۔ دماغ میں ان واقعات کی ریل چلنے لگی، جن میں باپ اپنے ہاتھوں سے بچوں کو قتل کرتا اور آخر میں خودکشی کر لیتا ہے، محض اس لیے کہ اس کے پاس انہیں کھلانے کو کچھ نہ ہوتا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے ہر در بند دِکھائی دیا۔ میرے دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں نے بے قرار ہو کر بے خبر سوتی بیگم کو اٹھایا۔ سدا کی بے پروا ہما نے آنکھیں ملیں، میرا غم سنا اور پھر آنکھیں مسلتے ہوئے بولی، نانا ابا سے کہیے گا، وہ دعا کریں گے، چٹکی میں مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ کو اس سے اچھی جاب مل جائے گی۔ ایسے ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ کھانا لینے کچن کی طرف چلی گئی۔ صحیح تو کہہ رہی تھی وہ۔ مجھے بھی ان پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ تھے بھی پہنچے ہوئے، جانے کیوں مجھے ان کا خیال نہیں آیا تھا۔ شاید پریشانی کی شدت نے حواس باختہ کر دیا تھا۔ مجھے ان کا محبوب ترین نواسا ہونے کا شرف حاصل تھا۔

اب، جب میں اس مشکل میں پھنسا، تو ان کے در کا رخ کیا۔ ان کی دعا میں عجب تاثیر دیکھی تھی، وہ مستجاب الدعوات تھے۔ ان کا دعاؤں پہ یقین مثالی ہوتا تھا اور دعا میں توکل ہو تو دعا کیوں قبول نہیں ہوگی۔ میں نے خود ان کے روبہ رو حاضری دینے کا سوچا اور علی الصبح چل دیا۔ ساری حالت ان کے گوش گزار کی۔ نانا جان نے اطمینان سے مسئلہ سنا اور مجھے یقین دلاتے ہوئے کہنے لگے، تمہارا کام بن جائے گا۔ پہلے سے اچھا بنے گا، بس تم پریشان مت ہو۔ کوشش

جاری رکھو۔ ان کے لہجے کا یقین مجھ میں بھی سرایت کر گیا۔ میں نے سوچا، نانا جان دعا کر دیں گے تو اور کیا چاہیے۔ مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اطمینان سے لوٹا اور اپنی سی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

لمحے دنوں میں، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ پھر مہینے سال میں بدل گئے۔ ایک جگہ کام ملا تو راس نہ آیا، باس کی حد درجہ سختی نے مجھے بھاگنے پہ مجبور کر دیا۔ ایک اور جگہ بڑی مشکل سے کام ملا، وہاں باس کو میں راس نہ آیا۔ پھر پندرہ ہزار روپے ماہوار پر مجھے ایک جگہ کام مل گیا۔ صبح سے شام تک کام کرتا اور پندرہ ہزار روپے وصول کرتا۔ جی ہاں، میں چالیس ہزار سے پندرہ ہزار پہ آیا تھا جب کہ میں چار بچوں کا باپ بھی تھا۔ غربت نے ایسی کمر توڑی کہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ بچوں کو ٹیوشن سے ہٹا دیا اور اچھے اسکول سے ہٹا کر گورنمنٹ کے ادارے میں داخل کروا دیا۔ سبزی اور سالن کا تصور گھر سے ختم ہونے لگا۔ روٹی ہی میسّر آ جاتی تو مرچوں کے ساتھ حلق سے اتارنے کی سعی کرتے۔ آس پاس کے لوگوں نے ڈھکے چھپے انداز میں مدد کرنے کی کوشش کی مگر میری خودداری زنجیر بن کر ان کے اور میرے مابین حائل ہوتی رہی۔

کبھی میں بے بسی سے آسمان کی جانب دیکھتا پھر ہاتھ نیچے کر لیتا کہ ہم گناہ گاروں کی وہ کیوں سنے گا؟ مگر نانا کی دعا کہاں تھی؟ نانا تو پہنچے ہوئے بزرگ تھے، نیک تھے، مستجاب الدعوات تھے۔ انہیں رب پر بڑا یقین تھا اور مجھے نانا پر یقین تھا۔ پھر.... مسئلہ کہاں تھا؟ میں سوچتا اور روتا رہتا۔ ہر بات مذاق میں اُڑا دینے والی ہما بھی اب پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اس کے قہقہے منوں مٹی تلے جا دفن ہوئے تھے۔ میرا جی چاہتا، دیواروں سے ٹکریں مار کر خود کو ختم کر لوں اور بلکتے ترستے بچوں کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دوں۔ نانا جان مسلسل ساتھ تھے اور کہتے تھے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

مجھے نہیں لگتا کہ یہ نانا ابا کے بس کا روگ ہے۔ میں شکست خوردہ، کام سے واپسی پر سوچتا ہوا لوٹ آیا۔ رات ہوئی تو ہما کہنے لگی، ''ہمارے گناہ ہوں گے جو آڑے آ چکے۔ سنا ہے توبہ کرنے سے مالک بخش دیتا ہے۔ ہمیں اس سے معافی مانگنی ہوگی ورنہ بھوکے مر جائیں گے''۔ میں نے اس کے زرد ہوتے چہرے کی جانب دیکھا اور کہا، صحیح کہتی ہو۔ بس وہ رات تھی۔ نہ میں سویا نہ وہ سوئی۔ رو رو کر معافی مانگی، مالک! بتا دے ہم سے کیا گناہ ہوا ہے؟ گناہ گار ہوں تو کیا؟ ہوں تو تیرا ہی بندہ۔ اگر تو صرف نیکوکاروں کا ہے تو گناہ گاروں کا رب کون ہے مالک؟ یہ کہتے کہتے میری ہچکی بندھ گئی۔ میں رب سے ایک طویل عرصے کے بعد یوں مخاطب ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سامنے پل پل کے گناہ کی ریل چلنے لگی۔

معاف کر دے، اب کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ ایک بھی گناہ نہیں کروں گا، تیری سب باتیں مانوں گا۔ میں عہد و پیمان پر اتر آیا۔ بس تو معاف کر دے، ہمارے دن پھیر دے۔ میں بھی رو رہا تھا، بیگم بھی بلک رہی تھی۔ ایک گھنٹہ، دو

گھنٹے، تین گھنٹے۔ بخدا ساری رات ہم یوں ہی سجدے میں پڑے میں پڑے رہے، یہاں تک کہ فجر ہوگئی۔ جمعۃ المبارک کی بابرکت اور روشن صبح نمودار ہوگئی۔

پوری دنیا کے انسان تمہارے خیر خواہ ہو جائیں، تمہارا بھلا کرنا چاہیں۔ وہ اس بات کے لیے جدوجہد کریں، اکٹھے ہو جائیں کہ ہم تمہارا کام کر دیتے ہیں۔ تمہیں مشکل سے نکال دیتے ہیں، تمہاری بگڑی سنوار دیتے ہیں۔ تو کائنات کے رب کی قسم، وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر اللہ نے تمہارے لیے در بند کر دیے ہیں اور اگر تمہارے رب نے تمہارے لیے خیر کا کوئی در کھول دیا ہے، وہ تمہیں نوازنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں کچھ عطا کرنا چاہتا ہے تو ساری دنیا تمہارے مدمقابل آ جائے، وہ تمہارا بال برابر بھی نقصان نہیں کر سکتی۔ تمہیں وہ خیر مل کر ہی رہے گی۔

''اللہ اگر لوگوں کے لیے اپنی رحمت (کا دروازہ) کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں اور وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے''۔ جمعۃ المبارک کا یہ خطبہ گویا میرے ہی لیے تھا۔ مجھے لگا، تیرہ مہینوں بعد جب میں تائب ہوا تو رب نے مجھے بتلایا کہ تمہارا گناہ تھا کیا۔ میرا گناہ، میرا کفر تھا۔ مجھے رب پہ ایمان تو ایک دن بھی نہ تھا۔ مجھے نانا کی ذات پہ اعتماد تھا۔ میرا تعلق تو نانا سے تھا۔ اپنے پیدا کرنے والے سے تو میرا کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ دیکھیے ایک منظر، چودہ صدیوں قبل ایک بھتیجا اپنے چچا کے سرہانے بیٹھا کہے جا رہا ہے۔ ''چچا! یہ جملہ کہہ دیں ناں.... کہہ دیں، کہہ دیں۔ ایک دفعہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں۔ فقط ایک دفعہ۔

بھتیجا کائنات کا امام ہے۔ اس کی دعا تھی، التجا تھی کہ چچا ابو طالب جہل کلمہ پڑھ لیں۔ کائنات کے امام اپنے چچا کا بھلا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ چچا بھی خیر سے نوازے جائیں۔ وہ اسلام سے سرفراز کیے جائیں۔ تب رب تعالی نے آسمان سے آیات اتاریں۔

''آپ اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، جس کی ہدایت آپ کو محبوب ہو بلکہ یہ اللہ ہے، جو جسے چاہتا ہے ہدایت سے سرفراز کر دیتا ہے''۔ (القصص ۵۶)

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جسم پسینے میں شرابور ہو گیا اور سانس پھولنے لگی۔ میری آنکھوں کے کٹورے بھرنے لگے۔ کائنات کے امام اپنے چچا کو ہدایت نہیں دلوا سکے تھے۔ مولا نا نہ جانے کیا فرما رہے تھے مگر مجھے بس ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ ''ساری دنیا مل جائے، وہ تمہیں خیر دینے کا اختیار نہیں رکھتی اگر تمہارے لیے اوپر والے کا دروازہ بند ہے اور اوپر کا در بس تب کھلتا ہے جب مصیبت میں مبتلا شخص کے پاس تین چیزیں ہوں۔ تقویٰ، توکل اور دعا''۔

''ساری دنیا مل کر بھی ہمارا کچھ نہیں کر سکتی ہما! جانتی ہو؟''

''ہوں.... ایسا ہی ہے''۔ اس کا تجربہ شاہد تھا، وہ ایک گہری سانس لے کر بولی، ''تمہارا یقین ہے یا تمہیں لگتا

ہے کہ دنیا کا کوئی شخص تمہیں اس مشکل سے نکال سکتا ہے؟ کوئی ایک بھی نہیں''۔ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بھرّا گیا۔

''تین چیزیں تھامنی ہوں گی۔تقویٰ،توکل اور دعا''۔

''تقویٰ کیسے؟''اس نے بیٹے کو گود میں لٹایا اور تھپک کر سلانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔

''اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے۔شُکر کیا جائے، ناشکری نہ کی جائے۔اسے ہر لمحے یاد رکھا جائے، بھولا نہ جائے پھر اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ ہر تنگی سے نجات دے گا''۔

''ہر تنگی....؟ میرے بچوں کی بھوک کا سامان بھی ہوگا؟''ہمارک کر بولی۔

''ہاں ہر تنگی سے نجات ملے گی۔کوئی پیچھے بچے گی ہی نہیں''۔میں نے حرف بہ حرف مولانا کے الفاظ دُہرائے۔

''ٹھیک ہے اور توکل؟''

''توکل، محنتِ کاملہ کی جائے اور رب پر ہر لمحہ، ہر لحظہ مان رکھا جائے کہ میرا رب بہترین کرے گا اور بہت جلد آسانیاں کرے گا۔مشکلات کی انتہائیں ہوں اور بندہ کہہ دے 'حسبی اللہ' میرا رب مجھے کافی ہے''۔

''اور دعا کا بھی بتا دیجیے''۔

''پورے وجود کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں جھک کر عرضی پیش کر دینا اور کسی اور کی جانب نہ دیکھنا''۔

''یہ تین کام کر لیں اور ہر پریشانی بھول جائیں، فکر اتار پھینکیں۔نتائج سے بے پروا ہو جائیں۔اب آپ نہیں کوئی اور ہے سب دیکھنے والا''۔میں نے مولانا کی ایک ایک بات اسے سنا دی۔''ہما! مولانا کہتے تھے،''دل کی گہرائیوں میں یہ بات اتار لیجیے، اختیار اسی کا ہے۔فیصلہ اسی کا چلتا ہے۔کوئی اس ذات کو مجبور نہیں کر سکتا۔ہر ایک کو خود اپنی جنت کمانی ہے اور اسی سے لینی ہے۔جب سب وہی ہے تو امیدیں، تمنائیں بھی اسی سے لگانی ہوں گی۔کسی اور کی جانب دیکھنے کا تصور بھی نہیں ہونا چاہیے۔ساری دنیا سے کٹ کر پورے مان، بھروسے اور امید سے اسے پکاریں۔کائنات کے رب کی قسم، آپ کا مان نہیں ٹوٹے گا''۔

''تقویٰ، توکل، دعا۔دنیا خود ہی ذلیل وخوار ہو کر قدموں میں گرے گی مگر ہم تب بھی اس سے بے نیاز ہوں گے''۔میں ایک بار پھر کھڑا ہوا۔اپنے بیٹے کی بھوک مٹانے کو میں گھر سے باہر نکلا۔توکل، تقویٰ اور دعا کی راہ میں چلتے ہم پر شیطان کبھی دائیں سے آیا کبھی بائیں جانب سے۔کبھی آگے سے، کبھی پیچھے سے۔ہم بھی ہزار بار لڑکھڑائے اور ہزار بار گرے مگر ہزار بار ہی اٹھے اور ہزار بار ہی جمے۔پھر رب نے بھی یوں تھاما کہ گرنے بھی نہ دیا۔شیطان کو قریب پھٹکنے ہی نہ دیا۔لگتا، ہم ان لوگوں میں سے کر دیے گئے ہیں جن پر شیطان کا زور نہیں چلا کرتا۔

ہما مجھ سے بڑھ کر نیک نکلی۔اس کی بات کی ابتدا اللہ سے ہوتی اور ختم بھی اللہ پر ہوتی۔کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی لگا جیسے سب کچھ میسّر ہے۔تھوڑا کھا کر بھی ہم سیر ہو جایا کرتے تھے۔روکھی سوکھی کھا کر بھی لگتا، ہم سا سعید اور خوش

نصیب کوئی نہیں۔ پھر نہ جانے کب اور کیسے وہ دن آ گئے کہ دولت بھاگی بھاگی ہمارے پیچھے آنے لگی۔ وہ آتی چلی جا رہی ہے مگر اب میں اس سے بھاگ رہا ہوں کہ سکون تو کہیں اور ہے۔ ہما کی دوڑ مجھ سے کہیں آگے ہے۔ وہ بس یہی کہتی ہے، ''مالک! ہمیں آپ کی جانب بھاگنا ہے۔ آپ کی آغوش میں آنا ہے۔ آپ ہمیں اپنی پناہ میں لے لیں۔ ہمیں دنیا کے حوالے نہ کریں''۔

میں اس وقت نانا جان کے قدموں میں بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا ہوں۔ نانا جان کی دعا قبول ہو چکی ہے مگر اس وقت، جب ہم مالک کی جانب خود بھاگے۔ ہم بھاگ رہے تھے، بھاگتے جا رہے تھے اور پھر مالک نے درِ رحمت کھول دیا۔ پوری وسعت اور کمال احسان کے ساتھ، نا ختم ہونے والے احسانات کے ساتھ۔ ساتھ ہی نانا ابا کی دعاؤں کے ثمر بھی ہمیں موصول ہونے لگے۔ میں نانا جان کے پاؤں دبا رہا تھا، اسی اثناء میں ہما بھی ہمارے ساتھ آ بیٹھی۔ کچھ دیر بعد وہ کہہ رہی تھی، ''نانا جان! ایسا بھی ہوتا ہے کہ بزرگوں کی دعائیں انسان کو فائدہ نہ دیں؟''

ہما کے سوال پر میں چونک گیا۔ نانا جان نے تبسم فرمایا اور کہنے لگے، ''بیٹا! انسان کو بزرگوں کی دعائیں اس وقت نفع دیتی ہیں جب اس کے پلّے میں کچھ ہو۔ بھلا دیکھو تو ایک ماں کے دو بیٹے ہیں۔ ایک تمہارے جیسا فرماں بردار، خدمت گزار اور ایک اللہ نہ کرے، نافرمان و نالائق ہے۔ ماں ہے ناں.... وہ تو دونوں کے لیے دعا کرتی ہے مگر ماں کی دعا کے کثیر ثمرات کسے حاصل ہوں گے؟ جس کے پلّے کچھ ہوگا''۔

وہ بہت احترام سے سر جھکائے سن رہی تھی۔ لان سے بچوں کے کھیلنے کی آوازیں اندر تک آ رہی تھیں۔ ''حسّان بیٹا!'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا، ''نیک بزرگوں سے اس بات کی درخواست کر دینا کہ وہ آپ کے لیے دعا کریں، بلاشبہ جائز ہے مگر ایسی دعائیں اس وقت تک کارگر نہیں ہوا کرتیں جب تک ہم خود ٹھیک نہیں ہوتے۔ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ خود دعا کرنا، اپنی اصلاح کرنا، خود مالک سے اپنا تعلق استوار کرنا، بذاتِ خود اس کی ذات پر توکل کر کے تقویٰ کی روش پر چلنا ہمارا فرض ہے۔ پھر مالک کا وعدہ ہے کہ میں تمہیں ہر مشکل سے نکال دوں گا۔ رزق وہاں سے عطا کروں گا جہاں سے گمان بھی نہ ہوگا۔ سمجھے بیٹا!''

''جی نانا جان!''

''انبیاء اس لیے نہیں آتے کہ ان سے دعا کی جائے۔ اولیاء اس لیے نہیں ہوتے کہ ان سے مدد مانگی جائے''۔ ہما رزور شور سے سر ہلا رہی تھی۔

''اور ہم نے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا مگر صرف اس لیے کہ اس کی اللہ کے حکم سے اطاعت کی جائے''۔ وہ اس لیے آتے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ ان سے محبت کر کے ان کے نقشِ پا کی پیروی کی جائے۔ اولیا سے مدد مانگنا کہاں کا انصاف ہے؟ نبیوں کو اپنا رب بنانا کہاں کی دانش ہے؟''

کمرے میں کچھ دیر سناٹا رہا۔ آخر ہما کی آواز نے خاموشی توڑی۔

''نانا جان! ہم چاہتے ہیں کہ من چاہی زندگی بسر کریں اور جب مشکلات ہماری زندگی کو تنگ کرنے لگیں تو ہم انبیاء اولیا کے حضور حاضری دیں اور مسئلے حل ہو جائیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی چاہت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ پھر گناہ ہو جائیں تو ہم خود اپنی ایسی اصلاح کریں کہ ہم ولی ہو جائیں۔ پھر وہ ہمیں بڑے مان سے کہہ دے، ''خبردار! جو ولی ہوتے ہیں، ان پر خوف ہوتا ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں''۔

نانا جان ایک دم ٹیک چھوڑ کر بیٹھ گئے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر میری طرف دیکھا اور بولے، ''جس قدر بھی شُکر کرو، کم ہے۔ خدا نے تمہیں اپنی ولی بندی عطا کی ہے''۔

میں ہولے سے مسکرایا اور سر جھکا لیا۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

سید شاہ زمان شمسی

سید شاہ زمان شمسی نے ایم اے اردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد سے کیا۔ لکھنے کا شوق تو ہے مگر ادب میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ادب پر خاصا متعلقہ بھی کیا ہوا ہے اور کئی ادیبوں پر اپنے تبصرے بھی لکھ چکے ہیں۔ قلم قبیلے سے تعلق ہی انہیں رائٹرز کلب کے قریب لے آیا اور اب وہ ایک سال سے رائٹرز کلب کے بطور ممبر حصہ ہیں۔

فہرست تحریر

1- عالم تمام حلقہ دام خیال ہے
2- کتابوں سے عشق کی آخری صدی
3- محسوسات و کیفیات کیا ہیں؟
4- نظام چاپلوسیت کا خاتمہ ناگزیر
5- آنکھوں سے نورِ ایمانی چھن گیا

☆.....☆.....☆

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

انسان کی تخلیق میں سب پہلے جو چیز رکھی گئی، وہ تھی ایک دوسرے کو سمجھنا۔ ایک انسان کی زبان کو دوسرے کے موافق بنایا گیا تا کہ وہ ایک دوسرے کے مسائل سنیں، سمجھیں اور حل کریں۔ اس کا مقصد تمام معلومات کی فراہمی اس سے متعلقہ فرد کو اسی کی زبان میں فراہم کرنا تھا۔

دنیا میں زبانیں مختلف ہیں مگر انہیں سمجھنے والے اپنے اپنے انداز میں سمجھتے ہیں۔ ایک ادیب کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اس زبان کو سمجھنے والے بھی ویسے ہی ہوتے ہیں۔ یعنی اس کے حلقے کے لوگ اسے بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ادیب یا لکھاری ہی ہوتا ہے، جو احساسات کو لفظوں کا جامہ پہنا کر بیان کر جاتا ہے۔ جس طرح ایک بولنے والے کا ہنر حلق سے جڑی زبان میں رکھ دیا گیا ہے، جیسے ہی زبان حرکت کرتی ہے، چاہے وہ شیریں ہو یا تلخ۔ بعض اوقات یہ زبان مزاج کے امتزاج سے بھی بھرپور ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح قلم کی نوک سے لکھے جانے والے الفاظ بھی ادیب کے اندر کا پتا دیتے ہیں۔ وہ جو لکھتا ہے، اس کا اندر ہوتا ہے۔ وہ کیا ہے؟ یہ لکھنے کے بعد پتا چلتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات وہ بالکل الٹ بھی ہوتا ہے۔

معیاری الفاظ کے چناؤ کو ملحوظ خاطر رکھنے والا قاری، ایک ادیب کے منتخب کیے گئے الفاظ کی ترکیب و ترتیب کو دیکھ کے ردّعمل کا اظہار کیا کرتا ہے۔ من کی دنیا بھی عجب دنیا ہے کیوں کہ الفاظ کا اطلاق بھی پڑھنے والے کے دل پر ہوتا ہے۔ اب یہ کہنے والے کے لب و لہجے کی ادائیگی پر منحصر ہے کہ اپنے الفاظ کو سامعین کی معیاری سماعتوں تک پہنچانے کے لیے کس قسم کے اندازِ بیاں یا اندازِ تکلم کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ ہمارے اردگرد معاشرے میں بولے جانے والے ایسے الفاظ بھی ہیں، جو اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اب یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس قسم کے الفاظ ہیں، جو غیر معیاری طور پر ہماری مارکیٹ یا گلیوں، بازاروں میں ذلیل و رسوا ہونے کے ساتھ پست درجہ رکھتے ہیں۔

خیالات کا تسلسل اور روانی ہی تو ہے جو لفظوں کو تعمیری شکل عطا کرتی ہے۔ کسی شاعر کی نظم ہو یا غزل، کسی نثر نگار کا لکھا ہوا مضمون ہی کیوں نہ ہو، اسے ضبطِ تحریر میں لانے سے پہلے خیالات کی بھٹی میں بھسم ہو کر نکلنا پڑتا ہے پھر جا کے کوئی بات بنا کرتی ہے۔ غالب کی زبان میں؛

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

☆.....☆.....☆

یہ آخری صدی ہے کتابوں سے عشق کی

موجودہ دور کے تقاضے بدل چکے ہیں۔ بوسیدہ کتابوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ ان مظلوم کتابوں کی خاک چھاننا شروع کی تو دایاں ہاتھ کتاب کے اوپر والی سطح صاف کرتے وقت مٹی سے بھر چکا تھا۔ کتاب کے صفحات بھی ضعیف تھے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باعث صفحات، پلٹتے ہوئے کتاب کی سلائی سے جدا ہونے کو ہی تھے کہ ہم نے اسے فوری طور پہ بند کر کے متعلقہ جگہ رکھ دی۔ یہ کچھ دنوں پہلے کی بات ہے، جب علامہ اقبال لائبریری، فیصل آباد میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں اس لائبریری کا پرانا رکن ہوں، جو بہت عرصے بعد کسی کتاب کی تلاش میں، ایک خاص جستجو کا مسافر بن کے مختلف الماریوں میں رکھی گئی کتابیں دیکھتے دیکھتے مغموم ہو رہا تھا۔ غم کھانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آیا کس مقصد کے لیے تھا اور دیکھنے کو عجب مناظر مل رہے تھے۔ کتابوں کی نوحہ گری نے دل کو عجب بے چین کر رکھا تھا۔

پرانی لائبریری ہے، مجھ جیسے نوجوان یہاں کم دیکھنے کو ملیں گے۔ البتہ ایسے خاموش طبع بزرگ ضرور مطالعہ کرتے ہوئے پائیں گے، جو واقعی کتابوں کے شیدائی ہیں۔ کہیں کسی میز پر کچھ نوجوان دیکھنے کو ملیں گے تو وہ بھی لیپ ٹاپ پر اپنا کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا نوجوان ہوگا جو ورق گردانی کرتا ہوا نظر آئے۔ خیر.... میں جس کتاب کی تلاش میں گیا تھا، وہ تو نہ ملی البتہ اپنی ہتھیلی پر جمی ہوئی خاک کی مہک سونگھ کے اسے اپنے اندر ضرور سمو چکا تھا۔ چوں کہ میں کتاب کو اپنے طور پہ حیات کا روحانی زادِ راہ تصور کرتا ہوں لہٰذا، اسی احساس کو اپنے اندر جاگزیں کر کے گھر لوٹ آیا۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک عزیز کی طرف سے ایک کتاب کا تحفہ موصول ہوا۔ یہ کوئی عام کتاب نہیں ہے۔ مرحوم ممتاز مفتی کا عظیم شاہ کار ہے۔ حقیقی جذبات کی عکاسی کرتا ایک ایسا سفر نامہ ہے جسے پڑھ کے قاری پوری طرح اس سفرِ عشق میں محو ہو جاتا ہے، جس کا نقشہ ممتاز مفتی نے اپنی کتاب میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

موجودہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دَور میں، جب کہ کتابیں انٹرنیٹ میں سمٹ کے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں مگر کاغذ میں سے اٹھنے والی مہک، انگلیوں کو چکھ کر صفحات پلٹنے کا مزہ، تخیلاتی اور تصوراتی سفر، جو اس طرح مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے، وہ پی ڈی ایف فائل ڈاون لوڈ کرنے میں کہاں؟ بلکہ موبائل سے پڑھنے میں کیف وسرور تو نہیں ملتا البتہ اعصابی کم زوری اور دماغی سست روی کی شکایات ضرور سننے کو ملی ہیں۔

جدید دَور کا ایک المیہ یہ ہے کہ کتاب دوستی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہمیں تو کتاب کا تحفہ وصول کرنے پر جو خوشی اور مسرت ملا کرتی ہے، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ کتاب کے ذریعے ذہنی آسودگی، روح کی بالیدگی اور شعور کی پختگی کو اپنے استقبال کے لیے منتظر پاتا ہوں۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں اور اس بات پر دُور اندیشی سے غور وخوض کرتا ہوں کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس ظالم سماج میں، صنعتی انقلاب کے دَورِ پُر آشوب میں، جب کہ لوگوں نے اپنے ابلاغی ربط کو مختصر کرلیا ہے اور آسانیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، ہماری آنے والی نسلوں پر ایک ایسا نظام مسلط کر دیا جائے گا جس میں رہ کے انہیں الیکٹرونک ڈیوائسز کے ذریعے تعلیم وتربیت دی جائے گی۔ کتابوں کا الگ ہی عجائب گھر ہوگا۔

کاش! ایسا نہ ہو۔ شاید یہ میرا اندیشہ ہو یا میرے تصور کی ان دیکھی آواز، جو سچ بھی ہوسکتی ہے۔ خدا کرے کہ کتابوں کی محبت، مہک اور احساس، ہمارے بعد آنے والی نسلوں میں بھی منتقل ہو۔ لیکن وہ بوسیدہ کتابیں، جو میں لائبریری میں چھوڑ آیا تھا، ان کی چیخیں اب بھی کانوں میں گونجتی ہیں۔

کاغذ کی یہ مہک، یہ نشہ روٹھنے کو ہے
یہ آخری صدی ہے کتابوں سے عشق کی

سعود عثمانی حقیقت سے پردہ اٹھا چکے ہیں، جس کے آثار مستقبل میں کچھ یوں ہوں گے کہ کتابوں کی محبت معاشرے سے اٹھ جائے گی، افراتفری ہوگی، مشینوں کی حکومت دلوں کو مزید مردہ کر دے گی، انسانوں سے محبت، جو آج کے معاشرے میں کہیں کہیں دیکھنے کو مل رہی ہے، مکمل طور پہ ختم ہو جائے گی۔ اللہ کرے ایسا نہ ہو۔ خدا کرے کہ ایسی نوبت نہ آئے وگرنہ قیامت کو دعوت دینے کی تیاری ہم خوب کر رہے ہیں جس کا محاسبہ کرنا مجھ سمیت ہر شخص کی ذمے داری ہے۔

☆.....☆.....☆

محسوسات و کیفیات کیا ہیں؟

یہ محسوسات آخر ہیں کیا؟ ان کی شدت و ماہیت ہر انسان میں یکساں ہوتی ہے۔ کیا اس سانچے سے کسی شاعر یا ادیب ہی کو گزرنا ہوتا ہے۔ اس راہ کا مسافر کیا ولی اللہ ہی ہوتا ہے یا وہ، جو نالۂ نیم شبی میں دل گداختہ ہو، آنکھوں سے برستی آنسوؤں کی جھڑی یا کسی کے فراق میں خاک بسر مٹی میں غلطاں ہو جانا۔ شعرا حضرات میں شاید یہ قوت بہ نسبت عام شخص کے زیادہ ہو، کیوں کہ عام شخص احتیاج و انفاس کی بھٹی جلانے کی کوششوں میں اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ اس کی سوچ بچار کی سطح شعرا و ادیب، دیوانہ و مجذوب شخص سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اوّل الذّکر شخصیات کی بات کی جائے تو ان کی سوچ کی گہرائی یا رسائی عام لوگوں سے بالا ہوا کرتی ہے۔ درد کی تلچھٹ کشمکش، پریشانی و بے چینی میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔

جب ایسی کیفیت سے گزر اوقات ہو جائے تو ادیب اپنی بساط کے تحت تخیل اور شعوری وجدان کا سہارا لے کر قلم اٹھاتا ہے، لکھتا ہے۔ درد کا سارا کتھارسس قلم سے رخصت ہو کے صفحۂ قرطاس پہ امڈ آتا ہے۔ نشہ ہو، خمار ہو یا جمال سوگوار، سب کی کیفیت الگ الگ۔ جو قلم دان کی خوں ریزی سے واقف نہ ہو تو اس کے پیروں کو گھنگھروؤں کی چھن چھن کرتی آواز اپنی طرف راغب کر لیتی ہے۔ وہ اسی چھن چھن کی جذب و مستی سے پوری طرح سرشار ہو کے رقص و سرور میں مبتلا رہتا ہے۔

غمِ حُسین علیہ السلام، ذکرِ کربلا، شہادتِ طفلانِ کربلا، مصائب و آلام سننے والوں کی الگ کیفیت، مقتل کی روایات ہوں یا عمومی طور پر ہر سال سنی جانے والی روداد۔ جب واقعات کا تصور باندھا جائے تو سن کر، غش کھا کے گرنا، سینہ کوبی کرنا، ہاتھوں سے منہ پیٹنا، دھاڑیں مار کے رونا، سب کی الگ کیفیت، الگ مقامِ معرفت۔ یہ کیفیات و محسوسات ہر شخص میں موجود ہیں خواہ وہ اس کا ادراک شعوری یا غیر شعوری طور پہ نہ کرے۔ جب پیمانہ ٹوٹتا ہے تو دل پہ

ضرب لگتی ہے۔ جام وسبو گرتے ہیں تو اس کا ظہور جنوں خیزی سے ہوتا ہے۔

فارسی شاعری میں جو سوز و گداز کی کیفیت ہے، درد و غم کی لہر محبت کی شدت کو سپردِ قلم کرنے کے لیے جو جذبوں کی آنچ، لفظوں کی مٹھاس، ایک دکھی دل کی پکار اور ایک پُر درد دل کی صدا ہوتی ہے، جو ان تمام بزرگان شعرأ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو اہل دل اسے پڑھتا ہے، یوں محسوس کرتا ہے جیسے خود اس کے دل کی آواز ہے۔ اس کا مقابلہ آج کل کے مادّہ پرستی کے دَور میں ہونے والی شاعری سے نہیں کیا جا سکتا۔ روحانیت کے جزیرے میں قلبی واردات بیان کرنے کے لیے جس طرح فارسی کے شعرأ نے اپنے جذبات کی صداقت، احساسات کی نزاکت، مشاہدے کی وسعت، فن کارانہ صلاحیت، لفظوں کی لطافت اور تراکیب کی خوب صورتی کو بیان کیا، اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ فارسی شعرأ کی توضیح العقائد پڑھنے کے لیے بھی قاری کو محسوسات کے سمندر میں غوطہ زن ہو کے اپنے اندر وہ کیفیت جاگزیں کرنا ہوتی ہے، جو حدودِ عقل سے ماورأ ہو۔ قاری ایسی دنیا میں جا داخل ہوتا ہے جسے عام آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کا اظہار محمد فضولی بغدادی بارگاہِ رسول میں یوں پیش کرتے ہیں۔

سیّاح درک باصرہ عقل کی رسد
جایی کہ جلوہ گاہ محمد جمال است

ترجمہ: عقل کی بینائی کے ادراک کا سیّاح اس مقام پر کب پہنچ سکتا ہے جو جمال محمد (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جلوہ گاہ ہے۔ یعنی عقل کی حدود و قیود سے نکل کر شدتِ محبت کی وہ کیفیت، جو انسان کے اندر ایسی تڑپ پیدا کرے کہ جو اسے محبوب سے قریب تر کر دے، بعض اوقات یہ سفر چشم تر سے بھی طے کیا جا سکتا ہے۔ منزلِ عرفان کی الگ الگ کیفیات ہیں۔ پھر آگے جا کے وہ یوں فرماتے ہیں:

اخبار انبیاء کہ سراسر شنیدہ ای
یک یک بیان حُسن خصال محمد است
چوں سوئے من گزر آی من مسکین زناداری
فدائے نقش نعلینت کنم جاں، یارسول اللہ

ترجمہ: گزشتہ انبیاء کی جو تمام باتیں اور قصے تم نے سنے ہیں، وہ سب کے سب خصال محمدیہ کے حُسن کا بیان

ہیں۔ اگر آپ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی میری طرف تشریف لائیں تو میں مسکین، آپ کے نعلین مبارک کے نقش پر اپنی جان قربان کر دوں۔

حمد و نعت کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ بقول کسی شاعر کے، ہزار بار بھی اگر میں اپنے منہ کو مشک اور خوشبو سے دھوؤں تو پھر بھی تیرا نام لینا میرے لیے ہزار بے ادبی کے برابر ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ 'خدا کے ساتھ تو دیوانے بن جاؤ لیکن محمد ﷺ کے ساتھ ہوشیار رہو۔ بلگرامی کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہزار بار تو ان کرد با خدا شوخی
ولیک دم نتوان زد بہ مصطفیٰ گستاخ

بلگرامی کا یہ شعر اسی مفہوم کو یوں ادا کرتا ہے کہ خدا کے ساتھ تو ہزار بار شوخی کی جا سکتی ہے لیکن حضور پاک ﷺ کے حضور میں بڑے محتاط انداز میں بات کرنی چاہیے۔ بیدل فرماتے ہیں:

ز لاف حمد و نعت اولی بر خاک ادب خفتن
سجودی می توان بردن، درودی می توان گفتن

بیدل نے کیا خوب کہا ہے کہ حمد و نعت کہنے کا دعوی کرنے سے بہتر ہے کہ خاکِ ادب پر سو جاؤ کیوں کہ اس مقام پر تو سجدہ کیا جا سکتا ہے یا درود پڑھا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن جامی نے بھی کیا خوب کہا ہے:

حُسن یوسف، دَمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آں چہ خوبان ھمہ دارند تو تنہا داری

یعنی رسول پاک ﷺ حُسن یوسف کے ساتھ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کے معجزے بھی رکھتے ہیں اور جو صفات، کمالات اور معجزات تمام انبیاء میں ہیں، وہ آپ کی اکیلی ذات میں موجود ہیں۔ ہلالی چغتائی نے اسی مضمون کو ایک نئے پیرائے میں یوں کہا ہے:

محمد عربی کہ آبروی ہر دوسراست
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسراو

ترجمہ: محمد عربی دونوں جہاں کی آبرو ہیں اور جو اُن کے دروازے کی مٹی نہ بن، اس کے سر پر خاک۔

آں حضور صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قدیم فارسی شعرأ کی عقیدت، جذبات اور احسات کا تعلق ان کی گہری وابستگی کو ظاہر کرتا ہے، جو سرکارِ مدینہ کے ساتھ وہ رکھتے تھے۔ پڑھنے والا بھی یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ احساسات بھی میرے اندر موجود ہیں جو شاعر نے ضبطِ تحریر کیے۔ شاعر کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل کر جب وہ جذبات قرطاس وقلم کی دنیا آباد کر لیتے ہیں تو ان کی ایک ایک سطر اور ایک ایک مصرعہ قیامت تک کے لیے امر ہو جاتا ہے اور ان کے لیے وہ نیک جذبات اور خیالات قیامت تک کے لیے ثواب کا باعث بنتے ہیں۔ وہ خیال، جو حُبِ رسول ﷺ کا عکاس بن کے ہمارے اذہان وقلوب کی زینت بنتا ہے۔ بارگاہِ خدا میں یہ دعا ہے کہ اس کے ذریعے ہماری عملی زندگیوں میں نکھار پیدا کرے اور حُبِ رسول ﷺ کی روح کو اپنے اندر منتقل کر کے عرفانِ حق کی جستجو میں سرگرم عمل رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆.....☆.....☆

نظامِ چاپلوسیت کا خاتمہ ناگزیر

یوں تو ہمارے محترم وزیراعظم ملکی معیشت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے بلند و بانگ تقاریر کیا کرتے ہیں اور ماہر معاشیات دن بہ دن نت نئی تجاویز پیش کرتے ہیں۔ ہمیں ایک طویل عرصے سے حکم رانوں کی طرف سے یہ سلسلہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ملکی سلامتی کے لیے مختلف ممالک کا دورہ کرنا، درآمدات اور برآمدات بڑھانے کے لیے دوطرفہ تعلقات مضبوط بنانا ایک خوش آئند عمل ہے لیکن اگر ملک کے اندرونی مامالات کا جائزہ لیا جائے تو مزدور طبقے کے افراد کا خون چوسا جاتا ہے۔ ان کے جسم دیمک کی طرح چاٹ کے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیے جاتے ہیں۔

ملکی معیشت مستحکم بنانے کے لیے پاکستان کو اربوں روپے کی آمدنی دینے والے محنت کش افراد کی جہدِ مسلسل اور سخت محنت کو پاؤں تلے روند کے کچھ خوشامدیے اپنی ترقی کا جشن منا رہے ہوتے ہیں۔ آج کل کے بے حسی اور افراتفری کے دَور میں اگر کسی پڑھے لکھے، گریجویٹ شخص کو کسی مل یا انڈسٹریل ایریا میں ملازمت مل جاتی ہے اور وہ حساس ترین بھی ہو تو اس کے لیے شروع شروع میں رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں، ٹارچر کر کے اسے ذہنی اذیت سے دوچار کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ رکتا نہیں بلکہ سالہا سال چلتا رہتا ہے۔

اس میں سب سے بڑا ہاتھ مینجمنٹ کا ہوتا ہے۔ پرانے تجربہ کار لوگ، جو اس جگہ کے پرانے پاپی اور بھیدی ہوتے ہیں، نت نئی سازشوں سے ایسے لوگوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں نہ تو قانون حرکت میں آتا ہے نہ ہی اس شخص کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہوتا ہے، جسے دکھا کے وہ یہ باور کروا سکے کہ مجھے ذہنی طور پر اذیت سے دوچار کیا جا رہا ہے۔ محنت مزدوری کی غرض سے آنے والا ایک نوجوان ایسے گھٹیا سسٹم کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، جو اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کم زور کر دیتے ہیں۔

میں ایسے کئی واقعات کا شاہد ہوں، جس کے ذریعے میں نے بہت سے لوگوں کو ملازمتوں سے برطرف ہوتے

دیکھا ہے۔اس کے برعکس ایسے لوگ، جنہیں چاپلوس، ٹی سی مین اور چمچہ گیر کے القاب ملتے ہیں، بڑے ٹھاٹ باٹ سے ملازمت سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔کسی فلاسفر نے کیا خوب کہا ہے،''بے غیرتی کا دوسرا نام چمچہ گیری اور چاپلوسی ہے''۔

چمچہ گیری ایک فن اور ہنر ہے۔یہ فن فطرتاً ایسے لوگوں میں پایا جاتا ہے، جن کی طبیعت شرافت اور سادگی کے بجائے مکاری اور چال بازی کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔اس ہنر کو پیدا کرنے کے لیے خودداری اور عزت نفس جیسے الفاظ زندگی کی ڈکشنری سے نکالنے پڑتے ہیں۔یوں سمجھ لیں کہ چمچہ گیری کی یہ عظیم صفت بے غیرتی اور ڈھٹائی کے خمیر سے پیدا ہوتی ہے۔

چمچہ گیری کا مرتبہ پانے کے لیے آپ کو اپنی آنکھوں سے شرم وحیا کا پانی نکالنا ہوگا۔اس صفت سے متصف ہونے کے بعد آدمی انسانیت، مروت، ہمدردی جیسے اوصاف واخلاق سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے اور خسّت وکمینگی کی ہر حد کو پار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔حق پرستی اور حق گوئی جیسی آؤٹ ڈیٹ صفات کے حاملین چمچہ گیری کے مقام کو نہیں پہنچ سکتے۔اس مقام تک پہنچنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے ہوتے ہیں۔صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز، مناسب اور نامناسب جیسی احمقانہ تقسیم سے اوپر اٹھ کر صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ میرے حق میں کیا مفید ہے اور پھر اسے کر گزرنا ہوتا ہے۔اگر آپ صفتِ چمچہ گیری میں اونچے مقام تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اپنا محاسبہ کیجیے کہ آپ کتنے خودغرض اور تو تا چشم ہیں۔ان اوصاف کے بغیر آپ کا ایک کامیاب چمچہ بننا ممکن نہیں۔

صفتِ چمچہ گیری کو سمجھنے کے بعد اب اس کے خاتمے پر تبصرہ کرتے ہیں۔پاکستان میں سب سے زیادہ گند اُن لوگوں کی وجہ سے ہے، جو کسی کو ذوق وشوق، دلی لگن اور جذبے سے کام نہیں کرنے دیتے بلکہ اسے حد درجہ تنگ کرنے کے بعد بغاوت کرنے پہ مجبور کر دیتے ہیں اور نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ہر وہ شخص، جو ذہنی اذیتوں کا شکار ہوتا ہے، یا تو قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے یا اس کرپٹ نظام سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ کام سے دست بردار ہو جاتا ہے اور ڈنڈہ بردار لوگوں میں اپنا نام رقم کروالیتا ہے۔

یہ چاپلوس، جو کسی کام کو ہاتھ لگانے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ کان بھرنے کے فن سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، اپنا مطلب نکالنے میں کامیاب ہو جایا کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگ پاکستان میں ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔شاید پاکستان میں ترقی کا حق انہی کو حاصل ہے اور محنت کش، پڑھے لکھے بندۂ مزدور کا خون بے اہمیت اور بے حیثیت کر کے خشک کر دیا جاتا ہے۔وہ بے راہ روی کا شکار ہو کے رہ جاتا ہے۔جون ایلیا نے انہی حالات وواقعات کو بڑے خوب صورت پیرائے میں شعری لب ولہجے سے یوں بیان کیا ہے۔

کارخانے میں لہو تھوک کے
اپنی روزی کما رہا ہوں میں

فی زمانہ ایمان کے شفاف چشمے میں وقتی مصلحتوں کی غلاظت ملانے والوں کی ریل پیل ہے لیکن آج تک نوجوانوں کی کسی تنظیم یا فرد نے ان کے خلاف نہ کوئی جلسہ کیا ہے اور نہ کوئی جلوس نکالا ہے۔صرف بسیں جلانے اور پتھراؤ کرنے کے لیے ہی جلسے اور جلوس نہ کریں بلکہ ان نظریاتی، تخیلاتی، ذہنی اور روحانی حشرات الارض کا بھی خاتمہ کریں، جو اس پاک سرزمین کی معاشی بنیادوں کو اندرونی اور بیرونی اثرات کے تحت دیمک کی طرح کھوکھلا کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔

☆.....☆.....☆

آنکھوں سے نورِ ایمانی چھن گیا

مجھے ایک خبر سن کے بہت افسوس ہوا، گہرے دکھ میں مبتلا ہو کے اس موضوع پر قلم اٹھانا پڑا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جیسے جیسے ٹیکنالوجی کے میدان میں نت نئی ترقی ہو رہی ہے، ویسے ویسے ہماری آنکھوں میں سے نورِ ایمانی کیوں چھن چکا ہے؟ آنکھوں میں حیا نہیں رہی اور بولتے وقت یہ نہیں سوچا جاتا کہ ہمارے الفاظ کسی کے لیے دل آزاری کا سبب تو نہیں بن رہے؟ ہم ایک ایسی گلی سڑی تہذیب کے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں اعلیٰ تہذیب، اخلاق، رکھ رکھاؤ کہیں کہیں ہی نظر آتا ہے۔ جہاں محض دولت سمیٹنے کی لالچ اور طمع نے لوگوں کو اندھا کر رکھا ہے۔ تاہم، معاشرتی انحطاط کا احساس تو موجود ہے لیکن وہ بھی شاید اسی صدی کی حد تک ہے۔ بعد میں تو شاید یہ احساس بھی ختم ہو جائے گا۔

آنکھوں سے نورِ ایمانی چھن جانے کی ایک جھلک اپنی تحریر میں دکھانا چاہتا ہوں۔ متوسط طبقے کے ایک ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک تعلیم یافتہ، باشعور، ذہین و فطین لڑکی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمت کے حصول کے لیے ایک بڑی کمپنی میں درخواست دیتی ہے۔

ایک باحیا، باپردہ اور مشرقی لڑکی، جس کا پختہ ایمان، اسلام اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے پہ ہو، جو انٹرویو میں پوچھے جانے والے تمام سوالات کے جواب دینے میں بھی کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے فقط اس وجہ سے ملازمت دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے کہ وہ نقاب پہننے کی پابند تھی اور نقاب اتارنا شرعی تقاضوں کو پامال کرنا تصور کرتی تھی۔ انکار سن کے سخت رنجیدہ ہوئی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ملازمت دینے انکار کرنے والا اعلیٰ افسر خود ایک کلمہ گو مسلمان تھا جس کی خواہش تھی کہ پہلے نقاب اتار کے چہرہ دکھاؤ۔ اس پاک و منزہ لڑکی کے لیے شرم ساری سے ڈوب مرنے کا مقام تھا لیکن اس اعلیٰ افسر نے یہ جملہ کہتے ہوئے ذرا سی بھی جھجھک محسوس نہیں کی۔ ایک اور حیران کن بات یہ تھی کہ میں نے جتنے بھی لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز دیکھا، بظاہر ان کا حلیہ ایک باکردار اور خوب صورت انسان کی طرح ہوتا لیکن

حقیقت میں اکثریت کی شرافت 'شر' اور 'آفت' کا ملاپ ہوتی ہے۔ کچھ لوگ باضمیر، عاجز اور منکسر المزاج بھی ہوا کرتے ہیں لیکن بہت سے پڑھے لکھے لوگ ایسے دیکھے ہیں، جو حد درجہ بدتمیز، منہ پھٹ، کسی کا لحاظ نہ کرنے اور سادہ طبعیت لوگوں کو بے وقوف بنانے والے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ حیا کا لبادہ صرف اس وقت اوڑھتے ہیں جب اپنے گھروں میں تشریف لے جایا کرتے ہیں۔ وگرنہ گھر سے رخصت ہوتے وقت دیکھنے کے زاویے ہی بدل جاتے ہیں۔ جب تک ایسے پڑھے لکھے، کم شعور لوگ ہمارے معاشرے میں رہیں گے، ہماری باحیا خواتین اور بچیوں کی سانسیں تنگ سے تنگ تر ہوتی رہیں گی۔

آپ خود کو بھی اس آئینے میں دیکھیں، کہیں وہ ہم ہی تو نہیں، جو ایسی خواتین اور بچیوں کا جینا دشوار کر رہے ہیں، جو اپنے بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا ہیں۔ آئیں! ہم سب مل کر ایسی بچیوں اور خواتین کے سروں پر ہاتھ رکھنے والے بنیں، جو کسی مجبوری یا بے کسی کی وجہ سے ملازمت کے لیے گھروں سے نکلتی ہیں۔ آئیں! ہم سب مل کر ایسی پاک دامن بچیوں کے لیے ماحول کشادہ کریں جو ہر قسم کے تعصب اور منفی پروپیگنڈہ سے پاک ہو۔ جس میں رہ کے وہ اپنا کام سکون سے انجام دے سکیں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

فریحہ سوہاگ

فریحہ سہاگ کا تعلق حیدر آباد سے ہے۔ایم اے اکنامکس کیا ہے۔لکھنے کا آغاز گزشتہ برس سے کیا ہے اور رائٹرز کلب سے بطور ممبر منسلک ہوئیں۔

فہرست تحریر

1-ڈپریشن کی وجوہ اور علاج

2- تعلیم کی اہمیت

3-پاکستان میں آبی مسائل

☆.....☆.....☆

ڈپریشن کی وجوہ اور علاج

مختلف چھوٹی بڑی مشکلات اور پریشانیوں سے شروع ہونے والا سلسلہ، جو انسان کو رفتہ رفتہ ناامیدی اور مایوسی میں مبتلا کر دے، ڈپریشن کہلاتا ہے۔ ڈپریشن کے شکار افراد تنہائی پسند ہو جاتے ہیں اور تنہا رہنے کے باعث مختلف سوچیں انہیں اس کیفیت سے باہر نہیں آنے دیتیں، نتیجتاً ایسے کئی افراد غلط راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق ڈپریشن ایک بیماری ہے، جس کا بروقت علاج کیا جانا از حد ضروری ہے۔ ابتدائی مراحل میں انسان سستی اور بے زاری کا شکار ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ یہ عوامل جڑ پکڑ لیتے ہیں اور انسان مکمل طور پر ڈپریشن میں چلا جاتا ہے اور اپنے اردگرد سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

علامات:

وقتی طور پر اداسی اور مایوسی کی کیفیت کا نام ڈپریشن نہیں بلکہ مستقل طور پر تنہائی پسند ہو جانا، بے زاری، منفی سوچ، منفی رویّے، احساس کمتری کا شکار ہو جانا، بے سکونی اور نیند کا نہ آنا، ڈپریشن کی علامات ہیں۔ ڈپریشن کے شکار افراد کی منفی سوچ ہی انہیں ناامیدی اور مایوسی کی جانب دھکیلتی ہے۔ ان میں اعتماد کی کمی ہونے لگتی ہے۔ قوتِ فیصلہ کم زور پڑ جاتی ہے۔ ذہن منفی سوچوں اور احساس کم تری کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ بعض اوقات ہم وقتی طور پر بدلتے رویے کو ڈپریشن سمجھ لیتے ہیں حالاں کہ ماہرین کے مطابق ڈپریشن کا شکار افراد ہفتوں اور مہینوں ان کیفیات کا شکار رہتے ہیں۔

وجوہ:

آج کے مشینی دَور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی خواہش نے انسان کو بھی مشین بنا دیا ہے، جو مقررہ اوقات پر اپنے تمام کام انجام دے کر رات کو تھک ہار کر سو جاتا ہے اور اگلے روز پھر اسی مِشن پر روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ

زندگی کا سکون، اپنوں کا ساتھ، کہیں کھو سا گیا ہے۔ ہم مستقبل کو بہتر بنانے میں اتنے مصروف ہو چکے ہیں کہ نہ صرف اپنے حال سے بے خبر ہیں بلکہ اپنے اردگرد کے لوگوں تک سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہم سے جڑے رشتے ہماری توجہ کے محتاج ہیں، ہم بہتر سے بہترین کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ نتیجتاً مختلف امراض کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ اکثریت ڈپریشن کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ ہم دوسروں سے مقابلے میں اس قدر محو ہیں کہ اپنی مشکلات اور پریشانیاں دوسروں کو بتانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ اندر ہی اندر ہماری ٹینشن ہمیں ختم کر رہی ہوتی ہے۔

کسی کو روزگار کی پریشانی ہے تو کوئی رشتوں کو لے کر پریشان نظر آ رہا ہے۔ کوئی امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے تو کوئی گھریلو ناچاقیوں کی بنا پر ڈپریشن کا شکار ہے۔ کل کی فکر میں ہم اپنا آج برباد کر رہے ہیں اور افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں اس کی خبر تک نہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے بچے توجہ نہ ملنے کے باعث تنہائی اور ڈپریشن کا شکار ہو رہے ہیں۔ گھر سے توجہ نہ ملنے کے باعث وہ غلط صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگتے ہیں، جس کا نقصان بعد میں تمام اہل خانہ کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

ہم کسی ریس کے گھوڑے کی طرح ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں لگے ہیں۔ آج اکثریت اپنے پاس نعمتیں، مال و اسباب نہ ہونے پر نہیں بلکہ کسی دوسرے کے پاس اس کے موجود ہونے پر ڈپریشن کا شکار ہے۔ ہم نے مزید کی حرص میں آج کا سکون بھی تباہ کر لیا ہے۔ ہم شکر کرنے کے بجائے حسد کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج زیادہ سے زیادہ کے حصول کے لیے خود کو مشین بنانے پر آمادہ ہیں۔ جب ہم قناعت نہیں کریں گے، جو ہے اس میں خوش نہیں رہیں گے، کل کی فکر میں اپنا آج بھی خراب کریں گے تو ہم ڈپریشن ہی کا شکار ہوں گے۔

علاج:

ڈپریشن دراصل بے سکونی کا نام ہے، جب جسم اور دماغ کو مسلسل منفی سوچ اور ناامیدی کی کیفیت میں پُرسکون نیند میسّر نہیں آئے گی تو دماغ فریش نہیں ہوگا اور جب دماغ فریش نہیں ہوگا تو جسم بھی تھکاوٹ محسوس کرے گا، نتیجتاً چڑچڑا پن طبیعت پر غالب آئے گا۔ ڈپریشن کے شکار افراد کو چاہیے کہ جلد سے جلد معالج سے رابطہ کر کے مکمل علاج کروائیں اور رب تبارک وتعالیٰ کا ہر حال میں شُکر ادا کرنے کی عادت اپنائیں۔ شُکر ادا کرنے سے نہ صرف نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ انسان منفی سوچوں سے بھی چھٹکارا پا لیتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ ڈپریشن کے شکار افراد بے سکونی ختم کرنے کے لیے نشہ آور ادویات کا استعمال کرتے ہیں، جن سے شاید وہ وقتی طور پر ہوش و خرد سے بے گانہ ہو کر سکون حاصل کر بھی لیتے ہوں لیکن پھر وہ بری طرح اس کے عادی ہو کر مزید کئی طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم واقعی سکون کی تلاش میں ہیں اور ڈپریشن سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنا ہوگا یعنی قرآن بتا رہا ہے کہ ''اور دلوں کا سکون اللہ کے ذکر میں ہے''۔ہم ذکر اللہ اور شُکر کو تھام لیں تو اس بے سکونی اور ڈپریشن سے بھی نجات حاصل کر لیں گے۔

☆.....☆.....☆

تعلیم کی اہمیت

علم وہ شے ہے جس کی بِنا پر آدم علیہ السّلام اشرف المخلوقات، نائبِ خدا اور مسجودِ ملائک ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا اور اسے عقل و شعور عطا فرما کر تمام مخلوقات سے ممتاز کر دیا۔ قرآن مجید فرقان حمید اور احادیث مبارکہ میں بارہا علم کے حصول کی تاکید کی گئی ہے۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض قرار دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے حصول علم کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا، ''ماں کی گود سے قبر تک علم حاصل کرو''۔ اہل علم کا درجہ کئی زاہد اور عابد لوگوں سے زیادہ ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق رہ نمائی ملتی ہے لیکن علم بھی اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اس کی جستجو کرتا ہے۔

دَورِ حاضر کی بات کریں تو علم فقط ڈگریوں اور اسناد تک محدود ہو گیا ہے۔ ہم نے تعلیم کو ڈگریوں میں تولنا شروع کیا تو علم ہم سے روٹھ گیا۔ ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں اور لوگوں سے پوچھیں کہ وہ کیوں پڑھنا چاہتے ہیں یا ان کی نظر میں علم کی کیا اہمیت ہے؟ تو عین ممکن ہے کہ 80 فی صد یا اس سے کچھ زائد لوگوں کا جواب ہوگا، بہترین مستقبل اور اچھی جاب کے لیے۔ ہم بچپن ہی سے اپنے بچوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ انہیں اچھے گریڈز لانے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ڈگریوں کا انبار لگانا ہے تاکہ وہ اچھی جاب حاصل کر سکیں۔ ہم انہیں یہ تعلیم نہیں دیتے کہ علم حاصل کرو کیوں کہ یہ تمہیں شعور بخشتا ہے، اچھے برے میں تمیز سکھاتا ہے۔ نیک و بد، سیاہ و سفید کے فرق سے آگاہ کرتا ہے۔ علم حاصل کرو تاکہ تم ملک و قوم کی خدمت کر سکو۔ اقبال و قائد کا ہر ادھورا خواب پورا کر سکو۔ ہم نہیں سکھاتے کہ علم حاصل کرو تاکہ تم بحیثیت پاکستانی شہری اپنی ذمے داریاں پہچان سکو۔ ہم ان ڈگریوں کے ذریعے شاید اچھی ملازمتیں حاصل کر بھی لیں لیکن علم کی اصل روح سے محروم رہیں گے۔ اس بات کا احساس دلانا ہوگا کہ حقیقی علم کیا ہے اور اسے حاصل کیسے کیا جائے۔

☆.....☆.....☆

پاکستان میں آبی مسائل

پانی اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم نعمت ہے، جس کا انسان جتنا شُکر ادا کرے، کم ہے۔ اس کے بغیر روئے زمین پر زندگی ممکن نہیں۔ زمین کا 70 فی صد حصہ پانی جب کہ 30 فی صد خشکی پر مشتمل ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ دیگر مخلوقات کے لیے بھی پانی اتنا ہی اہم ہے۔

پانی نہ صرف اس زمین بلکہ ہمارے جسم کا بھی اہم جُز ہے۔ ہمارا دو تہائی جسم پانی ہی پر مشتمل ہے۔ ایک عام انسان کے جسم میں 35 سے 50 لیٹر تک پانی ہوتا ہے۔ صرف انسانی دماغ کی بات کریں تو اس کا 85 فی صد حصہ پانی ہے۔ امراض سے لڑنے والے ہمارے خلیے خون میں سفر کرتے ہیں۔ خون بذاتِ خود 83 فی صد پانی ہی ہے۔

ہمارے ہر جسمانی خلیے میں موجود پانی ہی سے بدن کے تمام نظام چلتے ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق پانی ایک مکمل علاج ہے۔ ہر عمر کے افراد کو دن بھر میں کم از کم دو سے ڈھائی لیٹر پانی ضرور استعمال کرنا چاہیے۔

پانی جہاں اس قدر اہمیت کا حامل ہے وہیں ہم روزمرہ زندگی میں اسے کثرت سے ضائع بھی کر رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں پاکستان آبی مسائل کا شکار ہے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

محترمہ مغیثہ خالد صاحبہ

مغیثہ خالد کا تعلق کراچی سے ہے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور ایم بی اے کیا ہے۔ درس نظامی تا حال جاری ہے۔ رئٹرز کلب سے گزشتہ ایک سال سے وابستہ ہیں۔

☆.....☆.....☆

دعا کی فضیلت و اہمیت

حدیثِ مبارکہ ہے: ''دعا، عبادت کا مغز ہے''۔ دعا کرنا یعنی اس رب کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ عاجزی سے اٹھانا، جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کے تمام راز ہیں۔ اس مالک کل سے مانگنا جو خوش ہوتا ہے جب کوئی بندہ اسے پکارتا ہے۔ اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر عاجزی سے سوال کرتا ہے۔ اس کے قادر ہونے پر یقین رکھ کر جب کوئی اس کے آگے جھولی پھیلاتا ہے تو وہ مانگنے والے کو اپنی شان کے مطابق عطا کرتا ہے۔

دعا کی قبولیت کے مختلف درجات ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس کے بندے کے حق میں کس وقت کیا بہتر ہے۔ وہ اسے وہی عطا کرتا ہے جو بندے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ دعا کبھی رد نہیں ہوتی، یا تو بعینہ قبول ہو جاتی ہے یعنی جو دعا مانگی جائے، اللہ قبول کر لیتا ہے یا پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا کوئی نعم البدل عطا فرما دیتا ہے، جو ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ یہ پہلا درجہ ہے۔ پھر اگر ایسا نہ ہو تو اللہ تبارک تعالیٰ اس دعا کی برکت سے کوئی مصیبت، پریشانی یا آفت، ہم سے ٹال دیتا ہے۔ یہ دوسرا درجہ ہے۔ اگر ایسا بھی نہ ہو تو تیسرا درجہ ہوتا ہے، جسے اکثر لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ وہ ہے آخرت میں ذخیرہ، یعنی جو دعائیں دنیا میں قبول نہیں ہوتیں، رب تبارک وتعالیٰ اس کا اجر بندے کو روز قیامت عطا فرمائے گا اور اس وقت بندہ یہ خواہش کرے گا کہ کاش! دنیا میں اس کی کوئی دعا قبول نہ ہوئی ہوتی۔

یہ اس رب العالمین کا ہم گناہ گاروں پر فضل ہی تو ہے کہ اس نے ہمیں دعا مانگنے کا راستہ دکھایا۔ ہر مشکل گھڑی میں، جب انسان تنہا ہو، تو وہ اسے پکار سکے اور وہ اپنے ہر پکارنے والے کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔ اسے پسند ہے کہ اس کا بندہ اس کے سامنے عاجزی سے مانگے، ہاتھ پھیلا کر، گڑگڑا کر روئے، اپنی ہر چھوٹی سے

چھوٹی سی خواہش اس کی بارگاہ میں پیش کرے۔ جب بندہ اپنے رب کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو رب تبارک وتعالیٰ، جو اپنے بندوں سے ستّر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے، بندے کی جانب دو قدم بڑھاتا ہے۔ جب بندہ لڑکھڑاتا ہے تو وہ سنبھال لیتا ہے، جب گرتا ہے تو سہارا دیتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے بندے کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ آزماتا بھی ہے تو قدم قدم پر سہارا بھی دیتا ہے۔ مشکل حالات میں لڑنے کی ہمت بھی وہی عطا کرتا ہے۔ اپنے بندے کی پکار کو کبھی رد نہیں فرماتا۔

اے رب تو ہی تو ہے
زندگی کی ہر سانس میں
جو تو ہے تو سب کچھ ہے
ورنہ دنیا و آخرت کا خسارہ ہے

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

عمر الطاف باجوہ

عمر الطاف باجوہ ولد الطاف حسین باجوہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ساتھ ساتھ درس نظامی کا کورس بھی جاری ہے۔ کالم اور مضامین لکھنے کا سلسلہ 2017ء سے شروع کیا۔ ایک سال سے رائٹرز کلب سے بطور ممبر وابستہ ہیں۔

فہرست تحریر:

1- ففتھ جنریشن وار کیا ہے؟

2- یوم تکبیر

3- قلم کا تقدس

4- غزوہِ ہند

5- یوم پاکستان

☆.....☆.....☆

ففتھ جنریشن وار کیا ہے؟

مختصر یہ کہ انہی میں سے کچھ کو کرائے کا قاتل بناؤ، باقی سب خود ہی بے بس مقتول بن جائیں گے۔ ضروری اور سنجیدہ مسائل کو لٹکائے رکھو، کچھ جذبے والے افراد کو فرقے ورانہ، لسّانی، علاقائی اور سیاسی نعروں میں الجھائے رکھو۔ شکوک وشبہات کی وہ فضا بناؤ کہ عوام اپنی ہی عدلیہ، فورسز اور قومی اداروں سے مایوس ہو جائیں اور انہیں، انہی کے وطن کے خلاف استعمال کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ نوجوانوں کو فیک ویڈیوز دکھا کر اتنا اشتعال دلا دو کہ وہ اپنی ہی ریاست کے خلاف اسلحہ اٹھانے کو اپنی غیرت قرار دیں اور آپس میں مرنے مارنے میں فخر محسوس کریں۔ حکمرانوں اور اینکرز کو اتنا بے حس اور بے ضمیر کر دو کہ انہیں اپنے ذاتی مفاد کے علاوہ کچھ نظر ہی نہ آئے۔ ان کو شراب اور ڈالرز میں دھت کر دو، اتنا بے حال کر دو کہ معصوم بچیوں کی چیخیں سنائی نہ دیں، بہتا ہوا لہو نظر نہ آئے۔ لٹتی ہوئی عصمتوں کی خبر نہ ہو۔ تباہی وانارکی کے دہانے پر کھڑا ملک نظر نہ آئے۔ بس.... میں پنجابی، پشتون، سندھی اور بلوچی۔ میں نون لیگ، پی ٹی آئی اور پیپلز پارٹی کا سپورٹر۔ میں سنّی، وہابی اور دیوبندی فرقے سے ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہ آئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دشمن اس میں کامیابی سے ہم کنار تو نہیں ہو گیا؟ اگر جواب ہاں ہے اور یقیناً ہاں ہے، تو میں اور آپ اس وار میں کیا مجاہدانہ کردار ادا کر سکتے ہیں؟ ہاں ایک ایسا کردار، جو دشمن کی چالوں سے بھی خوب واقف ہو اور اپنوں کے مزاج کو بھی اچھی طرح جانتا ہو، جو چیتے جیسی چستی رکھتا ہو اور لومڑ جیسی مکاری، جو ہرن جیسی چال رکھتا ہو اور عقاب جیسی نظر، جو شیر جیسا جذبہ رکھتا ہو اور شاہین جیسا وار تو اٹھو! اسلام اور پاکستان کی نظریاتی وجغرافیائی سرحدوں کے محافظ مجاہدو! یہ عظیم تر دین اسلام اور یہ عظیم ملک پاکستان، ہمارا منتظر ہے۔ لگا دو صدا! ہم ہی ہیں امت مسلمہ کے پاسبان۔ ہم ہی ہیں ماؤں، بہنوں کے نگہبان اور ہم ہیں مسلمان۔ ہاں ہم ہی ہیں پاکستان۔

اگر آج امت مسلمہ کے شیروں اور پاکستانی مجاہدوں نے انگڑائی لی، اپنی صفوں میں دشمنوں کو پہچانا، ان کے مقاصد کو نیست و نابود کر کے ان کو اپنی موت آپ مارا، ہر طرح کی تفریق سے بالاتر ہو کر اتحاد کی فضا قائم کی، اپنے مفادات پر اسلامی و قومی مفادات کو ترجیح دی اور اپنی صلاحیتوں کا صحیح سمت میں استعمال شروع کر دیا تو انشاءاللہ ہم کافر دشمنوں کی ان چالوں کا رخ ان کے ہی ملکوں کی طرف موڑ دیں گے اور وہ دن دور نہیں جب یروشلم، نیویارک، ماسکو اور دہلی پر اسلام کا پرچم لہرائے گا اور دنیائے کفر مغلوب ہو گی۔ ان شاءاللہ۔

☆.....☆.....☆

یومِ تکبیر

28 مئی 1998، وطن عزیز کی تاریخ میں وہ عظیم دن ہے، جس دن اللہ پاک نے محض اپنے فضل و کرم سے پوری امتِ مسلمہ خصوصاً پاکستانی قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ انتہائی نامساعد حالات، معیشت کے گرے ہوئے پیمانے اور وسائل نہ ہونے کے بعد کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس ملک میں اپنا کوئی جدید اسلحہ موجود نہیں، جو اپنے ٹینکوں کے دہانے اور توپوں کے منہ اپنے خود کار گولوں سے نہیں بھر سکتا۔ جو اپنی حدود میں آنے والے دشمن کے طیاروں کا علم نہیں رکھ سکتا اور انہیں روک نہیں سکتا، وہ ملک ایٹم بم کیسے بنا لے گا؟ اسی لیے فنڈز اور دیگر مراعات کی طرف بھی کچھ خاص توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر ایک دُھن تھی، جذبہ تھا، ولولہ تھا اور ایک شعلۂ ایمانی تھا کہ یا تو اس میں کامیاب ہو جائیں گے یا پھر شہادت کو گلے سے لگا لیں گے اور کوئی تیسرا آپشن سامنے موجود نہیں تھا کیوں کہ دباؤ بڑھتے جا رہے تھے۔ عالمی توازن بگڑتا جا رہا تھا، کفار کی بدمعاشیاں عروج پہ پہنچ چکی تھیں۔

ان حالات میں صرف اور صرف ایک آسرے، ایک اللہ کے سہارے، ایک اللہ کے بھروسے پہ امت کے چند محسن مصروف عمل تھے۔ دنیا کی نظر میں ناممکن کو ممکن بنانے میں مگن تھے۔ امت کا سر فخر سے بلند کرنے کی جستجو میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ وہ کسی بھی صورت ہمت نہیں ہارنا چاہتے تھے، وہ کسی بھی قیمت پر جھکنا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ ان کے سامنے قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کا یہ واضح پیغام سنا رہا تھا، ''اور ان سے لڑنے کے لیے جو کچھ قوت سے اور صحت مند گھوڑوں سے جمع کر سکو، سو تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسروں پر رعب پڑے۔ جنہیں تم نہیں جانتے اور اللہ انہیں جانتا ہے''۔ (القرآن)

بالآخر اللہ پاک نے اپنا خصوصی فضل و کرم فرمایا، ان مجاہدوں کو معجزانہ طور پر اس کاوش میں کامیابیوں سے ہم کنار فرمایا اور 28 مئی 1998 کو چاغی، بلوچستان کے مقام پہ تین بج کر پندرہ منٹ پر پہاڑوں کے درمیان، ایک

کلومیٹر لمبی، بل کھاتی ہوئی سرنگ میں ایٹمی دھماکوں کے ساتھ امت مسلمہ اور وطن عزیز کو سرخ رو فرمایا، جس سے نہ صرف وہ پہاڑ بلکہ پوری دنیا میں اللہ، مسلمانوں کے اور وہ سارے دشمن لرز گئے، ان کے دل دہل گئے، جنہیں ہم نہیں جانتے تھے۔ یہ وہ دن تھا جب پوری مسلم دنیا میں چراغاں کیا گیا۔

پھر اللہ کا قرآن بھی مسکراتا ہوا میدان میں یہ صدا لگا رہا تھا، ''اور اس ذات سے ڈرو، جس نے ان چیزوں سے نواز کر تمہاری قوت میں اضافہ کیا ہے، جو تم خود جانتے ہو''۔ (القرآن) اس کے بعد دو ٹکے کے تجزیہ نگار بیٹھے اور یہ تجزیے دینے لگے کہ ایٹم بم بنانے میں اور ایٹمی دھماکے کرنے میں کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ اس سے بین الاقوامی امداد رک گئی۔ ہماری معیشت پہلے ہی خستہ حالی کا شکار ہے۔ ہمارے حالات اتنے سازگار نہیں تھے، ہم اس پوزیشن ہی میں نہیں تھے کہ یہ سب کچھ کرتے۔ یہ سراسر بے وقوفی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ مگر بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ سب سے بہتر اقدام یہی تھا۔ کئی پڑوسی اپنی اوقات میں آ گئے، کئی بین الاقوامی غنڈے اور پوری دنیا کو اپنی جاگیر سمجھنے والے ٹھٹھک کر رہ گئے۔ خطے میں طاقت کے توازن کے بعد امن قائم ہو گیا اور حقائق اس چیز پہ دلالت کرتے ہیں کہ اگر اس وقت یہ فیصلہ نہ لیا جاتا تو آج پاکستان کو انڈیا، ترنوالہ سمجھ کر نگل چکا ہوتا اور پوری دنیا میں امت مسلمہ پتا نہیں کس کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہوتی۔ الحمدللہ! اب یہ چیز روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہماری ایٹمی ٹیکنالوجی انڈیا سے بہتر، ہماری میزائل ٹیکنالوجی انڈیا سے بہتر، ہماری ہر قسم کی عسکری ٹیکنالوجی انڈیا سے بہتر ہے۔ اب کوئی بھی ہماری طرف میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ اب کوئی بھی ہماری طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ انڈیا اور اس کے ہم پلّہ وہم نواؤں کے لیے واضح پیغام ہے، ''آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا''

☆.....☆.....☆

قلم کا تقدس

'قلم' کوئی عام چیز نہیں۔ اللہ پاک نے قرآن مجید میں اس کی قسم کھائی ہے۔ ''قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھ رہے ہیں''۔ (سورۃ القلم) اور ہم نے اسے صرف ایک دوسرے پہ بازی لے جانے اور ہرانے کے لیے ایک اوزار سمجھا ہوا ہے۔ اسے ڈالروں، بنگلوں اور گاڑیوں کے عوض بیچ ڈالا ہے۔ شہرت کمانے، الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا پر اپنی دھاک بٹھانے اور کسی دوسرے کو مات دینے کے لیے بغیر سوچے سمجھے، بے دریغ اس کی سیاہی کو اپنے لیے وبال جان بنائے جا رہے ہیں۔

اسلام، اُمّت مسلمہ، حرمین شریفین اور وطن عزیز کو درپیش مسائل ہمیں نظر نہیں آتے۔ اسلام کا پیغام پہنچانے والا سو میں سے ایک، اُمّت مسلمہ کا درد بیان کرنے والا اجنبی مگر آپس کے تفرقات کو ہوا دینے، شرعی مسائل پہ فتوے بازی کرنے اور اُمّت مسلمہ کے ان دردناک حالات میں جہاد جیسے عظیم فریضے پہ کج بحثی کرنے والے 'مشہور و معروف تجزیہ نگار، نامہ نگار اور صحافی' مانے جاتے ہیں۔ انہیں ایوارڈز سے نوازا جاتا ہے۔ اہم، ایک بات یاد رکھیں! ہمارا قلم جو کچھ لکھتا ہے، ہماری تحریر سے لوگ جو کچھ سیکھتے ہیں اور اس سے جو سمت متعین کرتے ہیں، ہم اس کے جواب دہ ہیں۔

آج کے معمولی عیش و عشرت اور سہولتیں پانے کی دوڑ میں قلم بیچنے والو! ڈرو اس وقت سے جب تم اسی قلم و سیاہی سے پناہ مانگو گے اور یہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اللہ نہ کرے کہ جنت کے راستے سے بھٹک کر کسی اور سمت کو نکل جاؤ۔ یہ اللہ پاک کا خصوصی فضل و کرم ہے کہ اس نے تمہیں اتنے لوگوں میں سے چن کر کائنات و اُمّت کی تعلیم کے لیے چنا ہے۔ 'قلم' تعلیم کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اللہ پاک نے قرآن مجید کی جو سورۃ سب سے پہلے نازل فرمائی، اس میں فرما دیا کہ ''پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی''۔ (سورہ العلق) یعنی اس کے ذریعے ہم جو بھی لکھیں، ہماری ذمے داری ہے کہ ہمیشہ حق اور سچ لکھیں۔ کسی سے نہ ڈریں، نہ جھکیں اور نہ بکیں۔

مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہزاروں، لاکھوں فالورز ہوں، اگر ہمارے قلم سے حق اور سچ پڑھ کر کوئی ایک بھی راہِ راست پر آ گیا یا کسی ایک مظلوم کی دادرسی ہوگئی تو ہمارا کام پورا ہوگیا۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے مقصد کو پہچانیں۔ اپنی ذمے داری صحیح سمت میں استعمال کریں۔ قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔ اپنے حصے کا کام کرتے جائیں۔ چوں کہ ہم جو بھی لکھتے ہیں، کسی نہ کسی مقام پر معاشرے میں اس کے اثرات ضرور ہوتے ہیں اور اگر سب کی مشترک سمت ایک ہو تو اس کے بڑے دُوررس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے۔ قوموں کے دھارے بدلے جا سکتے ہیں، طوفانوں کے رخ موڑے جا سکتے ہیں، سیلابوں کے آگے بند باندھے جا سکتے ہیں مگر.... سب سے پہلے خود کو پہچاننا ہوگا۔ اپنی طاقت کا اندازہ کرنا ہوگا اور 'قلم' کا تقدس بحال کرنا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

غزوہِ ہند

حدیث پاک کی صحیح ترین چھے کتابوں 'صحاح ستّہ' میں شامل 'سنن نسائی' میں امام عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی رحمتہ اللہ علیہ نے کتاب الجہاد میں 'غزوتہ الہند' کا ایک مستقل عنوان قائم فرمایا ہے اور اس کے تحت مندرجہ ذیل دو احادیث نقل فرمائی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ہندوستان میں ہونے والے جہاد میں شرکت کا وعدہ لیا۔ پس اگر میں اس کو پاؤں گا تو اس میں اپنی جان اور اپنا مال لگا دوں گا۔ پھر اگر میں زندہ واپس لوٹ آیا تو جہنم سے آزاد شدہ ابو ہریرہ ہوں گا۔

اس حدیث شریف سے غزوہ ہند یعنی ہندوستان پر ہونے والے جہاد کتنی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ اپنے مقدس صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے اس میں شرکت کا وعدہ لے رہے ہیں کہ تم میں سے جو بھی اسے پائے گا وہ اس میں اپنی جان اور مال کھپا دے اور پھر اللہ تعالی کی طرف سے اس کو یہ انعام ملے گا کہ وہ اگر اس جہاد میں شہید ہو گیا تو وہ بہترین شہیدوں میں شمار ہوگا اور اگر بچ گیا تو جہنم سے آزادی کا پروانہ اس کے پاس ہوگا۔

آقا مدنی ﷺ کا آگے آنے والا فرمان یہ بتا رہا ہے کہ یہ وعدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ تمام اہل ایمان کے ساتھ یہی وعدہ ہے کہ وہ ہندوستان کے جہاد میں شرکت کریں گے تو انہیں یہ فضیلت نصیب ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، ''میری اُمّت کی دو جماعتیں ایسی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے بچا لیا ہے۔ ایک وہ جماعت، جو ہندوستان کے خلاف جہاد کرے گی اور ایک وہ جماعت، جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کے ساتھ ہوگی۔

اس حدیث شریف نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ غزوہ ہند کی فضیلت ہر اس شخص کے لیے عام ہے، جو اس

میں شرکت کرے گا۔

ہم نے آپ ﷺ کی زبان اطہر سے نکلی ہوئی بشارتیں ملاحظہ کرلیں۔ایسی ہی وہ بشارتیں تھیں، جن کے حصول کے لیے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اور اپنا تن دھن من قربان کر دیا تھا۔حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جہادِ قسطنطنیہ میں شرکت کی فضیلت سنی تو زندگی کے آخری دن تک اس میں شریک رہے اور انتقال کے وقت وصیت فرمائی کہ صبح جہاں تک مسلمانوں کا لشکر پیش قدمی کرے، وہاں مجھے دفنا دیا جائے۔اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں پر یقین ہی کی وہ دولت تھی، جس سے دنیا بھر کی قوتیں اور کسریٰ کی سلطنتیں ان کے قدموں میں آ گئیں۔

غزوہ ہند کی احادیث مبارکہ جہاں ایک طرف اس مبارک اور مقدس جہاد میں شرکت کرنے والے خوش بخت لوگوں کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ ہیں، وہاں یہ اس بات کی بھی کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ جہاد کا عمل قیامت تک کے لیے جاری رہنا ہے اور بعض مجتہدِ دین کا یہ کہنا کہ 'جہاد اور قتال صرف دَورِ رسالت کے ساتھ مختص تھا' یا 'حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنھم صرف چوروں اور ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اپنے پاس اسلحہ رکھتے تھے' محض بلا دلیل گم راہی ہے اور اس کا مقصد اُمّت مسلمہ کو اپنے دفاع سے غافل کرنا ہے۔ ہندوستان پر ہونے والے جہاد کو بہت سے علماء نے علاماتِ قیامت میں سے بھی شمار کیا ہے۔علامات قیامت کے بارے میں لکھی گئی قدیم 'کتاب الفتن' میں کئی احادیث نقل ہیں، جن میں سے صرف ایک حدیث پاک ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا، ''میری اُمّت میں سے ایک قوم ہندوستان پر جہاد کرے گی۔پس اللہ تعالیٰ ہندوستان کے خلاف ان کو فتح نصیب فرمائے۔ یہاں تک کہ وہ ہندوستان کے بادشاہوں کے گناہوں کو بخش دے۔پھر جب یہ لوگ شام کی طرف واپس جائیں گے تو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السّلام کو وہیں پائیں گے۔

کیوں کہ اس وقت ہندوستانی فوجیں اور جنگجو حکام اپنی تعداد اور اسلحے کی کثرت کے گھمنڈ میں، جو مظالم نہتے مسلمانوں پر ڈھا رہے ہیں، جن میں بیش تر معصوم بچے اور صنف نازک ہیں اور جس طرح ان کی املاک کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے، یہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہے اور اس جہاد میں شرکت، ان کی مذہبی غیرت کا اوّلین تقاضا ہے۔ بہر حال اس حدیث پاک سے ہندوستان پر جہاد کرنے والوں کے لیے بخشش اور مغفرت کی کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے چوں کہ خود رسالت مآب ﷺ کی زبانی بشارتیں سنیں اس لیے ان کے دلوں میں غزوہ ہند میں شرکت کا کس قدر شوق اور جذبہ تھا۔اللہ پاک ہمیں بھی آقا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات پہ عمل کرنے والا بنائے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے نقش قدم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆.....☆.....☆

یوم پاکستان

23 مارچ.... یوم پاکستان، یوم عہد، یوم تجدید عہد، یوم شعور، یوم احساس، یوم حیثیت، یوم حقیقت، یوم جذبہ وجنون، یوم عشق ووفا، یوم ایثار وقربانی، یوم کیف ومستی اور یوم ایمان ونظریہ ہے۔اس دن ہمیں یہ باور کرایا گیا کہ ایک اللہ کو ماننے والے اور ہزاروں نہیں، لاکھوں بتوں کی پوجا کرنے والے۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہبر ورہنما ماننے والے اور چانکیائی نظریات 'بغل میں چھری منہ میں رام رام' کرنے والے۔قرآن وحدیث جیسی بیّن ولاجواب دلیل رکھنے والے اور ارتھ شاستر جیسی متزلزل اور بدبودار تعلیمات رکھنے والے۔اپنی سنہری، روشن اور غیرت مند ایمانی تاریخ رکھنے والے اور سیاہ، بھیانک، بے شرمی اور بے غیرتی کی روایت قائم کرنے والے۔والدین کو کل کائنات اور اپنی جنت سمجھنے والے اور والدین کو بوجھ سمجھ کر اولڈ ہومز میں جمع کروانے والے۔بیٹی کو عزت دار رتبہ دینے، اپنے لیے اعزاز سمجھنے والے اور بیٹیوں کو فخر سے سرِ بازار ننگا نچوانے اور اپنا کاروبار بنانے والے۔ایک پاکیزہ ثقافت رکھنے والے اور ایک متعفن زندگی گزارنے والے۔ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے آنچل کا تحفظ کرنے والے اور ایک ان کی عزتوں سے کھلواڑ کرنے والے۔ایک اشرف المخلوقات مسلمان اور ایک جانوروں سے بدتر ہندو مشرک وکافر۔ایک دونوں جہانوں کے سردار کے اُمّتی اور ایک بند وتاریک گلی، جہنم کے مسافر، اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

نہ ان کا مذہب مشترک، نہ ان کے عقائد مشترک، نہ ان کی تعلیمات مشترک، نہ ان کے دستور مشترک، نہ ان کی تاریخ مشترک، نہ ان کی ثقافت مشترک، مشترک تو دُور کی بات ہے یہ ایک دوسرے سے متضاد دو تہذیبیں، دو قومیں ہیں۔دو قومی نظریہ طاقت پکڑ گیا اور یہ نعرہ بلند کر دیا گیا، ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ۔دستورِ ریاست کیا ہوگا؟ محمد الرسول اللہ ﷺ، لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان''۔

اس دن کے بعد پھر قربانیوں کی وہ تاریخ رقم ہوئی کہ جس نے دل دہلا دیے، کلیجے منہ کو آنے لگے۔زمین کانپ

اٹھی۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی گئی۔ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں تار تار کی گئیں۔ لوٹ مار کا بازار گرم کیا گیا۔ جیلیں مسلمانوں کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں سے بھر دی گئیں۔ لاشوں پر گھوڑے دوڑا دیے گئے۔ جوان بہنوں نے ان درندوں سے بچنے کے لیے کنوؤں کی گھٹا ٹوپ سیاہی، گہرائی اور ہول نا کی کو اپنی محفوظ پناہ گاہ جانا۔ وہ بہن، جو رات کو اکیلے کمرے میں سونے سے ڈرتی تھی، آج اپنا دوپٹا بچانے کے لیے دلیری کے ساتھ خود کو رسمِ نیل ادا کرتے ہوئے دریا کے حوالے کر رہی تھی کیوں کہ اے دریا! تو پاکستان کی طرف چلے گا۔ میری بلی لے لے اور کبھی سوکھنا مت تا کہ سرسبز و شاداب رہے میرا پاکستان۔

پورے برصغیر کے ایک ایک علاقے کے در و دیوار ہمارے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے رنگین ہوئے۔ ہر کال کوٹھری میں کوئی بوڑھا سسک رہا تھا، ہر اندھیری رات کسی ماں، بہن اور بیٹی کی دل دوز چیخوں کی گواہی دیتی تھی کہ جس کے پاکیزہ جسم کو نجس و بدبودار مشرک و کافر نوچتے تھے۔ ہر صبح کوئی نئی آفت ہوتی تھی۔ مصیبتوں اور آلام کے پہاڑ توڑے جاتے تھے تب جا کر اسلام کے نام پر یہ آزادی ملی۔ تب جا کر یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان بنا۔

آج اس میں ہی اسلام کی تذلیل کی جاتی ہے۔ اسلامی اقدار کا جنازہ نکالا جاتا ہے۔ آج اسی کی سڑکوں پہ اسلام، مسلمان، اُمّت مسلمہ اور پاکستان کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ کیوں....؟ کیوں کہ ہمارا کچھ لگا نہیں اس آزادی کے لیے۔ ہم نے کچھ دیکھا نہیں کہ اس کی بنیادوں میں سرخ رنگ کا گارا ہے۔ اس کی دیواروں میں ہمارے بڑوں کی کھوپڑیاں چُنی ہیں۔ اس کے دفاع میں مسلمانوں کی لاشوں کے انبار ہیں۔ اس کی سرسبز و شاداب اور زرخیز زمین کی مسلمانوں کے گرم اور پاکیزہ لہو سے آبیاری کی گئی ہے۔

پاکستانیو! ہمیں یہ آزادی ایسے ہی نہیں مل گئی، اس کے پیچھے قربانیوں کی طویل داستان ہے۔ یہ آزادی خون پر تیر کر ہم تک پہنچی ہے۔ کسی کال کوٹھری میں دم توڑتے بزرگ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ کسی کونے میں سسکتی بہن کی آہوں کی مرہونِ منّت ہے۔ اللہ پاک کی نعمت کی قدر کرو، اس کی حفاظت کرو۔ اس کی ترقی میں سنگ میل بن جاؤ۔

ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں، سب سے پہلے پاکستانی ہیں۔ ہم ایک جسدِ واحد کی مانند ہیں۔ ہم سب بھائی ہیں۔ دشمن مختلف روپ میں آ کے اس پیارے وطن کو توڑنا چاہتا ہے۔ اس کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے مگر ہم ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیں گے۔ کبھی وہ ہمیں مسلکی طور علیحدہ کرنا چاہے گا، کبھی وہ سیاسی نعروں میں ہمیں توڑنا چاہے گا۔ کبھی وہ لسّانی و علاقائی طور پر ہمیں بانٹنا چاہے گا مگر ہمیں ہوشیار رہنا ہے۔ دشمن کی ہر چال کو ناکام بنانا ہے۔ اس کے ہر وار کا منہ توڑ جواب دینا ہوگا۔ کبھی وہ پاکستان کے خلاف شکوک و شبہات ڈالے گا۔ کبھی علماء کے خلاف بھڑکائے گا۔ کبھی پاکستان کی فورسز، آرمی، رینجر اور پولیس کے خلاف بھڑکائے گا۔ کبھی پاکستان کے محسن دینی طبقے کے مدِ مقابل کھڑا کرے گا۔ مگر عزیز پاکستانی بھائیو! یہ سب دشمن کے مختلف روپ ہیں۔ اس کی چالیں ہیں، انہیں ناکام بنانا ہے اور

اس کے ہر وار کو، اس کے ملک ہی کی طرف موڑ نا ہے کیوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان مدینہ ثانی ہے۔ ایک نظریاتی ریاست ہے، جو اسلام کے نام پہ بیش بہا قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کی طاقت کا واحد مرکز ہے جو بہترین جغرافیائی، نظریاتی، معدنیاتی، فوجی، الغرض ہر قسم کے وسائل سے مالا مال ہے اور پوری کافر دنیا کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔ تو سوچو! کیا وہ ایسے ملک، پاکستان کو توڑنے اور نقصان پہنچانے کے لیے سازشیں نہیں کریں گے؟ اس لیے ہمیں ہر دم تیار اور ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں ہم دشمن کے آلۂ کار تو نہیں بن رہے؟ کہیں ہم وقتی طور پر جذبات میں بہ کے اس عظیم ملک کے خلاف تو استعمال نہیں ہو رہے؟ کیوں کہ یہ وطن ہمارا ہے، ہم ہیں پاسباں اس کے۔

آج یوم پاکستان کے موقع پہ ہم عہد بلکہ تجدیدِ عہد کریں کہ ان شاء اللہ اسلام، اُمّتِ مسلمہ اور پاکستان کے ساتھ، خون کے آخری قطرے تک وفادار رہیں گے۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

شاہ زیب ملک

شاہ زیب ملک کا تعلق بھکر سے ہے۔ بی ایس انگلش کے طالب علم ہیں۔ رائٹرز کلب کے پلیٹ فارم سے لکھنا شروع کیا، ایک سال سے رائٹرز کلب سے بطور ممبر منسلک ہیں۔

فہرست تحریر:

1- بچوں کو دکھائیں امکانات کی دنیا

2- زندگی کیسے گزاریں

3- سیرتِ حضرت بلالؓ

4- عشق حقیقی

☆.....☆.....☆

بچوں کو دکھائیں امکانات کی دنیا

آج سارے عالم میں مسلم دنیا کی حالت سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔بس یہ کہیں کہ دل خون ہوتا ہے جب ہم تصاویر ہیں معصوم بچوں کو روتے بلکتے' جنگوں میں تشدد کا شکار ہوتے اور ایک رات میں یتیم ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔خوف اور دہشت کا شکار معصوم بچے بے خانماں کیمپوں میں صبح وشام گزارنے پر مجبور ہیں۔عورتیں ظلم و جبر کی تصویر بنی سراپا سوال بنی کھڑی ہیں۔چاہے یہ معاملہ 'افغان کا یا کشمیر کا ہو، یا چیچنیا بوسنیا کوسوو کا ہو یا فلسطین ،مصر،عراق اور شام لیبیا کا ہو۔یا پاکستان کا ہو یا انڈیا کا۔غور کریں دل دہلا دینے والے تصاویر اور ویڈیو سارے عالم میں اسلامی ممالک کی حالت زار کی منہ بولتی تصویر بنی ہوئی ہیں۔

جوں ہی ویڈیو ختم ہوتا ہے ہم سے ہمارے گھروں کے بچے سوال کرتے ہیں یہ کون ہے؟ انہیں کیوں مارا جارہا ہے؟ ان پر کس نے حملہ کیا؟ اور ہمارا جواب ہوتا ہے مسلمانوں پر ظلم کیا جارہا ہے اور معصوم ذہن الجھ جاتا ہے۔بظاہر وہ خاموش ہوگیا لیکن اس کے ذہن کے نہاں خانوں بے شمار سوالات ہیں۔اب چونکہ میرا سبجیکٹ ہی بی ایس انگلش میں سائیکولوجی سے متعلق ہے تو ظاہر ہے میں اسی زاویہ سے سوچوں گا۔کوئی اسے خودغرضی بھی کہہ سکتا ہے لیکن شاید میں اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہوجاؤں تو متفق ہونے کا امکان ہے۔

یہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اس لیے کوئی خبر صیغہِ راز کم ہی رہتی ہے۔سوشل میڈیا کے ذریعے منٹوں نہیں، سیکنڈز میں بلکہ فریکشن آف سیکنڈز میں مشہور ہو جاتی ہے اسی لیے پہلے کی نسبت زیادہ خطہ اراضی پر ہونے والے مظلوموں کی فریاد ہم تک پہنچ رہی ہے اور یہ میڈیائی انقلاب جہاں ساری دنیا کو معلومات سے اپ ڈیٹ کرتا رہتا ہے وہیں یہ بھی مسلم حقیقت ہے کہ مایوسی بکھیرنے والے یہی ویڈیوز اور تصاویر ہیں۔جو ہماری نسلوں کی نفسیات پر ثبت ہو کر ان کو اپنے مقصدِ تعلیم سے بددل کرتے ہیں اور رہی سہی کثر فحش میڈیا اور انٹرٹینمنٹ ماڈرن میڈیا کر دیتا ہے۔

تاہم سب سے بڑا فیکٹر سماجی عدم تحفظ کا احساس او مذہبی کمیونل منافرت پیدا کرنا جو کہ پوری دنیا میں ہونے والے تشدد کے ساتھ ظلم وتشدد، مظلوموں کی آہ وبکا ان کی بے بسی بے کسی کی تصاویر اور ویڈیوز یہ نوجوان نسل کے خون کو گرمانے کے لیے ایک بھرپور نفسیاتی اٹیک کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ جس کا شکار عام عوام، میڈیا اور نوجوانوں کے ساتھ ساتھ اسکول کے طالب علم ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں شدت پسند مذہبی رجحان کو فروغ ملتا ہے۔ نوجوان اپنے تعلیمی مشن مقصد اور طے شدہ ٹارگٹ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ عالمی سیاسی گفتگو ان کا موضوع بن جاتا ہے۔ یا تو وہ شدت پسند مذہبی گروہ کا آلہِ کار بنتا ہے یا لاحاصل مباحثے اور غیر ضروری ایکٹیوازم دکھاتا ہے جو بس فریب کے سوا کچھ نہیں۔

اسی طرح کے موضوعات سے معصوم بچے بھی اس مایوسی کا شکار ہوتے ہیں جو ہمارے گھروں میں موجود ہیں اور ابھی اسکول جانے لگے۔ جب والدین گھروں میں پشاور اسکول کے حملے کا ذکر کر رہے ہوں۔ اسما بلتاچی کے بہادری کے قصہ سنا رہے ہوں، شام کی، ہاتھ اوپر اٹھانے والی معصوم کو دیکھ کر آنکھیں نم کر رہے ہوں یا حال میں لاہور بلاسٹ پر گفتگو ہو رہی ہو تو معصوم بچوں کے ذہن میں مذہب سے بدظنی پیدا ہونا کا اندیشہ ہے۔ جب ہم ان کی کٹی پھٹی لاشوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آنسو بہاتے ہیں، جب تشدد کے ویڈیوز سب مل کر دیکھتے ہیں اور جو اسکے بعد تبصرہ کرتے ہیں اس کا بچوں کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا کبھی غور کیجیے گا۔

خدارا یقین کریں یہ اذکارِ تشدد اور داستانِ مظلومیت ہمارے گھر کے بچوں پر نفسیاتی ظلم ہے، شدید ظلم۔ ان کے معصوم اذہان سوچوں کا رخ بدل دیتے ہیں۔ وہ امکانی دنیا کے مقابلے دنیا کو ظالم تصور کرتے ہیں۔ جو اب تک دنیا کو حسین سمجھتے تھے اب سفاک و بدنما سمجھتے ہیں۔ پہلے وہ اپنے اسکول کے تعلیمی مسابقت کو عظیم مسابقت اور فتح کو عظیم فتح سمجھتے تھے یا ب وہ مظلوم بچوں کو دیکھ کر ان کا دماغ سہم جاتا ہے۔ وہ اپنے والدین سے کھانے کے ٹیبل پر اپنے اسکول کے واقعات کے بجائے اب سناتے ہیں کہ ''ابو میرے دوست کے پاس پشاور اسکول کے بچوں دوبارہ اسکول شروع ہونے کا نغمہ ہے''۔ جس کے پیچھے کی کہانی کا ان کو علم ہے۔ ساری دنیا کے معصوم ذہنوں نے اس سے تاثر لیا۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے اسکا اندازہ مستقبل میں بدلتے رجحان سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

بڑی حیرانی ہوئی جب (exibitionscience) میں طلبا نے پشاور اٹیک کا ماڈل بنایا جس سے ظاہر ہے کہ وہ ظلم کی داستان سے صرف واقف ہی نہیں ہے بلکہ وہ واقعہ ان کے لاشعور کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ بیان کرنے کا مقصد ایک تیر لاکھوں شکار کے مصداق اس کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ بچے کی تعلیمی عمل میں مایوسی اور احساس شکست ان کے مستقبل کی خودکشی ہے۔

موجودہ ریسرچ فائنڈنگ سے بھی ثابت ہے کہ علیحدہ ہوجانے والے گھروں کے بچے، گھروں غیر ضروری

پابندیوں کا شکار بچے، مایوس کن باتیں کرنے والے افرادِ خاندان کے درمیان رہنے والے بچے، معاشی تنگی کے احساس کا شکار بچے، یا سماجی پسماندگی کا شکار بچے یہ ابنارمل سائیکولوجی رکھتے ہی۔ جیسے غیر متوازن جذباتیت، کمزور قوت فیصلہ ،تنہائی پسند، احساس محرومی، غیر متعین کام کے عادی ہوتے ہیں اور مایوس کن کیفیت کا شکار ہو کر زندگی سے بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔

ہماری کوشش یہ ہو کہ ان کے دل و دماغ میں حسین دنیا کا تصور باقی رہے۔ ان کا تعلیمی مسابقت کی اہمیت ہماری بے توجہی کا شکار نہ ہو جائے، ان کو جذباتیت سے بچانا اور قوتِ فیصلہ کو مضبوط کرنا اور مسلکی مباحثے، مذہبی تفریق، فرقہ بندی کا شائبہ تک ان پر نہ ہو۔

نہ ہی اسلامی تحریکات اور تنظیم کے فساد میں انہیں الجھایا جائے۔ وہ بچے ہیں انہیں بچہ ہی رکھیں اور اپنی نگرانی میں صرف ان میں موجود خوبیدہ صلاحیت کو بیدار کرنا ہمارا مقصد ہو اور تعلیم کے حصول، آگے بڑھنے کی لگن اور کامیابی حاصل کرنے کو ہی ان کا مقصد بنا دیں۔ جاپان کی اس پالیسی کے مصداق کہ انہوں اپنی نسلوں کے عظیم نقصان کے باوجود منفی بدلے کے بجائے مثبت بدلہ سکھایا اور اپنی نسلوں کو تعلیم کی طرف راغب کر کے کامیاب بنایا کیوں کہ معذور نفسیات زیادہ خطرناک ہے بمقابلہ معذور جسم کے۔

☆.....☆.....☆

زندگی کیسے گزاریں

جب بچے سمجھ دار ہو جائیں تو والدین کو چاہیے کہ ان سے گفتگو کریں اور انہیں با مقصد زندگی گزارنے کی طرف راغب کریں۔ جب بچے ٹین ایج سے گزر رہے ہوتے ہیں اس عمر میں ذہنی خیالات، عادات اور انداز و اطوار یکسر تبدیل ہو رہے ہوتے ہیں اور اس طرح بچے لڑکپن سے جوانی میں داخل ہوتے ہیں ان بچوں کو زیادہ سے زیادہ سراہے جانا اچھا لگتا ہے۔ وہ اپنے لیے خوب صورت چیز اور لباس کا انتخاب کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ خود کو زیادہ میچور سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے اپنے فیصلوں میں شراکت ان کو ناگوار گزرتی ہے۔ جب بچے اس عمر کو پہنچیں تو والدین کو بہت سمجھ داری اور تحمل سے ان کو لے کر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس عمر کے بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت انہیں دیں۔

اس عمر کے بچے اگر کچھ باتوں کو سنجیدگی سے سمجھ لیں تو وہ با مقصد اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔ با مقصد زندگی ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ بچوں کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر کے کام کاج سے واقفیت رکھیں۔ اپنے والدین کو کام کرتے ہوئے دیکھیں۔ اس طرح بچوں کے دل میں والدین کے لیے احساس اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بھی سیکھ جائیں گے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہیے۔ اس طرح یہ بھی سیکھ جائیں گے کہ بے جا فرمائشیں آپ کے والدین کے لیے کس طرح پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔

اپنے والدین کو دوستوں سے ضرور ملوائیں۔ اس طرح والدین کے دل میں آپ کے دوستوں سے پیار بڑھ جائے گا۔ اس وجہ سے آپ کے والدین آپ کے دوستوں سے ملنے سے نہیں روکیں گے اور دوست بھی آپ کے والدین کی عزت کریں گے۔ بچے اپنے ساتھ دن بھر پیش آنے والے واقعے اپنے والدین کو ضرور بتائیں۔ اس طرح اپنے معاملات پر اپنے والدین سے ضرور گفتگو کریں۔ کوئی بھی انہونی بات نوٹ کریں تو اپنے والدین کو آگاہ

کریں کیونکہ والدین سے بہتر کوئی دوست نہیں ہوتا۔اگر وہ آپ کے ساتھ آنے والے واقعات سے واقف ہوں گے تو آپ کو مصائب سے محفوظ رکھیں گے۔

پڑھائی پر توجہ دینا بہت ضروری ہے لیکن کمرہ بند کرنے سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور تنہائی میں آنے والے خیالات آپ کو پریشان کر سکتے ہیں۔اگر دروازہ کھلا رکھیں گے تو آپ اردگرد کے ماحول سے باخبر رہیں گے اور اگر کوئی چیز میسر ہو تو والدین آپ کو مہیا کر سکیں گے۔عبادات کو ان کے وقت پر ادا کیا جائے۔رسول اکرم ﷺ کی زندگی ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔سیرت پاک کا مطالعہ ضرور کریں کتابیں بہترین دوست ہوتی ہیں اس وجہ سے کتابوں کا مطالعہ ضرور کریں۔دنیاوی زندگی کو ایسے گزارنے کا عزم کریں کے وہ مقصود ربانی ہو اور اپنے مقصد حیات کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق بنائیں۔اپنی عزت وعصمت کی امانت کی طرح حفاظت کریں۔اخلاقیات کا دامن کبھی نہ چھوڑیں کیونکہ عمدہ خلق کے ذریعے دشمن کو بھی زیر کیا جا سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

سیرتِ حضرت بلالؓ

حضرت بلال بن رباح المعروف بلال حبشی ، رسول ﷺ کے مشہور صحابی تھے اور اسلام کے پہلے موذن بھی تھے۔شروع میں ایک کافر کے غلام تھے، پھر اسلام لے آئے جس کی وجہ سے انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دی گئی۔امیہ بن خلف جو مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، ان کو سخت گرمی میں دوپہر کے وقت ریت پر سیدھا لیٹا کر اوپر بڑی چٹان رکھ دیتا تھا تا کہ وہ حرکت نہ کر سکیں۔وہ کہتا تھا یا تو آپ اسلام سے ہٹ جائیں یا پھر اس حال میں مر جائیں اور اس حالت میں بھی آپ کی زبان سے ''احد احد'' جاری رہتا۔یعنی کہ معبود صرف ایک ہی ہے۔رات کو باندھ کے کوڑے لگائے جاتے تھے اور ہر طرح کے ظلم کیے جاتے تھے۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایسا دیکھا تو حضرت بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا۔حضرت بلالؓ، حضرت محمدؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔جنگ بدر میں آپ نے امیہ بن خلف کو قتل کیا۔سفر میں حضرت بلالؓ نبی اکرم ﷺ کے کھانے کا بھی انتظام کرتے تھے۔کفار کی جانب سے جب مسلمانوں پر سختیوں کی انتہا ہو گئی اور کفار کی سازش مسلمانوں کے خلاف دن بادن زیادہ ہونے لگ گئیں تو مسلمانوں کا مکہ میں مزید رہنا دشوار ہو گیا۔تو حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دیں۔

حضرت بلال بھی اس حکم کی تکمیل کرنے والوں میں شامل تھے۔صحابہ اکرام کی مدینہ میں ہجرت کے بعد حضرت محمد ﷺ نے بھی ہجرت فرمائی اور مدینہ میں تشریف لائے۔چند ماہ بعد کے بعد حضرت محمد ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔تو حضرت بلال کو حضرت رویح کا اسلامی بھائی بنا دیا اور دونوں بھائیوں میں اس قدر محبت ور پیار کی فضاء قائم ہوئی کہ دیکھنے والے رشک کرتے تھے۔محبت اور بھائی چارے کا یہ عالم تھا کے اگر اتفاق سے بھی حضرت بلال کو باہر جانے کی ضرورت پیش آتی تو اپنے تمام کاموں کی ذمے داری اپنے اسلامی بھائی کو دے جاتے

حضرت بلالؓ کا مسجد نبوی کی تعمیر میں حصہ لینے کا جزبہ بھی قابلِ دید تھا۔آپ بڑی تندو تیزی سے حصہ لے رہے تھے۔حضرت محمد ﷺ بھی صحابہ اکرامؓ کے ساتھ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور مٹی آپ ﷺ کے شکم مبارک پر لگ جاتی۔ صحابہ اکرامؓ جب یہ دیکھتے کہ آپ ﷺ اینٹیں اٹھا کر لا رہے ہیں۔تو وہ بھی کام میں خود تیزی دکھاتے اور ساتھ ساتھ رجز پڑھتے جاتے۔

مدینہ منورہ کی ابتدائی زندگی میں مسلمان تمام نمازوں کے لیے خود جمع ہو کر جاتے،اذان کے وقت اعلان کا کوئی ذریعہ نہ تھا،رسول پاک ﷺ کو اسی بات کی فکر تھی۔تب کسی نے تجویز پیش کی کہ بگل کے ذریعے اعلان کروایا جائے مگر یہ یہودیوں کا طریقہ تھا،اس لیے آپ ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا۔کسی نے مشورہ دیا کہ نماز کے وقت آگ روشن کی جائے تا کہ آگ کو دیکھ کے پتہ چل جائے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔کسی نے کہا کہ عیسائیوں کی طرح ناقوس بجا کر نماز کا اعلان کیا جائے،چنانچہ ناقوس تیار ہو گیا اور حضرت عمرؓ کے سپرد یہ خدمت کی گئی۔

تو اگلی صبح آئے اس سے پہلے دو لکڑیاں خرید کر لے آئے۔رات کو آپؓ سو رہے تھے کہ آپؓ نے خواب میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ناقوس نہ بناؤ بلکہ نماز کے لیے اذان دو۔حضرت عمرؓ یہ خواب رسول اللہ ﷺ کو سنانے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے،نبی اکرم ﷺ پر اس بارے میں پہلے ہی وہی نازل ہو چکی تھی۔اس بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے تجویز پیش کی کہ نماز کے وقت کوئی شخص مدینہ کی گلیوں میں 'حانت الصلواۃ' کی منادی کیا کرے۔

اس تجویز کو رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا اور یہ خدمت حضرت عبداللہ بن زیدؓ کے سپرد ہوئی۔حضرت بلالؓ چونکہ بلند آواز تھے تو یہ خدمت ان کے سپرد کی گئی کہ وہ ہر نماز کے سے پہلے مسجد کے صحن میں الصلواۃ الجماعت بلند آواز سے پکارا کریں۔روایت یہ ہے کہ چند دنوں بعد حضرت عبداللہ بن زیدؓ حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ ﷺ آج رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک سبز پوش ہاتھ میں ناقوس لیے میرے پاس آیا میں نے اسے کہا کہ اللہ کے بندے یہ ناقوس فروخت کرے گا؟

اس نے کہا تم اس کا کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں اس سے نماز کا اعلان کروں گا۔اس شخص نے کہا،اگر میں اس سے بھی اچھی ترغیب بتا دو۔ یہ کہا حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے کہ حضرت محمد ﷺ کو اذان کے کلمات سنائیں۔حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔حضرت عمر فاروقؓ اس گھر میں تھے اور اذان سن کر تیزی سے قدم اٹھا کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عرض کی یا رسول اللہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا میں نے بھی خواب میں یہی دیکھا تھا۔

روایت میں آتا ہے کہ جب حجرت عبداللہ بن زیدؓ نے حضرت محمد ﷺ کو اذان کے کلمات سنائے تو آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو بلوا کر اذان کے کلمات یاد کروائے اور پھر اذان دینے کا حکم دیا اور حضرت بلالؓ کے حجرہ

اقدس کے سامنے کھڑے ہو کر اسلام کی پہلی اذان دی۔

ابن سعدؓ نے حضرت قاسم بن عبدالرحمان سے روایت کی کہ حضرت بلالؓ اسلام کے سب سے پہلے موذن ہیں ۔حضرت بلالؓ کی سیرت مبارکہ کھلی اور ایک روشن کتاب کی مانند ہے۔رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت بلالؓ نے صرف ایک بار حضرت عمرؓ کے اصرار پر اذان دی۔ جب نبی اکرم ﷺ کا نام آیا تو غش کھا کے گر پڑے۔سیدنا بلالؓ کے اسم گرامی سے مسلم دنیا ہی نہی بلکہ غیر مسلم بھی آشنا ہیں۔

☆.....☆.....☆

عشق حقیقی

عشق حقیقی ایک کیفیت کا نام ہے۔ رب جسے چاہتا ہے، عشق حقیقی کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ جب انسان اپنی زندگی کے مقصد کو پالیتا ہے اور اپنی زندگی اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر گزارنا شروع کر دیتا ہے، اپنے روز وشب نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کے تابع کر دیتا ہے تو رب تبارک وتعالی اسے اپنی محبت عطا فرما دیتا ہے یعنی وہ عبادت الٰہی کے ذریعے رب تبارک وتعالی کا قرب حاصل کر لیتا۔ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سچی محبت عشق حقیقی کے زمرے میں آتی ہے۔

جب عشق نبی اکرم ﷺ کے یار غار حضرت ابوبکرؓ کو نصیب ہوتا ہے تو وہ صدیق اکبرؓ بن جاتے ہیں اور جب یہ عشق حضرت عمرؓ کو نصیب ہوتا ہے تو وہ فاروق اعظمؓ بن جاتے ہیں۔ یہ عشق جب حضرت عثمانؓ کو نصیب ہوتا ہے تو وہ عثمان غنیؓ بن جاتے ہیں اور جب یہ عشق حضرت علیؓ کو ملتا ہے تو وہ حیدر کرارؓ بن جاتے ہیں۔ اس عشق کا ایک رنگ جب بلال حبشیؓ کو نصیب ہوتا ہے تو وہ موذن رسول ﷺ بن جاتے ہیں۔

جب یہ عشق حضرت حسینؓ کو ملتا ہے تو حسینؓ گھر بار کربلا میں لٹا دیتے ہیں اور جب اس عشق کا ایک رنگ تاجدار گولڑہ شریف پیر مہر علی شاہ کو ملتا ہے تو وہ پیر مہر علی شاہ صاحب بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

اس صورت نوں میں جان آکھاں
جان آکھاں یا جان جہان آکھاں
کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء
گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

اس عشق حقیقی میں جب علامہ اقبال اپنے آپ کو رنگتے ہے تو ان کی زبان پہ یہ الفاظ آجاتے ہیں،

خیرہ نہ کر سکا مجھے دانش جلوہ فرہنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اشفاق احمد اپنی کتاب زاویہ کی جلد سوم میں لکھتے ہیں کہ ''اپنی انا اور نفس کو ایک انسان کے سامنے پامال کرنے کا نام عشق مجازی ہے اور اپنی انا اور نفس کو سب کے سامنے پامال کرنے کا نام عشق حقیقی ہے''۔ عشق حقیقی ایک درخت ہے اور جب کہ عشق مجازی اس کی ایک شاخ ہے۔ انسان عشق حقیقی میں چھوٹے راستے سے ہٹ کر بڑے راستے کا مسافر بن جاتا ہے۔ تب اس کی طلب اور ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ وہ اپنے مقصد حیات سے آگاہ ہو جاتا ہے اور قرب الٰہی کی جستجو کرتا ہے۔

عشق حقیقی دراصل معرفت الٰہی کا نام ہے جب بندہ پوری لگن سے اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کی رضا حاصل کرنے کی جستجو کرتا ہے تو رب تبارک وتعالی اس بندے پر خصوصی نظر فرماتا ہے اور اس کے دل میں اپنی محبت کے دیے روشن کر دیتا ہے۔ رب کریم اپنے بندے سے فرماتا ہے کہ تو میری طرف ایک قدم بڑھائے گا میں دس قدم بڑھاؤں گا۔ عشق حقیقی اس کو نصیب ہوتا ہے جو عشق کا طلب گار ہوتا ہے۔ طلب گاری کے لیے ہمیں غور کرنا پڑتا ہے، اپنے آپ پر اور حقیقت کے رنگوں پر۔

حقیقت کے رنگ اللہ کے ہمارے اوپر بے شمار احسانات ہیں۔ عشق حقیقی کے حصول کے لیے ہمیں شکر کو تھامنا ہوگا۔ اللہ کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں پر ہر لمحہ شکر ادا کرنا ہوگا اس نے ہمیں بچپن دیا، لڑکپن دیا اور بھرپور جوانی دی، عقل دی، علم دیا، شعور دیا۔ اس ذات پاک نے ہمارے لیے رزق کے اسباب پیدا کیے، زمین و آسمان کی بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں۔ لیکن ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ ہم سب کچھ بھول گئے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ پر غور کریں گے اور عشق حقیقی کی طرف جائیں گے تو ہمیں اس کائنات کے اسرار و رمز پر غور کرنے کے مواقع ملیں گیا وریہی عشق حقیقی کے رنگ ہیں۔ جو نہ ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی کبھی رکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنف

ضیاءاللہ گلگتی

ضیاءاللہ کا تعلق گلگت بلتستان ضلع دیامر چلاس ہوڈر سے ہے۔تعلیم ڈپلومہ آف ایسوسیٹ انجینئرنگ الیکٹرونکس سندھ بورڈ آف ٹیکنکل ایجوکشن کراچی۔مختلف ویب سائٹس اوراخباروں میں لکھتے ہیں۔ایک سال سے رائٹرز کلب کے ساتھ منسلک ہیں۔

فہرست تحریر:

1-اخلاقِ حسنہ،سنّتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

2-ناممکن سے ممکن کیسے ہوگیا

3-افغانستان،ایک خودمختار ملک

4-وادی ہوڈر،گلگت بلتستان

☆.....☆.....☆

اخلاق حسنہ، سنت نبوی ﷺ کی روشنی میں

خلق، انسانی عادت کو کہتے ہیں۔ انسان جب اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو والدین کی تربیت، اردگرد کے ماحول اور حالات وواقعات کے ذریعے اس کی مختلف عادات پر مشتمل ایک مزاج بن جاتا ہے۔ اخلاق اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ رزیلہ، دونوں کا ذکر آتا ہے۔ سچ بولنا اچھی عادت ہے، جھوٹ بولنا بُری عادت ہے۔ وعدہ پوری کرنا اچھی عادت ہے، وعدہ توڑنا بُری عادت ہے۔ یہ میں نے مثال کے طور پر عرض کیا ہے کہ عادات اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی۔ اچھی عادات کو بھی اخلاق کہتے ہیں اور بُری عادات کو بھی۔

معاشرتی واجتماعی زندگی کے بنانے اور سنوارنے میں اخلاق کو نمایاں حیثیت حاصل ہے بلکہ معاشرے کی پہلی اینٹ اخلاقِ حسنہ ہی ہیں۔ حسنِ اخلاق کے بغیر انسان نہ صرف یہ کہ انسان نہیں رہتا بلکہ درندگی وبہیمی پر اتر آتا ہے۔ انسانیت کا زیور حسنِ اخلاق ہے۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی میں دنیا اخلاقی اعتبار سے کنگال اور دیوالیا ہو چکی تھی۔ انسانیت وشرافت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ تہذیب واخلاق کے ستون اپنی جگہ کھو چکی تھی۔ تہذیب وتمدن کے گہواروں میں خودسری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا۔ روم وایران باختگی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جا رہے تھے۔ شراب، عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی، جو جاہل معاشرے میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی۔ سودی لین دین، کم زوروں کا استحصال اور صلے میں بے رحمی وسخت گیری عام تھی۔ بے شرمی وبے حیائی، رہ زنی وقزاقی معمولی بات تصور کی جاتی تھی۔ بے جا انتقام اور تعصب کا شمار قومی خصوصیات میں ہوتا تھا۔

ایسے اخلاق سوز اور غیر انسانی ماحول میں اسلام نے جو عمدہ اخلاقی نظام پیش کیا وہ انسانی طباع کے لیے اکسیر ثابت ہوا اور اس کی وجہ سے تہذیب وثقافت سے بے بہرہ قوم عرب، میں ایسے اخلاقی نمونے پیدا ہوئے جن کی مثال انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے اور تمام بنی نوع انسان کی رہ نمائی کرتا ہے۔ اسلام کے زرّیں اصولوں میں اخلاق کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ قرآن پورے کا پورا ہی اخلاق پر مبنی ہے۔ قرآن میں سب سے زیادہ زور حسنِ اخلاق پر دیا گیا ہے۔ حسن خلق ہی معاشرے میں امن، سکون، اطمینان وسلامتی کا ضامن ہے۔ انسانی معاشرے میں ایک دوسرے کا ادب واحترام، مساوات، رواداری، ایک دوسرے کی ہمدردی، حسنِ معاملات، اخلاق ہی سکھاتا ہے۔ اخلاق کی اہمیت وفضلیت ارشاداتِ عالیہ میں بڑے دل نشین اور موثر اسلوب میں اخلاق حسنہ کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

''کامل مومن وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں''۔ (ابوداود، ترمذی) ''مومن اپنے حسن اخلاق سے دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں عبادت کرنے والے کا درجہ پالیتا ہے''۔ (ابوداؤد) اچھے اخلاق رسول ﷺ کا محبوب اور مقرب بننے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ''میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں''۔ (بخاری) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے حسن اخلاق کے حامل شخص کی ان الفاظ میں تعریف وتحسین کی ہے۔ ''تم میں بہترین وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں''۔ (بخاری) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ حضور ﷺ کے نقش

قدم پر چل کر ہی انسان بلند اخلاق کا مالک بن سکتا ہے۔ حضور ﷺ کے اخلاق اس قدر بلند تھے کہ دوست تو دوست، بدترین دشمن بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جانی دشمنوں کو معاف کر دینا، غلاموں اور کنیزوں سے اچھا سلوک کرنا، بیماروں کی عیادت کرنا، کم زوروں اور ضعیفوں کو سہارا دینا اور اپنے پرائے سبھی کے ساتھ شفقت اور نرمی کا برتاؤ کرنے کی بے شمار مثالیں حضور ﷺ کی زندگی میں ملتی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی رسول اللہ ﷺ نے کبوتری کے گھونسلے سے اس کا ایک ننھا منا بچہ لیا۔ کبوتری اس صحابی کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ حضور ﷺ نے دیکھا تو بہت دکھی ہوئے۔ آپ ﷺ نے صحابی کو حکم دیا کہ وہ کبوتری کے بچے کو واپس گھونسلے میں رکھ دے۔ صحابی نے حکم کی تعمیل کی۔ یہ نبی کریم ﷺ کی رحمت اور پرندوں سے محبت کی مثال ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت کی کتابوں میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ حضور ﷺ کے طریقے پر چلیں اور مخلوق خدا کے ساتھ نرمی، محبت اور حسن سلوک کا رویہ اپنائیں۔ اسی میں ہماری دنیا اور آخرت کی بہتری ہے۔ لیکن آج کل ہم مسلمان کم اور فرقہ پرست کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم سنّتِ نبوی ﷺ پر کس حد تک عمل کرتے ہیں یا صرف باتیں ہی کرتے ہیں۔ ہر ایک مسلمان کو اپنے اپنے گریبان میں جھانکنا ہے اور خود فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس حد تک حضور ﷺ کی سنّتوں پر عمل کرتے ہیں؟

ہمیں اگر دنیا میں کہیں اچھے اخلاق کے نظارے نظر آتے ہیں تو اس کے ساتھ ہزار آلودگیاں بھی ہیں۔ اخلاق

ہے لیکن اس کے ساتھ ایذا رسانی بھی ہے۔ اخلاق ہے لیکن اس کے پیچھے کوئی غرض اور مصلحت بھی ہے۔ اخلاق ہے لیکن وہ کسی خاص قوم اور طبقے کے ساتھ محدود ہے، جس میں مذہب وملت، ذات برادری اور رنگ ونسل کی تفریق ہے۔ اخلاق ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ حدود وقیود ہیں۔ اس کی ایک خاص سطح ہے، جس کے آگے اسے بڑھنے کی اجازت نہیں۔ لیکن اخلاق کو جمال وکمال، حُسنِ لطافت اور کرمِ سماعت میں دیکھنا ہے تو یہ پیکر ہمیں ''صاحبِ خلقِ عظیم'' کے سوا اور کہیں نظر نہیں آئے گا۔

اس دنیا میں اخلاق اور کردار کے اعتبار سے انبیائے کرام علیہم السّلام سب سے بہتر لوگ تھے۔ اسی طرح انبیائے کرام علیہم السّلام میں سب سے برتر اور اعلیٰ شخصیت جناب نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ یہ بات مسلم وغیر مسلم سب تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی حُسنِ اخلاق کا کامل نمونہ ہے۔

انسانی تاریخ کا سب سے بہتر طبقہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا ہے۔ یہ تاریخی شہادت ہے کہ ایک معاشرے اور سوسائٹی کے طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا طبقہ سب سے مثالی اور آئیڈیل تھا۔ ایک دوسرے کے حقوق کا ضامن، ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے والا، ایک دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا، ایسا طبقہ جس کی بنیاد اچھے اخلاق وعادات پر تھی۔ اس لیے کہ یہ طبقہ جناب نبی کریم ﷺ کا تربیت یافتہ تھا اور حضور ﷺ نے ایک ایک شخص کی تربیت اس انداز سے کردی تھی کہ وہ انسانی معاشرے کی مشین میں پرزے کے طور پر اپنی اپنی جگہ فٹ ہونے چلے گئے اور یوں دنیا کا ایک بہترین معاشرہ تشکیل پایا۔

سچائی، اخلاق حسنہ میں سب سے پہلی عادت ہے۔ سچ بولنا، اس دنیا کی سب سے بڑی خوبی ہے اور انسانی اخلاق وعادات میں سب سے اچھی عادت سچ بولنا ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا سب سے بُری عادت ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے برائیوں کی ترتیب میں سب سے پہلے 'جھوٹ' کا ذکر فرمایا۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیم سے بتایا کہ اچھائیوں میں سب سے اچھی عادت سچائی ہے جب کہ برائیوں میں سب سے بُری عادت جھوٹ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو پوری نسل انسانی میں 'اصدق الناس' کہا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کے سب سے بڑے دشمن دو تھے، پہلے ابوجہل اور اس کے بعد ابوسفیان۔ رسول اللہ ﷺ کے خلاف مکہ کے معاشرے کو لڑانے والے یہی دو بڑے تھے لیکن آں حضرت ﷺ کے ایک سچا انسان ہونے کے بارے میں دونوں کی گواہی تاریخ کے ریکارڈ پر ہے۔ حضور ﷺ کی ذاتی زندگی تو سچائی ہی سے عبارت تھی۔ صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہوکر پورے معاشرے سے شہادت مانگی کہ ''میں نے تمہارے اندر چالیس سال گزارے ہیں۔ میرے شب وروز تم نے دیکھے ہیں۔ میرا بچپن، جوانی، اٹھنا، بیٹھنا اور میرے معاملات، سب کچھ تم لوگوں نے دیکھا ہے، تم لوگوں کی میرے بارے میں کیا رائے ہے؟ مجھے تم لوگوں نے سچا پایا یا جھوٹا؟'' سب نے بیک وقت ایک آواز میں کہا کہ

''اے محمد ﷺ تمہاری زندگی میں ہم نے کبھی سچائی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں''۔

فتح مکہ کے بعد جو قیدی کافروں کے ساتھ برتاؤ کیا ہے۔ دنیا نے بڑے بڑے فاتح دیکھے ہیں لیکن فتح، قبضے اور اقتدار و حکومت ملنے کے بعد اس طرح کوئی اپنے دشمنوں کو معاف کر دے، اس کی مثال جناب نبی کریم ﷺ کے علاوہ کوئی اور فاتح پیش نہیں کر سکتا۔ مکارم اخلاق اور اچھی عادات میں وعدہ نبھانا ایک اچھی خصلت ہے۔ وعدہ پورا کرنا ایک اچھی عادت ہے جب کہ وعدے کی خلاف ورزی کرنا بری عادت ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے وعدہ پورا کرنے کی تلقین فرمائی اور خود بھی وعدہ پورا کرنے کے مثالیں لوگوں کے سامنے پیش کیں۔

قارئین! جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے اور دنیا کو اخلاق کا بہترین نمونہ دکھانے آیا ہوں۔ چناں چہ حضور ﷺ نے اپنی جماعت کو اخلاق فاضلہ کی تربیت دے کر دنیا کے سامنے بہترین اخلاق وعادات کا حامل معاشرہ پیش کیا۔ یہ جناب نبی کریم ﷺ کا ایک بڑا معجزہ اور اعجاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آپ ﷺ کی سنت اور اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

☆.....☆.....☆

ناممکن سے ممکن کیسے ہو گیا

15 اپریل 2017 کو اچانک والد صاحب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ صبح اُنہیں لے کر گلگت گیا۔ وہاں DHQ ہسپتال میں چیک اپ کروایا تو الٹراساؤنڈ کرنے کے بعد پتا چلا کہ بڑی آنت میں زخم ہیں۔ ہسپتال والوں نے پمز ہسپتال، اسلام آباد ریفر کیا۔ گلگت سے تیاری کر کے چلاس، زیرو پوائنٹ آیا جہاں ہمارے رشتے دار انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ والد صاحب کو رخصت کر کے دن تین بجے براستہ بابوسر، ناران کاغان روڈ سے اسلام آباد روانہ کیا۔

راولپنڈی پہنچ کر اگلی صبح پمز ہسپتال پہنچایا۔ وہاں ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر آپریشن کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارے پاس اینستھیز یا یعنی بے ہوشی کی مشین کا فقدان ہے۔ اس کے بعد 'الشفاء ہسپتال' لے جانے کا مشورہ ہوا۔ لیکن بعد میں اسے منسوخ کر کے راول پنڈی ہولی فیملی ہسپتال لے گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے دوبارہ سارے ٹیسٹ کروانے کے بعد آپریشن کرنے کی تیاری کی۔ تاہم، آپریشن کو خطرناک قرار دیا۔ چوں کہ ہمارے پاس آپریشن کروانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا تو سب نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے آپریشن کرانے کے مشورہ دیا۔ لہٰذا، ہم نے بھی اجازت دے دی۔

جب والد صاحب کو آپریشن تھیٹر میں داخل کیا گیا تو میرے ذہن میں ہزاروں قسم کے وسوسے آنے شروع ہو گئے اور کافی مایوسی بھی چھائی ہوئی تھی۔ ٹھیک تین گھنٹے کے بعد والد صاحب کو آپریشن تھیٹر سے باہر نکال کر آئی سی یو میں داخل کر دیا گیا۔ اب ہم والد صاحب قریب بیٹھ کر دیکھتے رہے کہ کب ہوش میں آئیں گے۔ ایسے موقعے ویسے بھی بڑے حساس اور افسوس کے ہوتے ہیں۔ ٹھیک 72 گھنٹوں کے بعد انہیں ہوش آ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ بہتری آنا شروع ہو گئی۔ ہماری مایوسی، پریشانی اور وسوسے، خوشی اور یقین میں بدل گئے۔ ایک مہینے کے بعد انہیں ڈسچارج کر دیا گیا۔

آپریشن کے بعد بائیں جانب (کولسٹومی بیگ) لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا، چھے مہینے کے بعد دوبارہ لے کے آنا، کولسٹومی کو ریورس کریں گے۔لیکن یہ آپریشن اتنا خطرناک نہیں ہے۔ہم والد صاحب کو گھر لے آئے۔ان میں آہستہ آہستہ مزید بہتری آ رہی تھی۔ چھے مہینے بعد راول پنڈی ہولی فیملی ہسپتال لے کر گئے تو وہاں چیک اپ کرنے کے بعد انہوں نے آخر میں یہ کہہ دیا، چوں کہ ان کی عمر زیادہ ہے، دل کی دھڑکن بھی صحیح نہیں ہے تو جب تک دل کی دھڑکن ٹھیک نہیں ہو جاتی، تب تک آپریشن ناممکن ہے۔

ہم مایوس ہو کر انہیں دوبارہ گھر لے آئے۔ گھر پہنچ کر دوائیں جاری رکھیں۔اب بدقسمتی سے ان پر فالج کا اثر ہوا، ساتھ شوگر کا بھی حملہ ہوا۔اب آپریشن اور مشکل ہو گیا۔ جب طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو تین ماہ بعد پھر دوسری بار راول پنڈی ہسپتال لے گئے۔

اس بار پہلے سے زیادہ ٹیسٹ کروائے گئے، جن میں شوگر، بلڈ، ایم آر آئی، ای سی جی، ایکسرے، دل کی دھڑکن وغیرہ کے ٹیسٹ شامل تھے اور آخری رپورٹ دیکھنے کے بعد سرجن نے نفی میں سر ہلا دیا۔اس کے بعد ہمیں قوی یقین ہو گیا کہ اب شاید یہ آپریشن ابو کی زندگی میں کبھی نہیں ہو گا۔ مایوس ہو کر ایک ہفتے پنڈی میں رک کر گلگت کے لیے رخت سفر باندھا، گلگت پہنچے تو دو دن بعد پھر والد صاحب کو بخار ہو گیا۔ چیک اپ کرانے کے لیے آغا خان ہیلتھ سروس لے گیا، وہاں میڈیکل اسپیشلسٹ عائشہ سلیم نے چیک اپ کیا اور بڑے اطمینان سے داخل کر لیا۔

پانچ دن کے بعد ڈسچارج کیا تو جاتے وقت ڈاکٹر نے بتایا کہ میں سرجن تو نہیں ہوں لیکن آپ کو ان شاءاللہ آگاہ کر دوں گی کہ آپریشن کب کیا جائے گا۔ہمیں وہ بات مذاق لگی کہ جو کام اسلام آباد میں نہیں ہوتے، وہ یہاں کیسے ہوں گے؟ خیر....ہم گھر آ گئے اور وقتاً فوقتاً چیک اپ کرواتے رہے۔ 15 اکتوبر کو ڈاکٹر عائشہ نے کچھ سرجنز سے مل کر ایک میٹنگ کی، جس میں ڈاکٹر شاہ رحمٰن، ڈاکٹر نور خان، ڈاکٹر عائشہ سلیم اور ڈاکٹر تنویر شامل تھے۔ میٹنگ کے بعد 6 اکتوبر کو بتایا گیا کہ آپ پریشان مت ہوں، ڈاکٹر نور خان سرجری کریں گے۔ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر نور خان کے آفس میں گئے۔ ڈاکٹر نور نے ساری رپورٹ دیکھنے کے بعد کہا کہ 17 اکتوبر کو داخل کروا دیں، ان شاءاللہ 18 اکتوبر کو آپریشن ہو جائے گا۔

ہم 18 اکتوبر کو انہیں آغا خان ہیلتھ سروس لے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی سرجن نے داخل کر لیا۔ہم رات کو والد صاحب کے ساتھ ہی رکے۔ صبح دس بجے انہیں آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ ہم آپریشن تھیٹر کے دروازے کو دیکھتے رہے۔ٹھیک دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر باہر آئے اور عملے کے لوگ ابو کو آئی سی یو کے طرف لے جانے لگے تو ڈاکٹر کے منع کرنے پر سرجیکل وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔قریباً ڈھائی گھنٹے کے بعد والد صاحب کو ہوش آ گیا۔ یوں آغا خان ہیلتھ سروس کی میڈیکل ٹیم نے نمایاں کامیابی اپنے نام کر لی۔

پاکستان میں 164 ہیلتھ سینٹرز، سات ہسپتال، دو میڈیکل سینٹرز، فزیوتھراپی یونٹ، عوام کی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے اصولوں کو بروئے کار لا کر کراچی سے گلگت بلتستان کے فلک پوش پہاڑوں کے دامن میں، آغا خان ہیلتھ سروس اپنی قابل ترین میڈیکل ٹیم کے ساتھ صحت کو مشن بنا کر اپنے سفر پر جاری ہے۔

☆.....☆.....☆

افغانستان، ایک خودمختار ملک

افغانستان وسط ایشیا برصغیر اور چین کے سنگم پر واقع ہے۔ صدیوں سے یہ سرزمین امت مسلمہ کو ایسے صاحب ایمان، بلند ہمت، نڈر اور الوالعزم رجال کا کار مہیا کرتی آ رہی ہے، جنہیں بجا طور پر مذکورہ عربی شعر کے مصداق کہا جا سکتا ہے۔ ''یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب دشمن سے ٹکراتے ہیں تو حریف کا اسلحہ ان کی نگاہوں میں گھوڑوں کا گرد و غبار معلوم ہوتا ہے''۔

افغانستان کے باشندوں کی حمیّت ایمانی اور دینی جوش و جذبے کا تذکرہ کرتے ہوئے عالم عرب کے نام ور مورخ ''امیر شکیب ارسلان'' بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں: ''میرے رب کی قسم! اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے، کہیں بھی اس میں رمق باقی نہ رہے تب بھی کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا اور ان کا عزم جوان رہے گا''۔

افغانستان کو ایشیا کا دل، وسط ایشیا کا دروازہ اور فاتحین کی شاہ راہ بھی کہا جاتا ہے۔ ہزاروں سال سے یہاں قبائلی سیاست راج چلا آ رہا ہے۔ اسلام سے قبل یہاں قبائلی سرداری ہر قید و بند سے آزاد تھی۔ اشاعت اسلام کے بعد اس پر اسلامی تہذیب و تمدن کی ایسی گہری چھاپ لگی، جسے آج تک دھندلایا نہیں جا سکا۔ اس کے مشرق میں کوہِ سیاہ اور کوہِ سلیمان، افغان سرحد کو پاکستان سے جدا کرتے ہیں۔ انہی پہاڑوں میں درّہِ خیبر، درّہِ گومل، درّہِ ٹوچی اور درّہِ بولان واقع ہیں، جنہیں عبور کر کے بڑے بڑے فاتحین برصغیر پہنچتے رہے ہیں۔ کابل کے شمال میں واقع کوہِ ہندوکش ملک کا سب سے بلند پہاڑی سلسلہ ہے، جو شمال مشرق میں پامیر سے شروع ہو کر جنوب مغرب کی طرف پھلتا چلا گیا ہے۔ اس کوہستانی سلسلے کی بلندی بعض مقامات پر بیس ہزار فٹ جا پہنچتی ہے۔

پامیر کے کہسار اسے چین سے جدا کرتے ہیں۔ وسطی افغانستان کی سرزمین سطح سمندر سے 6 ہزار فٹ بلند ہے۔ ملک میں دریا بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ بڑے نہیں۔ دریائے کابل، کابل شہر کے درمیان سے گزرتا ہے اور

جلال آباد کے نزدیک دریائے کنٹر سے مل کر پاکستان کی حدود میں اٹک کے نزدیک دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ دریائے ہلمند اور دریائے ہری رود ہرات کے گردونواح کو سیراب کرتے ہیں اور سیستان کے صحرا میں ختم ہو جاتے ہیں۔ دریائے آمو ملک کی شمالی سرحد ہے، جو روس اور افغانستان کو الگ کرتا ہے۔ یہ پامیر کی برف پوش چوٹیوں سے نکل کر وسط ایشیا کے بحیرۂ ارل میں جا گرتا ہے۔

یہ ملک معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ ہیرے، موتی، کوئلہ، گیس، تانبا، گندھک، ابرق، جست، سرمہ، لوہا، سنگ مرمر اور نمک جیسی قیمتی معدنیات کے بے شمار ذخائر اس کی خاک میں پوشیدہ ہیں۔ سرد آب و ہوا کے اس ملک کے مشرقی اور وسطی صوبوں میں موسم سرما برف کی چادر اوڑھ کر آتا ہے۔ کابل، غزنی، فراہ سمیت تمام جنوبی مغربی اضلاع اور دریائے آمو سے متصلہ علاقوں مزار شریف، جلال آباد اور خوست کی گرمی بھی مشہور ہے۔

افغانستان کا کل رقبہ 647500 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ جس میں 2 کروڑ 60 لاکھ سے زائد افراد بستے ہیں۔ اکثریت حنفی مسلک کی ہے۔ نسلی اور لسانی لحاظ سے یہ لوگ مختلف قبائل ہیں۔ افغانستان میں ایران کی سرحدوں کے ساتھ بلوچ قبائل بھی بستے ہیں۔ جلال آباد کے شمال میں واقع صوبے نورستان کے لوگ زبان اور نسل کے لحاظ سے الگ قوم ہیں۔ یہ ڈیڑھ صدی پہلے تک غیر مسلم تھے اور ان کا علاقہ کافرستان کہلاتا تھا مگر امیر عبدالرحمٰن کے زمانے میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا جس کے بعد علاقے کا نام نورستان رکھ دیا گیا۔

2004 کی ایک رپورٹ کے مطابق افغانستان میں پختون 42 فی صد، تاجک 27 فی صد، ازبک 10 فی صد، ہزارہ جات 9 فی صد، ترکمان 3 فی صد اور بلوچ 2 فی صد بستے ہیں۔ باقی چند فی صد نورستانی، بروہی اور پامیری ہیں۔ ملک میں غیر مسلم آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم، کابل اور دوسرے بڑے شہروں میں کچھ ہندو اور سکھ خاندان مدت سے آباد ہیں۔ ہندو کمیونٹی زیادہ تر تجارت پیشہ ہے۔

افغانوں کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ شام کو اگر کوئی مسافر گھر میں آ جائے تو عام طور پر اس کی خوب خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کا کوئی دشمن بھی ان کی پناہ لینے کے لیے گھر آ جائے تو وہ پرانے خونی خاندانی جھگڑے بھول جاتے ہیں۔ افغانوں کی یہ خصلت ان کے اس قانون برداری کا نتیجہ ہے جس کو وہ ''پختون والی'' کہتے ہیں جسے ہر چھوٹا بڑا افغان مانتا ہے۔ افغانستان ہر لحاظ سے ایک مضبوط اور جفاکش ملک ہے۔ یہاں کے لوگ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے بہت معروف ہیں مگر یہاں کی خارجہ پالیسی نہ جانے کیوں آج تک ناکام ہے۔

طالبان اور امریکا کے درمیان جنگ ختم ہونے کے تاحال کچھ آثار نہیں، جس کی بنیادی کمزوری خارجہ پالیسی ہے۔ پاکستان کو ایک برادر ملک ہونے کے ناتے اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ اب افغان مسئلے کا حل نکالنا بہت ضروری ہے۔ شاید پاکستان کا امن و امان بھی افغانستان کے امن و امان سے مشروط ہے۔

☆.....☆.....☆

وادی ہوڈر، گلگت بلتستان

وادیٔ ہوڈر ''چیکون'' اپنی خوب صورتی میں پھیلی ہوئی حقیقت میں جنتِ ارضی کا منظر پیش کرتی ہے، جہاں، جس طرف نظر اٹھائیں، وہیں کا منظر قدم روک لیتا ہے۔ ہر طرف رنگ برنگ پھولوں اور پھلوں کی بہار ہے۔ چاروں طرف برف پوش چوٹیاں کوہ پیماؤں کا خواب ہیں۔ صاف شفاف پانی کے چشمے اور آبشار جل ترنگ بجاتے ہیں۔ یہاں کے مکین صلح جو، مہمان نواز اور محبت کرنے والے ہیں۔

راولپنڈی سے 550 کلومیٹر کے فاصلے پر شاہ راہ قراقرام کے کنارے وادیٔ ہوڈر، چیکون، نہایت لطیف مقناطیسی کشش والا مقام ہے۔ چلاس سے قریباً 60 کلومیٹر کے فاصلے پر آپ مولیے داس اور شئی پہنچتے ہیں تو سرخ گولڈن سیبوں کے حَسین باغات، اخروٹ، آلوچے، انگور، ہوڈر کی مشہور رس بھری خوبانیاں اور معدنیات سے بھرپور صحت افزا پانی آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ سادہ طرز زندگی، بغض وحسد سے دُور کثافت اور آلودگی سے پاک آب وہوا۔

جب آپ بلندی کی طرف گام زن ہوتے ہیں تو منظر بھی تبدیل ہو جاتا ہے اور کیا دل فریب منظر ہوتا ہے، اردگرد پھولوں کے باغات اور سبزہ زاروں کا حسین امتزاج دل میں بس جاتے ہیں۔ 'داس' سے قریباً 6 کلومیٹر کے فاصلے پر 'موڑیلی' پہنچتے ہیں۔ یہاں کے جنگلات بہت خوب صورت ہیں۔ یہاں سے قریباً 8 کلومیٹر کے فاصلے پر 'چیکون' پہنچ جاتے ہیں۔ چیکون کے صاف شفاف، خوب صورت مناظر میں کچھ لمحات گزرنا سرمایۂ حیات ہیں۔ تاہم، بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مقامی نمائندوں اور ٹورازم کی عدم توجہ سے بہت کم تعداد میں سیّاح یہاں کا رخ کرتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

تعارف مصنفہ

عائشہ عارف

عائشہ عارف کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے۔ بی ایس عربی اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے کر رہی ہیں۔ ایک سال سے رائٹرز کلب سے بطور ممبر وابستہ ہیں۔ رائٹرز کلب کے پلیٹ فورم سے ملک کے صف اول کے اخبارات میں اپنے آرٹیکل اور مضامین شائع بھی کروا چکی ہیں اور ابھی بھی سلسلہ جاری ہے۔ عزم ہے ملک وملت اور دین اسلام کے لیے لکھنا اور لکھتے رہنا۔

فہرست تحریر:

1- رزق حلال

2- ہمارے ہیرو، ہمارے رہنما

3- ہم کیوں لکھیں؟

4- مکمل ضابطہ حیات

☆.....☆.....☆

رزقِ حلال

کہا ناں....اماں! میں بھیک نہیں مانگوں گی۔آپ کی ساری زندگی بھیک مانگنے میں گزر گئی۔دو وقت کی روٹی ہی کھانی ہے ناں،تو بہتر ہے عزت اور محنت سے کھائیں۔میں بار بار کہہ رہی ہوں، میں بھیک نہیں مانگوں گی....نہیں مانگوں گی۔

اری اوجھلی! تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔اب تجھ کل کی لڑکی کو کیا پتا کہ آج کل عزت وزت کچھ نہیں۔پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑتا ہے اور توں کیا سمجھتی ہے،ہم محنت نہیں کرتے؟ ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلانا، کہیں سے دھتکارے جانا تو کہیں سے چند سکے مل جانا۔سارا دن مارے مارے پھرنا، پھر کہیں جا کے یہ چند روپے ہاتھ آتے ہیں جس میں گزر بسر مشکل سے ہوتا ہے۔

پر اماں....! جتنا رزق اللہ نے لکھ دیا، اتنا تو ملنا ہی ملنا ہے۔اب یہ تو انسان پر ہے کہ لکھے ہوئے رزق کو جائز طریقے سے حاصل کرے یا ناجائز طریقے سے۔محنت کر کے خود کمائے یا خالق ورازق سے مانگنے کے بجائے بقول آپ کے،لوگوں سے مانگنے میں 'محنت' کرے۔یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ چھوٹی سی لڑکی عجب انداز میں مسکرائی تھی۔

اری کم بخت! پھر تو بتا،تو کرے گی کیا؟ میں بیمار نہ ہوتی تو کبھی تجھے نہ کہتی، پر تو ہے کہ مانتی ہی نہیں۔اچھا چل! بتا کیا کرے گی، بھیک نہیں مانگے گی تو کیسے پیٹ بھرے گی اپنا اور ان چھوٹوں کا؟

اماں! میں 'حبیب اللہ' بنوں گی۔وہ فخر سے مسکراتے ہوئے بولی۔ہیں....حبیب اللہ؟ یہ کیا ہوتا ہے جھلّی لڑکی؟ اماں نے حیرت سے اسے تکتے ہوئے کہا۔اماں! ابا بھی تو 'حبیب اللہ' تھے اور ابا نے مجھے وصیت کی تھی کہ 'الکاسب حبیب اللہ' کہ بیٹا جو بندہ رزق حلال کما کر کھاتا ہے وہ اللہ کا دوست ہوتا ہے۔اب میں بھی 'حبیب اللہ' ہی بنوں گی۔ ان شاء اللہ۔اس چھوٹی سی لڑکی کا جوش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔تیرا باپ تو سڑکوں پہ بیٹھا جوتے پالش کیا کرتا تھا اور توں

ایسے فخر سے کہہ رہی ہے جیسے وہ کوئی بڑا افسر تھا۔ارے میری بھولی اماں! ہوسکتا ہے میرے باپ کا درجہ ان دنیاوی افسروں سے بھی اوپر کا ہو۔اس نے فلسفہ جھاڑا۔

اماں نے تمسخرانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔جوتے پالش کرنے والے کا درجہ افسروں سے بھی اوپر کا، پاگل۔

ہاں اماں! کیوں کہ میرا باپ کینسر کا مریض ہونے کے باوجود، جب تک اس کے جسم نے ساتھ دیا، سڑکوں پر بیٹھ کر جوتے پالش کرتا رہا۔محنت کرتا رہا اور ہمیں خون پسینے سے کمایا ہوا رزق حلال کھلایا۔اس نے وہ محنت کی جو انبیاء کرام کا شیوہ تھی۔ہمارے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے ساتھ کہیں جاتے تو فارغ نہیں بیٹھتے تھے۔ساتھ مل کر کام کرتے، کبھی پیٹ پر پتھر باندھ کر خندقیں کھودتے تو کبھی کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں چُن کر لاتے اور اماں! ابا بتاتے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السّلام اپنی روزی خود اپنے ہاتھوں سے کماتے تھے اور پتا ہے اماں! حضرت موسی علیہ السّلام کی مزدوری تو اللہ کو اتنی پسند تھی کہ اللہ نے ان کی مزدوری کا ذکر قرآن میں کر کے عزت بخشی اور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا، ''حضرت موسی علیہ السّلام نے آٹھ یا دس برس اس طرح مزدوری کی کہ اس دوران وہ خود بھی پاک دامن رہے اور اپنی مزدوری کو بھی پاک رکھا''۔

اماں! پتا ہے الکاسب حبیب اللہ کا مطلب ہے، محنت کش اللہ کا دوست ہوتا ہے۔تو جس کا اللہ دوست بن جائے اسے اور کیا چاہیے؟ وہ اپنے بندوں کو دنیا میں رسوائی سے بچاتا ہے اور آخرت میں بڑے بڑے انعامات سے نوازتا ہے۔تو اماں! مجھے بس ابا کا جوتے پالش کرنے والا سامان دے دو۔میں کل سے ابا کی جگہ پر جا کر جوتے پالش کا کام کروں گی۔اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ اپنے آنسو چھپا کر ایک بار پھر سخت لہجے میں بولی۔تم سڑکوں پہ بیٹھی رہنا، اپنے باپ کی طرح لیکن پھر بھی رات کو اتنا نہ لاسکو گی کہ ہم پیٹ بھر کھا سکیں۔

اماں! کہا ناں....اللہ نے جتنا میری قسمت میں لکھا ہے، وہ مجھے مل جانا ہے۔میرا سکول چھڑوایا گیا، میں تب بھی کچھ نہیں بولی تھی کیوں کہ میں جانتی تھی، حالات ایسے نہیں کہ دو وقت کی روٹی آسانی سے میسّر آئے۔ایسے میں اسکول کے اخراجات کیسے پورے ہوسکتے تھے۔مگر اب تو مجھے کوشش کرنے دو اور راضی خوشی اللہ سے دعا کرتے ہوئے بھیجو۔

ٹھیک ہے، جو مرضی کرو مگر جاتے ہوئے اپنے بہن بھائیوں کے چہرے ضرور دیکھتی جاؤ جو بھوک سے مرجھائے ہوئے ہیں۔جی اماں! آپ پریشان نہ ہوں۔مجھے اللہ پر کامل یقین ہے، وہ میری محنت کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔اس نے اماں سے بال بنوائے، لال اوڑھنی اوڑھی اور چل پڑی۔اس کے جاتے ہی ماں کا ضبط جواب دے گیا اور کتنی دیر کے روکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔وہ فوراً جائے نماز بچھا کے بیٹھ گئی اور رو رو کر دعا کرنے لگی، یارب! میری بیٹی میری

طرح ہمت وحوصلہ نہ ہار دے۔ اللہ! توں تو جانتا ہے، میں نے کس دل سے اسے بھیک مانگنے کو کہا۔ کس ماں کا دل کرتا ہے کہ اس کی اولاد سڑکوں پر لوگوں کی پھٹکار سنے۔ یا اللہ! یہی عزت اور محنت کی روٹی تو میں نے بھی کمانی چاہی تھی پر توں جانتا ہے، کچھ بھی حاصل نہ ہوتا تھا۔

اسے وہ دن یاد آیا جب وہ سارے دن کی تھکی ہاری، اپنا سامان اُٹھائے گھر واپس آ رہی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد چند دن تو لوگوں نے مدد کی لیکن آخر کب تک؟ آہستہ آہستہ سب رشتے دراوں نے منہ موڑ لیا۔ محلے دار بھی، جو شروع میں روٹی دے جایا کرتے، اب کوئی ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔ فاقوں کی نوبت آئی تو وہ شوہر کا سامان لے کر سڑک پر جا بیٹھی مگر مسلسل تین دن سڑک پر گزار کے، وہ ایک رات بھی بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا نہ کھلا سکی تھی۔ کچھ سرمایہ ہوتا تو کوئی اور کام شروع کر لیتی مگر جب اس نے دیکھا کہ سڑک پر مانگنے والوں کے ہاتھ تو نوٹوں اور سِکّوں سے بھرے ہوتے ہیں، بس وہی خالی ہاتھ رہ جاتی ہے تو پانچویں ہی دن وہ بھی سڑک پر ہاتھ پھیلائے لوگوں سے مانگ رہی تھی۔

ایسا کرتے ہوئے اس کی عزت نفس مجروح ہوئی کہ شوہر نے کم ہی سہی مگر ہمیشہ عزت کی روٹی کھلائی تھی۔ لوگوں کی دھتکار پھٹکار سننے کی وہ اب تک عادی نہ ہو سکی تھی۔ ہر روز جیتی، ہر روز مرتی اور اب وہ بیٹی کے لیے ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ بھی مایوس ہو کر بھیک مانگنے نہ لگ جائے۔ اسے بیٹی کی باتوں نے حوصلہ دیا تھا، ہمت دی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ بھی ٹھیک ہوتے ہی کہیں محنت اور عزت کی روزی تلاش کرے گی۔ وراب.... وہ دعا کر رہی تھی۔ یا اللہ! میری بیٹی کو مایوس نہ لوٹانا۔ اسے تجھ پر جو یقین ہے، اسے اور پختہ اور کامل کر دینا۔

☆.....☆.....☆

ہمارے ہیرو، ہمارے رہنما

(بچوں کی کہانی)

احمد، دادا جی کے کمرے میں رسالہ پڑھنے میں مصروف تھا کہ عبدالمعز بھاگتا ہوا آیا۔ ''چلو نا احمد! آج سینما دیکھنے چلتے ہیں۔ کیا آپ ہر وقت یہ رسالے پڑھتے رہتے ہیں، کیا ملتا ہے آپ کو ان سے؟ سینما میں نئی مووی لگی ہے۔ بہت مزہ آئے گا''۔ عبدالمعز نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

''نہیں بھائی! میں نہیں جا سکتا، مجھے وقت ضائع نہیں کرنا بلکہ اسے کارآمد بنانا ہے اور پتا ہے، کل ہی میں نے پڑھا ہے کہ کامیاب لوگ وقت ضائع نہیں کرتے''۔ احمد کسی بڑے دانش مند کا قول اسی کے انداز میں دُہرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''رہا سوال یہ کہ ان سے مجھے کیا ملتا ہے؟ تو بھائی! آپ خود پڑھ کر دیکھیں۔ یہ رسائل کتنے ہی لوگوں کی محنت اور علم کا ذخیرہ ہوتے ہیں اور ہر لکھاری اپنے انداز میں الگ بات سکھاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں، آپ بھی پڑھا کریں۔ یہ ہماری اصلاح کے لیے ہوتے ہیں۔ ان رسالوں میں ہمارے لیے چن کر، الگ کر کے بہت خاص باتیں دلچسپ انداز میں لکھی جاتی ہیں''۔ محمد احمد محبت سے وہ دینی و اخلاقی رسائل ہاتھ میں لیے اسے پڑھنے کی دعوت دے رہا تھا۔

عبدالمعز بولا، ''پر آج تو میں سینما جاؤں گا، کارٹون مووی دیکھنے۔ میں نے پاپا سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھے اس اتوار کو لے کر جائیں گے''۔ ''احمد نے کہا، اچھا! تو مجھے بھی بتایئے، کیسی مووی ہے؟''

''سپر مین کی ہے اور آپ کو پتا ہے، وہ کتنا مشہور ہیرو ہے۔ جو بھی مشکل میں ہو، اسے فوراً بچانے پہنچ جاتا ہے اور ڈشوں.... ڈشوں.... ایسے مارتا ہے''۔ عبدالمعز نے باقاعدہ ہاتھ پاؤں چلا کر سپر مین کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''میں تو ان کا فین ہوں۔ کاش! وہ کبھی مجھے ملیں اور میں ان سے آٹو گراف لے سکوں''۔

''آہا! اچھا تو آپ ایک جھوٹے ہیرو کو، جس کا حقیقت کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، دیکھنے میں اتنا سارا وقت ضائع کریں گے؟ آپ کو پتا ہے، میرا بھی ایک رہنما یعنی ہیرو ہے اور میرا رہنما سب سے سچا اور امانت دار ہے۔ آپ

کے ہیرو کو تو بس بچے ہی پسند کرتے ہوں گے لیکن میرے رہنما کو امی ابو، دادا دادی، سب پسند کرتے ہیں اور ان کی پیروی کرنا چاہتے ہیں بلکہ سب اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کے جیسے عمل کرنے کی توفیق دے''۔آپ آج میرے ساتھ، میرے رہنما کے بارے میں کچھ پڑھیں۔میرے رہنما اتنے اچھے، اتنے پیارے ہیں کہ آپ کو بھی ان کے بارے میں جان کر خوشی ہوگی''۔محمد احمد معصومیت سے بول رہا تھا۔''اور پتا ہے، میرے رہنما کو بچے اس قدر پسند تھے کہ وہ جب بھی کسی سفر سے واپس آتے تو لوگ ان کا استقبال کرتے وقت سب سے پہلے بچوں کو ان سے ملواتے تھے۔وہ بچوں کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے۔میرے رہنما، ہماری زندگی کے ہر پہلو پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔آپ کو پتا ہے، میں رات ہوتے ہوتے تھک جاتا تھا اور بہت جلدی سو جاتا تھا۔میرا اسکول کا کام بھی مکمل نہیں ہو پاتا تھا۔ایک دن میں نے ٹیچر کو بتایا کہ میں جلدی تھک جاتا ہوں۔تو ٹیچر نے مجھے میرے رہنما کی ایک سنّت کے بارے میں بتایا کہ وہ رات کو وضو کر کے سوتے تھے۔جب سے میں بھی اپنے رہنما کی بات پر عمل کرتے ہوئے سونے سے قبل وضو کرنے لگا اور جب میں نے ایسا کیا تو واقعی میری تھکاوٹ اور نیند دُور ہوگئی۔تو اب میں روز ایسا کرتا ہوں۔رات کو وضو کر کے سونے سے، صبح فجر کے لیے خود ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔بابا جانی سے بھی شاباش ملتی ہے۔انہیں مجھے جگانے کے لیے اب پہلے کی طرح محنت بھی نہیں کرنی پڑتی''۔

''اچھا....تو اسی لیے اب بابا جانی آپ کی زیادہ تعریف کرتے ہیں اور آپ کی اوّل پوزیشن بھی آئی ہے۔مجھے بھی تو اپنے ہیرو کا نام بتائیں''۔عبدالمعز نے اب بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔''میرے ہیرو ہیں، ہمارے پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم، جن کا ذکر ہم اکثر اپنے اسکول کی کتابوں میں پڑھتے ہیں اور آپ کو پتا ہے، جب وہ نبی کے مقام پر مبعوث نہیں ہوئے تھے تو ایک بار ان کا دل کیا کہ وہ بھی موسیقی کی کسی محفل میں جائیں۔تو ایک دن وہ موسیقی کی محفل میں چلے گئے لیکن وہاں ابھی محفل شروع نہیں ہوئی تھی۔اللہ جی کو موسیقی اور ناچ گانے والی محفل اتنی ناپسند ہے کہ اللہ تعالی کی قدرت سے نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے کان بند ہوگئے اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم وہاں سو گئے۔پھر جب دھوپ کی تپا دینی والی شعاعوں سے جب آنکھ کھلی تو محفل ختم ہو چکی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم جیسے اس محفل میں گئے تھے ویسے ہی آ گئے۔ایک بار پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا دل ایسی محفل میں جانے کو چاہا۔لیکن جب وہ گئے تو پھر ایسا ہی ہوا اور وہ کوئی بھی ایسی بات نہ سن سکے جو اللہ کی ناپسندیدہ تھی۔تب نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم سمجھ گئے کہ یہ محفل غلط جگہ ہے اور اللہ تعالی انہیں ان غلط جگہوں سے بچانا چاہتے ہیں۔چناں چہ نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے دوبارہ ایسی کسی بھی محفل میں جانے کی کوشش نہیں کی۔بلکہ نبی ہونے کے بعد انہوں نے ایک جگہ بانسری کی آواز سنی تو فوراً دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے وہاں سے دُور چلے گئے۔تم سمجھے عبدالمعز! اللہ نے ہمیں اس بات سے کیا سمجھایا؟ جو کوئی چاہتا ہے کہ اللہ اس سے محبت کرے اور اسے اچھے عمل کرنے کی توفیق دے تو

اسے چاہیے کہ وہ بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی طرح اللہ کے ناپسندیدہ کام نہ کرے اور میں تو بڑا ہو کر عالم دین بنوں گا اور لوگوں کو اسلام کی باتیں بتاؤں گا تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اللہ تعالیٰ کا حکم مانیں اور آگ کے عذاب سے بچ جائیں اور مجھے جنت میں میرے ہیرو، میرے رہنما کے ساتھ جگہ دے۔ اللہ کی جنت تو اتنی بڑی ہے کہ اگر ہم سب لوگ، دنیا کے سب سے بڑے ہیرو کی پیروی کریں تو کتنا مزہ آئے گا۔ ہم سب اللہ کی اتنی بڑی جنت میں ہوں گے''۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے احمد! کہ آپ تو اتنے بڑے ہیرو کی باتیں کرو ان کے بارے میں پڑھو اور میں نقلی ہیروز کی باتیں کروں۔ میں بھی سب سے بڑے اور سب سے سچے ہیرو کو اپنا رہنما بناؤں گا اور ان کی باتوں پر عمل کروں گا۔ مجھے بھی تو جنت چاہیے، جس میں اتنے بڑے بڑے باغ ہوں گے، کیلا تو مجھے بہت پسند ہے اور جنت کے کیلے تو کتنے مزے دار ہوں گے۔ میں نے ایک بار سورت واقعہ میں جنت کے کیلوں کے بارے میں پڑھا تھا''۔ عبدالمعز نے فوراً سپرمین کی مووی دیکھنے کا منصوبہ رد کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔ جب ہم مل کر اللہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی باتیں کریں گے تو فرشتے اپنے پروں سے ہمیں ڈھانپ لیں گے اور جب اللہ ہم سے خوش ہوگا تو ہم دونوں مل کر سب مسلمانوں کے لیے اللہ سے جنت مانگیں گے۔ تو لیجیے، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر کچھ کتب و رسائل، میری طرف سے تحفہ''۔ محمد احمد نے پُرخلوص مسکراہٹ کے ساتھ کتب و رسائل عبدالمعز کی طرف بڑھایا اور بولا، ''اپنے علم میں مزید اضافہ کریں کہ مجھے ان رسائل سے اور کیا کیا اچھی باتیں ملتی ہیں''۔

''جزاک اللہ! میرے پیارے بھائی، جب میں یہ پڑھ لوں گا تو کسی اور کو تحفے میں دے دوں گا تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بارے میں جانیں اور ان ہی کو اپنی عملی زندگی میں اپنا ہیرو اور رہنما بنائیں''۔

☆.....☆.....☆

ہم کیوں لکھیں؟

لفظ، ایک چھوٹا سا لفظ.... بظاہر کچھ نہیں مگر غور کیا جائے، سمجھا جائے تو لفظ کے بغیر کائنات میں کیا ہے؟ خود اللہ تعالیٰ نے پہلا لفظ ''کُن'' کہا تو یہ کائنات وجود میں آئی۔ اللہ کی ذات بابرکات سے ہم روشناس ہوئے تو ان ہی الفاظ کے ذریعے۔ حضرت ابراہیم کا تمام بتوں کو توڑ کر واحد، ایک اللہ کو ماننے کا واقعہ ہم تک پہنچا تو کیسے؟ جی بالکل! قرآن کے ذریعے، اللہ کی طرف سے بھیجی گئی وحی کے ذریعے اور وحی کے الفاظ صدیوں بعد ہم تک کیسے پہنچے؟ جی بالکل! جب وہ لکھے گئے، تحریری شکل میں آئے تب ہم اللہ کے کلام سے روشناس ہو سکے۔ تب ہمیں جہنم اور جنت کا، جزا اور سزا کا پتا چلا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ بول لینا یا سن لینا کافی نہیں، لکھنا ان دونوں سے زیادہ ضروری ہے۔ بولی ہوئی بات دوبارہ اسی طرح نہیں بولی جا سکتی جیسے پہلی بار بولی گئی تھی۔ سنی ہوئی بات جلدی بھول جاتی ہے۔ مگر لکھا ہوا دوبارہ ویسے ہی پڑھا جا سکتا ہے جیسا کہ پہلی بار پڑھا گیا۔ لکھا ہوا یاد بھی رکھا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ یادداشت کے طور پر ہمارے پاس رہتا ہے۔

لکھنا کسے ہے؟ لکھنا تو ہم سب کو ہے۔ لکھنا آپ کو بھی ہے، اگر آپ دین کے طالب علم ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ اس بات کو ہم اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ایک سیمینار منعقد ہوتا ہے، جس میں دین کا درس ہو۔ وہ سیمینار لاکھوں لوگوں پر مشتمل ہو تو اس سیمینار سے صرف وہی لاکھوں لوگ مستفید ہوں گے اور ان میں 99 فی صد لوگ وہی ہوں گے جو پہلے سے دین میں دلچسپی لیتے ہیں جب کہ اگر ہمیں معاشرے کو سنوارنا ہے تو ہمارا اصل ٹارگٹ وہ لوگ ہونے چاہئیں جو دین سے دُور ہیں۔ اب ان کو ہم فوراً تو کچھ درس نہیں دے سکتے اور نہ ان کی محافل میں شریک ہو سکتے ہیں۔ تاہم، اتنا تو کر سکتے ہیں کہ لکھیں اور اتنے موثر و پُرکشش انداز میں لکھیں کہ

پڑھنے والا بات کا مفہوم سمجھ جائے۔

ہمارا بولا ہوا تو کلبوں، تھیٹرز یا تفریح گاہوں میں نہیں جا سکتا مگر ہمارا لکھا ہوا، رسائل اور اخبارات کے ذریعے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے لکھے ہوئے الفاظ پڑھ کر کوئی خیر پالے تو یہ بلا شک وشبہ دنیا کی دولت سے بہتر ہے۔ اس کے بدلے میں ملنے والی جنت کا عرض، آسمان اور زمین سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ایک عام انسان، جو خیر بانٹنے کا جذبہ رکھتا ہے، وہ بڑے بڑے اسکالرز کی طرح بڑی بڑی مجالس کا اہتمام نہیں کر سکتا۔

ایک مڈل اور متوسط طبقے کا لکھنے والا کروڑوں تک خیر کی بات لکھ کر پہنچا سکتا ہے۔ لکھنا آپ کو بھی ہے، اگر آپ ڈاکٹر یا بیالوجی کے طالب علم ہیں؟ کیوں کہ قرآن میں بیان کردہ انسان کی بیالوجیکل ساخت کو جیسے آپ سمجھ سکتے ہیں ویسے کوئی عام انسان نہیں سمجھ سکتا اور اس پر غور وفکر کر کے جس موثر انداز میں آپ لوگوں کو اللہ کی ذات بابرکات کی صفات کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں ویسے کوئی انجینئر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر آپ انجینئرنگ کے طالب علم ہیں تو اپنے دنیاوی علم کا قرآن سے موازنہ کریں۔

زمین وآسمان کی ساخت پر غور وفکر کریں اور پھر اپنے فہم کو عام لوگوں تک پہنچائیں۔ کیوں کہ علم بانٹنے سے بڑھتا ہے۔ اگر آپ ذرائع ابلاغ کے طالب علم ہیں تو یقیناً قرآن میں اس علم کا بھی ذکر ہے۔ ہواؤں اور موسموں کے تغیرات پر غور وفکر کو قرآن کی آیات سے جوڑ کر سمجھنا اور سمجھانا آپ کا بھی فرض ہے۔ غرض ہر قسم کا دنیاوی علم اگر آپ اللہ کی کائنات سے جوڑ کر غور وفکر کریں اور اسے دوسروں میں بانٹیں تو یہ باعث ثواب اور صدقۂ جاریہ ہوگا۔ لکھنا تو آپ کو بھی ہے اگر آپ گھریلو خاتون ہیں اور گھر کے امور احسن طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اپنے اچھے تجربات دوسروں کو بتائیں اور دوسروں میں آسانیاں بانٹیں۔

درخت، جب ماچس یا لکڑیوں کی شکل میں گھر میں آتا ہے تو کھانا پکانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی درخت سے فرنیچر بنتا ہے۔ ان ہی درختوں سے پھل اور پھول حاصل ہوتے ہیں، جو مختلف فوائد کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی درخت ہمارے اردگرد کا ماحول خوب صورت بناتے ہیں۔ انہی درختوں سے پرندے اور بہت سے دوسرے جان دار اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ ان ہی درختوں سے ہم آکسیجن لے کر سانس لیتے ہیں۔

ان ہی درختوں سے مختلف ادویہ بنتی ہیں۔ درختوں کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں مگر یہاں ان کے بارے میں مختصراً یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر ایک درخت میں اللہ تعالی نے اتنی خصوصیات رکھی ہیں تو یقیناً ہم انسانوں میں بھی ایک ساتھ بہت سی صلاحیتیں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے، تو ہمیں وقت نکالنا آنا چاہیے۔ کیوں کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں اور یہ تو قرآن کے واضح الفاظ ہیں: ہر انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔

ہم جب لکھتے ہیں تو سوچتے ہیں اور سوچتے ہیں تو غور وفکر کرتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں تو اللہ کا حکم بجالاتے ہیں کیوں کہ اللہ نے قرآن میں غور وفکر ہی کی تو دعوت دی ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے، ''کچھ لوگ خیر کی چابیاں اور شر کے تالے تو کچھ لوگ شر کی چابیاں اور خیر کے تالے ہوتے ہیں''۔تو لکھتے وقت بس اس بات کا خیال رکھیں کہ ہمارے لکھے ہوئے الفاظ لوگوں میں خیر بانٹیں تا کہ ہم خیر کی چابیاں اور شر کے تالے بن جائیں۔خیر اتنا پھیلائیں کہ شر کے دروازے خود بخود ہی بند ہوتے چلے جائیں۔

☆.....☆.....☆

مکمل ضابطہ حیات

(بچوں کی کہانی)

ارے صائمہ بیٹی! بلال کدھر ہے آج؟ میں کب سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اب تو ہمیں بھی بے چینی ہوتی ہے کہ آج وہ ہم سے کیا نیا سوال پوچھے گا اور ہم کیا جواب دے کر اس کی تسلی کروائیں گے۔ اس کے سوالات دن بہ دن دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتے جا رہے ہیں کہ اکثر میں خود شش و پنج میں پڑ جاتا ہوں اور بہت سوچنے کے بعد جواب ڈھونڈ پاتا ہوں۔

درست کہا ابو جی! آپ کا پوتا اب ماشاءاللہ آپ کی صحبت میں رہ رہ کے کافی سمجھ دار ہوتا جا رہا ہے۔ وہ وہ باتیں پوچھتا ہے، جن کی طرف ہمارا خیال بھی نہیں جاتا۔ اچھا آپ کمرے میں جا کے آرام کریں۔ وہ قریبی پارک میں گیا ہے، جیسے ہی آتا ہے میں اسے بھیج دیتی ہوں۔

چلو بہتر، جلدی بھیج دینا۔ میں ذرا کتاب کا مطالعہ کر لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلے گئے۔ لیکن کچھ لمحے ورق گردانی کے بعد جیسے بے چین سے ہو گئے کہ آخر آج کا سوال کیا ہو گا، ان کے پوتے کا۔ سوال پتا ہوتا تو وہ ابھی سے جواب سوچ لیتے۔ وہ مسکرائے، کبھی سوچا نہیں تھا کہ ننھے سے پوتے کے سوال انہیں اتنا بے چین کریں گے۔ پھر اگلے چند ہی لمحوں میں ان کی یہ بے چینی انہیں پارک تک لے گئی۔

پارک میں بچے کھیل رہے تھے۔ کچھ پودوں کے گرد کھڑے پھول گن رہے تھے تو کہیں ایک طرف بچوں کی دادیاں، نانیاں گروپ بنائے بیٹھی تھیں۔ ایک طرف بلال بھی نظر آ گیا، کچھ دوستوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا۔ وہ پاس گئے اور مسکراتے ہوئے سب بچوں کو اونچی آواز میں سلام کیا اور حال چال دریافت کیا۔ ہاں تو ننھے دانش مندو! آج کس موضوع پر بات ہو رہی ہے؟ نو سالہ بلال فوراً بولا، میں دوستوں کو بتا رہا تھا کہ آج میں دادا جی سے کیا سوال کرنے

والا ہوں۔

آہا! آپ کا سوال جاننے کے لیے تو ہم بھی بے چین ہیں۔ ایسا کرتے ہیں وہ اُدھر، گلاب کے پودوں کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ کا سوال بھی جان لیتے ہیں اور پھولوں کی خوشبو سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔

سب بچے دادا جی کی بات کا احترام کرتے ہوئے گلاب کے پودوں کی طرف چل دیے۔ وہاں دادا جی کے گرد دائرہ بنا کر مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ ہاں تو ننھے دانش مند! پوچھیے سوال۔ دادا جی نے کہا۔ بلال تو جیسے اسی انتظار میں تھا کہ کب اسے بولنے کا موقع دیا جائے۔ وہ فوراً بولا، دادا جی! میں اکثر اسلامیات اور اردو کی کہانیوں میں پڑھتا ہوں کہ قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ آپ نے کہا تھا، کوئی بھی سوال آپ سے کرنے سے پہلے خود اس پر سوچا کروں۔ تو مجھے ضابطۂ حیات کا مطلب نہیں پتا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو اتنا سمجھ سکا کہ ضابطۂ حیات اسے کہتے ہیں جس پر مکمل طور پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزاری جا سکے۔ جس سے ہم زندگی کے کسی بھی معاملے میں رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اتنا کہہ کر وہ اداسی سے خاموش ہو گیا۔

دادا جی بولے، ماشاءاللہ! آپ نے درست کہا۔ قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس سے ہم زندگی کے کسی بھی پہلو پر رہنمائی حاصل کر کے بہت آسان اور کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔

اتنا کہہ کر دادا جی خاموش ہوئے تو بلال بہت اداسی سے بولا۔ دادا جی! میں نے مکمل قرآن پڑھ تو لیا ہے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میں اس سے اپنی زندگی کے معاملات میں رہنمائی کیسے حاصل کروں۔ میں نے بہت بار کوشش کی مگر مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ میں قرآن پڑھ رہا ہوں۔ پر مجھے یہ پتا نہیں چلتا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ جو میں پڑھ رہا ہوتا ہوں اس کا مطلب تو میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا ہوتا۔ جیسے میں اسکول میں انگریزی پڑھتا ہوں تو مشکل تو وہ بھی ہوتی ہے پر میری سمجھ میں آ رہی ہوتی ہے۔

دادا جی جیسے جیسے بلال کی باتیں سن رہے تھے، ویسے ویسے ان پر صدمے کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ بلال مزید بول رہا تھا، مجھے یہ تو پتا ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ ہم سے بات کرتا ہے۔ جیسے ایک بار میں امی کے ساتھ ایک محفل میں گیا تھا تو ایک آنٹی بتا رہی تھیں۔ پر دادا جی! مجھے یہ تو پتا ہی نہیں چلتا کہ اللہ مجھ سے کیا بات کر رہا ہے۔

بلال بولتا جا رہا تھا اور دادا جی مکمل طور پر گم صم اسے سن رہے تھے۔ دادا جی! مجھے بتائیں، میں قرآن سے رہنمائی کیسے حاصل کر سکتا ہوں اور کیسے کامیاب ہو سکتا ہوں؟ دادا جی چند لمحے خاموش رہے۔ بچے بے چینی سے دادا جی کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ گلا کھنکار کر ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولے، ننھے دانش مند! آپ تو ہم سے بھی زیادہ دانش مند نکلے۔ آپ قرآن سے کس معاملے میں رہنمائی چاہتے ہیں؟ بلال بولا، کلاس میں ایک ہم جماعت اکثر میری

پنسل توڑ دیتا ہے اور پھر مجھے اسی ٹوٹی ہوئی پنسل سے لکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے، میں بھی اس کی پینسل توڑ دوں۔ پر میں جب بھی ایسا کرنے لگتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اس کے پاس تو پہلے ہی چھوٹی سی پینسل ہوتی ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ اس سے بدلہ کیسے لوں؟ میں اسی کا حل قرآن سے تلاش کر رہا تھا۔

سب بچے گم صم بیٹھے کبھی دادا جان کی طرف دیکھ رہے تھے تو کبھی بلال کی طرف، جیسے یہ سوال تو سب کا ہو کہ اگر کوئی ہمارے ساتھ برا کرے تو ہم اس کے ساتھ کس طرح پیش آئیں۔ کیسے زیادتی کا بدلہ چکا کر اپنی تسکین کریں؟ دادا جی کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد مسکرائے، جیسے انہیں جواب مل گیا ہو۔ اب دادا جی سب سے پوچھ رہے تھے، کیا آپ لوگوں کے ساتھ بھی کبھی کسی نے ایسی شرارت کی؟ کسی نے دکھ دیا ہو اور آپ بھی اپنا بدلہ لینا چاہتے ہوں؟ سب یک زبان ہو کر بولے، جی.... ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔

اچھا تو پھر آپ کیا کرتے ہیں؟ دادا جی نے پوچھا۔

ننھا عزیر بولا، اگر کوئی مجھے مارے تو میں اسے ڈبل مارتا ہوں۔ کوئی کہہ رہا تھا، میں گھر جا کے بتاتا ہوں اور پھر ماما کی اس کی ماما سے لڑائی ہو جاتی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی مجھے مارے تو میں کچھ نہیں کرتا کیوں کہ مجھے ڈر لگتا ہے، اگلا بندہ مجھے پہلے سے زیادہ نہ مارنے لگ جائے۔

اچھا تو میں آپ کو قرآن سے اس کا حل بتاتا ہوں چوں کہ قرآن تو یہاں موجود نہیں ہے مگر قرآن میں ایک آیت ہے، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ کوئی تمہیں دکھ دے اور تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو صرف اتنا ہی بدلہ لو، یعنی سامنے والے کو اتنا ہی دکھ دو، جتنا اس نے تمہیں دیا اور معاف کر دیا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے کیوں کہ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور سورت النور میں اللہ کہتا ہے کہ معاف کر دیا کرو، اس امید پر کہ کل تمہیں بھی اللہ معاف کرے گا۔

اور پتا ہے بچو! جب ہم کسی کو اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دیتے ہیں تو اللہ بہت خوش ہوتا ہے اور ہمارے درجات بلند کرتا ہے تاکہ ہمیں جنت مل جائے اور جنت میں تو بس سکون ہی سکون ہے۔ وہاں کوئی کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہیں کرے گا۔ اس لیے ہمیں کسی سے بدلہ لیتے وقت سوچنا چاہیے کہ مجھے بدلہ لے کر سکون پانا ہے یا معاف کر کے اللہ کو خوش کرنا ہے اور اللہ کی خوشی کے ذریعے ہمیشہ کے سکون والی جنت لینی ہے اور حقیقت میں یہ بہترین بدلہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہمارے ساتھ برا کرے تو ہم اس کے ساتھ بھلائی والا معاملہ کریں۔ اس طرح وہ انسان آپ کی اچھائی کے بدلے دل میں شرمندہ ہوگا اور آئندہ کے لیے آپ سے اچھا برتاؤ رکھے گا۔

بلال فوراً بولا، پھر تو مجھے جنت ہی چاہیے اور میں تو اپنے کلاس فیلو کو نئی پینسلیں بھی دوں گا تاکہ مجھے جنت میں زیادہ پیارا گھر ملے۔

سب بچے کہہ رہے تھے، ہم بھی معاف کر دیا کریں گے تاکہ ہمیں بھی جنت میں ہمیشہ کا سکون اور ڈھیر سارے

انعامات ملیں۔

ان شاءاللہ ضرور، اللہ جنت دے گا اگر ہم اس سے ڈرتے رہیں۔ اچھا بچو! کل آپ سب پھر کوئی سوال سوچ کے آنا پھر ہم قرآن سے اس کا حل تلاش کریں گے۔ اب نمازِ مغرب کا وقت ہونے والا ہے، چلو مسجد میں نماز پڑھ کے گھر جاتے ہیں۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے دادا جی سوچ رہے تھے کہ ہم کتنے بے وقوف لوگ ہیں جو دنیا بھر کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں لیکن قرآن، جو کامیاب زندگی گزارنے کا نسخہ کیمیا ہے، اسے نہ خود سمجھتے ہیں اور نہ بچوں کو سمجھاتے ہیں۔ انہوں نے پکا ارادہ کیا کہ اب وہ روز قرآن کی چند آیات کا ترجمہ پڑھا کریں گے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے تا کہ آنے والی نسل کو بھی سمجھا سکیں۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ نماز کے بعد امام صاحب اور بچوں کے قاری صاحب کو بھی روزانہ قرآن کی ایک آیت مع ترجمہ سمجھانے کے لیے کہیں گے۔

اب قرآن کو واقعی سمجھ کے پڑھنا اور عمل میں لا کر ضابطہ حیات بنانا ہے اور اس سب سے پہلے اتنا عرصہ اللہ کی کتاب کے ساتھ غفلت برتنے پر سجدہ ریز ہو کر معافی بھی مانگنی ہے۔ بے شک اللہ بہت زیادہ معاف کرنے والا غفور الرحیم ہے۔

☆.....☆.....☆

شاعرہ

آسیہ عبدالحمید

نظم

مسافر تھک گیا!
کڑی اتنی ہے سزا
راہ سے میں مڑ گیا
دیکھا ہی نہیں کہ انجام ہے کیا بھلا
بس سر پر پاؤں رکھے بھاگ گیا
اسے پا کر بھی کیا کرتا
میں نے اسے پا کر بھی دیکھا
ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آیا
شمع کے گرد لپکتا ہوا پروانہ
بے پرواہ ہے اب کل زمانہ
بس اتنی ہی تگ و دو
بس اتنا سا فسانہ
اب کچھ بھی نہیں پاس میرے
اب کچھ بھی نہیں ساتھ میرے
بے کار تمناؤں کا اجڑا ہوا گھر

فقیر کی نیم مردہ آواز میں بکھرا ہوا ڈر
پھیلے ہوئے آنگن میں پتے در بدر
چڑیوں کی چہچہاہٹ سے خالی شجر!
بس اندر باہر پھیلا ہوا کرب مسلسل
اک شوریدہ سر درد پاگل

☆.....☆.....☆

نظم

میرے درد کو نہ دوا ملی
میرا درد در بھٹک گیا
میرے زخم کا مرہم پگھل گیا
میرا مسیحا بھی جہاں سے گزر گیا
میں مدت کے بعد جو لکھ بیٹھا
میرا قلم بھی ہاتھ سے گر گیا
کل متاع جان تھا، میری پہچان تھا
وہی شعر میرے ذہن سے نکل گیا
میں نہیں ہوں پجاری خواہش کا
میرا شوق گداگری بن گیا
جسے راس بھی نہیں مودت کا اک لمحہ
میں ایسا سوالی محبت بن گیا

☆.....☆.....☆

وضاحت

رائٹرز کلب کے دیگر ارکان جو کہ باقاعدہ طور پر تو کتاب میں شامل نہیں ہیں مگر ان کی نمائندگی کے طور پر ایک ایک تحریر شامل کتاب ہے۔

☆.....☆.....☆

ادیب اور ادب

زہرا تنویر

ادب کسی بھی زبان میں ہو ادب ہی کہلاتا اور سمجھا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے کچھ لوگ ادب میں یوں طبع آزمائی کرنے پر تل جاتے ہیں جیسے ان سے بڑا ادب کی دنیا میں کوئی اور لکھاری نہ ہو۔ ادب کے ساتھ جب بے ادبی سے پیش آیا جائے تو ادب بھی ایسے لوگوں کو اپنے دائرے میں جگہ دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ کچھ ناعاقبت اندیش لوگ ادب کی ایسی دھجیاں اڑاتے ہیں کہ سوائے افسوس کرنے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اردو ادب میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ادیب ہیں جن کے نام لیے جائیں تو فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔ ادیب کا کام ہوتا ہے کہ اپنے قلم سے معاشرے میں جنم لینے والی برائیوں اور اخلاقی قدروں کے معیار کو بلند کرے نہ کہ پست اور مردہ خیالات کو سب کے سامنے پیش کر کے ادب کو بدنام کرے۔

آپ کا قلم آپ کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے آپ چاہے سیاست پر لکھیں، عورت پر لکھیں، انسانی حقوق پر لکھیں، معاشرتی بگاڑ پر لکھیں یا پھر مذہب پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ آپ کی تحریر آپ کی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ کوشش کریں کہ اپنی سوچ کے محور کو مثبت رکھیں تاکہ آپ کی تحریر میں کسی کو کہیں آپ کی مردہ سوچ کا رنگ دکھائی نہ دے۔ ہمارے ہاں آج کل یہ ٹرینڈ چل پڑا ہے کہ ہر کوئی اپنی تحریر کو مذہبی رنگ دے کر شہرت حاصل کرنے چکروں میں پڑا ہے۔ مذہب اتنی سستی اور معمولی چیز تو ہے نہیں کہ جس کا جب دل کرے مذہب کے نام کو استعمال کر کے مفکر بن جائے۔ ہم نہ مذہب سے آشنا ہیں نہ ادب سے۔ شہرت مذہب کے نام سے نہیں ملتی۔ اگر آپ شہرت کے حصول کے متمنی ہیں تو بہتر ہے کہ اپنے خیال کی رو کو جانچیں وہ کس جانب بہہ رہی ہے جب آپ کو اپنے خیال کا اندازہ ٹھیک سے ہو جائے گا تب ہی آپ بہتر انداز سے اپنے قلم کا استعمال کر سکیں گے۔ ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنی صلاحیت کا پتا چل جائے کہ ہم یہ کام کر سکتے ہیں تو ہم اس میدان میں سوچے سمجھے بغیر کود جاتے ہیں ہر کام کرنے کا کوئی طریقہ کار ہوتا ہے جس کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے لیکن سمجھنے کی طرف آنے کو ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ جب بھی کسی کام کا آغاز کیا جاتا

ہے تو اس کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ اس کام میں آپ کو کب کہاں اور کیسے قدم رکھنا ہے اس طرح سے جب آپ اپنے قلم کو تھامتے ہیں تو یہ ضرور سوچیں کہ آپ کے قلم سے روشنی کی شعاعیں پھیلیں نہ کہ فرسودہ مردہ الفاظ کی گھن دکھائی دے۔ ہم لوگ ایک پنڈولم کی طرح ہیں جو اپنی مرضی سے کبھی ادھر کبھی ادھر ہلتا رہتا ہے یکسوئی سے کوسوں دور ہوتا ہے لیکن جیسے ہی کوئی پینڈولم کو ہلاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے ہلتا ہے پھر اپنی اصل حالت میں ہے۔ بالکل اسی طرح سے ہم میں سے کچھ ادیب اپنا قلم دوسروں کی مرضی سے چلاتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے پھر اپنی اصل جگہ پر آ جاتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ آپ اپنی صلاحیتوں کو دوسروں کے ناجائز امور میں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ادب کو باادب بنانے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو مثبت اور تعمیری سوچ کو اپنائیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں چاہے وہ سورج کے نکلنے کی سمت درست ہی کیوں نہ ہو مگر ہم اس کو ہی سلام کریں۔ اس کے برعکس ایسے لوگ جن کی سمت درست ہو گی لیکن شہرت کی سند سے محروم ہوں گے ان کو کوئی پوچھنا گوارا نہیں کرے گا کہ آپ کون ہیں؟ لکھنے کا شوق کب اور کیسے ہوا؟

تاریخ ایسے گمنام ادیبوں اور ادب کی نگارشات سے ہمیشہ محروم رہی ہے اور یہ شریف النفس گمنام لوگ بھی ایسے تھے اور ہیں جن کی زبان پر کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں آیا۔ اس موضوع پر حضرت واصف صاحب کا ایک تفصیلی مضمون ان کی کتاب ''دل، دریا، سمندر'' میں پڑھنے کو ملا (یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ میں خود کو ابھی اس قابل نہیں سمجھتی کہ واصف صاحب کے افکار کو ٹھیک سے سمجھ سکوں اور بحث کروں)

تو اس مضمون میں گمنام ادیبوں کی اعلیٰ سوچ کے متعلق جان کر خوشی کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ ان کو ادب میں وہ مقام کیوں نہیں ملا جس کے یہ لوگ حق دار تھے۔ حضرت واصف کہتے ہیں کہ گمنام ادیبوں اور گمنام شعراء کی کاوشیں کسی نہ کسی نام سے شائع ہوتی رہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک گمنام ادیب کے مرنے سے کئی نامور ادیب مر جاتے ہیں۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ہمارا المیہ یہ ہے کہ وہ دانشور جن کی عمر اسلام اور خدا پر بے باک بلکہ گستاخ تنقید میں گزری آج نعت کی محفلوں میں موجود ہیں۔ گمنام ادیب میں کم از کم ایک خوبی ضرور ہوتی ہے، وہ کبھی منافق نہیں ہو سکتا۔ وہ دانشور جو اونچی کرسیوں پر براجمان تھے، وہ کیسے کسی اجنبی کو اپنے دانش کدے میں داخل ہونے دیتے۔ آج بھی حالات اس سے مختلف نہیں ہیں پیسے اور سستی شہرت کے حصول کے لیے ادیب اپنا ادب بیچ رہے ہیں اور جن کے دل اور نیت صاف ہیں وہ آج بھی وہیں گمنام کھڑے ہیں جہاں پہلے کھڑے تھے۔

☆....☆....☆

سوشل میڈیا اور منہ بولے رشتے

ابن نیاز

پہلے بھی کئی بار بہت سے مقامات پر اپنے آرٹیکلز پر لکھا تھا اور آج بھی وہی خیال ہے کہ فیس بک اور دیگر سوشل میڈیا پر جو بھی رشتے بنائے جائیں، وہ کسی صورت اصل رشتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آپ سگی بہن، بیٹی کو بہت کچھ کہہ دو، وہ پھر اپنا خون ہوتا ہے۔ وقتی ناراضگی ہوتی ہے لیکن پھر آپ کے ساتھ ہر دکھ درد میں شریک۔ دل میں بات نہیں رکھتے۔ فیس بک ہو یا کوئی بھی سوشل میڈیا پلیٹ فارم، سب جھوٹے رشتے۔ کوئی کتنی سچائی سے، دل سے یا قسمیں کھا کر کہے کہ وہ آپ کو بہن سمجھتا ہے یا وہ بھائی سمجھتی ہے، بے شک ان کی نیت صاف ہو گی لیکن جب اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہہ دیا اور ان کا حکم پتھر پر لکیر ہوا تو اس کے بعد ہم ایسے رشتے بنانے پر کیوں اصرار کرتے ہیں جن کا مذہب اسلام میں سرے سے کوئی تصور ہی نہیں۔

شاید اس لیے کہ ہماری نیت صاف ہوتی ہے تو ہمیں مخالف پر بھی اعتماد ہوتا ہے لیکن ولی اللہ تو کوئی نہیں۔ نیتیں بدلتے دیر نہیں لگتی، کئی ایک ایسی مثالیں موجود ہیں۔ خاص طور پر لڑکیاں بہت نازک مانند آبگینہ ہوتی ہیں۔ بہت جلد بھائی بنا لیتی ہیں۔ بھیا بھی اللہ کی قسمیں کھاتا ہے، ہر طرح سے یقین دلاتا ہے کہ بھیا ہونے کی لاج نبھائے گا۔ ان لڑکیوں کو کیوں سمجھ نہیں آتی کہ یہ بھیا جب تم سے اعتماد کی پہلی قسط کے طور پر نمبر مانگے تو گڑبڑ کا احساس کیوں نہیں کرتیں۔ بہن کو تحفہ بھیجنا ہوتا ہے تو پتہ مانگا جاتا ہے۔ میری بہن کیسی دکھتی ہیں اپنی تصویر بھیجیں۔ تصویر بھیا دوستوں دیکھاتا ہے کہ نئی گرل فرینڈ ہے۔

یاد رہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ دونوں برابر کے قصوروار ہیں۔ سب سے پہلے تو دونوں کی دین کی تعلیمات سے دوری اور تربیت کا فقدان بنیادی وجہ ہیں یا تو دونوں جانتے نہیں کہ منہ بولے رشتے کی کوئی اصل نہیں اور

یا پھر ان کے گھر کا ماحول ہی اس طرح کا ہے جہاں ان کو بس کھانے پینے، نشو ونما پانے اور رہنے سہنے کے مواقع ہی دیے جاتے ہیں۔ رشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ کس سے کس طرح پیش آنا ہے، سب ان کے ماحول پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ جیسا چاہیں ماحول سے اثر لے لیں۔ ایسا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے والدین ان کو وہ توجہ نہیں دے پاتے جس کے وہ حقدار ہوتے ہیں اور والدین کی یہی لاپرواہی و بے توجہی انہیں راہ راست سے بھٹکانے کا سبب بنتی ہے۔ خدارا ہوش کے ناخن لیں اور سوشل میڈیا پر دوست اور رشتے ڈھونڈنے کے بجائے جو آپ کے قریبی عزیز آپ کی توجہ اور محبت کے محتاج ہیں ان کے ساتھ وقت گزاریں ہم سب نے ان کے حقوق کے بارے میں روز محشر جواب دینا ہے۔

☆....☆....☆

میت کا کھانا اور معاشرتی بے حسی

درصدف ایمان

یوں تو ہمارا معاشرہ بے حس اور بے شمار المیوں سے بھرپور ہے ان میں سے ہی ایک ایسا المیہ ہے اور جو لوئر مڈل کلاس اور مڈل کلاس میں از حد پریشانی کا باعث ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ المیہ سنگین صورتحال اختیار کر رہا ہے اگر کہیں کسی خاندان میں موت واقع ہوتی ہے تو میت کی تدفین ہوتے ہی دیگوں کے ڈھکن کھل جاتے ہیں اور وہی احباب جو کچھ دیر پہلے تسلی دیتے ہوئے نظر آ رہے تھے انہیں اپنے کھانے کی، بوٹیوں کی، گرم گرم بریانی کی، فکر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اہل خانہ جو غم سے نڈھال ہوتے ہیں۔

اب وہ بے چارے مصروف میزبانی ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تعزیت کرنے والے خود کیوں نہیں سوچتے کہ آیا وہ تعزیت کے لیے آئے ہیں یا پھر دعوت کھانے؟ اگر شریعت میں ہے کہ میت کے گھر والوں کو کھانا پہنچایا جائے تو یہ کھانا صرف اور صرف میت کے گھر والوں کے لیے ہوتا ہے یا پھر جو دور دراز سے تعزیت کے لیے آتے ہیں ان کے لیے۔

مکمل برادری کے لیے کھانا بنوانا، کھانا کھلانا اور ان سب باتوں سے قطع نظر خود غور کریں کہ یہ سب کس پر بار ہے؟ کس پر بوجھ؟ میت کے گھر پر اور اگر بالافرض جس کے گھر میں انتقال ہوا ہے اور وہ اس گھر کا واحد کفیل تھا تو جو تھوڑی بہت بھی جمع پونجی موجود بھی ہوتی ہے وہ اس برادری کی دعوتِ طعام کی نظر ہو جاتی ہے۔ بالفرض جمع پونجی نہ ہو تو وہ بے چارے اس غم میں اور برادری کی دعوتِ شیراز کرنے میں قرض دار بھی ہو جاتے ہیں اور اس طرح میت کے اہل خانہ ہر طرح سے خالی ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ شرعی طور پر تعزیت کا حکم اس سے بالکل جداگانہ ہے۔

میت کے گھر جائیں اہل خانہ کو تسلی و تشفی دیں، خاندان کے قریبی اقارب میں جو مالی طور پر مستحکم ہو میت کے گھر والوں کے لیے کھانے کا انتظام فرمائے، دعائے مغفرت و ایصالِ ثواب کا اہتمام کرے اور اس کے بعد اپنے گھروں کی راہ لیں۔

ایسا ہرگز نہیں جنازہ اٹھنے کے بعد دیگوں کے کھلنے کا انتظار کریں۔ پھر دسترخوان پر تشریف فرما ہو کر بھرے پیٹ

سے دوبارہ ملنے کے اختتامی ورسماً جملے بولیں اور گھر کی طرف جائیں یہ طریقہ نہ اخلاقی طور پور ٹھیک ہے نہ شرعی طور پر معتبر ہے بلکہ انسان کی انسانیت پر حرف اٹھانے والی بات ہے۔ کرنے کا کام صرف اتنا ہے کہ معاشرے کے رسم و رواج کے مطابق دیگیں آ ہی گئیں اور اہل خانہ کا کھانا کھانے پر اصرار بھی ہو تو صرف دو لقمے سے زیادہ نہ کھائیں، اس طرح امید ہے ایک نا ایک دن اس نظام فرسودہ سے نجات مل جائے گی۔ ہمیں اپنے آپ کو بدلنا ہے جب ہی اس بگڑے ہوئے نظام میں تبدیلی آ سکے گی اور ایک مستحکم معاشرہ بھی ان شاءاللہ جلد وجود میں آ جائے گا۔

☆....☆....☆

نجی تعلیمی ادارے یا نجی کاروبار

فری ناز خان

ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد اعلیٰ اور معیاری تعلیم و تربیت حاصل کرے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنے بچوں کو اپنی دانست میں معیاری اسکولز میں داخل کرواتے ہیں اور بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے وہ ہر ممکن جدوجہد بھی کرتے ہیں اسی ضمن میں وہ گورنمنٹ اسکولز کو نظر انداز بھی کرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے کسی بھی اچھے اور مہنگے اسکول سے تعلیم حاصل کریں تا کہ معاشرے میں ان کا نام ہو اور وہ اپنے بچے کے بارے میں بتاتے ہوئے فخر محسوس کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر سرکاری اساتذا اپنے نجی اسکول اور کوچنگ سینٹر کھول کر بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنا کاروبار چمکا رہے ہیں اور اپنی ساری توانائیاں سرکاری اسکولز کے طلبہ کی بجائے نجی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ پر صرف کر رہے ہیں اور با حالت مجبوری والدین اپنیچوں کو اچھے سے اچھے اسکولز میں داخل کروانے پر مجبور ہیں۔

اسی طرح دوسری طرف نجی اسکولز یا تعلیمی اداروں نے اپنا زریعہ تعلیم انگریزی بنا رکھا ہے جس کی بناء پر اکثر والدین یہ سوچتے ہیں کہ ان کے بچے کو بہتر تعلیم و تربیت ملے گی اور ان کے سماجی رتبے میں بھی اضافہ ہوگا اور وہ سب کو فخر سے بتا سکیں گے کہ ان کا بچہ بہے مہنگے اور اعلیٰ اسکول میں زیر تعلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب نجی تعلیمی ادارے اپنے اسکولز کو ایک کاروبار کی طرح چلا رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ والدین چاہ کر بھی اپنے بچوں کو ان کے اسکولز میں داخل کروائیں گے۔

یہ کاروبار آج کل بہت ہی زور و شور سے چل رہا ہے ہر گلی محلے میں لوگ اپنے گھروں کو ہی اسکولز بنا کر بیٹھ گئے ہیں اور انہوں نے اپنی منہ مانگی فیسیس مقرر کر رکھی ہیں۔ ہر اسکولز کی فیس اس کے معیار سے 50% زیادہ ہوتی ہے ان

کے دعوے تو بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں مگر معیار تعلیم ان کے دعووں کو جھوٹا ثابت کر رہی ہے اس کے باوجود بھی جب بھی نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے ان اسکولز کی فیسوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ کام صرف فیسوں سے نہں چلتا وہ اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے مختلف طرح کے فنڈز کا بھی سہارا لیتے ہیں مثال کے طور پر سائنس لیب چارجز، کمپیوٹر لیب چارجز اور بھی بہت سے چارجز۔ اگرچے اسکول میں کمپیوٹر لیب موجود ہو یا نہ ہو مگر چارجز ہر سال بڑھتے جاتے ہیں۔ ہر سال 20% سے 40% فیسوں میں اضافہ کہ باوجود بھی والدین اپنے بچوں کو نجی اسکولز میں پڑھانے پر مجبور ہیں۔

اکثر نجی تعلیمی اداروں نے سکیورٹی کے نام پر والدین سے علیحدہ چارجز اکھٹا کر رکھے ہیں اور یوں فیسوں میں اچھا خاصا اضافہ کر دیا اتنا چارجز لینے کے باوجود بھی اکثر تعلیمی اداروں کا معیار تعلیم بہت ناقص اور غیر معیاری ہے۔ اس کے برعکس حکومت اور نجی تعلیمی ادارے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے پر لگے رہتے ہیں انہی نجی اداروں کا کہنا ہے کہ اگر ملک میں تعلیمی معیار بہتر ہو رہا ہے تو وہ صرف نجی تعلیمی اداروں کی کاوشیں ہیں جبکہ حکومت کا کہنا ہے کہ نجی تعلیمی ادارے تعلیم کے نام پر کروڑوں کا بجٹ لے جا رہے ہیں۔

نجی اداروں کا کہنا کہ اس بار بجٹ میں جو بل پاس کیا گیا ہے اس سے نجی تعلیمی ادارے تباہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نجی اور سرکاری تعلیمی اداروں کو صرف اپنے بلز، اپنے فنڈز اور اپنی فیسیسز کا خیال تو ہے لیکن انہیں اس بات کا زرا بھی خیال یا احساس نہیں کہ ان کی اس آپس کی لڑائی میں غریب سفید پوش والدین اور خصوصا طلبہ کا مستقبل تباہ ہو رہا ہے۔ نجی تعلیمی ادارے اپنے اداروں کو تعلیمی معیار سے نہیں کاروباری معیار سے بڑھا رہے ہیں جتنا اچھا اسکولز فیس بھی اتنی ہائی ہوتی ہے اس کاروباری دوڑ بھاگ میں نجی اور سرکاری تعلیمی ادارے معیار تعلیم تباہ کرتے جا رہے ہیں مگر انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ انہیں اگر غرض ہے تو صرف اور صرف اپنی آنے والی فیس اور فنڈز سے۔

والدین نجی تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ خصوصا سفید پوش طبقہ۔ حال ہی میں ان سفید پوش طبقے کی آہ و بقا نے ہمارے معاشرے میں کچھ ہلچل سی پیدا کر دی ہے اور اس سال کے بجٹ میں اس بل کا پاس ہونا ایک چھوٹا سا قدم ہے جو کہ حکومت کی طرف سے ان سفید پوش طبقے کے لئے ہے۔

☆....☆....☆

پردے سے متعلق سائنسی حقائق

عائشہ صدیقہ

آپ کو نقاب یا عبایہ میں گرمی نہیں لگتی؟ اس میں سانس بند نہیں ہوتا؟ بہت ہی مشکل کام ہے نا پردہ کرنا؟ ایسا کوئی نا کوئی سوال ہمیں اکثر گردش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تو آیئے آج ان سب سوالوں کا جواب ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہمارے جسم کا مخصوص درجہ حرارت 37 ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے۔ جس پر ہمارے جسم کے تمام اعضاء درستی سے کام کرتے ہیں۔

جب یہ درجہ حرارت اس مقررہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو جسم کے افعال متاثر ہونے لگتے ہیں۔ اس درجہ حرارت کو برقرار رکھنے کے لیے قدرت نے ہمارے جسم میں کچھ نظام رکھے ہوئے ہیں جس میں سب سے اہم عملِ تبخیر (Evaporation) ہے۔ دوسرے تمام مائعات کی نسبت پانی میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ زیادہ حرارت جذب کر کے کم تبخیر (evaporate) ہوتا ہے۔ ایک لیٹر پانی میں سے صرف 2 ملی لیٹر پانی بخارات بن کر باقی کے 998 ملی لیٹر پانی کا درجہ حرارت 1 ڈگری کم کر دیتا ہے۔ یعنی پانی زیادہ درجہ حرارت جذب کر کے کم تبخیر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

پانی کی حرارت جذب کرنے کی یہی صلاحیت ہمارے جسم کا درجہ حرارت متوازن رکھتی ہے۔ ہمارے جسم میں عمل تبخیر (Evaporation) پسینے کے ذریعے ہوتا ہے اس طرح باقی جسم کا درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے اسے لیے عمل تبخیر (یعنی پسینہ آنے) کے فوراً بعد ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے اور اگر آپ تھوڑی سی ہوا لیں تو جسم کا ٹمپریچر مزید کم ہو جاتا ہے۔

جب آپ اپنی جلد کو براہ راست سورج کی روشنی میں رکھتے ہیں تو درجہ حرارت تیزی سے بڑھتا ہے اور بہت

زیادہ پسینہ آتا ہے جس کی وجہ سے جسم کے پانی اور نمکیات کا لیول (Level) تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ ایسے میں اگر ہم جسم کو کپڑے سے ڈھانپ دیں تو جسم اور سورج کی روشنی کے درمیان ایک ڈھال آجاتی ہے جس کی وجہ سے عملِ تبخیر کم ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر آپ کُھلا لباس استعمال کریں تو اس میں مُسلسل ہوا کا گزر ہوتا رہتا ہے جو پسینہ آنے کی صورت میں آپ کے جسم کو ٹھنڈا رکھنے کا کام کرتا ہے۔ اس لیے گرمیوں میں مکمل اور کھلے لباس کا استعمال زیادہ موزوں ہے کیونکہ چست لباس ہوا کا گزر روک دیتے ہیں۔

لہٰذا دیکھا جائے تو اس طرح عبایا اور نقاب کرنے والی خواتین گرمی سے زیادہ محفوظ رہتی ہیں۔ سیاہ اور گہرے رنگ حرارت کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کے لیے آپ پردہ کرنے کے لیے سفید یا نیلے رنگ کا استعمال کرلیں کیونکہ یہ حرارت کو کم جذب کرتے ہیں۔ اسی طرح سردیوں میں عبایا اور نقاب آپ کو سردی سے محفوظ رکھتا ہے۔ مزید برآں مکمل لباس کا استعمال موجودہ دور میں بڑھتی ہوئی ماحولیاتی آلودگی میں آنکھ، ناک، گلہ اور جِلد کے امراض بالخصوص کینسر سے بچاتا ہے۔ اس کے علاوہ نقاب آلودہ ہوا کے لیے فلٹریشن کا کام کرتا ہے۔

گرین ہاؤس ایفیکٹ، گلوبل وارمنگ اور اوزون ڈِپلیشن کے باعث سورج کی نقصان دہ شعاعوں اور ماحولیاتی اثرات سے بچانے کے لیے چہرے سمیت کا مکمل لباس نہ صرف خواتین بلکہ مَردوں کے لیے بھی موثر ہے بلکہ ہمارے گرد کچھ ذہین مرد حضرات گرمی میں باہر نکلتے وقت مکمل لباس کے ساتھ منہ ڈھانپ کر اور کچھ تو سر پر گیلے تولیے کا استعمال کر کے خود کو گرمی کے اثرات سے محفوظ کرتے ہیں۔ لہٰذا پانی کا زیادہ استعمال، کھلا اور مکمل لباس آپ کو موسمی شدت سے محفوظ رکھتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے، ''تعالیٰ کسی بھی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا (بوجھ نہیں ڈالتا)''۔

سو پردے کا حکم طاقت کے مطابق ہی نہیں بلکہ موزوں بھی ہے بلکہ مجھے اس میں بڑی حکمت نظر آتی ہے کیونکہ فزکس کے لاء آف تھرموڈائنامکس (thermodynamics of Law) میں ایک لاء آف اینٹراپی (of Law Entropy) ہے جس کے مطابق ہر گزرتے وقت کے ساتھ ماحول بگاڑ کی طرف جا رہا ہے۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ زمین کا درجہ حرارت اور ماحول گزرتے وقت کے ساتھ خراب ہوتا چلا جا رہا ہے لہٰذا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حکم پردہ سے پہلے زمین کا ماحول موجودہ آلودگی کے برعکس بہت بہتر اور صاف ستھرا تھا مگر چونکہ اسلام قیامت تک کے لیے ہے اس لیے خالق نے انسانیت کے لیے وہ اَحکام نازل فرمائے جو ماحولیاتی لحاظ سے بھی انسان کے لیے موافق اور بہتر ہوں۔

اس ساری وضاحت کے بعد یہ کہنا کہ پردہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اس میں گرمی لگتی ہے۔ سانس نہیں لیا جائے گا۔ تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اللہ نے آپ پر ایسا حکم نازل فرمایا جس کا بوجھ اٹھانے کی آپ میں صلاحیت نہیں ہے تو (معاذ اللہ) آپ کا کلام مندرجہ بالا آیت کے منافی ہوگا۔ یعنی حکم پردہ کی نافرمانی کے ساتھ آپ انکار آیت

کے بھی مرتکب ہوں گے۔

آپ فیشن، لوگوں کے اعتراضات یا باتوں کے خوف سے اپنے آپ کو اس گناہ کا مجرم نہ بنائیں۔ بے تکے جواز پیش کر کے اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دے کر مطمئن کرنے کی کوشش مت کریں۔ روزِ محشر آپ اللہ کو یہ جواز نہیں دے سکتے کہ تیرا حکم اس وجہ سے ہمارے لیے قابل عمل نہیں تھا۔ خود کو احتساب کے کٹھہرے میں کھڑا کر کے پوچھیں کہ اب آپ کی عقل کے پاس کیا جواز ہے پردے سے انکار کا؟ بلکہ ایک روایت ہے کہ، ''اللہ تعالیٰ اس بالغ عورت کی نماز قبول نہیں فرماتا جب تک وہ پردہ نہ کرے''۔ (سنن ابوداؤد) یہ حکم ظلم ہیں نہ ہی زیادتی بلکہ بہت سی معاشرتی برائیوں اور ماحولیاتی اثرات سے بچنے کا ذریعہ ہیں۔

☆....☆....☆

نوجوان نسل کی ذمہ داریاں

ثوبیہ اجمل

نوجوانی کا دور قوت، صلاحیت، حوصلوں اور امنگوں سے پھر پور ہوتا ہے۔ نوجوانی ہی وہ دور ہے جب انسان کے اندر کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یوں تو انسان کی تمام زندگی ہی قیمتی ہے مگر بلاشبہ جوانی انسان کی زندگی کا قیمتی ترین دور ہوتا ہے۔ اس لیے جوانی میں انسان پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ جن میں سے کچھ کا تعلق اس کی ذات، اس کے خاندان اور کچھ کا تعلق معاشرے سے ہوتا ہے۔

جوانی میں انسان اکثر جلد جذباتہ ہو جاتا ہے، اسے غصہ بھی بہت جلدی آجاتا ہے۔ بس ہر وقت اپنی من مانی کرنے کو جی چاہتا ہے اور اس کے اس رویے کا سب سے زیادہ شکار اس کے والدین ہوتے ہیں۔ وہ خود کو عقل کل سمجھنے لگتا ہے اور یہ بات سب سے خطرناک ہے۔ انسان بے شک کتنا ہی بڑا ہو جائے مگر اپنے والدین کی بات کو اہمیت دینی چاہیے کیوں کہ ایسا نہ کر کہ وہ والدین کا بھی دل دکھاتا ہے اور اللہ تعالی کی ناراضی بھی مول لیتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا حق خود پر ہے۔ جوانی کے دور میں اکثر لوگ اپنا وقت ضایع کرتے ہیں اپنی تعلیم پر توجہ نہیں دیتے اور بعض اوقات غلط صحبت میں پڑ کر برائیوں کے دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں اور جب انھیں احساس ہوتا ہے تو وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

جوانی کے دور میں اپنی عقل کے فتور میں اور لاابالی پن میں اکثر نوجوان دین سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات دین سے دوری کے سبب وہ غلط عادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی نصیحت نہ سننے کے باعث اکثر و بیشتر دینی و دنیاوی نقصانات اٹھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جوانی میں انسان چوں کی دنیا کی زیادہ جلدی مائل ہو جاتا ہے اور شیطان جو کہ انسان کا ازلی دشمن ہے اسے برائیوں کی طرف راغب کرتا ہے اسی لیے جوانی میں کی گئی عبادات

اللہ تعالی کو بے حد پسند ہیں کیوں کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بندہ اپنی خوش دلی سے اللہ کی عبادت کرتا ہے۔

نوجوانوں کو چاہیے کہ انہیں جب کہیں بھی کام کرنے کا موقع ملے تو ایمانداری اور محنت سے کام کریں۔ اپنی صلاحیتوں کو ملک وقوم کی خدمت میں صرف کریں تا کہ وہ معاشرے کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکیں اگر نوجوان نسل اپنی ذمہ داریاں خلوص نیت سے نبھائیں تو ہمارا ملک ترقی کی منازل تیزی کے ساتھ طے کرسکتا ہے۔

☆....☆....☆

رسول اکرم ﷺ بحیثیت مثالی شوہر

حسنین معاویہ

نبی کریم ﷺ ایک کامل واکمل انسان ہیں۔آپ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے،آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو قابل ستائش وقابل عمل اور مثالی ہے۔آپ ﷺ صرف پیغمبر، نبی اور رسول ہی نہیں بلکہ ایک بہترین باپ اور مثالی شوہر بھی ہیں۔آپ ﷺ ایک بہترین زندگی گزاری ہے چاہے وہ بحیثیت تاجر ہو،مبلغ ہو،معلم ہو آپ ﷺ کی نجی زندگی بھی ایک مثالی زندگی ہے۔بحیثیت شوہر اور رفیق حیات نبی اکرم ﷺ کا جو کردار ہے وہ ہر شوہر کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

آپ ﷺ نے اس پہلو پر بہت زیادہ زور دیا یہاں تک کہ آخری خطبہ (حجۃ الوداع) کے موقع پر بھی بیویوں کے حق میں نصیحت فرمائی۔''اگر کبھی تمہاری ان سے کسی بات پر اونچ نیچ ہو جائے اور بات جھگڑے تک پہنچ جائے تو ان کو آرام سے سمجھاؤ۔اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو تلاش نہ کرو، بے شک تمہارا عورتوں پر اور ان کا تم پر حق ہے''۔ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:''تم میں سے بھلا آدمی وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے بہترین ہو''۔ (ترمذی،ابن ماجہ)

آپ ﷺ نے 11 عورتوں سے نکاح کیا جن میں سے 2 ازواج نے آپ ﷺ کی زندگی میں ہی وفات پائی اور باقی نو ازواج آپ ﷺ کی وفات تک زندہ رہیں۔آپ ﷺ نے ہمیشہ ان کا خیال رکھا،کبھی بھی ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ان کی ہر جائز خواہش،ضرورت کا بھرپور خیال رکھا اور ان کو کبھی کوئی تکلیف نہ دی،ان کی ہر غمی اور خوشی میں برابر شریک رہے۔ان کے درمیان ہمیشہ میانہ روی اختیار کیے رکھی،زیادہ ہونے کے باوجود ان کو ہمیشہ خوش رکھا۔جب آپ ﷺ کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو اپنی ازواج کے درمیان قرع اندازی کرتے جس زوجہ کا نام نکلتا اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔آپ ﷺ نے تمام ازواج میں برابری کے لیے ان کے درمیان باری تقسیم کی ہوئی تھی۔ جس رات جس کی باری ہوتی آپ ﷺ اسی کے پاس رات گزارتے تھے۔

جب آپ ﷺ کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو اپنی ازواج کے درمیان قرعہ اندازی کرتے تھے جس زوجہ کا نام نکلتا اسے اپنے ساتھ لے جاتے، آپ ﷺ نے تمام زواج میں برابری کے لیے ان میں باری تقسیم کی ہوئی تھی، جس رات جس کی باری ہوتی آپ ﷺ اسی کے پاس رات گزاتے تھے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ، ''میں آپ ﷺ کے ہاں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی اور میری سہیلیاں بھی میرے ساتھ ہوتی تھیں، جب آپ ﷺ گھر تشریف لاتے تو سب ادھر اُدھر چھپ جاتیں تو آپ ﷺ خود ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے پاس بھیجتے تا کہ وہ میرے ساتھ کھیلیں''۔ (بخاری، مسلم)۔ ایک بار حج کے موقع پر ام المومنین حضرت صفیہؓ کا اونٹ راستے میں بیٹھ گیا اور یہ قافلے سے پیچھے رہ گئیں اور زور قطار رونے لگیں، آپ ﷺ تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے چادر کا پلو لے کر آنسوں پونچھتے رہے اور وہ روتی رہیں۔

ایک دن آپ ﷺ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ کے درمیان دوڑ کا مقابلہ ہوا کیوں کہ حضرت عائشہؓ اس وقت چھریرے بدن کی تھی اس لیے آگے نکل گئیں اور مقابلہ جیتا لیا۔ پھر کافی عرصہ بعد جب حضرت عائشہؓ کا بدن بھاری ہو گیا تو پھر مقابلہ ہوا اس دفعہ وہ سرکار دو عالم ﷺ سے پیچھے رہ گئیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا اس دن کا بدلہ ہو گیا۔

آپ ﷺ کا روزانہ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد ہر زوجہ کے گھر تشریف لے جاتے تھے، تا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ گھر میں کیسے تھے؟ کہنے لگیں تمام انسانوں میں نرم، سب لوگوں سے بڑھ کر عزت و وقار والے آپ ﷺ تمہارے مردوں کی طرح مرد تھے مگر یہ کہ آپ ﷺ زیادہ دیر تک مسکراتے رہتے تھے۔

آپ ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ گھر میں رہتے ہوئے گھر والوں کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، ان کی خدمت کرتے، جب کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو اس کو پیوند لگاتے، جوتا پھٹ جاتا تو اس کو اپنے دست مبارک سے سی دیتے، بکری کا دودھ بھی خود نکال لیتے تھے۔

الغرض آپ ﷺ کی زندگی کا یہ پہلو بھی باقی پہلوؤں کی طرح مثالی اور شاندار ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ پیغمبر اور رسول ہونے کے باوجود گھر میں اپنی ازواج کے کے ساتھ عام سی زندگی گزارتے تھے۔ ہمارے لیے اس پہلو میں سبق ہی سبق ہے۔ ہم زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کر کے ایک اچھے شوہر بن سکتے ہیں۔

☆....☆....☆

کامیابی سے ملاقات

بلال شیخ

بدقسمت کو کسی بابا مشورہ نے بتایا کہ فلاں پہاڑ کی چوٹی پر کامیابی نے اپنا ڈیرہ ڈالا ہوا ہے کہتے ہے جو اس سے ملتا ہے اس کی زندگی بدل جاتی ہے۔ بابا مشورہ نے کہا ''راستہ کوئی آسان نہیں جو بھی اس رستے سے گزرتا ہے سہی سلامت نہیں رہتا کئی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو کوئی ناکام واپس آ گے کچھ نہ مل سکا ان کو''۔مگر بدقسمت نے خود کو اس مشکل سفر کے لیے تیار کر لیا۔اس نے امیدوں کو بیگ میں ڈالا، ہاتھ میں بہادری کا ڈنڈا پکڑا اور سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔

بدقسمت نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا اس کو بابا مشورہ کی بات یاد تھی مگر وہ اس دفعہ ارادہ کر چکا تھا۔ وہ کچھ تھوڑا سا ہی پہاڑ پر چڑھا تھا کہ پست حوصلہ کر دینے والے گیدڑوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ گھبرا گیا گیدڑ اس کو دیکھ کر چیخ رہے تھے جب بھی وہ ان گیدڑوں کو ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے انہیں ڈراتا تو وہ ڈر جاتے مگر پھر وہ اس کے قریب آ جاتے پہلے تو وہ گھبرایا مگر پھر اس نے دیکھا حوصلہ شکن گیدڑ ڈرپوک ہیں۔ بدقسمت نے سمجھا شاید راستہ آسان ہو گیا ہے مگر وہ غلط تھا۔آ گے چڑھائی چڑھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ حسدی کتے بھونکتے ہوئے اس کے قریب آ گئے وہ حیران ہو گیا۔

سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا وہ تعداد میں 3 تھے۔ان کتوں نے اس کو تینوں طرف سے گھیر لیا تھا کچھ دیر کے لیے اس کو لگا اب وہ نہیں بچے گا۔ایک حسدی کتے نے بھونکتے ہوئے اس پر حملہ کر دیا۔ کسی نے چاقو سے کتوں پر حملہ کر کے بدقسمت کو بچایا۔

بدقسمت نے اس کو دیکھا جو اس کی مدد کے لیے آیا تھا اس کا جسم فولادی تھا اور چہرہ بڑا خوشگوار لگ رہا تھا۔ بدقسمت نے اس سے پوچھا ''کون ہو تم ؟'' اس نے جواب دیا، ''میں ہمت ہوں میں ادھر ہی ہوتا ہوں تم جیسے اکثر اس رستے سے گزرتے ہیں میں ان کی حفاظت کرتا ہوں۔تم کامیابی سے ملنے جا رہے ہو نا، آ گے بڑھو اوپر چڑھتے جاؤ ابھی

کافی راستہ پڑا ہوا ہے گھبرانا نہیں آگے میری طرح اور بھی ہوں گے جو تمہیں اوپر جانے تک حفاظت کریں گے چلو جلدی کرو بدقسمت نے اس کی بات سنی تو آگے بڑھ گیا۔

چڑھائی اور مشکل ہوگئی راستے میں کافی بڑھے بڑھے پتھر پڑے تھے، کہیں سے پتھر اس کے اوپر گرنے لگ گئے اس نے اوپر منہ کیا تو تنقیدی بندر اس کے اوپر چھوٹے چھوٹے پتھر پھینک رہے تھے جو کہ بہت زور سے لگتے تھے اور اس کا جسم زخمی کر دیتے۔ وہ پریشانی سے کبھی ادھر بھاگے کبھی ادھر بھاگے اس کو کچھ سمجھ نہ آیا وہ کیا کرے پھر اس نے سوچا ان سارے بندروں سے میں نہیں لڑ سکتا اور اب واپس گیا تو مایوسی کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے گی تو اس نے اوپر چڑھنے کی رفتار تیز کر دی اور وہ چڑھتا گیا حتی کہ سارے بندر پیچھے رہ گئے اور اس کے اوپر پتھر برسنا بند ہو گئے مگر اس کا جسم کافی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کو کافی درد ہو رہا تھا اور وہ اسی درد کے ساتھ چل رہا تھا آگے گیا تو ایک بہت بڑا پتھر نظر آیا جس کے اوپر حوصلہ مند بیٹھا عبادت کر رہا تھا۔

بدقسمت نے سوچا شاید یہی کامیابی ہے۔ اس نے پوچھا ''تم کامیابی ہو؟'' ''نہیں میں حوصلہ ہوں کامیابی کافی بلندی پر ہوتی ہے تم چڑھو اوپر تھوڑا ہی راستہ رہ گیا ہے۔ تم کافی تھک گئے ہو''، حوصلہ مند نے کہا۔ ''ہاں ہمت جواب دے گئی میری''، بدقسمت نے کہا۔

''نہیں آگے بڑھو تمہارے حالات بدل جائیں گے بس تھوڑا سا دور ہی تو جانا ہے''۔ بدقسمت نے سنا اور اس کو جوش آیا اور وہ چل دیا حوصلہ مند کی بات سے اس کو لگا بس تھوڑا سا ہی ہوگا مگر ابھی تھکانے کے لیے آگے ناامید بھیڑیا بیٹھا تھا جب بدقسمت نے دیکھا تو وہ ڈر گیا۔ وہ دیکھنے میں بہت بھیانک لگ رہا تھا اور پچھلے جتنے مسائل آئے تھے ان میں سب سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا۔

ناامید بھیڑیے نے دیکھا تو وہ چوکنا ہو گیا اور اس پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ بدقسمت نے سمجھا بھیڑیا بھوکا ہے تو اس نے بیگ میں سے کافی ساری امیدیں نکال کر اس کے سامنے پھینک دی۔ جس کو وہ کھانے لگ گیا اور اس طرح جو مسئلہ سب سے بڑا لگ رہا تھا وہ سب سے آسان ہو گیا بالآخر بدقسمت کامیابی کے اپنا ڈیرے پر پہنچ گیا۔

جب بدقسمت اوپر پہنچا تو کامیابی بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا اس کے چہرے پر بڑا سکون تھا۔ اس کا چہرہ پر رونق تھا۔ کامیابی نے لکھتے لکھتے کہا، ''آجاؤ تمہارا ہی انتظار تھا''۔ بدقسمت بڑا حیران ہوا۔ ''بتاؤ کیا چاہیے کیا لینے آئے ہو''، کامیابی نے پوچھا۔

''میں بدقسمت ہوں میرے حالات بہت خراب ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں، میں بے کار ہوں ناکام ہوں، سب کے لیے فضول ہوں، سب میرا مذاق اڑاتے ہیں، میرا ہر لمحہ زوال ہے آپ کے پاس حالات کی بہتری کے لیے آیا ہوں کوئی طریقہ ہی بتا دیں''، بدقسمت نے کہا۔ کامیابی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ بدقسمت کو دیا اور کہا۔

یہ لو تمہاری سند اب تم نا کام اور بے کار نہیں رہو گے۔ تمہارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ بدقسمت نے سند پکڑی تو اس میں لکھا تھا۔

''شکر گزاروں کو اپنا ساتھی بنا لو اور مغروروں سے دور رہو''۔ بدقسمت نے سند جیب میں ڈالی اور شکریہ کہہ کر واپس جانے لگا تو پیچھے سے آواز آئی، ''اب سے تمہارا نام خوش قسمت ہوگا اور یاد رہے جو اوپر آنے کا راستہ ہے وہی نیچے جانے کا راستہ بھی ہے مگر تم سب کے لیے رہنما بن جاؤ گے''۔ خوش قسمت اب سب کچھ سمجھ گیا تھا اور نیچے جانے کے لیے تیار تھا۔

☆....☆....☆

صلاح الدین ایوبی، دسویں صدی کا رجل عظیم

ایمن احمد

دنیائے اسلام کی تاریخ میں بڑے بڑے فاتحین نے جنم لیا ہے۔محمد بن قاسم جیسا سپہ سالار،محمود غزنوی جیسا شہسوار، ٹیپو سلطان جیسا نڈر حکمران، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور یوسف بن تاشفین جیسے فاتح۔ان تمام ہستیوں نے عرصہ دراز تک عالم کفر کی رات کی نیند کو حرام کیے رکھا لیکن تاریخ اسلام میں صلاح الدین جیسا حکمران آج تک روئے زمین پر دوبارہ پیدا نہیں ہوا۔ یہ کہانی اس دور سے شروع ہوتی ہے جب مشرق وسطیٰ کی فضائیں صلیبیوں کا عروج دیکھ رہی تھیں۔

جب مسلمان اپنی کٹھ پتلی حکومت کے رحم وکرم پر تھے اور ایوبی جیسے بطل عظیم کی راہ تاک رہے تھے۔کہا جاتا ہے کہ صلاح الدین کے والد نجم الدین نے ایک ایسی عورت سے شادی کی خواہش کی تھی کہ جس سے اسے ایک بیٹا عطا ہو اور وہ فاتح بیت المقدس بنے اور پھر اس کے ہاں صلاح الدین کی پیدائش ہوئی جس نے بیت المقدس ایسے فتح کیا کہ انیسویں صدی تک دوبارہ یہود و نصاریٰ اس کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

صلاح الدین ایوبی بیک وقت حکمران بھی تھا اور سپہ سالار بھی۔انھوں نے ایک ایسے دور میں ہوش سنبھالا جب مسلمان ہر طرف سے کفر کے محراب میں گھرے ہوئے تھے۔ جب مشرق وسطیٰ کے حکمران صلیبیوں کو اپنی آغوش میں جگہ دے چکے تھے اور جب غداری کا بازار گرم تھا۔ایسے میں وہ لوگ جن کے دلوں میں شمع ایمان کی لو ابھی جگمگا رہی تھی کسی ایسے ہی معجزہ کے رونما ہونے کا انتظار کر رہے تھے جو انہیں اور ان کے ایمان کو جائے پناہ دے۔ یہ وہ وقت تھا جب قبلہ اول ایک بار پھر نصاریٰ کی توجہ کا محور بن چکا تھا اور مسلمان پھر اس کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور مالک کائنات کو یہ کام صلاح الدین سے لینا ہی منظور تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایوبی کو اندرونی جنگ بھی لڑنا تھی کیوں کہ اس کی اپنی قوم کے لوگ ہی غداروں کے ساتھ مل چکے تھے جو مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جس پر وقت پر قابو پانا ایسے ہی ضروری تھا جنگل میں بھڑکتی ہوئی آگ پر قابو پانا ضروری ہے۔ کیوں کہ ایک بار پھر نضر بن حارث کی سوچ کے حامل افراد یک مشت ہو چکے تھے جو اہل ایمان کو گمراہ کرنے کے لیے عورت کا سہارا لیتے تھے۔ مسلمان نوجوانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی تمام تر کوششیں زور وشور سے جاری تھیں۔ کمزور ایمان والے تیزی سے اس فتنے کا شکار ہو رہے تھے۔ خود صلاح الدین ایوبی کو اس فتنے کی آڑ میں سات بار قتل کرنے کی ناکام سی کوشش کی جا چکی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کی مدد کے تمام تر انتظامات اپنے ذمے لے رکھے تھے کیوں کہ ان کی نیت خالص اور کوشش سچی تھی اور مقصد رضائے خدا اور پرچم اسلام کی سربلندی تھا۔

ان کا ایک راز دار ہم نوا علی بن ابی سفیان تھا جو ہر وقت اس کو ساتھ رہتا تھا۔ علی بن ابی سفیان کو خدا نے یہ صلاحیت دے رکھی تھی کہ وہ خبر رسانی وخبر گیری بہت اچھی کرتا تھا۔ آج کل کی زبان میں اسے انٹیلی جینس کہا جاتا ہے۔ اندر کی جنگ لڑنے میں ایوبی کے ساتھ اس کا بہت بڑا ہاتھ تھا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اندر کی جنگ اور باقی تمام امور علی بن ابی سفیان نے سنبھالے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ صلاح الدین باہر کی جنگ لڑنے میں مصروف تھے۔

فاروق اعظمؓ کے بعد بیت المقدس کی فتح کا سہرا ایوبی کے سر جاتا ہے۔ نہ صرف علی بن ابی سفیان بلکہ ایوبی کی پوری ٹیم خداداد صلاحیتوں کی مالک تھی امت اسلام کا درد رکھنے والی تھی اور خلوص دل کے ساتھ بغیر کسی مفاد کے اپنی قوم کے لیے کام کرنے والی تھی۔ صلاح الدین خود بھی غیرت مند انسان تھے اور اس بات کے تحت وہ اپنی قوم کے نوجوانوں پر خصوصی توجہ دیا کرتا تھا۔ انھوں نے کبھی مال جمع نہیں کیا تھا صدقہ وخیرات ایک طرف ایوبی اپنا ذاتی مال بھی جہاد کی راہ میں جتنا ہو سکے لگاتے تھے۔ یہاں تک کہ حج کرنا ان کی دیرینہ خواہش تھی مگر ان کے پاس حج کے لیے زاد راہ نہ تھا۔ ایوبی کا نظریہ تھا کہ سلطنت اسلامیہ کی کوئی سرحد نہیں۔

جس روز امت محمد ﷺ نے اپنے آپ کو سرحدوں کا پابند کر لیا اس روز امت کا زوال شروع ہو جائے گا اور سلطنت اسلامیہ کی سرحدیں سکڑنے لگیں گی۔ 4 مارچ 1139ء کو سلطان صلاح الدین ایوبی اپنے فجر کی اذان کی صدا کی ساتھ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ کہا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد اگر قوم پر کوئی ضرب کاری پڑی ہے تو وہ صلاح الدین ایوبی کے انتقال کی ہے۔ اس وقت امت مسلمہ پر غم کی جو گھٹا چھائی وہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

آج کی نوجوان نسل اور موجودہ حکومت کے لیے صلاح الدین ایوبی کی سیرت وکردار میں بہت سے پیغامات پنہاں ہیں۔ جس نے بیک وقت راہنمائی، سپہ سالاری اور حکمرانی کے اصول سے دنیا کو آشنا کرایا۔ مگر افسوس ہے کہ آج غیر تو ہمارے اسلاف کے نقش قدم پر چل رہے ہیں مگر ہم غیروں کے اسلاف کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

آج ہمارے بچے کیا بلکہ نوجوان بھی ان فاتحین کے ناموں تک سے نا آشنا ہیں مگر پھر بھی انہیں نصاب میں چنگیز خاں اور ایڈولف ہٹلر پڑھایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں میں حکوت سے کچھ نہیں کہوں گی بلکہ والدین سے درخواست کروں گی کہ وہ اپنے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا بندوبست خود کریں نہ کہ تعلیمی اداروں کو اس کا قصوروار ٹھہرائیں۔ اس لیے کہ تعلیمی ادارے آپ کے اختیار میں نہیں لیکن بچے آپ کے اختیار میں ہیں۔انہیں اپنی تاریخ اور حقیقی ہیروز سے آگاہ کریں کہ ہم کن لوگوں کی نسل ہیں۔ ہمارے اسلاف کون ہیں اور انہوں نے کیا کیا عظیم کارنامے سرانجام دیے۔

☆....☆....☆

استاد، تعظیم کا حقیقی حقدار

مریم بتول

استاد معمار قوم وملت، یہ وہ ہستی ہے جو اندھیروں میں شمع روشن کرتی ہے۔ یہ وہ شخصیت ہے جو تعلیم وتربیت کا منبع ومحور ہے۔ والدین اولاد کو آسماں سے زمین پر لاتے ہیں جب کہ استاد بچوں کو زمین سے آسمان پر پہنچتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ علم کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا اور علم کے لیے معلم کا ہونا لازمی ہے۔ اگر ہم تخلیق انسانی پہ نظر دوڑائیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالی معلم اول ہیں کہ جب خدا تعالی نے انسان کو پیدا کیا تو ساتھ ہی اسے اشیاء کا علم سیکھا دیا۔ ارشاد ربانی ہے، ''اور آدمؑ کو اللہ کریم نے سب چیزوں کے نام کا علم عطا کیا''۔

اللہ تعالی نے انسان کی تعلیم کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث فرمائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ''بلاشبہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ آپ نے پہلے خود اپنے صحابہ کو تعلیم دی اور پھر ان میں سے کامل افراد کا انتخاب کیا جو اس کام کو آگے لے کر چلیں۔ والدین کے بعد سب سے زیادہ قابل تکریم ہستی استاد ہوتا ہے۔ آپ کے ارشاد کے مطابق ''استاد کی حیثیت روحانی باپ کی ہے''۔ دنیا میں اگر کوئی ہماری کامیابی پر خوش ہوتا ہے آگے بڑھنے کی دعائیں دیتا ہے تو وہ والدین کے بعد ہمارا استاد ہی ہوتا ہے۔ جو اپنے شاگرد کو اپنے سے بھی بلند مقام پر دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ طالب علم پر استاد کا اتنا ہی حق ہے جتنا والدین کا اولاد پر، ہر عظیم شخص کے دل میں اپنے استاد کے احترام کے بے شمار جذبات پائے جاتے ہیں۔ سکندر اعظم اپنے استاد کی بے حد عزت کیا کرتے تھے وجہ پوچھنے پر بتایا کہ ''میرا باپ میرے لیے باعث حیات فانی ہے جبکہ میرا استاد میرے لیے باعث حیات جاوداں ہے۔ میرا باپ میرے جسم کی پرورش کرتا ہے جب کہ میرا استاد میری روح کی''۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب ہندوستان کی انگریز حکومت نے شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کو سر کا خطاب دینے کا ارادہ کیا تو وقت کے گورنر نے اقبالؒ کو اپنے دفتر آنے کی دعوت دی۔ اقبالؒ نے یہ خطاب لینے سے انکار کر دیا۔

جس پر گورنر بے حد حیران ہوا۔ وجہ دریافت کی تو اقبالؒ نے فرمایا، ''میں صرف ایک صورت میں یہ خطاب وصول کر سکتا ہوں کہ پہلے میرے استاد مولوی میر حسنؒ کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے''۔ یہ سن کر انگریز گورنر نے کہا، ''ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو سر کا خطاب اس لیے دیا جا رہا ہے کہ آپ بہت بڑے شاعر ہیں۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انہی لوگوں نے ترقی کی ہے جنہوں نے اپنے معلمین کی قدر کی ہے۔ استاد بادشاہ نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے شاگرد کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔ جو شاگرد اپنے اساتذہ کا ادب کرتے ہیں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ قانون ارتقاء کی رو سے باعلم قوموں کو حق حاصل ہے کہ کم علم قوموں پہ حکمرانی کریں۔ ترقی یافتہ قوموں نے ہی اس زمین پر حکمرانی کی ہے اور ان پڑھ قومیں ماتحت رہیں۔

☆....☆....☆

صحافت جرائم پیشہ افراد کا گنگا جمنا

علی احمد ساگر

صحافت ایک عظیم شعبہ ہے۔ معاشرے میں اس کی اہمیت اور افادیت سے ہر ذی شعور بخوبی واقف ہے۔ صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون جب کہ معاشرے کی آنکھ اور کان کا درجہ حاصل ہے۔ عام آدمی کی آواز کو اعلی ایوانوں تک پہنچانے اور جلد انصاف کی فراہمی میں صحافت کا بڑا اہم کردار ہے۔ شعبہ صحافت سے وابستہ افراد (صحافیوں) نے اپنے مفادات کو پس پشت ڈالتے ہوئے شب و روز محنت اور کاوشیں کر کے اسے بہت بڑا مقام دلوایا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت شعبہ صحافت ترقی کی جس منزل پر پہنچ چکا ہے اب اس سے آگے اوپر جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ تاہم اگر آج سے 25 سے 30 سال پیچھے چلے جائیں تو اخبارات اور اس سے ملحق افراد کی تعداد تو بہت کم تھی البتہ وہ اپنے کام میں پختہ، تجربہ کار اور معیار پر پورا اترنے والے تھے۔

بدقسمتی سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج 90 فیصد شعبہ صحافت سے وابستہ افراد غیر صحافتی اور متعدد صحافیوں کے ستائے ہوئے اور ان سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ اس شعبہ سے وابستہ اکثریتی افراد نے اپنے دو نمبر کاروبار کو تحفظ دینے کے لیے اس عظیم شعبہ کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں پراپرٹی، سگریٹ کا کاروبار کرنے والے، کالج یونیورسٹیز، ڈیئری فارمز، کارخانوں، پیٹرول پمپس، ہوٹلز، فوڈ ملز کے مالکان اور ٹھیکیداران اسی طرح کرپٹ ریٹائرڈ سرکاری افسران اور یہاں تک کہ منشیات کا کاروبار کرنے والے اربوں پتی افراد نے صحافیوں سے تنگ آ کر اپنے اخبارات اور چینلز بنا لیے ہیں۔ بڑی شرم کی بات یہ ہے کہ یہ غیر صحافتی میڈیا مالکان ایک پریس ریلیز بھی اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتے۔ اتنا برا حال تو ملکی سطح پر ہے جب کہ علاقائی سطح پر تو اس سے بھی زیادہ برا حال ہوا ہے۔

صحافت مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ نچلی سطح پر علاقائی رپورٹرز کا اس طرح استحصال کیا جا رہا کہ نہ تو ان کی کوئی تنخواہ

ہوتی بلکہ ان سے ہزاروں روپے سالانہ بزنس کی شکل میں وصول کیے جاتے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادارے اپنے رپورٹرز کو خود کرپشن کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ بڑے بڑے اخبارات کے اداروں میں نیوز پر بیٹھنے والے کمپیوٹر آپریٹرز ماہانہ رقم لے کر خبروں کی اشاعت کرتے ہیں۔ صحافت کمزور اور غریب پڑھے لکھے افراد کی پہنچ سے باہر ہو چکی ہے۔ اخبارات، چینلز میں رپورٹرز بننے کے لیے تعلیم، تجربہ کریکٹر سرٹیفکیٹ کی تو ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ وہاں تو صرف اور صرف پیسے کی بولی لگتی ہے جو پیسے زیادہ دے وہیں نمائندہ بن جاتا ہے خواہ وہ چور، ڈاکو، رہزن، بدمعاش، سٹے باز یہاں تک کہ اگر کسی قبہ خانے کا دلال ہی کیوں نہ ہو۔ رہی سہی کسر ڈمی اخبارات اور ویب چینلز نے نکال دی ہے۔

ڈمی اخبارات اور ویب چینلز کی بڑھتی ہوئی تعداد نے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں دو نمبر رپورٹرز کا جال بچھا رکھا ہے۔ ان پڑھ، ہل گوار دو نمبر رپورٹرز گلی محلوں میں لوگوں کو پریشان کر کے بلیک میل کرتے ہیں اور ان سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ ڈمی اخبارات اور ویب چینلز کے مالکان جن میں عمومی طور پر پرائمری پاس بھی نہیں ہوتے سوشل میڈیا کا سہارا لیتے ہوئے ہیں ''ضرورت نمائندگان'' کے اشتہارات پھیلا دیتے ہیں اور اپنے ہی جیسے لوگوں کو رپورٹرز کا جعلی کارڈ دے کر پہلے تو خود پیسے وصول کرتے ہیں اور بعد میں اپنے رپورٹرز کو بھی گلی محلوں میں شرفاء کی پگڑیاں اچھالنے اور انہیں بلیک میل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں دو نمبر رپورٹرز کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ اب یہ بات درست ثابت ہو رہی ہے کہ آج کل تو ریڑھی بان بھی صحافی بن چکے ہیں۔

''ایک صحافی تانگے پر سفر کر رہا تھا جب وہ اپنی منزل پر پہنچا تو ''کوچوان'' نے کرایہ مانگا۔ تو صحافی نے اپنا کارڈ نکالا اور کہا کہ میں تو پریس رپوٹر ہوں۔۔ ''کوچوان'' نے جوتا اتارا اور اس کے سر پر مارا اور اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا کہ پاگل تو ایک پریس رپورٹر ہے۔ میں تو بیورو چیف ہوں''۔

بدقسمتی اور معذرت کے ساتھ آج اس وقت صحافت کا ہر جگہ یہی حال ہوا ہے۔ میری مراد ان صحافیوں کے بارے نہیں جو آج بھی حق اور سچ کا علم بلند کیے ہوئے عظیم شعبہ، شعبہ صحافت کے ماتھے کا جھومر ہیں بلکہ ان نام نہاد شرفا اور نام نہاد معززین کے لیے ہے جو اپنے کالے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے صحافت کا سہارا لیتے ہیں۔ جیسے ہندو اپنے گناہ، پاپ دھونے کے لیے گنگا جمنا میں اشنان کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ ناجائز کاروبار کو تحفظ دینے کے لیے صحافت کو گنگا جمنا بنائے ہوئے ہیں لیکن اب تو لگتا ہے کہ صحافت ان لوگوں کے گناہ دھوتے دھوتے خود ہی میلی ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے حکومتی سطح پر بھی کوئی عملی اقدامات نہیں کیے جا رہے اگر اس حوالے سے جلد از جلد عملی طور پر کچھ نہ کیا گیا تو آنے والے وقتوں میں پاکستان میں صحافت اور زیادہ پستی کا شکار ہو سکتی ہے۔

☆....☆....☆

فرائض میں کوتاہی کیوں؟

ام کلثوم

ثمرہ بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور زور سے چلائی، آپی دیکھیں میرا وزن بڑھ گیا ہے، وہ پریشانی سے بولتی ہوئی پوری گھوم گئی۔ نمرہ نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولی، کہاں بڑھا ہے؟ صحیح تو ہو۔ ''آپی آپ ٹھیک سے تو دیکھیں ناں، میں ابھی چیک کروا کر آئی ہوں''، اس نے منہ بسور کر کہا۔

''کہاں گئی تھیں؟'' نمرہ نے پوچھا۔ ''فرح کے گھر، ان کے پاس مشین ہے نا وہیں پہ دیکھا۔ پتا ہے آپی بڑھتا ہوا وزن صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہے مجھے فرح نے اتنی باتیں بتائیں کہ رہی تھی کہ ہائیٹ اور ویٹ میں بیلنس رکھو، اپنے جسم کا ٹھیک سے خیال رکھا کرو۔ آج کے دور میں یہ بہت عجیب لگتا ہے کہ بندہ ایسے ہی اپنے آپ سے لاپروا رہے اور لڑکیوں کو تو خصوصی خیال رکھنا چاہئے ثمرہ روانی سے بولتی گئی۔

اور کہہ رہی تھی کہ اپنے بالوں کو دیکھو کیسے ہو رہے ہیں اور کلر بھی خراب ہو گیا ہے۔ آپی! دیکھیں نا میں ایسی ہو گئی ہوں؟ اور اس نے مجھے بالوں کے لیے بہت ساری ٹپس دیں اور چہرے کے لیے بھی ماسک بتائے۔ اب تو بھئی میں اپنی خوب کیئر کروں گی۔ فرح کے تو یہ لمبے اور پیارے بال تھے اور چہرہ بھی چمک رہا تھا اور میں''۔ وہ بات کرتے کرتے اٹھی اور جا کہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی اور خود کو دیکھنے لگی۔ نمرہ اس دوران کچھ سوچتی رہی پھر اس نے ثمرہ کو کہا، ''ثمرہ! کتنی دیر بیٹھی تم فرح کے گھر؟''۔ ''آپی تقریبا دو گھنٹے''، ثمرہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا! دو گھنٹے بس یہ ہی باتیں ہوئیں؟'' نمرہ نے پوچھا۔ ''جی آپی پھر فرح نے کچھ ویڈیوز وغیرہ بھی دکھائے ہیلتھ اور بیوٹی ٹپس کے''، ثمرہ نے بتایا۔ ''تم دونوں نے نماز پڑھی؟'' نمرہ کے اس اچانک سوال پہ ثمرہ گھبرا گئی کیوں کہ ثمرہ نماز کے معاملے میں کافی سست تھی لیکن نمرہ گھر میں کوشش کر کہ اس کی نماز قضا ہونے نہیں دیتی تھی۔ ''آپی وہ! باتوں باتوں میں پتا نہیں چلا کیسے دونوں نمازیں قضا ہو گئیں''، ثمرہ نے شرمندگی سے کہا۔ ''ادھر میرے پاس آ کے بیٹھو''، نمرہ نے خود سے تین سال چھوٹی بہن کو پیار سے بلا کے پاس بٹھایا۔

''دیکھو میری پیاری بہنا! اللہ پاک نے ہمیں اس دنیا میں جو بھی نعمتیں عطا کی ہیں نا یہ سب عارضی ہیں۔ یہ آنکھیں، یہ بال، یہ جسم۔ان پہ ہم جتنی بھی محنت کریں گے نا یہ ختم ہو جائیں گی، لیکن ایک چیز ہے جو دائمی ہے وہ ہیں ہمارے اعمال نامے میں رقم کیے ہوئے ہمارے اعمال! جس طرح تم نے کہا ویٹ اور ہائیٹ میں بیلنس ضروری ہے اسی طرح دنیاوی اعمال اور اخروی اعمال میں بھی بیلنس بہت ضروری ہے۔ایک ایسی چیز کے پیچھے پڑ جانا، ہر وقت اس لیے محنت میں لگے رہنا جو ختم ہو جائے گی یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟'' نمرہ نے ثمرہ کو سمجھایا۔

''پر آپی دل تو کرتا ہے نا اچھا لگنے کا تو یہ بھی نا کریں کیا؟'' اس نے منہ بنا کہ کہا۔''میں نے ایسے تو نہیں کہا کہ بنو سنورو مت یا ہر وقت سر جھاڑ منہ پھاڑ رہو بلکہ صفائی تو نصف ایمان ہے اور انسان کے جسم کا بھی انسان پہ پورا پورا حق ہے کہ وہ اس کا خیال کرے لیکن میں حد سے تجاوز کرنے سے منع کر رہی ہوں کہ بس ان چیزوں میں گم ہو کر اپنا مقصد حیات نہ بھول جاؤ اور وہ آیت یاد ہے نا جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے''۔

''آج کل لڑکیوں میں یہ چیز بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، بالوں کی فکر، چہرے کی فکر، جسم کی فکر۔ گھنٹے گھنٹے بیٹھ کہ یہ ویڈیوز دیکھ رہی ہیں۔ کتنے فرائض و واجبات سے کوتاہی کرتی ہیں۔ میں نے لڑکیوں کو فرض نماز چھوڑنے پہ روتے نہیں دیکھا پر وزن بڑھنے پہ روتی ہیں۔نماز کے لیے سستی لیکن اپنے جسم کے کیے گھنٹے پارلر میں لگا دیتی ہیں۔ دیکھو! تم نے دو گھنٹے صرف یہ ٹاپک ڈسکس کیا اور دو نمازیں قضا کر دیں۔کیسی محفل ہو گی یہ جس میں اللہ کا ذکر تک نہ ہو! اپنے وقت کو کارآمد بناؤ۔ایسا کام نہ کرو کہ یہ وقت حسرت بن جائے تمہارے لیے''، نمرہ اتنا بول کہ خاموش ہو گئی۔''آپی آئندہ میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کروں گی اور ہر چیز کو برابر رکھنے کی پوری کوشش کروں گی''۔ان شاءاللہ، ثمرہ نے مسکرا کے کہا۔''اللہ تمہارے لیے آسانی فرمائے''، نمرہ نے کہا۔

☆....☆....☆

دوہرا معیار

معصومہ ارشاد سولنگی

''یہ بے چینی کب ختم ہوگی''؟، دلنشین نے شکوہ کیا۔''تیری یہ بے چینی اب ہم سے بھی دیکھی نہیں جاتی''، جیا کی ہمدردی پا کر اس کی بے بس آنکھوں سے بہتی آنسوں کی لڑی گالوں کو بھگو گئی۔عورت نے گھر سے باہر نکلنے کی بات کی، تو اسے آوارگی کا طعنہ ملا۔ کچھ کر کے اپنی پہچان بنانی چاہی، تو سنایا گیا کہ عورت کفالت کی ذمے داری سے آزاد ہے۔آزادی سے جینے کا حق مانگا تو اسے دائرہ اسلام کی حدود بتائی گئیں۔اندر کی ساری بے چینی بے بسی بن کر ان الفاظ میں دم توڑ گئی۔

''دلنشیں! تم نے خوامخواہ ایک چھوٹی سی بات کو دل پر لے لیا ہے۔ باپ اور بھائی ہونے کے ناتے لڑکی کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا حق ہے ان کو اور جیا کی دلیل ابھی پوری بھی نہ ہوئی کہ دلنشیں بول پڑی،''کوئی یہ تو بتاؤ۔کہاں لکھا ہے یہ، کہ حق کے نام پر عورت کو اس کی مرضی کے بغیر زبردستی کسی کے ہاتھ بھی بھیڑ بکری کی طرح بیچ دو؟ اور اگر دشمنی میں کوئی تیرے ہاتھ سے مارا جائے تو غیرت کے نام پر گھر بیٹھی بہن یا بیٹی کو کاری کر کے مار دو؟، وہ بلک اٹھی۔ جذبات کی شدت نے آنسوں کو روانی بخشی۔اس نے جب سے شازی کی موت کا سنا تھا وہ اسی صدمے کے زیر اثر تھی۔ شازی اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ابھی کچھ دن پہلے ہی تو وہ آئی تھی، اس کو اپنے بھائی کی بات پکی ہونے کی خوشخبری سنانے۔ بہت خوش تھی۔اس نے بھائی کی شادی کی تقاریب کو دھوم دھام سے منانے کے لیے ساری سہلیوں کو اکٹھا کیا تھا۔جس دھام دھوم سے بہن نے بھائی کی شادی منائی تھی۔ بھائی نے بھی اپنا فرض خوب نبھایا تھا۔اپنے زمینی تکرار کی وجہ سے دشمن کو مار کر قانون کی سزا سے بچنے کے لیے غیرت کے نام پر گھر میں گھستے ہی بہن کو کاری کر کے مار دیا اور کاری کا الزام دے کر خوب دھوم سے اس کا جنازہ نکالا اور باپ نے جوان بیٹے کو جیل جانے سے بچانے کی خاطر معصوم سی بیٹی کی قربانی ہنس کر قبول کر لی۔

مگر جیا یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت کے لیے محفوظ پناہ گاہ گھر ہے جس کا قرآن میں بھی حکم ہے۔ بشرطیکہ وہ گھر ہو، جہاں اس کے ساتھ کسی قیدی کی طرح پیش نہ آیا جائے نہ ہی اپنی انا کی جنگ جیتنے کے لیے قربانی کا جانور سمجھا

جائے''، جیا کے سمجھانے پر وہ چوٹ لگی شیرنی کی طرح بپھر گئی۔

''ایک عورت کے لیے اس کے رشتوں سے زیادہ کچھ اہم نہیں وہ اس گھر میں بھی خوش ہوتی ہے جہاں محبت اس کا مقدر نہ سہی مگر عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے اور رحم کی پناہ میں ہو۔ اگر اس سے برداشت نہیں ہوتا نا تو وہ معاشرے کا یہ دوہرا معیار ہی ہے جو ہر اسلامی نظریہ یاد رکھتا ہے مگر تب جب عورت حقوق کی بات کرے اور جب خود کی باری آئے تو سب تعلیم اور تربیت کہیں بے بس منہ تکتی رہ جاتی ہے۔

☆....☆....☆

ایک غلط بیانی

امان اللہ باجوڑی

بھائی کا گھر سے نکلے ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کا فون آیا، ''ہیلو، السلام علیکم، میں مدراس چوک کے پاس ہوں گاڑی پنکچر ہوگئی ہے جلدی آجاؤ''۔ یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔ میں نے فوراً اپنی گاڑی اسٹارٹ کی، گھر والے سب میرے اردگرد جمع ہوگئے اور پوچھنے لگے ''اب تم بھی کہاں جارہے ہو؟''۔ میں نے کہا، ''سب کچھ ٹھیک ہے، بس بھائی کو گاڑی پنکچر ہوگئی ہے اس کو پنکچر والے تک پہنچا آتا ہوں''۔ دراصل گھر والوں کی اس طرح بے چینی بجا تھی، چھوٹے بھائی کے ہاسٹل سے اس کے دوست کا فون آیا تھا کہ اسامہ کی طبیعت زیادہ ناساز ہے فوراً آکر ہسپتال پہنچادو۔ ابو نے فون کرنے والے سے پوچھا بھی کہ بائیک پر تو بیٹھ سکے گا نا اور ابو نے ہمیں جلد از جلد ہاسٹل پہنچنے کا حکم دیا۔ ابھی ہم مشورہ کررہے تھے کہ کون جائے کون نہیں کہ امی نے نہایت غصے میں کہا، ''تم باتوں میں لگ جاؤ اور وہاں میرا بیٹا مر رہا ہے اس کی پرواہ نہیں''۔ پھر بھائی نے نہایت پُرتی سے بائیک نکالی، تھوڑی ہی دیر بعد اس کا فون آیا اور مجھے مدراس چوک پر بلایا۔

میں جب وہاں پہنچا تو بھائی فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا تھا، بازو میں لگے ہوئے زخموں کو ٹٹول رہا تھا۔ اس کی بائیک بری طرح پھنس چکی تھی۔ بھائی نے بتایا، ''اللہ تعالی نے بہت کرم کردیا جو مجھے بچایا، دراصل میں بھائی کو لینے کے لیے تیزی میں تھا، کہ الٹے سمت سے آنے والی گاڑی کا خیال نہ رہا اور ایکسیڈنٹ ہوگیا، کار والا تو بھاگ گیا لیکن الحمدللہ میں ٹھیک ہوں، بس اب تم فوراً ہاسٹل پہنچو۔ بھائی کو ڈاؤ ہسپتال لے آؤ، لیکن آہستہ جاؤ کوئی جلدی نہیں کرنی''۔

میرا بھی سینے میں دل تھا، چاہتا تھا کہ جلد از جلد ہاسٹل پہنچوں لیکن بڑے بھائی کی ہدایات سامنے تھیں، گھبراہٹ کی وجہ سے جسم پر کپکپی سی طاری تھی۔ بیس منٹ بعد ہاسٹل پہنچا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ پورا گھنٹہ پہنچنے میں لگ

گیا۔ میں جیسے ہی گیٹ سے اندر داخل ہوا تو حیران رہ گیا، کیوں کہ بھائی موج مستی میں کینٹین کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہا، اس نے آ کر پوچھا، ''کیسے آنا ہوا؟۔ میں نے پہلے گلے سے لگایا اور پھر ساری داستان سنادی''۔ بھائی نے سر جھکایا پھر کہا، ''مجھے ہلکا سا بخار تھا، گولی کھائی تو اللہ تعالی نے شفاء دے دی۔ میرے دوست نے مجھے کہا کہ اپنے ابو کا نمبر دے دو تا کہ میں انہیں بلاؤں لیکن میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس نے کہیں سے نمبر ڈھونڈ نکالا اور مجھے بتائے بغیر آپ لوگوں کو تکلیف دے دی''۔

میں نے فورا گھر فون کیا، انہیں اصل صورتِ حال بتادی، لیکن خاص کر امی کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ سو میں بھائی کو لے کر گھر آ گیا۔ پورے راستے میں میں یہی سوچتا رہا کہ کس طرح ایک غلط بیانی یا مبالغہ آرائی سے ہم پر قیامت صغریٰ گزری۔ اس طرح تو کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، ہماری ایک غلط بیانی کسی کی جان بھی تو لے سکتی ہے اور ایک تسلّی کسی کی جان بچا بھی سکتی ہے۔ ہمیں خود احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ کسی کے لیے جان لیوا بھی ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارا دین بھی ہمیں درس دیتا ہے کہ ''پہلے تولو پھر بولو'' اور یہی عقلمندوں اور حکماء کا شیوہ بھی ہے۔ جب تک کسی بات کی مکمل تحقیق نہ ہو اسے آگے نقل کرنا نہایت نامناسب امر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ، ''آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ جو بات وہ سنے (بلا تحقیق کے) لوگوں میں پھلانا شروع کردے''۔

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ، ''زبان جسم کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے لیکن اس کا گناہ اور اثر بہت زیادہ اور گہرا ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ بعض منہ پھٹ قسم کے لوگ جو دل میں آتا ہے کہہ دیتے ہے، ان کو مخاطب کی ذرہ بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کس حالت میں ہے۔ میری یہ بظاہر چھوٹی سی بات ان کے زخموں پر نمک پاشی تو نہیں کرے گی۔ ہماری ایک ہی بے تکی بات سے کوئی اپنی عزت، مال و جان سے ہاتھ دھو بیٹھ بھی سکتا ہے اور پھر اس کے لیے خود بھی وبال کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کو اپنی بہت سی باتوں پر بعد میں پشیمانی ہوتی ہے لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے۔

لیکن اس کے برخلاف میٹھا اور شیریں زبان و لہجہ لوگوں کے دل جیتنے کا ذریعہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ، ''زیادہ بہتر اور اچھا انسان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''۔ (بخاری) دوسری حدیث میں ہے کہ، ''خوش قسمت ہے وہ شخص جو زبان کو قابو میں رکھے، گھر تک محدود رہے اور گناہوں پر روئے''۔ (ابوداؤد) تو ہمیں لوگوں کی عزتوں سے، ان کی زندگیوں سے اور ان کی خوشیوں سے کھیلنے کا اختیار نہیں ہے۔ ہم نے خوشیاں بانٹنی ہے اور لوگوں کو زندہ رہنے کا احساس دلانا ہے۔

☆....☆....☆

آئینہ

مدیحہ مدثر

ایک انتہائی اہم چیز ہے آئینہ جو ہماری زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دراصل آئینے کا کام ہے ہمارا اپنا آپ ہمارے سامنے کھول کر رکھنا۔ اب وہ ظاہری ہو یا باطنی آئینہ تو آئینہ ہے۔ جس قدر ہم اسے دیکھیں گے اسی قدر یہ ہمارا اصل چہرہ ہمارے سامنے کھولتا چلا جائے گا۔ آئینے سے ہم اپنا ظاہری بناؤ سنگھار بھی کر سکتے ہیں اور یہی وہ کام ہے جو شاید ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے اور آئینے کا استعمال بھی اسی کام کے لیے سب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ صبح اُٹھیں تو سب سے پہلے آئینہ، کالج، اسکول، آفس کہیں بھی جانا ہو تو آئینہ دیکھے بِنا جانا ناممکن ہے۔ کسی تقریب میں جانا ہو تو گھنٹوں آئینہ ہمارے سامنے رہتا ہے۔ پھر بھی بار بار جہاں آئینہ مل جائے بناؤ سنگھار وہیں شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اکثر خواتین کے پرس میں اور مرد حضرات کی جیب میں بھی موجود ہوتا ہے کہ جب موقع ملا نکالا اور اپنا آپ دیکھنا شروع کر دیا لیکن یہ تو صرف ظاہری کام ہے آئینے کا جو ہم بڑے شوق سے بلکہ زندگی کے لازمی جز کے طور پر کرتے ہیں۔ اگر آئینہ نہ ملے تو کسی سے ملنے کا دل ہی نہیں چاہتا کہ نجانے چہرہ ابھی کیسا ہو گا کہیں کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔

لیکن اس آئینے کا انتہائی اہم کام ہمارے اندر کی خوبصورتی ہمارے سامنے لانا ہے۔ ہماری شخصیت، ہمارا کردار ہمارے سامنے کھول کر رکھنا ہے، ہمارے کردار پر لگے داغ دھبے ہمیں دکھانا، ہمارا سچ اور جھوٹ ہمارے سامنے لانا، ہماری نفرت ہماری محبت اور ہماری عقیدت سب کھول کر رکھنا اسی آئینے کا کام ہے۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس آئینے کا استعمال کریں لیکن افسوس کہ ہم آئینے کا اصل استعمال کرتے ہی نہیں اور ظاہری استعمال ضرورت سے زیادہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ہر شخص دوسرے کی غلطیاں گنواتا نظر آتا ہے اور اپنی غلطیاں نہ اسے نظر آتی ہیں اور نہ ہی کسی کے کہنے پر غلطی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ کسی معاشرے میں بگاڑ کی بڑی وجہ یہی بات ہے کیونکہ غلطی معلوم ہو گئی تو ہم اپنی غلطی میں سدھار پیدا کریں گے لیکن ہم آئینہ بھی اپنی پسند کے مطابق استعمال کرنے کے عادی ہیں اور ہر خاص و عام انسان اس خود غرضی میں مبتلا ہے۔ عام زندگی میں دیکھ لیں ساس بہو کی غلطیاں گنواتی رہے گی اور بہو

ساس میں نقص تلاش کرتی نظر آئے گی، شوہر بیوی کی غلطیاں تو بیوی شوہر کی یعنی بہن بھائی ہوں یا گھر سے باہر اسکول، کالج یا آفس میں جہاں دیکھ لیں یہی حال ہے۔

سب دوسروں کی غلطیاں گنواتے نظر آتے ہیں اور جس کی غلطی ہو وہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ یہی بات تکرار اور لڑائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن نہ ہم ایک دوسرے کی غلطیاں گنوانا چھوڑتے ہیں اور نہ اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر یہی صورتحال ہمارے حکمرانوں کی ہے اور کیونکہ کام بڑے بڑے تو غلطیاں بھی بڑی بڑی اور جتنی غلطی بڑی اتنی ہی بحث وتکرار زیادہ ہوتی ہے اور یہ منظر خاص کر ٹاک شوز میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے بلکہ معلوم یوں ہوتا ہے کہ ٹاک شوز کا صرف اور صرف یہی مقصد ہے کہ تمام حکمران بیٹھ کر ایک دوسرے کی غلطیاں گنوائیں اور اپنی غلطیوں کو جھٹلائیں۔ اسی لیے آئینے کی سب سے زیادہ ضرورت ان ٹاک شوز میں نظر آتی ہے۔

کتنا ہی اچھا ہو کہ یہ حکمران ان ٹاک شوز کے دوران آئینہ سامنے رکھ کر بیٹھیں اور ایک دوسرے سے کچھ کہنے سننے کی بجائے آئینے سے نظر ملائیں اور اس میں نظر آنے والی تمام خامیاں دیکھتے بھی جائیں اور ان کا جواب بھی دیتے جائیں۔ لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم سدھار کی طرف جانا ہی نہیں چاہتے شاید ہم جانتے بھی ہیں کہ ہم غلط کر رہے ہیں لیکن ہم اس بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتے اور ہم اپنے جھوٹ کے ساتھ ان خرابیوں کو جنم بھی دیتے ہیں اور ان کی افزائش بھی کرتے ہیں۔

یہ المیہ ہے ہمارا جب کبھی غلطی سامنے آنے لگے تو آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ جیسے شتر مرغ طوفان سے بچنے کے لیے اپنا سر زمین میں چھپا لیتا ہے لیکن طوفان سے بچ نہیں پاتا ایسے ہی ہم بھی اپنی غلطیوں سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ آئینے سے نظر ہٹا لیتے ہیں لیکن ہم اپنی غلطیوں کے نقصانات سے بچ نہیں سکتے۔ آج اگر ہمارے حکمران بھی آئینے کا صحیح استعمال کریں تو یقیناً اپنی غلطیوں کو سدھار سکتے ہیں لیکن بات وہی آجاتی ہے کہ ہم دوسرے کو نہیں بدل سکتے لیکن اپنے اندر ضرور تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم دوسروں کو آئینہ دکھا دکھا کر اپنا وقت برباد کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے جب کہ ہم وہی وقت اپنے اوپر لگائیں تو بہت کچھ تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنی اخلاقی بنیادوں کو بھی خود ہی درست کر سکتے ہیں اور معاشرے کو بھی ہم اپنے آپ کو صحیح رکھنے کے ساتھ ہی سدھار سکتے ہیں۔

پس آئینہ اپنے ساتھ ہمیشہ رکھنا ہے اور وہ آئینہ جو ہمارے اندر کا حال بتا دے۔ دراصل وہ ہمارا ضمیر ہے۔ آج ضرورت اسی بات کی ہے کہ ہم اپنا ضمیر جگائیں۔ اپنے گھر کے معاملات درست کرنے سے آغاز کریں اور ساتھ ہی باہر کے تمام معاملات میں میل جول، لین دین سمیت ہر عمل کو اپنے آئینے کی مدد سے درست کرنا شروع کریں اور اپنے ملک کی ترقی کے بارے میں بھی سوچیں۔

ہم ملک کو اچھے حکمران دے سکتے ہیں۔ ان بے ضمیر حکمرانوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم خود صحیح ہیں

تو ہم سب کچھ بدل کر رکھ سکتے ہیں۔ ہم اپنے حصے کا کام کر ڈالیں اور دوسروں کے بارے میں چھوڑیں۔ غلطیوں کی نشاندہی بھی ضروری ہے لیکن اپنے عمل کی درستی کے ساتھ اور صرف نشاندہی ہی نہیں بلکہ جہاں دوسرا غلط بھی کرتا نظر آئے وہاں ہم صحیح کرنا شروع کریں۔ ہم پہلا قدم معاشرے کے سدھار میں اُٹھانے والے بن جائیں تو یقیناً اللہ ہماری منزل ضرور آسان کرے گا اور اچھائی کی راہ میں قدم سے قدم ملانے والے ہمارے ہم قدم بن جائیں گے۔

☆....☆....☆

عبادت کے معنی و مفہوم، قبولیت کے تقاضے

عالیہ ذوالقرنین

عبادت کا لفظ ''عبد'' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں پرستش اور بندگی کے ہیں۔ اصطلاحاً اس کے معنی وہ مذہبی ارکان ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے اختیار کیے جائیں۔ عبادات کی دو اقسام ہیں۔ توقیفی عبادات اور غیر توقیفی عبادات۔ توقیفی عبادات وہ ہے جن کے کرنے کا طریقہ قرآن وسنت کی روشنی میں بتا دیا گیا اور اب قیامت تک اس میں تبدیلی ممکن نہیں مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ جبکہ غیر توقیفی عبادات وہ ہیں جن میں ردو بدل ممکن ہے جیسے تبلیغ دین، امر بالمعروف نہی ان المنکر وغیرہ۔

اللہ رب العزت نے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کر کے اس دنیا میں بھیجا اور جہاں اسی کی جسمانی ضرورت کے لیے اشیاء ارض کو مسخر کر دیا وہیں اس کی روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس کو اپنی عبادت کا پابند بنایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا''۔

حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ: حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سوار تھا۔

آپ نے فرمایا ''اے معاذ! کیا تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر کیا ہے؟'' میں نے کہا، ''اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اسے عذاب نہ دے''۔

تقویٰ کے معنی بچنا کے ہیں۔تقویٰ سے مراد پرہیز گاری ہے،یعنی تمام عبادات کی بنیاد ہی تقویٰ ہے اور یہی انبیا علیہ السلام کا وصف ہے۔حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،''تقویٰ یہاں ہے،تقوی یہاں ہے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے 3 بار یہ لفظ دھرایا۔یعنی انسان کا تقویٰ ظاہری نہیں بلکہ اس کے اندر دل میں موجود ہوتا ہے۔

قرآن میں کئی سو آیات میں تقویٰ کی اہمیت پر زور دیا گیا اور اسے انسان کے لیے لازم قرار دیا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے،''اے لوگو! بلا شبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر ہم نے تم کو مختلف قبیلوں و قوموں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے''۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ علیہ السلام نے تقویٰ کو انسانی فضیلت کا معیار قرار دیتے ہوئے فرمایا''کسی عربی کو کسی عجمی پر،کسی عجمی کو کسی عربی پر،کسی گورے کو کالے پر یا کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں مگر تقویٰ کے سبب''۔

دین اسلام ایک فطری دین ہے اس لیے یہ انسان کے ہر ایسے کام کر شروع میں ہی رد کر دیتا ہے جو نمود و نمائش اور ریا کاری کی غرض یا نیت سے کیا جائے۔

اخلاص عبادات میں روح کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے''اللہ کی عبادت کرو،صرف اس کے بندے ہو کر،ہاں خالص اللہ ہی کی بندگی ہے''۔(القرآن)

بخاری شریف کی پہلی حدیث مبارکہ بلا شبہ عبادات میں اخلاص کا بنیادی سبق دیتی ہے۔حدیث مبارکہ ہے :''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''۔نماز،روزہ،حج،زکوٰۃ اور دیگر تمام امور زندگی میں اخلاص کی بنیاد پر عبادات کے قبول ورد ہونے کی کسوٹی ہے اسی لیے تمام نیک اعمال کے لیے انسان کا مطلوب و مقصود اخلاص نیت ہونا چاہیے۔ایسے اعمال جن کی بنیاد میں اخلاص کا پانی نہ ہو خواہ کتنے ہی عظیم الشان ہوں اللہ رب العزت کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ''اللہ تعالی تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے''۔(صحیح مسلم)

خشیت کے معنی ڈر اور خوف کے ہیں اور خشیت الٰہی سے مراد اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس سے حیا کی وجہ سے گناہ اور اپنی خواہشات سے رک جانا اور اس کی رحمتوں کے طلب گار ہونا۔

ابو حفص رحمہ اللہ علیہ نے خشیت کی تشریح یوں فرمائی ہے''قلب مومن میں خشیت وہ شمع ہے جس کی روشنی کی بدولت وہ خیر و شر میں فرق کر سکتا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے''بے شک جو لوگ اپنے رب کی خشیت سے مضطرب اور لرزاں رہتے ہیں اور جو لوگ

اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے ربّ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتے اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جتنا وہ دے سکتے ہیں اور (اس کے باوجود) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ وہ اپنے ربّ کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی لوگ بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں اور وہی اس میں آگے نکل جانے والے ہیں''۔

انسانی زندگی میں خشیت الٰہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہی وہ صفت ہے جو اسے تنہائی میں بھی گناہ سے باز رکھتی ہے۔ اللہ رب العزت کے سامنا کرنے اور دیکھنے کا خوف مومن کی زندگی میں اس قدر شامل ہوتا ہے کہ وہ ہر ہر لمحہ خوفِ خدا میں گزارتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سلف الصالحین بہترین طریقے سے عمل کرنیاور اپنی دنیاوی خواہشات سے رک جانے کے باوجود خشیت الٰہی سے کانپتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ایک انسان کو اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے جو اشرف المخلوقات کے معنی و مفہوم پر پورا اترتا ہو اسی لیے اس نے عبادات میں تقویٰ، اخلاص اور خشیت الٰہی کو بنیادی اہمیت دے کر مسلمان کو ان کے مطابق زندگی گزارنے کا پابند بنایا اور یہاں آقا علیہ السلام کی حدیث مبارکہ نے یہ بات سمجھنے میں مزید آسانی فرما دی۔

ارشاد نبوی صل اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے''۔ تو اس دنیاوی قید میں رہتے ہوئے اگر ہم اپنی زندگیاں تقوی اخلاص اور خشیت الٰہی کی بنیاد پر گزاریں گے تو یقیناً اخروی کامیابی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔

☆....☆....☆

گوشت خور گدھ اور مسلمان

سفیر احمد چوہدری

گدھ جس کو دنیا کا بے حس، ظالم اور غلیظ ترین پرندہ تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ ہر مردہ جانور بشمول انسان کا گوشت کھاتا ہے۔ مردہ گوشت ہی اس کی عام غذا ہے۔ جب کوئی جانور مرتا ہے یا مرنے کے قریب ہوتا ہے تو گدھ اس کے آس پاس جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر زندہ ہو تو اس کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں اور جیسے ہی وہ جانور مرتا ہے تو اس کو نوچ نوچ کر کھاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے گوشت سے بھرا وجود ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔ گدھ کی ایک خوبی بھی ہے کہ اپنے مردہ بہن بھائیوں کا گوشت کبھی نہیں کھاتا۔

آج کا انسان گدھ تو نہیں مگر ظلم، بے حسی اور غلاظت میں شاید گدھ کو بھی پیچھے چھوڑتا ہے۔ گدھ تو مردہ جانوروں کو اپنے نوکیلے پنجوں اور اور لمبی نوکدار چونچ سے کھاتے ہیں جبکہ انسان زندہ انسانوں کو بدعنوانی، لالچ اور دھوکے بازی جیسے اوزاروں سے نوچتا ہے۔

مسلمان جسے چودہ سو سال پہلے ایک خاندان میں پرو دیا گیا اور تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا اور ایک مکمل ضابطہ عطا کیا گیا۔ مگر اب صورتحال برعکس ہے۔ جب بھی بدعنوانی، جھوٹ، دھوکا دہی اور لالچ جیسی برائیوں کا ذکر چھڑتا ہے تو مسلمان ممالک کے نام سرفہرست ہوتے ہیں ہمیں تو دین اسلام نے زندگی کے ہر مسئلہ کے متعلق رہنمائی عطا کی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے پیاروں اور دوستوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ بدعنوانی کی چونچ سے اپنوں کو ہی نوچتے ہیں، منافع خوری اور لالچ کے گھاؤ اپنوں کو ہی لگاتے ہیں اور آخر میں گدھ کے برعکس اپنے ہی بہن بھائیوں کو کھا جاتے ہیں۔ آج کے دور کے گدھ نما انسانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو دیکھ کر اصل گدھ بھی شاید خود کو معصوم تصور کرتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کے گدھ بننے کی سب سے بڑی وجہ دین اسلام سے دوری ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان اپنی زندگی کو اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق گزاریں کیونکہ دین اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے ایک مکمل ضابطہ حیات دیا اگر برسوں جہالت میں رہنے والی اور بگڑی ہوئی مغربی اقوام مہذب ہوسکتی ہیں تو ہم مسلمان کیوں نہیں؟

ہمیں تو آج سے چودہ سو سال پہلے ایک مثالی ضابطہ حیات عطا کر دیا گیا ہے بس ضرورت صرف اپنی زندگیوں میں اسلام اور اس کے قواعد وضوابط کو عملی طور پر اپنانے کی ہے جن کو اپنی زندگیوں میں رائج کر کے ہم دنیا کی مہذب اور عظیم ترین اقوام میں شامل ہو سکتے ہیں۔ہمیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہم اپنی زندگیوں کو دین اسلام کے مطابق گزارتے ہوئے خود کو ایک سچا مسلمان ثابت کریں گے۔

☆....☆....☆

بیٹیاں رحمت، زحمت مت سمجھیں

آمنہ عبدالغفور

بیٹی جسے اللہ نے رحمت بنا کر بھیجا۔مگر شاید وہ اس دنیا کے لیے زحمت کا نشان بنا دی گئی۔ایسا کیوں اس بات کا شاید جواب کسی کے پاس ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ آج کی بیٹی کو وہ مقام حاصل نہیں جس مقام کی وہ حقدار ہے۔بیٹیوں کو نا جانے کیوں پسند نہیں کیا جاتا باوجود اس کے کہ ہم پڑھے لکھے ہیں۔پھر بھی بیٹی کی پیدائش میں ایسے منہ بن جاتے ہیں کہ جیسے کسی نے وفات کی خبر دے دی ہو۔کچھ لوگ تو حد ہی کر جاتے ہیں کہ ڈاکٹر کو مارنے لگ جاتے ہیں (نعوذ باللہ)

کچھ ایسا ہی ردعمل ساسوں ماں کا بھی ہوتا ہے کہ خود بھی کسی کی بیٹی ہوتی ہے مگر پھر بھی پوتی کے پیدا ہوتے ہی ایسے رونا ڈالتی ہے جیسے کسی نے اتنا بڑا گناہ کر لیا ہو، یہ جاہلیت ہے۔اسلام سے پہلے یعنی زمانہ جاہلیت میں لوگ لڑکی کی پیدائش کے بجائے لڑکی کی وفات پر مبارکباد دیتے تھے۔وہ لڑکیوں کو اس قدر نیچ سمجھتے تھے کہ کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ مارے شرم کے منہ چھپائے پھرتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے،اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔۔ان میں سے کچھ لوگ ایسے ظالم تھے کہ بیٹی کا باپ کہلوانے کے خوف سے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔قرآن پاک نے ایسے لوگوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے،لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائیے گا۔سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رکھے یا مٹی میں دبا دے''۔

لیکن یہ تو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا حال ہے۔۔۔بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں۔ہمارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے''جو شخص 3 بیٹیوں یا 3 بہنوں کی کفالت کرتا ہے اس پر جنت واجب ہے''۔ضروری نہیں ہے کہ 3 ہی ہوں اس سے زیادہ یہ کم بھی ہو تو جنت واجب ہے۔نبی کریم ﷺ کے فرمان سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ بیٹیاں والدین کے لیے

جنت میں جانے کا ذریعہ ہیں۔۔

بیٹیاں آخرت میں والدین کی بخشش کا سبب بھی ہوں گی۔ پھر بھی اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ بعض والدین اپنی ہی بیٹیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کرتے ہیں؟ کیوں ان کی پیدائش پر سوگ مناتے ہیں؟ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے ''تمہاری اولاد میں سب سے بہتر گھر میں رہنے والی لڑکیاں ہیں''۔ مگر اس کے باوجود ہم میں سے اکثر لڑکیوں کو رحمت کے بجائے زحمت اور نحوست کی علامت سمجھتے ہیں۔۔ کیا ہم مسلمان ہیں؟ اگر مسلمان ہیں تو پھر بچیوں کے معاملے میں ہمارا رویہ قرآن وحدیث کے منافی کیوں ہے؟

آج جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، ہم سے بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو بیٹی کی آمد کو خوش گوار نہیں سمجھتے بلکہ اس پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو باقاعدہ آنسو بہاتے ہیں اور مبارک باد کہنے کے بجائے باقاعدہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ بیٹی کو رحمت کے بجائے زحمت سمجھتے ہیں۔ اسے بوجھ گردانتے ہیں۔ بیٹیوں کو ہر معاملے میں بیٹوں سے کم تر سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ انہوں نے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے۔ آخر کو گھر کے کام کاج ہی کرنے ہیں، ان کے لیے تعلیم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ اچھی خوراک، اچھا لباس اور دیگر ضروریات زندگی میں لڑکیوں کے بجائے لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور بیٹے کی رائے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ آج کا مسلمان زمانہ جاہلیت کے لوگوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں حالانکہ جس گھر میں بیٹی نہ ہو اس گھر میں رحمت نہیں ہوتی۔ یعنی بیٹی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے۔ حضور کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''جب کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس فرشتے بھیجتے ہیں جو کہتے ہیں، اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو پھر اس بچی کو اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ضعیف ہو۔ ضعیف سے پیدا ہوئی ہو۔ قیامت تک اس کے کفیل کی مدد کی جائے گی۔

ہمیں اپنے اولاد میں بیٹیوں پر چہرے مرجھانے کے بجائے خوش ہونا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں رحمت سے نوازا ہے۔ یاد رکھیں! کل قیامت کے روز بیٹی پر منہ بنانے اور ناانصافی کا جواب دینا ہوگا اور یہی بچی کا گریبان پکڑے گی اور اللہ سے اپنے ساتھ رکھے گئے رویہ کا حساب کروائے گی۔

☆....☆....☆

قرارداد پاکستان، ماضی سے مستقبل تک

سیدہ حمیرا فاطمہ

برصغیر کے مسلمانوں کی لازوال قربانی نے ہم کو پاکستان جیسی نعمت سے نوازا مگر ہم خود ہی ناشکرے ہیں نہ اس دی ہوئی چیز کا شکر ادا کرتے ہیں نہ اس خدا سے فریاد کرتے ہیں اور وہ کے مسلسل ہم نوازتا ہے اور دیئے ہی جا رہا ہے۔کوئی ملک اس وقت تک یتیم نہیں ہوتا جب تک اس کے حکمران اپنی جیبوں کے بجائے اپنے عوام کو دیکھتے ہیں لیکن ہم وہ واحد بدقسمت ملک ہیں جس کا کوئی وارث نہیں، نام نہاد حکمران سیاست چمکانے اس ملک کا رخ کرتے ہیں جب مدت ختم ہوتی ہے تو ایک ملازمت کی طرح ملک کو ٹھوکر مار کر چلے جاتے ہیں یہ ہے میرا "پاکستان "جو مصیبتوں ،مسائل میں گھیرا ہوا ہے۔علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر آج روئے زمین پر سسکتی پھر رہی ہے۔

برصغیر میں دو قومیں آباد تھیں مسلمان اور ہندو اور ہمارے آباؤ اجداد اس بات کو محسوس کر چکے تھے کہ ہم کبھی یہاں اکثریت میں نہیں آئیں گے اور نہ یہاں ہم کو اپنے دین پر عمل کرنے دیا جائے گا تو قائداعظم اور دیگر رہنماؤں کی انتھک محنت کے نتیجے میں 23 مارچ 1940ء کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔لفظ قرارداد کے معنی کیا ہے؟ مطلب کسی کو نہیں پتا ہوگا اور ہوگا تو صرف اپنے مطلب کے لیے،،،اقرار کرنا ،تسلیم کرنا، ماننا، پر کیا ماننا؟ یہ قرارداد کس لئے منظور ہوئی تھی؟ یہ قرارداد ایک سوچ ،ایک کتاب،ایک مذہب ،ایک قوم کے لئے منظور ہوئی تھی۔اُس وقت کے دو ظالم قوموں نے یہ تسلیم کیا تھا کہ مسلمان ایک قوم ہے،انکے بھی اپنے رہن سہن ہیں،اور انکو بھی ایک الگ اور ایسے ملک کی ضرورت ہے، جو پاک ہو، جہاں وہ اپنی زندگی اُس مذہب اور اُس کتاب کے مطابق بسر کریں اور رب کی عبادت کر سکیں۔

اس لئے اس ملک پاکستان کا مطلب کیا؟ کا نعرہ بلند کیا!یعنی مجموعے میں سے ایک آواز آتی ''پاکستان کا مطلب کیا؟ اور پورا مجموعہ یک آواز ہو کر کہتا ''لا الہ الا اللہ'' اور آج 75 سال گزرنے کے بعد بھی یہ نعرہ ہماری آنے

والی نسلوں کو یاد ہے لیکن افسوس سد افسوس صرف نعرہ یاد ہے۔ مگر نعرے کا مفہوم بھول گئے!

آج کا مسلمان خاص طور پر پاکستان کا مسلمان مردوں کا اسلام چار شادیوں تک محدود ہے۔ چار شادیاں شوق سے کریں لیکن جو شرائط ہیں ان کو بھی پورا کریں۔ مردوں کے لئے اسلام میں اس کے علاوہ بھی اور احکامات ہیں، مثلا: داڑھی رکھنا، ٹخنوں سے اونچی شلوار پہننا، ان سب کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ یہ نہ تو معلوم ہے، نہ ہی جاننا چاہتے ہیں کیونکہ عمل بھی تو نہیں کرنا۔

اسی طرح ایک نظر مسلمان پاکستانی عورتوں پر ڈالیں تو ان کو اسلام کی معلومات اتنی ہے کہ انہوں نے رخصت ہونے کے بعد شوہر کو لیکر الگ ہو جانا ہے کیونکہ اسلام انہیں ساس سسر کی خدمت سے آزاد کرتا ہے کیونکہ اگر ان کی مرضی نہیں ہے کہ وہ گھر کے کام کریں تو شوہر ان کے لئے نوکر کا بندوبست کرے۔ عقل کو ہاتھ ماریں اگر شوہر کے ذہنی سکون کے خاطر تھوڑی سی محنت کر لیں تو قباحت ہے۔ جب ایسی سوچ کے حامل افراد ہوں گے تو وہ آنے والی نسلوں کی کیا تربیت کریں گے۔

مذہب اسلام ہمیں جہاں اتنی آزادی دیتا ہے، وہیں وہ ہمیں انسانیت کا درس بھی دیتا ہے۔ ہم اس پر عمل کیوں نہیں کرتے ہم صرف اپنے مطلب کی باتوں پر ہی کیوں فوکس کرتے ہیں۔ اس ملک کو اسلام کی چند باتوں پر عمل کرنے کے لئے نہیں حاصل کیا تھا۔ بلکہ زندگی کے تمام معاملات کو مکمل اسلامی ضابطہ حیات پر گزارنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ! جب جب ہم مسلمانوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو پامال کیا! ہم محکوم ہوئے ہیں اور جب جب ہم نے تعلیم اور اپنے رہن سہن کو اسلام کے مطابق گزاری ہم نے دنیا پر حکومت کی ہے۔

آج پھر 23 مارچ ہے، قرارداد پاکستان کا دن ہے، ہمیں ایک بار پھر اقرار کرنا ہوگا، اور اب کی بار ہم نوجوانوں کو آپس میں اقرار کرنا ہوگا کیونکہ کسی بھی قوم کی ترقی میں نوجوان ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆....☆....☆

تمت بالخیر والحمدللہ

(نوٹ)

یہ کتاب آپ پرنٹ کی صورت میں بھی خرید سکتے ہیں

رائٹرز کلب انتظامیہ سے کے پاس کتاب انتہائی رعایتی قیمت میں دستیاب ہے

رابطہ کے لیے

0301-7886719

داعی الی الخیر

عارف رمضان جتوئی

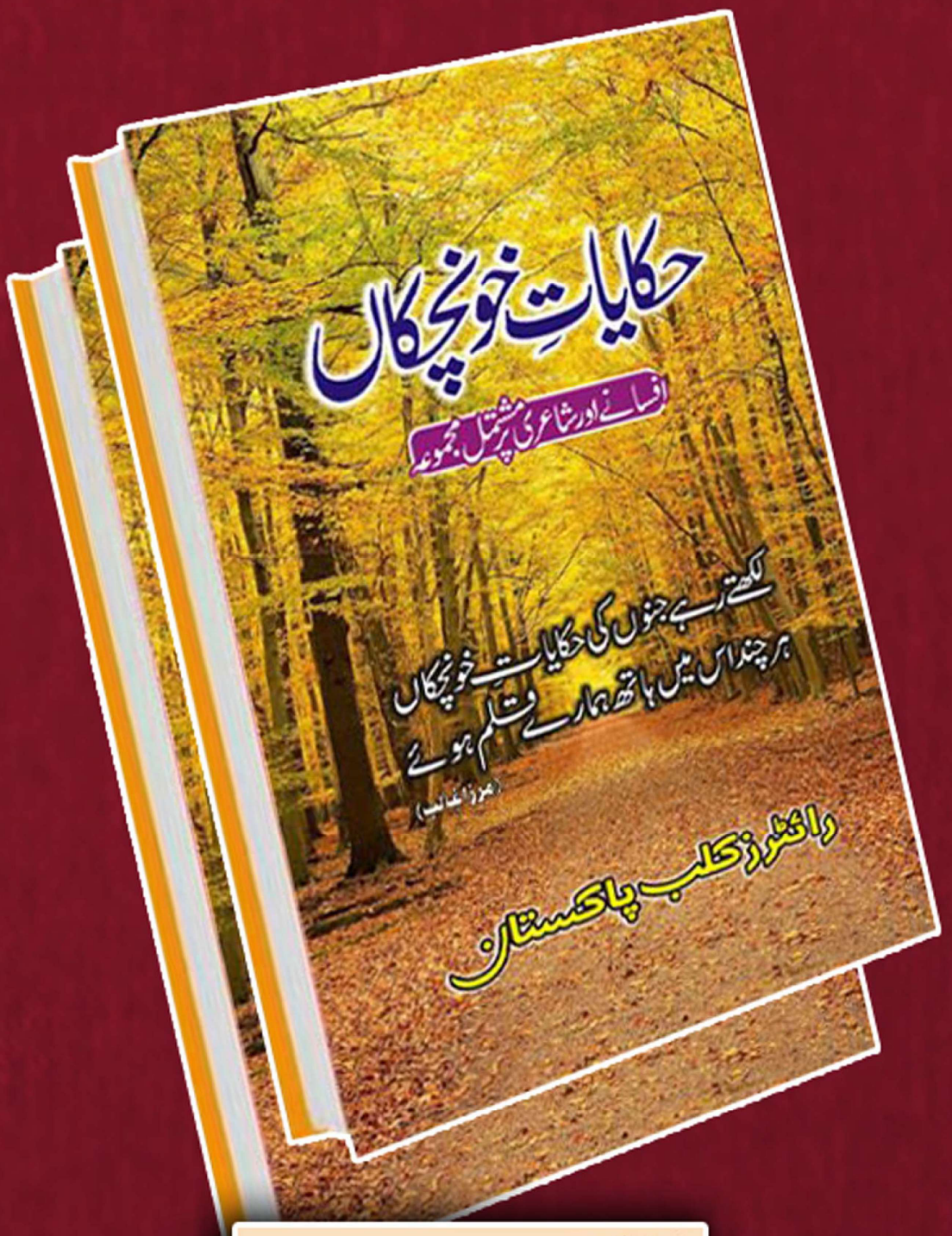

ملنے کا پتہ
جمعیت الفلاح اکبر روڈ ریگل چوک صدر کراچی
0301-7886719 / 0313-6286827
urdu.article@gmail.com
www.writersclubpakistan.com